خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

مارچ 2020

بانی

معراج رسول

صفحات 290

قیمت 100 روپے

www.alifbayjeem.com

سسپنس ڈائجسٹ
CPNE
MEMBER APNS

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

07 انشائیہ — جون ایلیا
جب الفاظ بے معنی ٹھہریں تو ایسی ہی لازوال تحریر رقم ہوتی ہے

08 آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

14 آوارہ گردی — زویا اعجاز
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

43 بوڑھی محبت — نجمہ مودی
بے قرار روح اور پیاسی محبت کا انوکھا ملاپ

51 نئی کہانی — تنویر ریاض
پرانے واقعات کے درمیان چھپی ایک انوکھی اور دلچسپ کہانی کا آغاز

60 شہہ زور — اسما قادری
اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

89 چنگاری — انجم فاروق ساحلی
کچھ کر جانے کی لگن میں کچھ بھی نہ کرنے والی حسینہ کی بے بسی

95 کارساز — صبا مغل
بے بس لوگوں کا وسیلہ بن جانے والی کارساز ذات کی مہربانی

98 عذرِ لنگ — مرزا امجد بیگ
شاطر بیوی اور جہاندیدہ شوہر کے درمیان خونی معرکہ آرائی کا احوال

www.alifbayeem.com

131 **تدبیر**
عبدالرب بھٹی
محبت کے لیے محبت کی قربانی دینے والے ایک عاشق کی نامرادیاں

139 **شارٹ کٹ**
فہمی فردوس
کمزور حالات اور بکھرے خیالات کے درمیان الجھے لوگوں کا قصہ

152 **محفلِ شعر و سخن**
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

155 **انجام**
شاکر لطیف
''چور کو پڑ گئے مور'' کے مترادف ایک شیر کی بزدلی کا افسوسناک واقعہ

170 **ساشا**
عمر عبداللہ
طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

197 **پناہ گاہ**
غزالہ یاسمین
جلتے الاؤ پر ٹھنڈی پھوار بن کر برس جانے والے ایک کمزور بادل کا قصہ

221 **حضرت حسین بن منصور حلاج ؒ**
رضوانہ ساجد
اللہ کے ایک نیک فطرت اور برگزیدہ بندے کا مقام

23 **دنیا گول ہے**
ناہید سلطانہ اختر
زمانہ طالب علمی کی بے شمار یادوں میں سے ایک خوب صورت یاد کا سہارا

237 **انٹرویو**
اعتزاز سلیم وصلی
ایک معمولی سے انٹرویو کے لیے غیر معمولی کاوشوں کا احوال

246 **کربِ نارسائی**
کاوش صدیقی
انتہائی خاموشی سے زندگی سے نکل جانے والی شریک زندگی کی دلفگار داستان

www.alifbayjeem.com

آوارہ گردی

زویا اعجاز

دنیا مختلف تواریخ کا دلچسپ مجموعہ ہے... اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر دور کے تمام پہلوئوں پر دنیا کی نظر بھی پڑ جائے... بہت کچھ جان لینے کے باوجود بہت کچھ نظروں سے اوجھل بھی رہ جاتا ہے... کچھ ایسا ہی حال اس عہد کا بھی رہا جس نے اپنے وقت پر دھوم بھی مچائی اور تباہی بھی... جہاں مختلف عقائد کا ٹکراؤ اور نتیجے میں جنگ و جدل نے بڑی خونیں تاریخ رقم کی... انتہائی گنجلک کرداروں اور غیر یقینی حادثات و واقعات سے گندھے انتہائی پُرسرار ماضی کا عکس در عکس۔

www.alifbayjeem.com

آسمان پر ابتدائی تاریخوں کا چاند روشن تھا۔

چاندنی بے حد نقرئی ہوئی تھی۔ سائبیریا کی ایک بستی ''پوکروسکوئی'' کا وہ میدان برف کی چادر اوڑھے نہایت پُرسکون تھا۔ سفید براق سی برف میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھوڑا گاڑیاں، خستہ جھگیاں اور مرجھائی ہوئی جھاڑیوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ زندگی اور خوشگواریت کے آثار صرف ایک چوبی عمارت میں موجود تھے۔ یہ مختصر سا شراب خانہ پہلی ہی نظر میں کافی بوسیدہ دکھائی دیتا تھا۔ اندرونی جانب چند چوبی میزیں اور بینچ پڑے تھے جن کے اردگرد مقامی دہقان خوشگوار انداز میں بیٹھے بنتِ انگور سے دل بہلا رہے تھے۔ ان سبھی نے موسم کی مناسبت سے اونی لبادے پہن رکھے تھے جن کی طوالت قدآدم تھی۔ بعض کے سروں پر اونی ٹوپیاں بھی تھیں۔ گھنی مونچھوں اور بے ترتیب ڈاڑھی والے ان افراد کی زندگی میں شراب نوشی ہی واحد تفریح تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ انہوں نے زندگی کو نہیں بلکہ زندگی نے انہیں گزارا ہے۔ اس کے باوجود وہ خوش باش اور مگن دکھائی دے رہے تھے۔ شراب کے جام لنڈھاتے ان کی نظروں کا مرکز ایک چودہ سالہ لڑکا تھا جو فرش سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر ایک چبوترے پر بیٹھا تھا۔ اس لڑکے نے سفید رنگ کی مقامی قمیص پہن رکھی تھی۔ پتلون اور جوتوں میں بھی خستگی نمایاں تھی۔ اس کا چہرہ استخوانی اور زرد رو تھا۔ وہ اس وقت اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

''گریشا! تو پھر بتاؤ، آج میں نے کیا کھایا ہے؟''

حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا۔ گریشا سے ایسے سوالات کرنا ان سبھی کے لیے کسی تفریح سے کم نہ تھا۔

''تم نے اس وقت اپنے ہاتھ میں سرخ رنگ کا پھول تھام رکھا ہے۔'' اس جواب نے سب کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔

''ارے احمق! اس نے تم سے کیا سوال پوچھا ہے اور تم کیا جواب دے رہے ہو؟'' ہجوم سے ایک آواز آئی تو گریشا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ نوعمری سے ہی اپنی ذلت برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ اپنے خلاف ادا ہونے والے ایک بھی لفظ کا بھرپور بدلہ لینا اس کی خصلت تھی۔

www.allbayjeem.com

''اچھا چلو چھوڑو! یہ بتاؤ اب میرے ہاتھ میں کیا ہے؟'' گریشا کے والد ایفیم یاکوولیوچ نے پوچھا۔

''محبت..... آپ کے ہاتھ میں محبت ہے۔'' اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ایفیم نے اپنے ہاتھ میں موجود کارڈ کو دیکھا جس پر کسی مقامی صوفی کی شبیہہ کندہ تھی۔

''ذرا ہمیں بھی تو دکھاؤ یا... اوپر کر کے لہراؤ!'' مجمعے سے چند آوازیں ابھریں۔ ایفیم نے ان کی فرمائش پوری کر دی۔ قہقہوں سے ماحول ایک بار پھر مرتعش ہو گیا۔

''اچھا! اب میرے ایک سوال کا جواب دو۔'' سرخی مائل ڈاڑھی اور مونچھوں والے ایک دہقان نے حظ اٹھانا چاہا۔

''بند کرو یہ سب بکواس!'' ایک پاٹ دار آواز گونجی اور سب دہقان خاموش ہو گئے۔ ''یہ لڑکا ڈھونگی ہے۔ اس کے پاس کوئی جادوئی طاقت نہیں ہے۔'' اس نے اعلان کیا۔ گریشا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا۔ گہرے بھورے رنگ کے لبادے اور ٹوپی میں ملبوس اس شخص نے جدید انداز میں کسی جانور کی بیش قیمت کھال سے بنا کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ چوڑا چکلا اور جسم بھاری بھرکم تھا۔

''مجھے منہ کھولنے پر مجبور نہ کرو پیارے! اگر میری زبان پھسل گئی تو یہاں بہت دنگا ہو جائے گا۔'' گریشا نے اسے تند نظروں سے گھورا۔ ولادی میر نامی وہ شخص ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ ایک اسی پر موقوف نہیں تھا۔ قصبے بھر میں یہی بات زبان زد عام تھی کہ گریشا کی آنکھوں میں بھیڑیے جیسی چمک اور خونخواری ہے جسے دیکھ کر بدن پر لرزہ اور حواس پر سنسناہٹ سی طاری ہو جاتی ہے۔

''یہ بے وقوف کسان تو تمہارے ڈھکوسلوں میں آ سکتے ہیں لیکن میں نہیں..... تمہارے پاس کوئی بھی ایسی طاقت نہیں ہے جسے ہم غیر معمولی کہہ سکیں۔ احمق..... گدھا..... کیچوا کہیں کا۔'' وہ شراب کے نشے میں دھت مغلظات بکتا چلا گیا۔ ایفیم بھی اس صورتِ حال پر خاصا ناخوش اور مضطرب دکھائی دینے لگا۔

''تو پھر میں سب کو بتائے ہی دیتا ہوں کہ میرے والد کے اصطبل سے گھوڑے تم نے چرائے تھے۔'' گریشا ایک جست لگا کر چبوترے سے نیچے اترا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

''گریشا! یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' ایفیم چلایا۔

''یہ بے ہودگی نہیں سچ ہے۔ ایک بہت بڑا سچ۔ آپ کے گھوڑے ولادی میر نے ہی چرائے ہیں۔'' وہ اب بھی اپنے موقف پر قائم تھا۔ ایفیم بے اختیار آگے بڑھا اور بیٹے کے چہرے پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔ گریشا لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے جا گرا۔ ولادی میر اس کی حالت پر خوشی سے قہقہے لگانے لگا۔

''معافی مانگو محترم ولادی میر سے!'' اس نے حکم دیا۔

''کس بات کی معافی؟'' وہ سرکشی سے بولا۔

''تم نے ایک معزز شخص کی توہین کی ہے۔''

''توہین بڑا جرم ہے یا اپنی اچھی معاشی حالت کے باوجود چوری جیسی عادت میں ملوث ہونا؟'' وہ ہار ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ ولادی میر نے سرور کے عالم میں شراب کا ایک اور جام بھر لیا۔

''معافی مانگو گریشا!'' ایفیم نے چلا کر کہا۔

''نہیں مانگوں گا! یہ شخص چور ہے۔ اس نے ابھی تک میری بات کو جھٹلایا بھی تو نہیں ہے۔'' گریشا نے ولادی میر کی آنکھوں میں براہِ راست جھانکا۔ ولادی میر کو اپنے حواس شل ہوتے محسوس ہونے لگے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ ذہن منجمد اور سوچیں ساکت ہو گئی ہیں۔ اردگرد کے مناظر پر وہ گہری چمکدار آنکھیں ہی چھائی ہوئی تھیں۔ وہ انکار میں سر ہلانے تک سے قاصر ہو چکا تھا۔ بلاشبہ چوری کا ارتکاب اسی نے کیا تھا۔ وہ ماضی میں بھی ایسی کئی وارداتیں کرتا رہا تھا۔

''ہاں! اس نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا۔ یہ خاموشی ہی اس کے جرم کا ثبوت ہے۔'' ہجوم سے آنے والی ایک آواز نے ولادی میر کو لرزا دیا لیکن یہ لرزش بھی اس حصار کو توڑنے میں ناکام تھی جو گریشا کی غصیلی آنکھوں نے قائم کر رکھا تھا۔

''میں بھی سوچتا تھا کہ مناسب روزگار نہ ہونے کے باوجود یہ اتنا دولت مند کیسے ہے؟'' ایک غصیلی آواز نے اسے مزید مضطرب کیا۔ گریشا نے ہلکی سی مسکراہٹ سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔

''میں نے انکار کیا تو تھا۔ یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو اس وقت یہیں اسی شراب خانے میں موجود تھا۔'' وہ روانی سے کہتا یک دم خاموش ہو گیا۔ اسے اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہوا تھا۔

''پکڑ لو اسے..... اس مجرم کو چھوڑنا نہیں۔'' چند غصیلی آوازیں ابھریں۔

''ہاں! اس کو مزہ نہ چکھایا گیا تو یہ ہم غریبوں کے مال پر یونہی قبضہ کر کے اپنی دولت بڑھاتا رہے گا۔'' کچھ اور افراد بھی ہم نوا بن گئے۔

www.allday.com

''رکو! میری بات سنو!'' وہ اپنی صفائی دینے کے لیے مچل اٹھا لیکن کوئی بھی اس کی بات سننے کے لیے تیار ہی کہاں تھا؟ غم و غصے میں مبتلا دہقان اسے دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے اور ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔

''وہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' وہ چاندی جیسی برف پر اذیت سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ آسمان سے روئی کے سفید گالے ایک تواتر سے گر رہے تھے۔ گریشا ایک بار پھر چبوترے پر چڑھا اور کھڑکی کے شیشے سے دھند صاف کر کے اطمینان سے باہر دیکھنے لگا۔ اپنی تذلیل کرنے والے اس مجرم کی یہ درگت اس کے لیے بہت خوش کن تھی۔

''خدا مہربان ہے۔ اپنے گناہ گاروں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔ لیکن گریگوری راسپوٹین ایسا کبھی نہیں کرتا۔ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرے گا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک غیر فطری و غیر انسانی چمک لہرا رہی تھی۔ اس نے مسرور انداز میں اپنے مجرم کو دیکھا اور چبوترے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔

☆☆☆

''کیا واقعی؟ تم سچ کہہ رہے ہو؟'' اینا نے حیرت سے اپنے شوہر ایفیم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! سچ کہہ رہا ہوں۔ تم دیکھ لینا کل صبح تک یہ خبر پوری بستی میں گردش کر رہی ہو... گی کہ گریشا نے ایک بار پھر کسی چور کو پہچان لیا ہے۔'' ایفیم نے یقین دلایا۔ اینا یکدم کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگی ہو؟''

''کچھ نہیں۔ گریشا کے سوا اور کیا سوچ سکتی ہوں؟'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''وہ اتنا منفرد بچہ کیوں ہے؟''

''منفرد تو وہ خیر شروع سے ہی ہے۔'' ایفیم نے دھیرے سے کہا۔ ''اس کی پیدائش کے بعد سے ہی مسائل شروع ہو گئے تھے۔''

''ہاں! تم تو اس وقت سفر پر گئے ہوئے تھے۔ دائی نے مجھ سے کہا تھا کہ اس کے بعد اور کوئی اولاد پیدا کرنے کا خطرہ مول نہ لوں ورنہ شدید جانی مسائل کا اندیشہ ہے۔''

''سفر پر جانا بھی ضروری تھا۔ سرما کی آمد تھی اس لیے رقم جمع کر کے رکھنی بہت ضروری تھی.....'' ایفیم نے بارہا کی کہی ہوئی بات دہرائی..... ایفیم سائبیریا کے میدانوں میں ''دریائے تورا'' کے کنارے پر ایک ہائی وے کے قریب ہی واقع بستی پوکروسکوئی کا رہائشی تھا۔ ''صوبہ توبول'' کی یہ عام سی بستی کسانوں اور محنت کشوں کی آبادی پر مشتمل تھی۔ ایفیم ایک گاڑی بان تھا۔ وہ گھوڑا گاڑی پر لوگوں کا سامان یا مسافروں کو آس پاس کے دیہات میں لے جایا کرتا۔ مسافر سیاحتی، کاروباری یا معاشرتی نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل علاقوں میں جایا کرتے تھے..... 1869ء میں پیدا ہونے والے گریگوری نے اپنے والدین کی شادی کے سات سال بعد اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ ستائیس سالہ ایفیم اور انتیس سالہ اینا نے اولاد کی جانب سے بہت دکھ اٹھائے تھے۔ شادی کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہونے والی بیٹیاں عہد

اتفاق

کسی نے ملا نصیر الدین سے پوچھا۔ ''ملا جی! آپ کے گھر میں کبھی حلوا بھی پکا ہے۔''

ملا جی کہنے لگے۔ ''ارادہ تو بہت دفعہ کیا لیکن کوئی نہ کوئی چیز حائل رہی مثلاً ایک دفعہ گھر میں سوجی اور چینی تو تھی مگر گھی نہیں تھا، دوسری دفعہ گھی اور چینی تو تھی مگر سوجی نہ تھی۔ تیسری دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ یہ سب چیزیں تو تھیں مگر میں نہ تھا۔

حماقت

ایک مخالف وکیل نے ملزم پر جرح کرتے ہوئے کہا۔

''قتل تم نے ہی کیا ہے۔ تمہاری انگلیوں کے نشان آلۂ قتل پر پائے گئے ہیں۔''

ملزم نے فوراً کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے خوامخواہ پھنسانے کے چکر میں ہیں۔ خنجر پر میری انگلیوں کے نشان کیسے آ سکتے تھے؟..... میں نے تو قتل کے وقت دستانے پہنے ہوئے تھے۔''

عادت

ایک شاعر کسی جرم میں گرفتار ہو گئے۔ عدالت میں مقدمہ چلا اور ان پر جرم ثابت ہو گیا۔ جج صاحب نے شاعر سے پوچھا۔

''آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

شاعر نے کہا۔ ''جی ہاں، ایک تازہ غزل حاضر ہے۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

www.alifbayjeem.com

طفولیت میں ہی وفات پا گئیں۔ اس کے بعد ایک لڑکا ''آندری'' کی ولادت ہوئی جسے وہ پیار سے 'میشا' کہتے تھے۔ پھر دو سال بعد ایک اور لڑکے کی پیدائش نے انہیں بیک وقت خوشی اور خوف کے جذبات میں مبتلا کر دیا۔ سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے جشن منائیں یا ایک اور متوقع موت کا صدمہ اٹھانے کے لیے خود کو تیار کرنے کا آغاز کر دیں۔ اس روز ''یوم سینٹ گریگوری'' تھا۔ نومولود کے لیے اسے اچھا شگن تسلیم کرتے ہوئے گریگوری نام ہی دے دیا گیا۔ اس دور میں ناخواندگی اور کم علمی کا یہ عالم تھا کہ اہل خانہ نومولود کو کوئی بھی نام دیتے وقت معنی و مطالب پر غور ہی نہیں کرتے تھے۔ گریگوری کے آباؤ اجداد سے بھی ماضی بعید میں ایک ایسی ہی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ انہیں علم ہی نہ تھا کہ راسپوٹین ایک شرمناک لفظ ''راسپوٹا'' سے ماخوذ ہے اس نام کا مصدر ''راسپوٹیسا'' تھا جس کا مطلب موسم بہار یا خزاں میں روسی شاہراہوں کا کیچڑ کی وجہ سے ناقابل گزر بن جانا تھا۔ اس حوالے سے راسپوٹین بدچلنی' عیاشی' نکمے پن اور بدکاری کے مطالب اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ ان سیدھے سادے' محنت کش اور زندگی کے مصائب سے گھرے دکھی افراد کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ گریگوری میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوں گی۔

''گریشا اوائل عمری سے ہی بہت منفرد تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سفر سے واپس آ کر جب اسے پہلی بار گود میں لیا تھا تو اس کے سیاہ گھنے بال دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا۔'' ایفیم نے ماضی کے دریچوں سے ایک اور یاد دہرائی۔

''پڑھائی لکھائی میں بھی اس کا دل بالکل نہیں لگا۔ میری کتنی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا کوئی افسر بن جائے۔'' اینا دکھی ہوئی۔

''پڑھنے لکھنے کا شوق کیا ہوتا؟ اس نے تو اصطبل کو ہی اپنا گھر بنا لیا تھا۔ گھنٹوں عبادت کے سے انداز میں وہیں موجود رہتا۔'' ایفیم نے اپنی اہلیہ کو بیٹے کی پڑھائی سے دل چرانے کی وجہ یاد کروائی۔

''میں نے بھی اس وقت کبھی اس لیے منع نہیں کیا کہ اس عمر میں بچوں کو جانوروں سے محبت ہو ہی جاتی ہے۔ وہ ان کے ساتھ وقت گزاری پسند کرتے ہیں۔''

''میں بھی اتنا سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ سوچتا تھا کہ گریشا ایک گاڑی بان کا بیٹا ہے۔ گھوڑوں سے محبت موروثی اور واقفیت مستقبل کے لیے بہت اچھی ہے۔ وہ ایک بہترین گاڑی بان ثابت ہوگا۔ میرے نام اور کام کو آگے بڑھائے گا۔ یہی سوچ کر اس کی سرگرمیاں نظر انداز کرتا رہا لیکن اس کے طور اطوار تو ہولناک ہوتے جا رہے تھے۔ گھنٹوں تک گھوڑوں کی آنکھوں میں گھورتے رہنا اور ان کے نتھنوں سے خارج ہونے والی آوازیں سن کر مطالب پر غور کرنا مجھے خوفزدہ کرنے لگا تھا۔ میں نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ اس پر سختی کروں۔ اصطبل میں اس کی دلچسپی کم کر دوں لیکن میری اس پابندی کے بعد وہ اتنا بیمار ہو گیا کہ میں یہ سلسلہ مزید جاری رکھ ہی نہ سکا۔ دوبارہ اجازت ملتے ہی وہ بالکل تندرست ہو گیا تھا۔'' ایفیم نے افسردگی سے کہا۔

''مجھے تو گریشا سے اس وقت خوف محسوس ہوا تھا جب اپنی کمزور جسمانی حالت کے باعث محنت مشقت نہیں کر پاتا تھا۔ لگن اور محنت کا جذبہ اس میں سرے سے ہی نہیں تھا۔ خوف اس لمحے پیدا ہونا شروع ہوا جب وہ تیز دھوپ میں نہائی بستی میں آسمان پر نغمہ گو پرندوں کو دیکھتا رہتا۔ سستی اور کاہلی اس کے وجود کا حصہ بن چکی تھی۔ میں یہی سوچ کر ہولتی رہتی کہ میرا یہ بیٹا مستقبل میں آخر کیا کرے گا؟''

''اسی خوف سے تو میں نے اسے اپنے ساتھ لے جانا شروع کر دیا تھا۔ بارونق علاقوں میں جا کر دنیا کی رنگینیاں دیکھنے سے ہی شاید اس کی سستی اور مخصوص ذہنی کیفیت ختم ہو جاتی۔ دور دراز علاقوں کی معاشرت اس کے دل میں اپنا مستقبل سنوارنے کی جوت جگا دیتی۔'' ایفیم کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

''شاید وہ اپنی اصلاح کر ہی لیتا لیکن میشا.....'' اینا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ہاں! میرا میشا..... جانے کیوں ہمیں اتنی جلدی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہماری کون سی خطا اسے ہم سے دور کر گئی۔'' ایفیم کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔ ان دونوں کے درمیان گہری خاموشی حائل ہو گئی۔ اس خاموشی میں برسوں کی جھیلی گئی وہ اذیت تھی جو انہوں نے اپنے بڑے بیٹے میشا کی موت کے بعد جھیلی تھی۔

میشا اپنے چھوٹے بھائی گریشا کی دوسری محبت تھا۔ پہلی محبت گھوڑوں کے بعد وہ میشا سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ دس گیارہ سالہ گریشا نے اپنے ساتھ بڑے بھائی کو بھی کھیل کود میں لگا لیا تھا۔ وہ آوارہ گردی کرتے کرتے گھر سے بہت دور نکل جاتے۔ ان کا پسندیدہ مقام ''دریائے تورا'' کا کنارہ تھا۔ دن بھر وہاں کھیل کود جاری رہتا۔ ایسے ہی ایک روز کھیل کے دوران میشا کا پاؤں پھسلا اور وہ دریا میں جا گرا۔ یخ بستہ پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ گریشا نے بڑے بھائی کو بچانے کے

www.urdudigest.com

لیے دریا میں چھلانگ لگادی۔ پانی کے تیز بہاؤ کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ گریشا کے ہاتھ پاؤں شل ہو کر رہ گئے۔ بے بسی کا یہ عالم تھا کہ دور بہتے میشا کو بچانے کے بجائے اپنی جان کے ہی لالے پڑ گئے۔ اسی دوران کسی راہ گیر کا وہاں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اچھا تیراک تھا۔ اس نے جان پر کھیل کر دونوں کو باہر نکال لیا۔ گریشا کی حالت تو جلد سنبھل گئی لیکن میشا کے پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا۔ اس کے علاوہ نمونیہ نے مزید حالت خستہ کردی۔ مقامی ڈاکٹر کی سر توڑ کوشش کے باوجود وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ میشا کی موت نے گریشا کو ذہنی صدمے میں مبتلا کر دیا۔ اسے یہ احساسِ جرم چین ہی نہ لینے دیتا کہ بڑے بھائی کی موت کا اصل ذمے دار وہ ہے۔ میشا کو آوارہ گردی، کھیل کود اور دریائے تورا کے کنارے جانے کی لت ڈالنے والا وہی تو تھا۔ اس احساسِ جرم سے گریشا سخت بیمار پڑ گیا۔ علاج معالجے کے باوجود اس کا بخار اترکے ہی نہ دیتا۔ رنگت میں زردی گھل چکی تھی۔ کمزوری اس قدر تھی کہ دو قدم چلنے کی بھی سکت نہ رہی۔ اس کی کھال ہڈیوں سے منڈھا چمڑا معلوم ہوتی تھی۔ اہلِ علاقہ دبی زبان میں اسے ''آسیب زدہ مخلوق'' کہنے لگے تھے۔ گھر والے اس کی زندگی سے بے حد مایوس ہو چکے تھے۔ اس کا بستر باورچی خانے میں ہی لگا دیا گیا۔ شام کے بعد مقامی روایات کے مطابق دہقان شراب خانے یا کسی نہ کسی ساتھی کے گھر اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ اس روز وہ سب ایفیم کے گھر جمع تھے۔ موضوعِ گفتگو علاقے میں ہونے والی ایک چوری تھی۔ ایسی واردات کا ہونا سب کے لیے لمحۂ فکریہ تھا۔

''ساتھیو! ہمیں چور کو تلاش کرنا چاہیے۔ آج ایک گھر میں چوری ہوئی ہے۔ چور کی ہمت بڑھتی گئی تو وہ بڑی وارداتیں بھی کرنے لگے گا۔'' پیٹر نامی ایک شخص نے ہمدردی سے سبھی کے دلی جذبات کو گویائی دی۔

''لیکن پتا چلے بھی کیسے؟'' ایفیم نے تاسف سے سر ہلایا۔

''چور یہیں آپ سب کے درمیان موجود ہے۔'' گریشا کی نحیف آواز نے وہاں ایک دھماکا کر دیا۔ ''پیٹر الیگزنڈروچ نے ہی چوری کی ہے۔''

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ کیا میں تمہیں شکل سے چور لگتا ہوں؟'' پیٹر چلایا۔ ''تمہارے گھر میں مہمانوں کی خاطر داری اس طرح کی جاتی ہے ایفیم؟''

''معاف کرنا میرے دوست! گریشا نادان ہے۔ میشا کی وفات کے بعد اس کا ذہنی توازن اور جسمانی صلاحیتیں ٹھیک نہیں ہیں۔'' ایفیم نے جلدی سے وضاحت دی۔

''وہ بچہ ہے، ناسمجھ ہے، آپ بھی کس کی بات کو سنجیدہ لے رہے ہیں۔'' اینا نے بھی معذرت کی۔ اس وقت معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مہمان بھی رخصت ہو گئے تاہم اصل ہنگامہ نصف شب کے بعد بیدار ہوا۔ بستی کے کچھ افراد نے پیٹر کو مالِ مسروقہ کے ساتھ فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ شام کو ہونے والے واقعے کے بعد اس کے دل میں خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ اسے گرفتار کر لیں گے۔ وہ مالِ مسروقہ کو کہیں ٹھکانے لگانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ پیٹر کی اس گرفتاری نے گریشا کی قدر و قیمت میں راتوں رات اضافہ کر دیا۔ اہلِ علاقہ کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو گئی تھی کہ گریشا ایک ''غیر معمولی'' بچہ ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل تلاشنے اس کے پاس آنے لگے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ گریشا کی کہی ہوئی ہر بات سچ ثابت ہونے لگی۔ مختصر عرصے میں پوکروسکوئی کے کئی لوگ اس کے عقیدت مند بن گئے۔ ایفیم کے گھرانے کی عزت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ کچھ وقت اور گزرا تو گریشا کی حالت ناقابلِ یقین رفتار سے سنبھلنے لگی۔ صحت میں بہتری کے ساتھ ہی جسمانی پھرتی اور توانائی بھی لوٹ آئی۔ گریشا کی اس نئی زندگی نے والدین اور اہلِ علاقہ کو تھوڑے ہی عرصے میں زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ بدتمیزی کی حد تک شریر ہو چکا تھا۔ کبھی کسی کے کھیت میں گھس کر فصلیں تباہ کر دیتا تو کبھی ذخیروں کو نذرِ آتش کر دیتا۔ میشا کی دائمی غیر موجودگی کے باعث اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تو انجام مار پیٹ کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ وہ ''ناقابلِ برداشت'' عہدے پر فائز ہو گیا۔ اہلِ علاقہ آئے روز اس کی شکایات لے کر والدین کے پاس بھی آتے لیکن نتیجہ صفر۔ ایفیم اور اینا کی اکلوتی اولاد ان کے لیے ایک بہت بڑا امتحان بن گئی تھی۔

☆☆☆

گریشا نامی آسیب اب بچپن کی حدود سے نکل کر عہدِ نوجوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔ بچپن میں ہر نے والی اس بیماری نے اس کی جسمانی ساخت پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ ایک دبلا پتلا اور بے کشش شخص تھا۔ اس کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی ''آنکھیں'' تھیں۔ خواب ناک، چمکدار اور روح کی گہرائیوں تک اترتی ہوئیں۔ اس کی زندگی کے دو ہی معمول تھے۔ پوکروسکوئی میں اودھم مچائے رکھنا اور شراب کے نشے میں دھت رہنا۔ ایفیم نے اس کی سرکشی قابو کرنے کے لیے غم روزگار میں ملوث کرنے کے لیے بستی کے ماحول سے دور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

www.urdupoint.com

''ہمارا ایک ہی بیٹا ہے ایفیم! اسے بھی میلوں دور بھیج رہے ہو۔'' اینا نے تڑپ کر کہا۔

''میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ اسے ذمے داریوں میں الجھا دینا ہی بہتر ہے ورنہ وہ وقت دور نہیں جب ہمارے پاس پچھتاووں کے سوا اور کچھ نہیں بچے گا۔'' ایفیم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اگر تم اس کی شراب نوشی کی وجہ سے یہ بات کہہ رہے ہو تو روسی دہقانوں میں یہ بات عام ہے۔ تم بھی تو شراب پی ہی لیا کرتے ہو۔'' وہ دبے لفظوں میں بولی۔

''ہاں! میں مانتا ہوں اور اب یہ بھی سوچنے پر مجبور ہوں کہ اپنی یہ عادت ترک کر دوں۔ آج اگر میں اس عادت میں مبتلا نہ ہوتا تو شاید گریشا کو سختی سے روک ہی لیتا۔'' وہ مضطرب تھا۔

''بچہ ہے۔ آہستہ آہستہ سدھر ہی جائے گا۔'' اینا نے روایتی دلیل دی۔

''نہیں اینا! وہ اب بچہ ہی تو نہیں رہا۔ مجھے اس کے مزاج میں پُرتشدد عیاشی اور وحشیانہ مارکٹائی نظر آ رہی ہے۔ وہ مجھ سے بھی کئی بار دو بدو ہو چکا ہے۔ مجھے تو خدشہ ہے کہ وہ مارکٹائی کے کسی نئے رستے پر نہ چل پڑے۔''

''خدا نہ کرے! ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ میری کتنی خواہش تھی کہ اسے زندگی میں اس قدر کامیابی ملے کہ دنیا ہمیں اس کے نام سے شناخت کرے۔'' اینا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

''رونے سے کیا حاصل ہوگا اینا؟'' ایفیم نے اس کا سر تھپکا۔ ''یہ وقت بہت سوچ سمجھ کر گزارنا ہوگا۔ تھوڑے مشکل فیصلے کر کے ہم گریشا کو راہِ راست پر لے آئیں گے۔'' ایفیم جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے لگا۔

خواب اور ان کی سہانی تعبیر دیکھتے ان میاں بیوی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ''احمق گریشا'' نے انہیں زندگی بھر آنسوؤں کا تحفہ ہی دینا ہے اور وہ تاقیامت اپنے بیٹے کے حوالے سے تاریخ کا حصہ بن کر امر ہو جائیں گے۔ اینا صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے خاموش ہو گئی۔ گریگوری کو ''تیومن'' نامی بستی میں کاشتکاری کے لیے بھیج دیا گیا۔ کچھ وقت سکون سے گزر گیا۔ اینا اور ایفیم سوچنے لگے کہ خدا نے ان کی سن لی ہے۔ وہ خوش اور پُرسکون ہو گئے۔ اس اطمینان اور سرشاری کا خاتمہ اس روز ہوا جب گریشا زخمی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا گھر چلا آیا۔

''یہ سب کیا ہے گریشا؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اینا دہل گئی۔ وہ بیٹے کو زخموں سے چور دیکھ کر اس کے وجود سے اٹھتے شراب کے بھبکے بھی نظرانداز کر بیٹھی تھی۔

''کچھ نہیں ہوا..... کچھ ہونا تھا کیا؟'' وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔

''واپس کیوں آئے ہو؟'' ایفیم نے پوچھا۔

''میری مرضی..... آنا تھا بس آ گیا۔'' اس نے بدلحاظی سے جواب دیا۔

''میرے بچے! اگر ماں سے ملنے کا اتنا ہی دل چاہ رہا تھا تو گھوڑے پر چلے آتے۔ میلوں تک پیدل آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' اینا نے اس کے گھنے بال سنوارے جو اس وقت میل اور پسینے سے سخت کھردرے ہو رہے تھے۔

''گھوڑا میرے نیچے سے نکل جاتا تھا۔ وہ..... میرے ساتھ پتا نہیں کون سا کھیل کھیلنا چاہ رہا تھا۔ میں اسے ٹانگ مار کے چلا آیا۔'' گریشا نے مخمور لہجے میں فحش گالی دی۔ ایفیم تاسف سے بیٹے کو دیکھ کر رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نشے میں ہونے کے باعث گریشا گھوڑے پر بیٹھ ہی نہیں پا رہا ہوگا۔

''یہ زخم کیسے آئے تمہیں؟'' اس نے سختی سے پوچھا۔

''بے چارے مسکینی کے عالم میں روتے ہوئے بستی سے باہر گھوم رہے تھے۔ میں نے سوچا اکیلے ہیں۔ کہیں رستہ ہی نہ بھٹک جائیں۔ اس لیے پکڑ کر بدن پر سجا لیے۔ اب انہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔'' بیٹے کے اس بے ربط جواب نے ایفیم کا ذہن گھما دیا۔

''کسی بگھی یا گدھا گاڑی پر ہی آ جاتے۔'' اینا نے روتے ہوئے کہا۔

''روبل مانگتے ہیں وہ۔ اور میری جیب کسی طوائف کی طرح ہے۔ اس کے پاس روبل کسی گاہک کی طرح کچھ دیر کے لیے ہی نکلتے ہیں۔'' اس کے بے ہودہ انداز پر ایفیم کا ضبط بالکل جواب دے گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھانے کی خواہش پر بہ مشکل قابو پایا اور بیٹے کو گھر کنے کا ارادہ پھر کسی وقت پر اٹھا رکھا۔ یہ موقع بھی اسے بہت جلد مل گیا۔ زخموں سے صحت یابی کے بعد گریشا سستی اور کاہلی اختیار کیے بستر پر اینڈتا رہتا۔ کبھی کسی وقت دل چاہتا تو دریائے تورا کے کنارے جا کر کتنی ہی دیر خلاؤں میں نظریں جمائے نادیدہ نقوش تلاشتا رہتا۔ ایفیم نے اس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''تیومن کب جا رہے ہو؟''

''کبھی بھی نہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''کیوں؟'' ایفیم نے تیوریاں چڑھائیں۔ ''کام کاج کا کیا ہوگا؟''

www.dilbayjeem.com

''تم ہو نہ کام کرنے کے لیے۔ گزارہ ہو ہی جائے گا۔''

''تمہیں شرم نہیں آتی گریشا؟ باپ کمانے والی مشین ہے کیا؟ میں نے ساری زندگی تمہیں کھلایا ہے۔ اب تمہارا فرض بنتا ہے کہ اپنے والدین کو کما کر کھلاؤ۔'' ایفیم دکھی تھا۔

''تو کون سا احسان کیا ہے؟ دنیا کا ہر باپ ہی ایسا کرتا ہے۔ اسے ایسا کرنا ہی ہوتا ہے۔'' وہ بدلحاظی سے بولا۔

''تم اس قدر بے حس، بے ضمیر اور سرکش کیوں ہو گریشا؟''

''آپ کو پتا ہونا چاہیے۔ آپ ہی کی اولاد ہوں۔'' اس نے اپنی ناک میں انگلی پھیری اور مواد کپڑوں سے ہی صاف کر کے دانتوں سے ناخن کترنے لگا۔

''بس! بہت ہو گئی تمہاری ہٹ دھرمی۔ کل تم تیومن جاؤ گے اور کاشتکاری شروع کرو گے۔''

''میں تو نہیں جاؤں گا۔ یہ کاشتکاری میرے بس کا روگ نہیں ہے۔'' گریشا اب تسلسل سے جمائیاں لے رہا تھا۔ ایفیم کا ضبط ختم ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو طمانچہ رسید کر دیا۔ گریگوری نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی زبان سے مغلظات کا ایک سمندر ابل پڑا تھا۔ آواز اس قدر بلند تھی کہ ہمسائے بھی اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔

''کیا ہوا ہے اندر؟'' ایک شخص نے دوسرے سے دریافت کیا۔

''ایفیم اپنے بیٹے سے لڑ رہا ہے۔ گریشا کی حرکات اب ناقابلِ برداشت ہونے لگی ہیں۔'' جواب ملا۔

''وہ پاگل ہو گیا ہے کیا؟ گریشا سے لڑ رہا ہے۔ اس کی یہ ہمت بھی کیسے ہو گئی؟'' دوسرے نے خوفزدگی سے کہا۔

''گریشا خداوند کا خاص بندہ ہے۔ ہماری بستی کے لیے ایک اوتار ہے۔ اس سے الجھنے کا خمیازہ بہت مہنگا ثابت ہو سکتا ہے۔'' تیسرے شخص نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ ان سب کی باتوں سے بے نیاز گریگوری تن فن کرتا باہر نکلا اور چہل قدمی کے انداز میں اپنے مخصوص مقام کی طرف چل دیا۔ بستی کے لوگ قیاس آرائیاں کرتے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

☆☆☆

ایفیم اور گریشا کی یہ لڑائیاں معمول بن گئی تھیں۔ اس دوران گریشا نے خود کو ایک اور مشغلے میں الجھا لیا۔ وہ جس وقت جس بھی لڑکی کو چاہتا اپنے ساتھ کسی نہ کسی ویران مقام پر لے جا کر آبروریزی کر دیتا۔ اس کی آنکھوں میں پنہاں غیر معمولی تنویمی کیفیت کے سامنے بہت کم لوگ مزاحمت کر پاتے تھے۔ بستی کے افراد اسے دن بھر کئی لڑکیوں کے ساتھ اس ویرانے میں آتے جاتے دیکھتے لیکن اس کی شخصیت کے رعب و خوف سے کچھ بھی کہنے کی جرأت ہی نہ کر پاتے۔

گریشا کی یہ منفی مصروفیات ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی چلی گئیں۔ عورت بازی کے ساتھ شراب نوشی بھی ایک نئی نہج اختیار کر رہی تھی۔ اس عیاشی کے لیے اب ایفیم سے پیسوں کا حصول تو ممکن ہی نہ تھا، مجبوراً اسے ایک اور راہ اختیار کرنا پڑی۔ اس نے آس پاس کے گھروں میں سوکھی گھاس کے گردگی باڑھ چرانے کا آغاز کر دیا۔ اس مقصد کے لیے ایک بیل گاڑی بھی تیار رہتی تھی۔ ایک روز ایسی ہی باڑھ اکھاڑ کر بیل گاڑی پر لاد کر کھسکنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ مکان مالک وہاں چلا آیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ ایک مقدس انسان ہو کر چوریاں کرتے ہو؟ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ سب ایک ڈھونگ ہے لیکن لوگوں کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں جو انہیں حقیقت نظر نہیں آتی۔'' وہ غصے سے چلانے لگا۔ گریشا نے غضبناک نگاہوں سے اسے دیکھ کر اپنے قابو میں کرنا چاہا لیکن اس بار ناکام رہا۔

''چلو میرے ساتھ! تمہارا علاج علاقائی منتظم ہی کرے گا۔'' ہمسائے نے اسے بازو سے کھینچا۔ ''وہ بستی کی باقی چوریاں بھی تم سے اگلوا لے گا۔''

گریشا نے لمحہ بھر میں ذہنی جمع تفریق کی اور بیل گاڑی میں رکھی کلہاڑی نکال لی۔

''میرے پاس آنے کی جرأت نہ کرنا۔'' اس نے کلہاڑی لہرا کر حملہ کرنا چاہا۔ ہمسائے نے کسی بھی دباؤ میں آئے بغیر اپنی لٹھ گھمادی۔ لٹھ اس قدر زور سے لگی کہ منہ اور ناک سے فوری خون جاری ہو گیا۔ شراب کے نشے میں مخمور گریشا لڑکھڑا گیا۔ ہمسایہ لمحہ بھر کے لیے گھبرا گیا۔ اسے خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اس کی روح ہی پرواز نہ کر گئی ہو۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''احمق گریشا! کیا ہوا ہے تمہیں؟ اٹھو!'' وہ اسے ہلانے لگا۔ کچھ دیر بعد گریگوری کے ساکت وجود میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ قدرے سست انداز میں کسمسا رہا تھا۔ ہمسائے کے تیور دوبارہ تبدیل ہو گئے۔ وہ اسے کھینچ تان کر دوبارہ علاقائی دفتر لے جانے کے درپے تھا۔ گریشا نے ایک بار پھر مزاحمت شروع کر دی۔ ہمسائے نے اس کے چہرے پر پے در پے کئی گھونسے رسید کیے۔ اس پٹائی نے گریشا پر عجیب

www.alhaiyeem.com

ہی اثر کیا۔ وہ یکدم ہی ہونق بن گیا تھا۔ اس نے مزاحمت ترک کی اور تعاون کے سے انداز میں ہمسائے کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ گریشا اس وقت ایک انوکھی سرشاری میں مبتلا تھا۔ مضروب بدن' بہتا لہو اور احساس ذلت اسے ایسی مسرت فراہم کر رہے تھے جو آج سے قبل کبھی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ علاقائی منتظم نے اسے سخت تنبیہہ کے بعد چھوڑ دیا۔ ہمسائے کو بھی توقع تھی کہ وہ اس درگت اور تنبیہہ کے بعد اپنی یہ روش ترک کر دے گا لیکن گریشا پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے کچھ ہی عرصے بعد اسی شخص کی ایک مشترکہ چراگاہ سے دو گھوڑے چرا لیے۔ اس چوری میں اسی جیسے کچھ اور افراد بھی شامل تھے۔ یہ چوری بھی ناکام رہی۔ اہلِ علاقہ نے انہیں گرفتار کروا دیا۔ مشرقی سائبیریا کی ایک عدالت میں ان سب پر مقدمہ چلا۔ گریشا کے ساتھیوں کو جیل بھیج دیا گیا لیکن اسے کوئی سزا نہ ملی۔ اس بریت کے بعد وہ کھل کر کھیلنے لگا۔ بستی کی کوئی بھی لڑکی اس کی دست درازی سے محفوظ نہ رہی تھی۔ وہ جس کے گھر میں چاہے، گھس جاتا اور اپنے شکار کی عزت پامال کر کے دندناتا ہوا بے خوفی سے بستی میں گھومتا۔ اس کی یہ حرکات اہلِ علاقہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو متاثرہ لڑکیوں کی ماؤں نے اجتماع کی صورت میں اینا اور ایفیم کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ ان کے طنزیہ اور سفاک' توہین میں لتھڑے الفاظ سن کر اینا زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''میری بہنو! میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اپنے بیٹے کی غلطی تسلیم ہے۔'' وہ ندامت سے بولی۔

''صرف تسلیم کر لینے سے کیا ہو گا اینا؟ تمہاری تربیت کا ہی کھوٹ ہے جو آج ہم سب کو یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔''

''مجھے اپنی تربیت کی کوتاہی بھی تسلیم ہے۔ تمہاری بیٹیاں میری بچیوں جیسی ہی ہیں۔ مجھے ان کی اذیت اور دکھ کا احساس ہے۔'' اینا رونے لگی۔

''شکر کرو اینا کہ تمہاری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ ورنہ تمہارا گریشا جس شیطانی فطرت کا مالک ہے انہیں بھی ہوس کا نشانہ بنا دیتا..... بلکہ دن رات بناتا ہی رہتا۔'' ایک ہمسائی کے یہ الفاظ کسی خنجر کی طرح اس کے دل میں گڑ گئے۔ اس لمحے وہ گڑگڑا کر یہ دعا مانگ رہی تھی کہ کسی طرح بیٹے کی شادی کر دے تاکہ وہ راہ راست پر آ جائے۔ اینا کی یہ خواہش بہت جلد پوری ہو تو گئی لیکن ادھوری۔ انہی دنوں گریگوری کی ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جس کے لیے وہ شادی کی حد تک سنجیدہ ہو گیا۔

☆☆☆

گاؤں بھر میں میلے کی تیاریوں کا غلغلہ تھا۔ گاؤں کے باہر میدان میں لگنے والا یہ روایتی میلا بے حد پُررونق' ہنگاموں اور تفریح کا مرکز ہوتا تھا۔ گریشا ہمیشہ ہی ایسے مواقع کی تلاش میں رہا کرتا۔ آوارگی اور بوالہوسی کو تسکین دینے کے لیے اس سے بہتر موقع کہاں میسر آ سکتا تھا؟

پہلا روز لڑکیوں کا تعاقب اور ان پر بے ہودہ فقرے کستے ہوئے مزے سے گزرا۔ دوسرے دن بھی روانگی سے قبل اس نے حسب معمول شراب پی اور پہلے سے زیادہ جوش و جذبے سے میلے میں پہنچ گیا۔ اس کی توجہ کا مرکز لڑکیاں ہی تھیں۔ تعاقب کرتے' فقرے کستے اور جوانی مغلظات سنتے وہ بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک طرح دار... لڑکی پر پڑی جو اکیلی ہی ایک جانب کھڑی تھی۔ وہ بے اختیار اس کی جانب لپکا تاہم اس لپک میں پہلے کی طرح سفلی جذبات نہیں تھے۔

''اکیلی کیوں ہو؟ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے کیا؟''

لڑکی نے نگاہِ غلط دہرائی اور ناگواری سے منہ پھیر لیا۔

''مجھ سے رخ پھیر لینے سے کچھ نہیں ہو گا اے پری وش! میں جس چیز کی تمنا کر لوں اسے حاصل کر کے ہی دم لیتا ہوں۔''

''ہاں! تمہارے سیاہ کرتوت تو چہرے مہرے اور حلیے سے ہی نظر آ رہے ہیں۔ آوارہ تو ہو ہی..... بدکردار بھی لگتے ہو۔'' وہ تنک کر بولی۔

''میں تو ابھی تمہارے پاس آ کر کھڑا ہوا ہوں۔ میں نے ایسا کیا کر دیا جو تمہیں بدکرداری محسوس ہو رہی ہے۔''

گریشا اس کے ہر ایک انداز سے گھائل ہو رہا تھا۔

''تمہارے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی ہے۔ یہی تمہارے کردار کا بہت بڑا ثبوت ہے۔'' اس کے دوٹوک انداز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''تمہیں علم ہے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔'' گریشا نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان نگاہوں میں حرص کا نام و نشان نہیں تھا۔

''ہاں! مجھے بالکل علم ہے۔ تمہیں زمین و آسمان کے قلابے ملانے یا شاعری کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''شاعری نہیں کروں گا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔'' اس نے اپنے ارادے ظاہر کیے۔

''میری مرضی کے بغیر ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

''لوگوں کی مرضی تبدیل کر کے اپنے مطابق ڈھالنا

www.aftabiyem.com

مجھے بھی بہت مرغوب ہے۔" گریگوری نے جتایا۔ لڑکی اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ اس نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ گریگوری راسپوٹین بہت مشتاق لیکن محتاط انداز میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ کسی بھی لڑکی کے بارے میں گریشا کا یہ ردعمل بے حد انوکھا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ صنفِ نازک کی عزت کا خیال کرنے اور اسے رسوا نہ کرنے کا دل چاہ رہا تھا۔ گریشا کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں تھی کہ وہ "محبت" نامی آفاتی جذبے کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ کہنا تو مشکل تھا کہ اس جذبے کا دورانیہ کتنی دیر قائم رہتا ہے۔ تاہم وہ شادی کے فیصلے پر اٹل تھا۔ اس نے لڑکی کی رہائش گاہ دیکھی اور اپنے گھر آ کر والدہ کے سامنے صورتِ حال بیان کر دی۔

"میں کسی بھی لڑکی کے گھر تمہارا رشتہ لے کر نہیں جاؤں گی۔" اینا نے موقع بہترین جان کر اسے رگیدنا شروع کیا۔

"مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔ آپ شاید یہ بھول رہی ہیں کہ اس گھر کو اب کام کرنے والے دو مزید ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ اس بستی میں بیویوں کا انتخاب ان کی جوانی یا خوبصورتی نہیں بلکہ مضبوطی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور وہ ایک مضبوط لڑکی ہے۔"

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا تمہاری ذات میں ایسی کوئی خوبی ہے جس کی بنا پر میں ان بھلے لوگوں کے سامنے اپنا سوال رکھ سکوں۔" اینا کی صاف گوئی پر گریشا ذرا بھر بھی شرمندہ نہ ہوا۔ اس نے دلائل اور جذباتی استحصال سے کسی طرح والدہ کو قائل کر لیا۔ اینا ڈھیروں خدشات لیے بیٹے کے بتائے گئے پتے پر چلی گئی۔ نتیجہ حسبِ توقع برآمد ہوا۔ "پریسکو ویا" کے اہلِ خانہ نے صاف انکار کر دیا۔

"دیکھ لیا اپنی ضد کا انجام؟ میں نے تمہیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔" اینا اپنی توہین پر ملول تھی۔

"اس معاملے کو میں اب خود ہی دیکھ لوں گا۔ ان کا انکار بہت جلد اقرار میں تبدیل ہو جائے گا۔" گریشا پُراعتماد تھا۔ وہ اگلے ہی روز پریسکو ویا کے گھر پہنچ گیا۔

"ہم آپ کی والدہ کو کل ہی جواب دے چکے ہیں۔ یہ شادی ممکن نہیں ہے۔" پریسکو ویا کے والد نے کہا۔

"آپ انکار کی وجہ تو بتائیے کوئی؟" گریشا نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کیں تو مقابل بے چینی محسوس کرنے لگا۔

"تمہاری شہرت اچھی نہیں ہے۔ لڑکیوں سے تعلقات کی خبریں بھی سننے کو ملتی رہتی ہیں۔"

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم بہار کے
دل کش نظارے
مارچ کے شمارے
کے یادگار پیامے

وبائی ہتھیار
وبائی وائرس جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا.....
بایولوجیکل وبائی ہتھیاروں کی تجربہ گاہ.....
ایکشن، تحیر اور سنسنی خیزی کا شاہکار

انا گیر
سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے
سوداگر کی دل فگار داستان..... امجد جاوید
کے زور آور قلم کا امتحان.....

الاؤ
مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل.....
زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار
کی جا رہی تھی..... ڈاکٹر عبدالرب بخشی
کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ
قاتل و مقتول کی آنکھ مچولی..... قاتل
اپنے مقتول کی کھوج میں تھا.....
دھند پھیلی ہو تو بہت کچھ آنکھوں سے اوجھل ہی رہتا ہے.....
دھند میں چھپے چہروں کی دوستی، دشمنی اور سفاکی.....

چٹپٹی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

''ایسا کون مرد نہیں کرتا؟ کیا آپ کا شادی سے پہلے کہیں کوئی رومانوی تعلق نہیں تھا؟'' اس نے الٹا سوال داغا۔

''تم کماتے بھی تو نہیں ہو؟''

''کماتا نہیں ہوں تو کہیں سے مانگتا بھی تو نہیں ہوں۔'' وہ تن کر بولا۔ پریسکو ویا کے والد کی مزاحمت خودکار انداز میں دم توڑنے لگی۔ انہیں اپنا ذہن اور سوچیں کسی شکنجے میں جکڑی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے! میں اس شادی کے لیے تیار ہوں۔'' انہوں نے بلا ارادہ کہا۔ گریگوری مسکراتا ہوا اٹھ گیا۔

''مجھے آپ سے اسی دانشمندی کی امید تھی۔ میں آپ کو بالکل مایوس نہیں کروں گا۔'' وہ اینا اور انعیم کو خوشخبری دینے کے لیے گھر لوٹ گیا۔

پریسکو ویا اور گریگوری راسپوٹین کی شادی مقامی روایات کے مطابق انجام پا گئی۔ شادی کے بعد پہلی ہی رات پریسکو ویا کو اس کی شیطانی خصلت اور حیوانی مزاج کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا وجدان بھانپ گیا تھا کہ زندگی بہت بڑے طوفان کی زد میں آ گئی ہے لیکن گریشا نے اس کی توقعات سے بھی زیادہ بدخصلت اور کم ظرف ثابت ہونا تھا۔ اس نے بیوی کے پند و نصائح کا بدلہ لینے کے لیے بستی کی ایسی خواتین کو گھر لانے کا آغاز کر دیا جو اچھی شہرت کی حامل نہیں تھیں۔ وہ آوارگی اور بدکرداری میں اپنی مثال آپ تھیں لہٰذا بخوشی اس کے ساتھ چلی آتیں۔ پریسکو ویا نے صدائے احتجاج بلند کی تو گریشا کے شیطانی دماغ نے بدلہ لینے کے لیے ایک نئی راہ تلاش کر لی۔ وہ بیوی کے سامنے ہی ان عورتوں کے ساتھ شرمناک کھیل کا آغاز کر دیتا۔ پریسکو ویا بے بسی اور اذیت سے آنکھیں میچ لیتی لیکن گریشا کسی نہ کسی طریقے سے اسے وہ بے ہودہ مناظر دیکھنے پر مجبور کر دیا کرتا۔ اس صورتِ حال سے تنگ آ کر پریسکو ویا نے شادی کا بندھن توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سنجیدگی سے اس فیصلے پر عمل پیرا ہونا چاہتی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کے خزاں رسیدہ گلشن میں امید اور تبدیلی کی نوید کے لیے ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ پریسکو ویا کے دل میں خوش فہم جذبات اجاگر ہونے لگے کہ اولاد کی ذمے داریاں گریشا کو شراب نوشی اور خواتین کے ساتھ تعلقات ختم کرنے پر مجبور کر دے گا۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ پڑا تو پریسکو ویا نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''گریشا! تم ایک بیٹی کے باپ بن چکے ہو۔''

''تم نے مجھ پر یہ عظیم انکشاف کر کے کتنا بڑا احسان کر دیا۔ اوہ! مجھے تو اس بات کا علم ہی نہیں ہو سکا تھا۔'' وہ شراب کے نشے میں مخمور تھا۔

''کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو گریشا!'' وہ غصے سے چلائی۔ ''تمہیں ذرا احساس نہیں ہے کہ اپنی ذمے داریاں کس طرح پوری کرنی ہیں۔ کل کو بیٹی جوان ہو گی۔ وہ اپنے باپ کو ان اخلاقی برائیوں میں مبتلا دیکھے گی تو کیا سوچے گی؟ کیا کرے گی؟ کیا تم اسے کسی بھی غلط راہ پر چلنے سے منع کر سکو گے؟''

''میں کیوں منع کروں گا؟ میں تو خود اسے بتاؤں گا کہ زندگی کا فلسفہ گناہ میں پوشیدہ ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جس قدر گناہ کرے گا اسی قدر نیکی کی اہمیت معلوم ہو گی۔ نیکی کا اصل سرور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ گناہ کی بھرپور لذتیں حاصل کی جائیں۔'' اس کی دلیل اور ذہنی استعداد نے پریسکو ویا کا تن بدن بھسم کر دیا۔ اس کا شوہر کتنے آرام سے بیٹی کو گناہوں اور بدکاری کی جانب مائل کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

''تم سے شادی کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی لیکن اب میں یہ غلطی سدھار لوں گی۔'' وہ غصے سے کہتی اپنی بچی کے ساتھ والدین کے گھر چلی گئی۔ اس انتہائی فیصلے پر عمل کرنے سے قبل وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے ایک بار پھر سوچ بچار کرنا چاہتی تھی۔

کچھ عرصہ یونہی خاموشی سے بیت گیا۔ اس کا گریشا سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اہلِ علاقہ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی خبر لیے چلے آتے۔ وہ اس کے ساتھ نہ ہونے کے باوجود تمام معمولات سے آگاہ تھی۔ گریگوری راسپوٹین کا زیادہ تر وقت دریائے تورا کے کنارے بسر ہو رہا تھا۔ وہ وہاں عجیب و غریب حرکات میں مشغول پایا جاتا تھا۔ کبھی فضا میں ہاتھ ہلا کر نادیدہ نقوش بناتا تو کبھی آنکھیں بند کیے گھنٹوں مراقبے میں مصروف ہو جاتا۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ خواتین سے تعلقات میں واضح کمی نظر آ رہی تھی۔ ایک روز وہ اچانک ہی پریسکو ویا سے ملنے چلا آیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ جوش اور مسرت تھی۔

''کیا بات ہے..... کوئی خزانہ مل گیا ہے کیا؟'' پریسکو ویا نے طنز کیا۔

''خزانہ ہی سمجھو۔ میں نے دریا کے کنارے ہزاروں فرشتوں اور حوروں کو رقص کرتے دیکھا ہے۔''

''کل میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا۔ تم صاف ستھرے حلیے میں شریفانہ انداز میں کام کاج کرتے اپنی اولاد کے لیے

www.aiffdayiqbal.com

ایک مثالی باپ نظر آرہے تھے۔اس سے ثابت ہوا کہ جاگتی آنکھوں کے خواب یونہی مضحکہ خیز ہوا کرتے ہیں۔''
پریسکو ویا نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔
''وہ سب خواب نہیں ایک اٹل سچائی تھی۔بہت جلد تم جان لوگی کہ میں جھوٹ نہیں کہتا تھا۔'' وہ غصے سے کہہ کر باہر نکل گیا۔اس کے بعد وہ ایک بار پھر منظرِ عام سے غائب ہو گیا لیکن اس کے بارے میں خبریں متواتر مل رہی تھیں۔خواتین میں عدم دلچسپی کے متعلق جان کر پریسکو ویا کے دل میں خوش فہم جذبات پیدا ہونے لگے تھے کہ وہ دھیرے دھیرے راہِ راست پر آرہا ہے۔کچھ روز مزید گزرے تو گریشا ایک بار پھر اس کے پاس چلا آیا۔
''مجھے ہدایت ملی ہے کہ صحراؤں اور برف زاروں کا رخ کر کے لوگوں کے لیے ہدایت کا پیغام لے کر جاؤں۔''
''لوگوں کی ہدایت سے پہلے اپنی ہدایت تو حاصل کر لو۔اس نئی ہستی سے ذرا یہ بھی معلوم کر لینا تھا کہ بیوی اور بیٹی کو کس کے حوالے کر کے جاؤ گے۔'' بیوی کے اس جواب پر وہ بے نیازی سے مسکراتا رہا۔
''بہرحال میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنا آبائی پیشہ اختیار کرتے ہوئے گھوڑا گاڑی چلاؤں گا۔'' اس کے نئے انکشاف پر پریسکو ویا طنز سے سر جھٹک کر رہ گئی۔اسے علم تھا کہ شوہر کے اس فیصلے کے پیچھے معاشی خوشحالی یا ذمے داریوں کا بار اٹھانے کی نیت نہیں بلکہ نت نئے علاقوں کی سیاحت اور عیاشی تھی۔اس واضح عکس کے باوجود اس نے گریشا کو آخری موقع دینے کا فیصلہ کر لیا۔اسے گمان تھا کہ بستی کے ماحول اور آوارہ مزاج دوستوں کی صحبت چھوڑنے کے بعد وہ دلی طور پر محنت کرنے لگے گا۔اس نے دل و جان سے شوہر کی اصلاح اور احساس ذمے داری کے لیے دعائیں مانگنے کا آغاز کر دیا لیکن گریگوری کے لیے کوئی بھی دعا قبول ہو کے ہی نہ دیتی۔وہ سیلانیت کی طرف مائل ہو چکا تھا۔اس کی روح میں ایک دائمی پیاس تھی جو اسے مختلف سوالوں کے جواب تلاش کرنے پر مائل کرتی۔گھوڑا گاڑی میں بٹھائے جانے والے مسافروں سے مذہبی مسائل پر ایسے دلائل سے گفتگو کرتا کہ وہ بھی حیران رہ جاتے۔ایسی ہی ایک بحث کے دوران اسے ایک سواری کے چہرے پر تجسس اور کشمکش کے آثار نظر آئے۔گریشا اپنی چہرہ شناسی کی بدولت بھانپ گیا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن دیگر افراد کی موجودگی میں بات کرنے سے احتراز برت رہا ہے۔سوئے اتفاق یہ سفر قدرے طویل تھا۔راستے میں ایک مقام پر گھوڑوں کو وقتی آرام دینے کے لیے اور ان کے چارے پانی کا انتظام کرنے کے لیے سرائے میں قیام کرنا پڑا تو وہ نوجوان خاموشی سے اس کے پاس چلا آیا۔
''میرا نام میلینی زیوروسکی ہے۔میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔
''کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟'' گریشا کا وجدان بھی اسے کسی اہم انکشاف کا اشارہ دے رہا تھا۔
''آپ کو مذہبی علوم کے متعلق کافی معلومات ہیں۔یہ تعلیم آپ نے کہاں سے حاصل کی ہے؟''
''کہیں سے بھی نہیں۔میں نے پوکروسکوئی کی خانقاہیں کھنگالی ہیں۔فطرت کے مناظر سے بہت کچھ سیکھا ہے۔اپنی آنکھوں سے یسوع کو ساحل کے ساتھ چلتے دیکھا ہے۔فطرت نے ہی مجھے خدا سے محبت اور گفتگو کرنے کا درس دیا ہے۔'' وہ جذب کے عالم میں بولا۔
''آپ کا رجحان کافی حد تک فطرت اور مذہب کی جانب ہے۔میرا مشورہ ہے کہ کسی مذہبی درسگاہ میں داخلہ لے لیں۔''
''میں سفید ان پڑھ ہوں میرے بھائی! مجھے نہیں معلوم کہ درسگاہ کیا ہوتی ہے اور کس بازار سے ملتی ہے۔'' اس نے سر کھجایا۔
''یہ انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ کے اندر روحانیت موجود ہے۔میری مانیں تو ''درخوتور'' کی درسگاہ میں داخلہ لے لیں۔وہاں آپ کی بہت پذیرائی ہوگی۔آپ کی روحانی صلاحیتیں ایک نئی معراج حاصل کریں گی۔''
''کہاں ملے گی یہ؟'' اسے قدرے دلچسپی محسوس ہوئی۔
''یہ سائبیریا کی سب سے مشہور درسگاہ ہے۔اس خانقاہ کو سولہویں صدی میں ''مسکوئی زاروں'' نے تعمیر کروایا تھا۔یہ دو چھوٹی ندیوں کے سنگم پر ایک چٹان پر واقع ہے۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ عبادت گاہ بھی ہے،طول و عرض میں کھیت پھیلے ہوئے ہیں جہاں روحانی فیض حاصل کرنے والے افراد خود کاشت کاری کر کے گزر اوقات کا اہتمام کرتے ہیں۔اس خانقاہ کے پیروکار ''خلستی'' کہلاتے ہیں۔وہاں الوہیت کی تعلیم کے علاوہ عیسایت کے عمومی تصور سے مختلف فلسفہ سکھایا جاتا ہے۔'' میلینی نے تفصیل بتائی۔
''خلستی کون ہیں؟ میں نہیں جانتا۔'' گریشا الجھا۔
''سب کچھ جان جائیں گے۔ایک بار خانقاہ میں داخل

www.alfaayan.com

ہو جائیے۔ تمام خفیہ ضابطے اور راز معلوم ہو جائیں گے۔"
میلینی کی باتیں گریشا کو کسی دلچسپ داستان کی طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس سفر سے واپس آتے ہی وہ ایک نئے سفر کے لیے تیار تھا۔ اس سے قبل گریشا نے گھوم پھر کر کچھ مزید مذہبی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اس کے باوجود اسے علم نہ ہو سکا کہ روس میں سرکاری چرچ پر عدم اعتمادی خاصی گہری ہے۔ روس کی سرزمین میں دسویں صدی عیسوی میں عیسائیت قبول کر لینے کے باوجود فطری مظاہر کی پرستش برقرار تھی۔ عیسائی گرجا گھر بھی عام طور پر پرانے مذہبی مقامات پر ہی تعمیر کیے گئے تھے۔ روسیوں نے پرانے دیوتاؤں کی خصوصیات عیسائی مذہبی شخصیات سے منسوب کر رکھی تھیں۔ قدیم فطرت پرستی ان کی روح سے الگ ہی نہ ہو سکی۔ یہ پورا خطہ ایک ہزار برس کے عرصے میں فطرت پرستی اور آرتھوڈوکسی پر عمل کرتا رہا۔ اس دوران سترھویں صدی میں "خلست" نامی فرقہ نمودار ہو گیا۔ اس فرقے کا بانی "ڈینیئل فلپووچ" تھا جس کے پیروکاروں کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ ایک آتشیں رتھ پر سوار ہو کر آسمان سے آیا تھا اور ایک انسان کی صورت میں کرۂ ارض پر رہا۔ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق ڈینیئل فلپووچ ایک سو سالہ "مدر آف گاڈ" کے بطن سے مظلوم اور عسرت زدہ عوام کے تحفظ کے لیے پیدا ہوا تھا۔

خلستی اس نظریے کا پرچار بھی کرتے تھے کہ ان کا یسوع "کریملن" میں سرعام مصلوب کروایا گیا تھا لیکن اسے پھر نئی زندگی مل گئی۔ اس کے بعد اسے دوبارہ صلیب پر چڑھایا گیا مگر اس نے ایک بار پھر موت کو شکست دے دی اور از خود آسمان پر چلا گیا۔ اس نظریے کی تبلیغ کے باوجود ان کا ماننا تھا کہ وہ کسی دوسرے مادی جسم میں رونما ہو چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کے روس میں اَن گنت "مسیح" موجود تھے۔ فطرت پرستی اور آرتھوڈوکسی کا یہ ملغوبا جاہل، مظلوم اور مصائب کے شکار روسیوں میں مقبول ہو چکا تھا۔ کچلے، پسے ہوئے دہقانوں کے لیے ناقابلِ یقین تصورات کے در کھول دیے تھے۔ جاہل دہقان اس پرکشش فرقے میں جوق در جوق داخل ہوئے۔ انہوں نے خاندانی جنسی زندگی ترک کر دی۔ وہ ایک اجتماع کی صورت میں "راڈینی" نامی رسم مناتے جس میں گانے اور رقص کے بعد جنسی عمل کیا جاتا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس رسم کی ادائیگی سے انہیں روحانی ارتقا حاصل ہوتا ہے۔

خلست فرقے کی بے راہ روی کے ردِعمل میں اٹھارھویں صدی میں ایک نئے جنونی تصور نے جنم لے لیا۔ "سکوپتسی" نامی اس فرقے کے پیروکار وہ لوگ تھے جو گناہ کے ذریعے معراج حاصل کرنے کے تصور کی بابت شکوک و شبہات کا شکار تھے۔ اس فرقے کے بانی "کونڈریٹی سیلیوانوف" نے خلستی جنسی بے راہ روی پر شدید تنقید کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ باطنی ارتقا صرف اعضائے مخصوصہ کٹوانے سے حاصل ہوگا۔ اس کے کم علم اور جاہل پیروکاروں نے یہ عمل خود ہی کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس درندگی کے بعد وہ خود کو دیگر فانی انسانوں سے برتر گمان کرنے لگتے۔

☆☆☆

روسی مذہبی زندگی سے نیم واقف گریگوری نے خانقاہ میں داخلہ لے لیا جہاں ان انکشافات کے علاوہ مزید حیرت انگیز عقائد بھی اس کے منتظر تھے۔ وہاں جا کر اسے علم ہوا کہ "ڈینسلاتیخ" نے عیسائیت کا پیروکار ہونے کے باوجود انجیل اور دیگر مذہبی کتابوں کو بے کار قرار دے کر دریائے وولگا میں بہا دیا تھا۔ خانقاہ کے لوگ بھی یہ مانتے تھے کہ خدا سے رابطہ رکھنے اور جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے انسان کا کسی نہ کسی طرح پُراسرار موت مرنا لازم ہے۔ انسان پیدائشی طور پر ہی عاصی ہے۔ گناہ میں ڈوب جانے اور پراسرار موت حاصل کرنے کے بعد وہ حیاتِ نو حاصل کرتا ہے جس کے نتیجے میں اسے کرامات دکھانے، بیماروں کو شفا دینے، مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے حتیٰ کہ مُردوں کو زندہ کر دینے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔

اس خانقاہ میں گریشا کو ایک اور نظریے نے بہت متاثر کیا۔ خلست پیروکاروں کا ماننا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کے بعد خداوندان گنت بار روس کی مقدس سرزمین پر دیہاتیوں کے روپ میں نمودار ہوئے (نعوذ باللہ)۔

"کیا واقعی خدا انسان کے روپ میں نمودار ہو سکتا ہے؟" گریگوری نے خوابناک انداز میں ایک ساتھی سے دریافت کیا۔ "مجھے راڈیوف کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔" وہ سخت بے چین تھا۔

"اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں لیکن حقیقت میں وہ انسان کے بھیس میں خداوند تھا۔" اس کٹر خلستی نے اپنے اس نئے ساتھی کو بتایا جس کی تنویمی آنکھوں نے اسے روزِ اول ہی اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"اچھا! پھر اس کے بعد کیا ہوا؟" گریگوری مزید متجسس ہوا۔ وہ اس نظریے و عقیدے کے بارے میں جان

www.alidaiyeem.com

کر اپنی روح میں ایک عجیب سنسنی محسوس کرنے لگا تھا۔

''زاروس کے مصاحب اس کے بہت خلاف تھے۔ وہ اسے اپنے عقیدے سے تائب ہونے پر مجبور کرنے لگے۔ راڈیوف اپنے نظریے و دعوے پر کسی چٹان کی طرح مستحکم رہا۔ اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا کہ اس کے جسم میں مقدس روح نے یہ کام کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کے اعمال خدا کی مرضی کے تابع ہیں لہٰذا تائب ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بہت خوب! ایسی ہی استقامت ہونی چاہیے۔ بالکل ایسی ہی ہونی چاہیے۔'' گریشا پرجوش ہوا۔ وہ ذہنی طور پر کہیں نہ کہیں اپنے وجود میں بھی اسی تبدیلی کے ظہور کے لیے تیار ہونے لگا تھا۔ خلستی عقائد اور خانقاہ کے ماحول نے اسے اس قدر متاثر کیا کہ وہ اپنا ماضی، گھر بار، والدین، بیوی بچی سب کچھ فراموش کر بیٹھا۔ وہ مکمل طور پر خلستی فرقے میں رنگ چکا تھا۔

خانقاہ کے آزمائشی مراحل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اسے چند دیگر پیروکاروں کے ساتھ ''خفیہ مسکن'' کی طرف روانگی کا حکم ملا۔ یہ خفیہ مسکن کرامات کے حصول کا مرکز تھا۔ جھونپڑیوں کی شکل میں بنے ان مسکنوں میں ہفتے کی شام قابل اعتماد مرد و زن عبادت خانوں میں جمع ہوا کرتے۔ گریگوری راسپوٹین کو بھی ایسی ہی ایک جھونپڑی میں لے جایا گیا۔ وہاں صرف ایک سادہ میز اور دو پرانی خستہ حال کرسیاں موجود تھیں۔ دیواروں کے ساتھ بینچ پڑے تھے۔ دائیں جانب عورتوں اور بائیں سمت کی نشستیں مردوں کے لیے مخصوص تھیں۔ صدر مجلس کی آمد کے بعد خشوع و خضوع اور نہایت جذبے سے گانا گانے کے بعد از راہِ عقیدت موت سے بغلگیر ہونے کا عہد کیا گیا۔ اس کے بعد شرکاء نے اپنا لباس اتارا اور لٹھے کی مخصوص انداز میں سلی قمیص پہن لی گئی۔ یہ تمام تر عمل نہایت نظم و ضبط اور بھرپور میکانکی انداز میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ طے شدہ طریقہ کار کے مطابق پہلے میز پر رکھی درجن بھر موم بتیاں جلائی گئیں اور پھر ان کے گرد بھرپور وحشت سے رقص کیا جانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس دائرہ نما رقص میں اس قدر تیزی آ گئی کہ ارد گرد موجود ہر شے گھومتی دکھائی دے رہی تھی۔ مدہوشی نے ظاہر و باطن کو اپنی مکمل لپیٹ میں لے لیا۔

گریگوری اس نئے کھیل کا ایسا شیدا ہوا کہ واپسی کے بعد اسے اگلے ہفتے کا شدت سے انتظار رہتا۔ اس کی ماضی میں گزاری گئی زندگی ایک بار پھر بھرپور اہتمام اور محفوظ انداز میں میسر آ گئی تھی۔ اس ''خفیہ مسکن'' میں چند ہفتوں کی آمد و رفت نے اس کا عقیدہ مزید پختہ کر دیا اور وہ اس نظریے پر راسخ ہو گیا کہ حیاتِ نو گناہ آلود زندگی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ عبادت کا اصل مفہوم دنیاوی رسوم اور بندھنوں سے آزادی ہے۔ پیدائشی عیسائی ہونے کے باوجود وہ کلیسا اور اس کے پادریوں سے بدظن ہونے لگا۔ اس کا ماننا تھا کہ چرچ کے اجارہ داروں سے مباحثے کرنا وقت کا زیاں ہے۔ ان کا علم و فضل کھوکھلا ہے۔ لفظوں نے انہیں اس قدر الجھا دیا ہے کہ وہ اپنے قدموں میں خود ہی زنجیریں ڈال کر قیدی بن چکے ہیں۔ وہ کسی بھی نجات دہندہ کے نقش قدم پر نہیں چل سکتے۔ روحانی نشوونما حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کے لیے ان جیسوں کا وجود بے مصرف ہے۔ وہ کوئی مفید مشورہ دینے کے اہل ہی نہیں۔ اہل اور روحانیت کے اعلیٰ درجات پر فائز افراد تو دور دراز کونوں کھدروں میں پوشیدہ ہیں۔ خلستیوں نے روس بھر میں گمنام مقامات پر ''آرک'' بنائے ہوئے تھے جس کے توسط سے وہ ایک دوسرے سے خفیہ رابطے قائم رکھتے تھے۔ ان رابطوں کا ذریعہ بھی گریگوری جیسے ''آوارہ گرد'' ہی تھے۔

گریگوری راسپوٹین نے یہ گمراہ کن عقیدہ بھی تسلیم کر لیا تھا جس کی بدولت اس پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ درختوری کی اس تاریک خانقاہ میں اگلے کئی برس کامیابی سے گزارنے کے بعد گریگوری ناقابلِ یقین قوتِ ارادی اور تنویمی طاقتوں کا مالک بن گیا تھا۔ اس کی خود اعتمادی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ کسی بھی طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار تھا۔ درسگاہ کی تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ خود کو ایک دوراہے پر کھڑا محسوس کرنے لگا۔ بیوی، بچی کی یاد اور وجود تو برسوں پہلے ہی بے کشش ہو گئے تھے۔ دوسری راہ یہ تھی کہ مزید آوارہ گردی کرتے ہوئے جنگلوں کی خاک چھانی جائے۔ خانقاہ میں اس کے دیرینہ ساتھی نے یہ الجھن بھانپ لی۔

''بیوی اور اولاد تمہیں اصل مقصد سے بھٹکا دیں گے۔ فی الحال ان کا تصور ہی چھوڑ دو۔ تمہارے سامنے تسخیر کے اور بھی بہت سے میدان ہیں۔ اپنی ذات کو کسی ایک میدان تک محدود نہ کرنا۔''

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو لیکن یہ بھی تو سمجھ نہیں آ رہی کہ اب مجھے ''روشنی'' کہاں ملے گی؟'' وہ الجھ کر بولا۔

''ماکاری کے پاس کیوں نہیں جاتے؟'' ساتھی نے غصے سے کہا۔ ''اس سے زیادہ روشنی تمہیں اور کہاں ملے گی؟''

''ارے ہاں! میں اس کا نام کیسے بھول گیا؟ میری اگلی

www.aiwayeem.com

منزل یقیناً وہی ہے۔'' راسپوٹین نے اپنے بھلکو پن پر افسوس کیا۔

ماکاری کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ ایک بوڑھا راہب تھا جس نے دنیاداری بالکل ہی ترک کردی تھی... وہ درختوں کی خانقاہ سے قدرے فاصلے پر جنگل کے تاریک کونے میں ایک تبرنما جھونپڑی میں رہتا تھا۔ لباس کے نام پر ایک لنگوٹی کے سوا کچھ بھی استعمال نہ کرتا۔ بھوک پیاس اس کے لیے بالکل بے معنی تھی۔ مصائب میں گھرے افراد نہایت دور دراز سے اپنی مرادیں حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس آتے۔ گریگوری اس کے پاس پہنچا اور اظہارِ عقیدت کے لیے قدموں میں جھک کر روایتی انداز میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے مستقبل کے لیے راہنمائی و ہدایت طلب کرنے لگا۔

''تمہارے لیے بے حد خوشی کا مقام ہے میرے بیٹے! خدا نے تمہیں ہزاروں انسانوں میں منتخب کرلیا ہے۔ تمہاری قسمت میں بہت بڑے کام لکھے ہیں۔ بیوی، بچی، گھوڑے اور ماضی کو بھول جاؤ۔ اپنی ذات کو سیلانیت میں روپوش کردو۔ عنقریب سرزمین روس تم سے ہمکلام ہوگی۔ تمہیں ان الفاظ کے معنی سمجھنے ہوں گے، سیکھنے ہوں گے۔ اس کے بعد ہی دنیا کی طرف لوٹنا بہتر ہوگا۔'' ماکاری کی یہ گفتگو اس کے لیے سیلانیت اختیار کرنے کا واضح اشارہ تھا۔ گریگوری راسپوٹین نے ایک نیا روپ اختیار کرلیا۔ ماکاری کے حکم پر اس نے نہ صرف شراب اور تمباکو نوشی کو خیرباد کہا بلکہ گوشت اور مٹھائیاں بھی خود پر حرام کرلیں۔ وہ روسی ثقافت کے مطابق خالصتاً ''آوارہ گرد'' بن گیا۔ اٹھارھویں صدی میں آوارہ گردی روسی زندگی کا جاندار ترین حصہ ہوتی تھی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر کسان مقدس مقامات کی سیر کے لیے جایا کرتا۔ وہ ایسی خانقاہوں کی زیارت کو ترجیح دیتے تھے جو اولیاء کے تبرکات اور اپنی معجزہ کار شبیہوں کی وجہ سے شہرت کی حامل ہوا کرتیں۔ عوام الناس کے علاوہ خواص بھی اپنی گھوڑا گاڑیوں میں آوارہ گردی کرتے۔ دہقان اپنی پشت پر جھولے لٹکا کر پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ گریگوری راسپوٹین کے دور میں یہ تناسب اکا دکا افراد تک ہی محدود رہ گیا۔ مقدس روس کی حیثیت افسانوی سی ہوچکی تھی۔ اب عقائد و نظریات میں وہ پختگی نہیں رہی تھی کہ ''خدا کا بندہ'' بن کر مقدس شبیہوں اور تبرکات کی زیارت کے لیے گھربار، بیوی بچے اور تمام آسائشات چھوڑ کر پیدل سفر پر نکلا جائے۔ گریگوری اپنی سائبیریائی بستی سے کمر پر ایک جھولا ڈال کر نکلا اور روس کی برف سے اٹی طویل شاہراہوں پر پیدل سفر کرنے لگا۔ بھوک لگتی تو خیرات میں کھانا مانگ لیتا، نیند آتی تو کسی نہ کسی کے گھر میں سونے کی جگہ کا مطالبہ کرتا ہوا ''کیف'' کی خانقاہوں، ماسکو کے گرجا گھروں اور پیٹرزبرگ کے عبادت خانوں میں پہنچ گیا۔ مقامی دہقان اس کے کسی بھی مطالبے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ وہ ان آوارہ گردوں کو آج بھی خداوند کے پسندیدہ بندے اور پرانے زمانوں کے آخری وارث تصور کیا کرتے تھے۔ ان افراد کی آمد اور خیرات مانگنا اپنے لیے بہت خوش قسمتی کی علامت سمجھی جاتی۔ ان کی خدمت میں عقیدت و احترام سے نذر و نیاز پیش کرکے خصوصی دعائیں کروائی جاتی تھیں۔ ایک بستی سے دوسری بستی، ایک گرجا گھر سے دوسرے اور ایک خانقاہ سے دوسری خانقاہ تک کے اس سفر میں گریگوری کی بھی ہر مقام پر خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ سنسان سڑکوں پر ڈاکوؤں سے سامنا ہوجاتا۔

''تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے ہمارے حوالے کردو۔'' اسے دھمکایا جاتا۔

''میرے پاس علم اور وجدان کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' وہ بھرپور متانت ظاہر کرتا۔

''بس کرو فریبی انسان! مقامی لوگوں نے بہت مال تم جیسوں کے حوالے کیا ہوتا ہے۔ سیدھی طرح نکال دو اسے۔''

''یہ میرا نہیں خدا کا مال ہے۔ اگر تمہیں پھر بھی چاہیے تو میں اسے بخوشی تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ سب بھلا میرے کس کام کا؟'' وہ اپنی آنکھوں کی قوت کا استعمال کرتے ہوئے ان کے اعصاب پر حاوی ہوتا تو وہ لٹیرے اپنا ارادہ ترک کرکے اس کی راہ چھوڑ دیتے۔ راسپوٹین اپنے سفر کا دوبارہ آغاز کرتا اور طویل سڑک کسی بستی اور گرجا گھر پر اختتام پذیر ہوجاتی۔

گریگوری راسپوٹین کا یہ قریہ قریہ سفر یونہی جاری رہا۔ اسی کے ساتھ اس کا ذہنی سفر بھی نہایت تیزی سے ترقی کی منازل طے کررہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے اپنے اردگرد ہیولے نظر آنے لگے تھے۔ دھند اور اسرار میں لپٹے یہ ہیولے اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کردیتے تھے۔ ایسے ہی ایک روز اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سامنے کسی ہستی کا ظہور ہورہا ہے۔ دھند نے اس کے ذہن پر غلبہ پانا شروع کردیا۔ کچھ روز اسی کیفیت میں بیت گئے۔ اس دوران اسے عجیب و غریب خواب دکھائی دینے لگے۔ اسے پہلے سے کہیں زیادہ واضح طور پر اپنے وجود میں کسی خاص ہستی کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ گمان و تصورات مضبوط تر ہورہے تھے۔ ہیولوں کی

www.attbayiem.com

نمودار ہی کا عالم بھی نرالا ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی اس آوارہ گردی کے دوران گریگوری نے ایک ایسے کمرے میں رات بسر کی جہاں "مدر آف گاڈ" کی شبیہہ موجود تھی۔ گریگوری اس پر نظریں جمائے خانقاہ اور ماکاری کی جھونپڑی میں گزرے وقت کے بارے میں سوچتا سو گیا۔ نصف شب کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت سردی میں بھی اپنے بدن میں حدت محسوس ہو رہی تھی۔ دل و دماغ آج پھر دھند کی لپیٹ میں تھے۔ اسے اپنے سامنے "مدر آف گاڈ" مجسم نظر آ رہی تھی۔ گریگوری نے بے اختیار اپنی آنکھیں مسلیں، بار بار مسلیں لیکن ہر بار منظر وہی تھا۔ شبیہہ رو رہی تھی۔

"کیا..... ہوا..... ہے؟ یہ..... آنسو..... کیوں؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"گریگوری راسپوٹین! میں بہت زیادہ دکھی ہوں۔" ایک نرم آواز سماعت میں پڑی۔

"کیوں..... کیوں دکھی ہیں؟" شبیہہ کے جواب پر وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"میں انسانوں کے گناہوں پر آنسو بہا رہی ہوں۔ کیا تم میرے لیے ایک کام کرو گے؟"

"کروں گا..... دل و جان سے کروں گا..... آپ اس نیاز مند کو حکم تو دیجیے۔"

"تو پھر جاؤ! سرزمین روس میں گھومو پھرو! انہیں کوتاہیوں سے آگاہ کرو! گناہوں سے پاک کرو!"

مدر آف گاڈ کا یہ حکم سنتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے دل و دماغ پر دھند غالب تھی۔ وہ برہنہ پا باہر نکل کر چلانے لگا۔

"توبہ کرلو..... اپنے گناہوں سے تائب ہو جاؤ..... خداوند ناراض ہے..... تمہیں ہٹ دھرمی کی سزا بھگتنی ہو گی..... سزا بھگتنی ہو گی۔"

"یہ شخص پاگل ہو گیا ہے..... اس کا حلیہ تو دیکھو۔ میل اور غلاظت سے برا حال ہے۔" ایک دہقان نے گھن کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ یہ یقیناً شراب کے نشے میں اول فول بک رہا ہے۔" دوسرے شخص نے بھی تائید کی۔

"سزا بھگتنی ہو گی..... تم سب کو سزا بھگتنی ہو گی۔" وہ مدہوشی کے عالم میں کہتا رہا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اسے پراسرار ہیولا ایک بار پھر دھند سے باہر آتا محسوس ہوا۔ گریگوری کے ہوش و حواس مختل ہو گئے۔ اس وقت اس نے صرف ایک قمیص پہن رکھی تھی۔ سخت سردی بھی اس کے بدن کی حدت اور حواس کی بیگانگی پر کوئی اثر کرنے میں ناکام تھی۔ وہ اسی حلیے اور انداز میں بستی کے طول و عرض میں دوڑتے ہوئے توبہ کی صدائیں لگانے لگا۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ کسی باڑھ سے ٹکرا کر گرا اور اگلے چوبیس گھنٹے وہیں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ الگ تھلگ گوشہ ہونے کے باعث کسی کا دھیان بھی اس کی جانب نہ گیا۔ اس کے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ کہیں دور بہت سی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ بوجھل سر کو قابو میں لاتے ہوئے اس نے آوازوں کے ماخذ پر غور کیا تو صورت حال کچھ واضح ہو گئی۔

"یہ دیکھو! اسے ہم کہاں کہاں نہیں تلاشتے رہے۔ یہ یہاں پڑا ہے۔" ایک دہقان کی آواز آئی۔

"مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے سب؟" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے سچ کہا تھا۔ ہمیں بہت پہلے اپنے گناہوں کا احتساب کر لینا چاہیے تھا۔ رات کو آدھی بستی جل کر راکھ ہو گئی۔" اس کے انکشاف پر گریگوری کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم عظیم ہو..... بہت عظیم ہو..... ہمیں دعا دو۔ ہمیں نجات کا رستہ دکھاؤ۔" وہ متوحش دہقان جو پہلے اسے غلیظ اور قابل نفرت سمجھ رہے تھے، اب اس کے ہاتھ چوم رہے تھے۔ لوگوں کی ستائش، عقیدت اور انکساری اسے ساتویں آسمان پر پہنچانے لگی۔ اسے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ الفاظ کس ذہنی کیفیت میں زبان سے ادا ہوئے تھے لیکن نتیجہ دیکھ کر میٹھی میٹھی سی سرشاری بدن میں ہلکورے لینے لگی۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ کسی بھی مخصوص ذہنی مدہوش حالت میں چند نوید دیتے یا خوفزدہ کر دینے والے الفاظ بعد ازاں کیا جادوئی اثر پیدا کر سکتے ہیں۔ اس نئی شہرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گریگوری کے وجود پر یکدم گریشا غالب آ گیا۔ اس نے پوکروسکوئی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

پریسکویا نہایت افسردہ اور ملول حالت میں گھر کے صحن میں بیٹھی تھی۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے دونوں بچوں کو سلا کر آئی تھی۔ گریشا کو گھر سے گئے ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ اب تو ایسا لگتا تھا کہ شوہر کے وجود کی خوشبو محسوس کیے کئی صدیاں گزر گئی ہیں۔ اس سیلانی کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک اور بچے کا باپ بن چکا ہے۔ اس بدنصیب بچے نے بھی باپ کے جانے کے بعد اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور تا حال

www.alhijaveem.com

والد کے لمس، شفقت اور محبت سے محروم تھا۔ پریسکو ویا نے گہری سانس لے کر اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو واپس دھکیل دیا۔ آنسوؤں کی اس تپش نے اس کے حلق میں جلن پیدا کر رکھی تھی۔ آنکھیں بے دردی سے مسلتے ہوئے اس نے شکوہ کناں نظروں سے آسمان کی جانب دیکھا اور چاند میں ماضی کے نقوش تلاشنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں گریشا سے پہلی ملاقات کے مناظر کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ اس ضدی اور سرکش شخص نے پریسکو ویا کو اپنی شریکِ حیات بنا کر ہی دم لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اپنی زندگی تبدیل کر کے اس کی فطرت کے تقاضے ہی نظر انداز کر دیے تھے۔ وہ ہمہ وقت سلگتی اور تڑپتی رہتی۔ گریشا حریص تھا، شیطانی فطرت کا مالک تھا، جنونی مزاج تھا، جو بھی تھا، جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا جو اس کی ذات اور خواہشات کی تکمیل کا واحد ذریعہ تھا۔ برسوں کی یہ دوری اب پریسکو ویا کے لیے ناقابلِ برداشت امتحان بننے لگی تھی۔ کچھ عرصہ قبل تک اپنا کا وجود اس کے لیے بہت بڑی ڈھارس تھا۔ بیٹے کے غائب ہونے کے بعد وہ اس کا بہت حوصلہ بندھایا کرتی لیکن پھر خود بھی اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر نیم دیوانگی میں مبتلا ہو گئی۔ اس مخصوص ذہنی رو میں بھی وہ گریشا کو ہی پکارتی رہتی۔ کچھ ہی عرصے بعد آنکھوں میں بیٹے کی واپسی کے خواب سجائے وہ زندگی کی بازی ہار گئی۔ کبھی کبھی پریسکو ویا بھی اپنے لیے موت کی آرزو کرنے لگتی۔ وہ زندگی کی ان مشکلات سے لڑتے لڑتے تھک گئی تھی۔ اعصاب شکستہ اور حوصلہ بکھرنے لگا تھا۔

''اتنی رات گئے یہاں کیوں بیٹھی ہو بیٹی؟ سردی کہیں تمہیں بیمار ہی نہ کر دے۔'' ایفیم کی شفیق آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے سسر کے آنے کی بالکل خبر نہیں ہوئی تھی۔

''اپنے نصیبوں کو بیٹھی رو رہی ہوں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''نصیب تو ہم سبھی کا ایک جیسا ہے۔'' ایفیم کی آنکھوں میں بھی آنسو آئے۔ ''میری قسمت میں تو شاید اولاد کا سکون لکھا ہی نہیں ہے۔ پہلے میشا کی موت ہوئی۔ وہ میرا ہیرا بیٹا تھا۔ آج زندہ ہوتا تو شاید ہم یہ حالات نہ دیکھ رہے ہوتے۔ میشا مر گیا اور گریشا جانے کن راہوں کی دھول بن گیا ہے؟''

''کیا وہ کبھی واپس نہیں آئے گا؟ کیا میری اولاد باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کی زندگی ہی گزارے گی؟'' وہ زار و قطار رونے لگی۔

''میرے ذہن میں گریشا کو واپس لانے کا ایک طریقہ موجود ہے۔'' ایفیم نے پُرامید انداز میں کہا۔ ''آج شام کو میرے دہقان دوست کسی سیلانی کی بات کر رہے تھے۔ سنا ہے کہ وہ بہت پہنچا ہوا ہے۔ اس کی دعائیں اور پیشگوئیاں بہت جلد پوری ہو جایا کرتی ہیں۔''

''کہاں ہے وہ.....؟ آپ ان سے مل کر گریشا کی واپسی کی دعا کروائیے نا۔ مجھے یقین ہے کہ دعاؤں کی طاقت اسے بہت جلد ہمارے پاس واپس آنے پر مجبور کر دے گی۔'' پریسکو ویا تڑپ اٹھی۔

''اس کے اصل ٹھکانے کا کسی بھی دہقان کو علم نہیں۔ وہ مقدس روس کے آخری زمانوں کی زندہ علامت ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے چند کسانوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے دیکھا۔ اس نے دن بھر خاموشی سے کام کروایا۔ اس وقت تک کوئی بھی اس کی اصلیت سے واقف نہیں تھا۔ شام ہوئی تو اس نے اپنی زبان کا قفل توڑا اور کسانوں کو بتانے لگا کہ زندگی میں جس قدر گناہ کیے جائیں، نجات کے مواقع اسی قدر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔'' ایفیم کی اس بات پر پریسکو ویا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ باتیں اور انداز وہ کس طرح بھول سکتی تھی؟

''اور..... اور کیا کہتا ہے وہ؟''

''سنا ہے کہ اس کے بعد وہ کہیں چلا گیا۔ پھر چند لوگوں نے اسے جنگل میں دیکھا۔ وہ درختوں کی شاخوں کو صلیب بنائے خواتین کے ساتھ عبادت میں مصروف تھا۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے اسے برہنہ حالت میں جوہڑوں اور تالابوں میں کھڑے پایا۔ لڑکیاں اس کے جسم سے میل اتارنے میں مصروف تھیں۔ کچھ افراد نے اسے آگ کے الاؤ کے گرد رقص کرتے ہوئے عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ چلاتے ہوئے ایک ہی بات کہتے ہوئے سنا کہ انسان کا غرور گناہ کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے، زیادہ گناہ کرو۔'' پریسکو ویا یہ باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص گریشا کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

''میں اس انسان کو ضرور تلاش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے ملتے ہی ہمارا گریشا بھی لوٹ آئے گا۔''

''میں بھی اسے ڈھونڈتا رہوں گا۔ وہ جہاں بھی ملا اس کے قدموں سے اس وقت تک سر نہیں اٹھاؤں گا جب تک وہ میرے گریشا کے واپس آنے کی کوئی نوید نہ سنا دے۔'' ایفیم نے بھی اپنا عزم ظاہر کیا۔

پریسکو ویا کے پاس جینے کی ایک نئی امید آ گئی۔ اس نے دیوانہ وار تلاش کا آغاز کر دیا۔ اردگرد کے علاقوں میں مقیم افراد سے اسے علم ہوا کہ اس انسان کی کرامات میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے ایک شخص کے بدن سے بدروح کو مار

www.urdtayeem.com

بھگایا تھا۔ کسی علاقے کے لوگوں نے اسے ستایا جس کے جواب میں وہ انہیں بددعا دے کر گیا تو تین ماہ تک بارش ہی نہ ہوسکی۔ یہ سب باتیں سن کر پریسکو ویا متفرق جذبات میں گھر گئی۔ اسے اپنے شوہر کی یہ کرامات سن کر فخر و خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ گزرے برسوں میں گریشا نے بے حد عبادت و ریاضت کی ہے۔ اس فخر و مسرت کے بعد وہ جھنجلانے لگتی کہ ہر کوئی گریشا کی ذات سے وابستہ کہانیاں سناتا ہے۔ اس کے اصل ٹھکانے کا کسی کو کیوں علم نہیں ہے۔ پھر یہ جھنجلاہٹ غصے اور افسردگی میں ڈھل جاتی۔ گریشا انہی علاقوں میں کہیں موجود تھا تو اس سے ملنے کیوں نہیں آتا تھا۔ کیا اسے بیوی کا وجود بالکل ہی فراموش ہو گیا ہے؟ اپنی ذات کی اس توہین اور بے قدری پر آنسو بہاتی پریسکو ویا رات بھر بے چین رہی۔ اس کا ضبط اور حوصلہ ختم ہونے لگے تھے۔ ہجر کی ان طویل راتوں کی تپش ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ وہ بہتے آنسوؤں میں شوہر کی واپسی کی دعائیں مانگتی رہی۔ اس گریہ و زاری میں صبح کا اجالا ہر سو پھیلا تو دروازے پر دستک نے اسے چونکا دیا۔ یہ انداز بے حد جانا پہچانا تھا۔ پریسکو ویا کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے دروازہ کھولا اور سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس شخص کے بال چکنائی اور میل سے جم چکے تھے۔ ڈاڑھی بے ترتیب، چہرہ زرد اور استخوانی تھا۔ پہلی نظر میں اسے پہچاننا واقعی بہت مشکل تھا۔ اتنی دیر میں ایفیم بھی دروازے پر چلا آیا۔ گریشا کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھرا سی گئیں۔

''گریشا! یہ تم ہی ہو نا؟ کہاں چلے گئے تھے؟ کیا تمہیں ایک بار بھی ہماری یاد نہیں آئی؟'' پریسکو ویا ہیجان زدہ ہو گئی۔

''ہمارے بچے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ کیا تمہیں کبھی ان کا بھی خیال نہیں آیا؟'' وہ اس کا گریبان جھنجوڑنے لگی۔ گریشا کا چہرہ سپاٹ اور بے تاثر تھا۔ اس کے کسی بھی انداز میں اپنے سامنے کھڑے ان دونوں افراد کے لیے کوئی شناسائی نہیں تھی۔ اس نے اینا کے متعلق بھی کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''تہ خانے کا دروازہ کھلوا دیجیے خاتون! مجھے آپ کے گھر کو شرف بخشنے اور یہاں عبادت کا حکم ملا ہے۔'' وہ میکانکی انداز میں پادریوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر دعا دیتے ہوئے سیلانیوں کے مخصوص انداز میں بولا۔ پریسکو ویا صدمے و بے یقینی سے کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر خاموشی سے تہ خانہ کھول دیا۔ گریگوری لاتعلقی سے تہ خانے میں اترا اور کسی مخصوص عبادت میں مشغول ہو گیا۔ پریسکو ویا ایک نئی اذیت میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے شوہر کی ایسی ذہنی حالت اور بے نیازی کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایفیم بھی اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ دن تو کسی طرح کٹ گیا، رات ہوئی تو اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر پریسکو ویا نے بھرپور ذاتی زیبائش کی۔ گزرے وقت نے اس کی خوبصورتی اور دلکشی پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ بناؤ سنگھار کے بعد وہ گریشا کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ رات ہوتے ہی وہ اس کے پاس ضرور آئے گا لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ انتظار کی گھڑیاں طویل اور ناقابلِ برداشت ہوئیں تو اس نے خود ہی شوہر کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بے خودی کے عالم میں وہ تہ خانے میں پہنچی تو گریشا کو دیکھ کر سخت خوفزدہ ہو گئی۔ وہ سرد اور پتھریلے فرش پر گھٹنوں کے بل غیر فطری سے انداز میں جھکا تھا۔ اس کا چہرہ زمین کو چھو رہا تھا اور بدن پر لرزش طاری تھی۔ تہ خانے میں اس قدر بھیانک خاموشی تھی کہ وہ مزید وہاں ٹھہرنے کی ہمت ہی نہ کر سکی اور دکھی دل بوجھل قدموں سے واپس چلی آئی۔ وہ رات بھی آنسوؤں اور بے خوابی میں گزر گئی۔ اگلی صبح بستی میں ایفیم کے گھر سیلانی کی آمد اور تہ خانے میں عبادت کی دھوم مچ چکی تھی۔ بستی کا ایک معزز شخص اس سے ملاقات کے لیے گیا۔ اس کی حالت و ریاضت نے اسے بہت متاثر کیا۔

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہو رہا کہ یہ سیلانی ایفیم کا وہی بیٹا ہے جو شراب کے نشے میں دھت لڑکیوں کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ وہ تو ایک ''اوتار'' بن گیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس نے یہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔'' وہ ہر ایک کو کہتا پھرتا۔ اس کے بعد کئی دیگر افراد بھی تہ خانے میں جا کر اس کی حالت کا معائنہ کر آئے۔ کم علم اور جاہل لوگوں کی وہ بستی جوق در جوق مذہبی تعلیم کے لیے گریگوری راسپوٹین کے پاس آنے لگی۔ اس کا گناہ برائے نجات کا عقیدہ شہرت کی نئی بلندیاں چھو رہا تھا۔ اس کی یہ مقبولیت کلیسا تک پہنچی تو پادری غیظ و غضب میں مبتلا ہونے لگے۔ گمراہی اور شیطانیت کا یہ پرچار ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ گریگوری راسپوٹین بلاشبہ ایک ابلیسی نمائندہ تھا۔ اس کی تنویمی قوت جادوگری کے زمرے میں آتی تھی۔ پادری نے برملا اس کی مخالفت شروع کر دی۔ مسیح اور مریم کے مجسموں کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے والے مقامی افراد اب ایک گمراہ شخص کے قدموں سے لپٹے رہتے تھے۔ گرجا کی گھنٹیاں بار بار بجا کر انہیں خداوند کی عبادت کے لیے طلب کیا جاتا لیکن کسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔ پادری کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ ایفیم کے گھر پہنچا

www.pklibrary.com

توعقیدت مندوں کا ایک جم غفیر دیکھ کر طیش زدہ ہو گیا۔

''پوکروو سکوئی کے لوگو! تم خداوند کی ناراضگی مول لے رہے ہو۔ عبادت کے بغیر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ تمہیں خداوند کو راضی کرنے کے لیے گرجا آنا چاہیے۔'' وہ انہیں سمجھانے لگا۔

''فادر! گریگوری راسپوٹین کو بھی ہمارے پاس جیزز کرائسٹ نے ہی بھیجا ہے۔ وہ ہمیں خداوند سے براہِ راست ملاقات کے لیے عبادت کے طریقے بتاتا ہے۔ اسی نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم جس قدر زیادہ گناہ کریں گے اسی قدر پراسرار موت سے ہمکنار ہو کر کرائسٹ سے ملیں گے۔ اگر اور بھی زیادہ گناہ کیے تو خداوند مجسم صورت میں ہمارے سامنے آئیں گے۔'' دہقانوں کی اس منطق نے پادری کو لرزا کر رکھ دیا۔ گناہ آلود زندگی کی جبلی کشش نے انہیں عقل و شعور سے بالکل ہی محروم کر دیا تھا۔

''وہ خدائی نمائندہ نہیں بلکہ کوئی شعبدہ باز اور جادوگر ہے۔ خود ساختہ ریاضت میں شیطان راہنما بنتا ہے۔ وہی انسان کو سبز باغ دکھاتا ہے۔ نجات کا رستہ گناہ میں نہیں بلکہ نیک اعمال میں ہے۔ تم لوگ تو بے وقوف ہو جو اس کی شعبدہ بازی کو کرامت سمجھ رہے ہو۔ میں آج سب کے سامنے اس کا پردہ چاک کر کے رہوں گا۔'' وہ تنتناتا ہوا تہ خانے میں چلا گیا۔ وہاں موجود بھی افراد سنسنی میں مبتلا ہو گئے۔ آنے والے لمحات کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ کچھ لمحوں بعد تہ خانے میں پادری کی ہولناک چیخوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اوپر آیا تو اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

''کیا ہوا فادر! آپ تو راسپوٹین کو جھوٹا ثابت کرنے گئے تھے۔ کوئی ثبوت نہیں ملا کیا؟'' ہجوم سے کسی نے پھبتی کسی لیکن پادری کی سماعت بھی مفلوج سی ہو چکی تھی۔ وہ وحشت اور خوفزدگی کے عالم میں واپس چلا گیا۔ راسپوٹین کی آنکھوں کا تنویمی اثر زائل ہوا تو وہ حکومت کو ایک خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے واضح اور دوٹوک انداز میں حکومت کو متنبہ کیا کہ گریگوری راسپوٹین نامی وہ شخص خلستی فرقے کا پیروکار ہے۔ لوگوں کو گناہوں کے ذریعے نجات حاصل کرنے کا سبق پڑھا کر وہ گمراہی اور بدکاری کو فروغ دے رہا ہے۔ اس کی تعلیمات عیسائیت کے بالکل متضاد ہیں۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو روس میں ایک نیا فتنہ جنم لے سکتا ہے۔

پادری کی اس شکایت پر حکومت فوراً حرکت میں آ گئی۔ متعلقہ محکمے نے ایک کمیشن تشکیل دے دیا۔ کمیشن کے اراکین نے پوکروو سکوئی آتے ہی مقامی افراد سے بھرپور انداز میں تفتیش کا آغاز کر دیا۔ بستی کا ہر ایک فرد گریگوری راسپوٹین کے پاکیزہ کردار اور روحانی معراج کی گواہی دیتا رہا۔ کمیشن کے سربراہ کو کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ وہ راسپوٹین سے ملنے کے لیے تہ خانے میں چلا گیا۔ گریگوری کے لیے اسے اپنی آنکھوں سے سحر زدہ کرنے اور قوتِ ارادی مفلوج کر دینے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ عقیدت سے اس کے ہاتھ چومتے ہوئے واپس لوٹ آیا۔ کمیشن کوئی بھی ثبوت حاصل کیے بغیر ناکام واپس لوٹا۔ راسپوٹین کے عقیدت مندوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کی شہرت جنگل کی آگ کی طرح سائبیریا کی حدود سے باہر پھیل چکی تھی۔ گھر کے باہر ہمہ وقت ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ان میں سے اکثریت ایسے افراد کی تھی جو اپنے مصائب و مشکلات کا حل اور روحانی علاج چاہتے تھے۔ اسی دوران گریگوری نے تین دن کا سخت ترین چلہ کیا اور تہ خانے سے باہر نکل کر اپنے عقیدت مندوں کے درمیان چلا آیا۔ وہ اسے اپنے سامنے موجود پا کر خوشی اور جوش سے بے قابو ہونے لگے تھے۔ گریگوری نے متانت سے ہاتھ اٹھا کر ان کے نعروں پر بند باندھا اور گویا ہوا۔

''میرے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں تمہیں ایک ہی پیغام دینا چاہتا ہوں۔ ایسا پیغام جس میں تمہارے لیے بہت سی مسرتیں پوشیدہ ہیں۔ اپنی ذات کو گناہوں میں اس قدر غرق کر لو کہ گناہ بھی شرمندہ ہو جائیں۔ جی بھر کر گناہ کرو۔ سنگین ترین اور لاتعداد کرو۔ تمہیں ہر حال میں گناہوں کو شکست دینی ہوگی۔ یاد رکھو! جس قدر گناہ کرو گے جنت تمہارے نزدیک آتی جائے گی۔''

عوام الناس کے چہرے خوشی سے چمکنے لگے۔ ان کے دلوں میں ہزارہا سفلی خواہشات جنم لے رہی تھیں جن کی تکمیل بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ وہ گریگوری راسپوٹین کے حق میں نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کا جوش تھما تو اس نے سلسلۂ کلام کا دوبارہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہاں خصوصی چلہ کشی کے لیے بلایا گیا ہے۔ مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ بہت جلد آپ سب سے دوبارہ اور بھرپور ملاقات ہوگی۔ خداوند آپ سبھی کو زیادہ سے زیادہ اور سنگین ترین گناہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔'' وہ الوداعی کلمات ادا کرتا دریائے تورا کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ منظر سے غائب رہا۔ اس کی کہیں کوئی خبر نہ تھی۔ کچھ وقت یوں ہی خاموشی سے بیت گیا۔ راسپوٹین کا نظریہ لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ ہوتا جا رہا تھا۔ مختصر روپوشی کے

www.alfalayleem.com

بعد جب وہ منظرِ عام پر آیا تو عہدِ جوانی میں بھی اس کا چہرہ کڑی زندگی اور آوارگی کے دوران دھوپ، سرد ہواؤں کے باعث جھریوں زدہ ہو چکا تھا۔ اس نے مقدس صحائف، عظیم پاسٹروں کی تعلیمات اور بے شمار وعظ یاد کر لیے تھے۔ خلست آرکوں میں گزارے گئے اس وقت میں اس نے عیسائی دعاؤں کے علاوہ جادو کے ذریعے مریضوں کو شفایاب کرنے کا ہنر بھی سیکھ لیا تھا۔ شیطانی قوتیں اس کی بھرپور مطیع تھیں۔ مقابل کی قوتِ ارادی، مرض، مسائل اور تناؤ ختم کرنے یا پرسکون کرنے کے لیے اس کے مضطرب ہاتھوں کا لمس اکثیر ثابت ہوتا تھا۔ اس کی ہر ایک ادا اور وعظ عوام میں مقبولیت کی نئی بلندیاں حاصل کر رہا تھا۔ اسی دوران اس نے علوم الٰہیہ کے ایک ادارے میں شمولیت اختیار کر لی۔ وہ ادارے کے طلبہ کو مذہبی مسائل پر استدلال سے جواب دیا کرتا۔ ''سکیٹ'' کے پیچیدہ مسئلے پر اس کے دوٹوک، صاف گو اور سیدھے سادے دلائل نے طلبہ ہی نہیں انتظامیہ کے چند افراد کو بھی ورطۂ حیرت میں گم کر دیا۔ ادارے کے ڈائریکٹر ''فیوفان'' نے اسے خصوصی طور پر اپنے پاس طلب کر لیا۔ وہ چند اہم نکات پر اس کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ گو اس ادارے میں شمولیت کے وقت اس سے بھرپور گفتگو ہوئی تھی لیکن اس کا وجدان مزید بات چیت کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

''برادر گریگوری! تم نظریۂ گناہ پر اس قدر یقین کیوں رکھتے ہو؟''

''کیونکہ میرے نزدیک یہ فطرت اور حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔''

''لیکن کیسے؟ مسیح اور قدیم کلیسا کے سبھی مقلدین گناہ کو ابلیس کا راستہ قرار دیتے ہیں۔ کیا تم ابلیسی نظریات کے پیروکار ہو؟'' فیوفان کے اس سخت سوال پر راسپوٹین لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ جوابی تلخی یا سختی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

''میں مقدس مسیح اور دیگر بزرگوں کو نہیں جھٹلا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے گناہوں کو شیطانی فعل قرار دیتے ہوئے ہی انہیں رد کیا ہے۔ لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ توبہ اور معافی کے لیے گناہ کا ارتکاب ضروری ہے۔ انسان کو اتنے گناہ کرنے چاہئیں کہ پچھتاوے گھیر لیں۔ اس کے بعد ہی پشیمانی اور توبہ گناہوں سے پاک کر سکتی ہے۔'' فیوفان اس کے خیالات و نظریات سے متفق تو نہ ہوا البتہ خود اعتمادی، سنجیدہ، دوٹوک انداز اور اپنی منطق پر ثابت قدم رہنے کی خصلت نے اسے بہت متاثر کیا۔ راسپوٹین کے وجود میں کسی شعلے کی سی لپک محسوس ہوتی تھی۔ وہ مقابل کو اپنے بس میں کرنے اور بات منوا لینے کے فن میں طاق نظر آ رہا تھا۔

''برادر گریگوری! میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہوں گا۔'' فیوفان نے تمہید باندھی۔

''کس سے ملوانا چاہتے ہیں آپ مجھے؟'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''لارڈ بشپ ہرموگن سے۔'' فیوفان نے دوٹوک کہا۔

''مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''ایک نہیں بے شمار ہوں گے۔ طاقت، پیسا، اختیار اور اقتدار تو صرف اس کا آغاز ہوگا۔ اختتام لامتناہی ہے۔''

''بہت خوب! پھر تو میں ضرور ملوں گا۔'' گریگوری نے دلچسپی لی۔ جلد ہی اس کی ملاقات لارڈ بشپ سے ہو گئی۔ اس کی نفیس اور باوقار شخصیت کے سامنے گریگوری کی خستہ حالت مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود گریگوری کا اعتماد اور انداز لاجواب تھے۔ اس کی بوسیدہ شخصیت کے باوجود لارڈ کو قوتِ تسخیر کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے فوری طور پر ذہن بنا لیا کہ روسی سیاست میں مغرب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف کلیسا کی جنگ اور کوششوں میں یہی شخص ترپ کا پتا ثابت ہوگا۔

''برادر راسپوٹین! میں نے آج تک تم جیسا باعلم اور پُرکشش شخص نہیں دیکھا۔ تمہاری آنکھوں کی یہ قوت دنیا ہلا سکتی ہے۔''

''لگتا ہے اب آپ بھی مجھے کسی اور سے ملوانا چاہتے ہیں۔'' راسپوٹین نے اپنے زرد دانتوں کی نمائش کی۔

''ہاں! زارسٹن کے سیاسی پادری ''ایلیوورڈ'' تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ انہیں تمہارے جیسی ہی کسی شخصیت کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے! میں تیار ہوں۔'' سیاست کا نام سن کر اس کی آنکھیں مزید چمک اٹھیں۔ سیاست سے منسلک ہونے کا مطلب لامتناہی اختیارات تھے۔ لارڈ بشپ راسپوٹین سے بھی زیادہ عجلت پسند ثابت ہوا۔ اس نے فوری طور پر ایلیوورڈ سے پہلے خود ملاقات کی اور تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''کیا واقعی وہ شخص اتنا طاقتور ہے کہ سیاسی معاملات پر اثر انداز ہو سکے؟''

''بالکل ہے۔'' ہرموگن نے زور دیا۔ ''میرا یقین کیجیے فادر! اس کی آنکھوں اور ہاتھوں کے لمس میں کوئی جادو ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو یہ شخص ہمارے لیے بہت مفید رہے گا۔ روس کی زار حکومت اس وقت بہت مشکلات میں گھری ہوئی

www.allthayeem.com

ہے۔ ایک جانب انقلابی طاقتیں داخلی طور پر حکومت کو کسی طرح سے پریشان کر رہی ہیں تو دوسری طرف عالمی انقلابی تحریک کے در پردہ موجود خفیہ طاقتیں کسی طرح برطانیہ کو روس کے ساتھ جنگ میں ملوث کرنا چاہتی ہیں۔'' ایلیوورڈ پُرجوش ہوا۔

''آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں فادر! امریکا' برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ سوویت یونین کی حیثیت ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس روس کی سلامتی کے لیے کسی بھی حد تک جائیں گے۔ انقلابیوں سے نمٹنے کے لیے تو ''ٹروشین پیوپل پارٹی'' کی تشکیل اور لائحہ عمل ہی کافی ہے۔ بین الاقوامی سازشوں کا تیا پانچا بھی بہت جلد ہو جائے گا۔''

''ہاں! اگر گریگوری راسپوٹین میں واقعی ہماری مطلوبہ صلاحیتیں موجود ہوئیں تو ٹروشین پیوپل پارٹی کے حوالے کر دیں گے۔''

''میرا یقین کیجیے فادر! راسپوٹین ایک انمول شخص ہے۔'' ہرموگن نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔ ''اس وقت ہمیں روسی دیہاتوں اور قصبوں میں رہائش پذیر کروڑوں افراد کی حمایت درکار ہے۔ انہی کے تعاون سے مغربی سیاست کے خلاف کلیسا کی جنگ جیتی جا سکتی ہے اور یہ کام گریگوری راسپوٹین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ دیہاتی اس کے سحر میں بری طرح گرفتار ہیں۔ وہ اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں۔ اسے وحی خداوندی سمجھتے ہیں۔ اس کی کہی ہوئی کسی بھی بات پر انکار کر ہی نہیں سکیں گے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی؟'' ایلیوورڈ نے کہا۔ ''فوری طور پر دو کام کرو۔ راسپوٹین کی ''فادر جان گرجا'' میں عوام کے سامنے رونمائی کرواؤ پھر اسے زار روس کے مسائل اور محل کے حالات سے ہلکی پھلکی آگاہی فراہم کرو۔ اس جنگ میں کودنے سے پہلے اسے اپنا کردار اچھی طرح سمجھ لینا ہوگا۔ لیکن ایک بات کا مزید دھیان رکھنا۔ اس کی طنابیں اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھامنا ہوں گی۔ یہ نہ ہو کہ وہ ہماری ہی جڑیں کاٹ کر محل میں اپنا اثر رسوخ قائم کر لے۔''

''بے فکر رہیے فادر! وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ میں اسے کچھ بھی کرنے ہی نہیں دوں گا۔ وہ فیوفان کے ساتھ رہے گا۔ وہی اسے 'پیٹرز برگ' کے عالی مرتبت افراد سے متعارف بھی کروائے گا۔'' ہرموگن کی اس تجویز پر ایلیوورڈ نے توثیق ثبت کر دی۔ ہرموگن فیوفان کے توسط راسپوٹین کو ''فادر جان گرجا'' رسائی کی بابت حکمت عملی تیار کرنے لگا۔

☆☆☆

گریگوری راسپوٹین ایک پُرشکوہ عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی حالت نہایت خستہ تھی۔ بڑھے ہوئے میلے بال' بے ترتیب ڈاڑھی' متورم چمکدار آنکھیں' پھٹے ہوئے کپڑے' اُدھڑے ہوئے کوٹ اور پھٹے پرانے جوتوں میں وہ کوئی بدحال فقیر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ لمحوں تک گہری نگاہوں سے گرجا کے چمکتے مینار اور مقدس شبیہات دیکھتا رہا اور پھر اندرونی جانب بڑھ گیا جہاں کوئی بھی نشست خالی نہ تھی۔ پادری سحر انگیز انداز میں وعظ دیتے ہوئے مقدس ماں اور یسوع مسیح کے متعلق بتا رہا تھا۔ گریگوری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اسے یقین تھا کہ وہ ایک لمحے میں عوام کو اس سحر سے نکال کر اپنے قابو میں کر سکتا ہے۔ وہ بااعتماد قدموں سے چلتا ہوا پادری کے سامنے چلا آیا۔

''میں نے مقدس ماں کی زیارت کی ہے۔'' اس نے پادری کے خاموش ہوتے ہی دھماکا کیا۔

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' پادری نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہی جو آپ نے سنا فادر!'' گریگوری نے اس کے سیاہ لبادے' مخصوص سرپوش اور گلے میں لٹکتی صلیب کا دلچسپی سے جائزہ لیا۔

''تم نے کس کو دیکھا ہے؟'' وہ اب بھی اپنی سماعت پر مشتبہ تھا۔

''مقدس ماں کو..... ان کی آنکھیں کسی سنہری طاقت کا منبع تھیں۔ جلد ایسی چمکدار اور سفید کہ کائنات کی ساری چمک اور روشنی اس کے سامنے ماند دکھائی دے۔ ان کا لمس اب بھی میری پیشانی پر زندہ ہے۔'' وہ خوابناک انداز میں بتانے لگا۔

''کون ہو تم؟'' پادری نے اس کے حلیے کا بغور جائزہ لیا۔

''گریگوری راسپوٹین۔''

''یہاں کیوں آئے ہو؟ پیٹرز برگ کے تو نہیں لگتے۔''

''مقدس ماں نے بھیجا ہے۔ مجھے حکم ملا تھا کہ انسانیت دکھی ہے' خون ریزی کا شکار ہے۔ ان کی مدد اور راہنمائی کروں۔''

''ان کی زیارت کے دعوے آج تک بہت سے لوگوں نے کیے ہیں۔'' پادری نے تولتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں دعوے کے لیے نہیں بلکہ ثبوت کے ساتھ آیا ہوں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری پیشانی پر وہ مقدس لمس اب بھی موجود ہے۔'' گریگوری کے اصرار پر وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے ہاتھ گریگوری کی طرف بڑھائے جس نے موقع غنیمت جان کر وہ دونوں ہاتھ تھامے اور اپنی پیشانی سے لگا دیے۔ پادری یکدم ساکت

www.aiftayjeem.com

ہوگیا۔ اس کے لمس اور آنکھوں سے خارج ہوتی شعاعوں نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔

''یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے..... بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اس نے اپنے اردگرد کھڑے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔ پھر مجمعے سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اے لوگو! دیکھو..... اس عظیم ہستی کو غور سے دیکھو۔ یہ ایک مسیحا اور سراپا نور و تقدس ہے۔ اس کی تعظیم کرو۔ اس کے قدموں میں خود کو نچھاور کر دینا ہماری خوش قسمتی ہوگی۔'' وہ خود بھی اس کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ راسپوٹین نے مسکراتے ہوئے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا۔ عوام میں جوش و خروش کی نئی لہر دوڑ گئی۔ جوش و ولولے نے انہیں عقل و شعور سے محروم اور دیوانگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ گریگوری راسپوٹین کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

☆☆☆

فادر جان گرجا میں اس دھماکے دار آمد کے بعد فیوفان نے راسپوٹین کو اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی جو اس نے بلا تامل قبول کر لی۔ پیٹرزبرگ میں اس ''پیش بین'' کی صلاحیتیں دھوم مچا رہی تھیں۔ فیوفان ہی کے توسط سے وہ مختلف بااثر گھرانوں سے ملاقاتیں کرنے لگا۔ اعلیٰ طبقے کے یہ افراد اس کی پیشگوئیاں جاننے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ ان دنوں روس کے سیاسی و عسکری حالات تناؤ زدہ تھے۔ جاپان اور روس کی کشمکش جاری تھی۔ اسی دوران گریگوری کو ایک اونچے پیمانے کی محفل میں مدعو کیا گیا۔ وہ اپنے مخصوص حلیے میں وہاں پہنچا۔ لمبے میل زدہ بال، غلیظ سی آنکھیں، خستہ کپڑے اور ڈاڑھی۔ عجیب تر بات تو یہ تھی کہ اس کے بدبودار حلیے کے باوجود کوئی بھی اس سے گھن نہیں کھاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں پوشیدہ کشش، لب و لہجہ اور بالخصوص آنکھیں مقابل کی قوتِ ارادی کو پل بھر میں ہی زیر کر لیا کرتے۔ اس محفل میں بھی خواتین کسی پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلانے لگیں تو کچھ مرد حضرات جز بز ہوتے اسے دیگر معاملات میں الجھانے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

''موجودہ ملکی حالات کے بارے میں کیا خیال ہے فادر؟'' ایک شخص نے اس سے پوچھا۔ وہ اپنی شریکِ حیات کو راسپوٹین کی جانب والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے چڑ کر یہاں آیا تھا اور اس کے پاس آتے ہی اپنے سابقہ جذبات بھول کر سحر زدہ ہو گیا۔

''جنگ انسانی فطرت ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے دوسرے علاقوں میں ان کے وسائل اور خوشحالی پر قبضہ کرنے کی خواہش بھی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ یہی خواہش اسے نت نئے ہنگاموں میں الجھاتی رہے گی۔ طرزِ حکومت جتنا ہی شاہانہ اور باوقار ہوگا، دشمن کی نظروں میں اتنا ہی کھٹکے گا۔ وہ اس کی ذاتی حیثیت اور جاہ و جلال ختم کرنے کے درپے رہیں گے۔ کیا سمجھے؟''

''سمجھ گیا فادر! میں سب سمجھ گیا۔ محترم زار کو خصوصی دعاؤں اور مذہبی تعاون کی ضرورت ہے۔ وہ جس قدر مذہب اور روحانیت سے دور ہوں گے اسی قدر خطرات کے مدار میں آتے جائیں گے۔'' راسپوٹین نے کندھوں پر صلیب بناتے ہوئے زیرِ لب مناجات ادا کیں۔

''جاپانی بحری بیڑے سے لڑائی کے لیے روسی بیڑا بھی روانہ ہو رہا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے دعا ہی کر دیجیے گا۔'' ایک اور شخص نے گفتگو میں حصہ لیا۔

''ضرور کروں گا..... لیکن پھر بھی میں جانتا ہوں اور میری آنکھیں اپنے بیڑے کی تباہی دیکھ رہی ہیں۔ حیرت زدہ فوجی، جہاز کو بچاتا ہوا ہراساں عملہ، ایک دوسرے کو بلند آواز میں ہدایات دیتے ملاح، پانی کے چھپاکے، سمندر کی گود میں سماتا ہوا بیڑا۔ ہاں! میں سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔'' اس کی یہ پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ روسی بیڑا آبی قبر میں ہمیشہ کی نیند سو گیا تھا۔ اس واقعے نے راسپوٹین کی شہرت میں اضافہ کیا۔ عالی مرتبت افراد اس کے عقیدت مند بن چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد گریگوری کی ملاقات سیمینری کے چند طلبہ سے ہوئی۔ وہ ان سے پہلی بار مل رہا تھا۔ ان کی فرمائش پر گریگوری نے کسی کے ادیب بننے، کسی کے سخت بیماری میں مبتلا ہونے اور کسی کو اچانک دولت مل جانے کی پیش گوئی کی۔ طلبہ کا یہ گروہ اس وقت مکمل طور پر اس کے دام میں آیا جب اس نے ایک نوجوان کو بتایا کہ وہ نہایت سادہ دل انسان ہے جس کی وجہ سے دوست احباب ہمیشہ اس کا فائدہ اٹھایا کرتے ہیں۔ فیوفان کے لیے یہ صورتِ حال بہت تسلی بخش تھی۔ گریگوری راسپوٹین کا وہ سفر نہایت درست سمت میں رواں تھا۔ کچھ عرصے بعد فیوفان نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت گریگوری کی ملاقات زار روس کے چچا ''گرینڈ ڈیوک پیوترنکولائیوچ'' کے گھرانے سے کروائی۔ اس گھرانے کی شاہی محل میں اہمیت مسلمہ تھی۔ گرینڈ ڈیوک کے محل میں سینتیس سالہ 'میلیتسا' اور چھتیس سالہ 'اسٹیسیا' (عرف عام اسٹینا) کا راج تھا۔ وہ دونوں بہنیں مونٹی نیگرو کے بادشاہ 'نکولس نیگس' کی بیٹیاں تھیں۔ میلیتسا کی شادی گرینڈ ڈیوک پیوترنکولائیوچ سے ہوئی تھی۔ اسٹینا 'ڈیوک آف لائٹنبرگ' کی اہلیہ اور اس

www.urdtayiem.com

کے کئی بچوں کی ماں تھی۔ اسٹینا اپنے معاشرے اور حلقۂ احباب میں کافی متنازعہ تھی۔ اس کے محل میں میلیتسا کا دیور گرینڈ ڈیوک نکولائی نکولائیوچ کی آمدورفت غیر معمولی تھی۔ اعلیٰ طبقے میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ ان دونوں کا معاشقہ عروج پر ہے۔ نکولائی کی عمر سینتالیس سال تھی۔ وہ دیوقامت، عظیم الجثہ اور بہترین شہسوار تھا۔ شاہی خاندان ''رومانوف'' میں اسے رنگین شخصیت اور خوفناک انکل کہا جاتا۔ وہ شاہی محافظوں میں کافی مقبول اور زار روس کے بھی بہت قریب تھا۔ مونٹی نیگرو بہنیں البتہ ''زارینہ الیکسس'' کے لیے بااعتماد تھیں۔

زارینہ کو شادی کے بعد روس آمد کے ساتھ ہی درباری معاندت کا سامنا تھا۔ ان حالات میں دونوں بہنوں نے ہی اسے اخلاقی اور جذباتی سہارا فراہم کیا تھا۔ شاہی دربار میں زار اور زارینہ کے اس گھرانے سے میل ملاپ میں بھی بہت سے تحفظات تھے۔ پیوتر نکولائیوچ اکثر بیمار رہتا۔ اسے قدرے بے ضرر سمجھا جاتا تھا۔ خوفناک انکل نکولائی بے وقوف، بے لچک اور انتہائی ضدی طبیعت کا مالک تھا۔ دونوں بہنیں متصوفانہ ادب میں دلچسپی لیا کرتیں۔ انہیں ہر انوکھی اور مافوق الفطرت شے بہت بھاجاتی تھی۔ شاہی محل کے رہائشیوں کے تحفظات اور نفرت کا یہ عالم تھا کہ سیاہ فام ملک میں پیدا ہونے اور سیاہ بالوں کی وجہ سے انہیں ''سیاہ عورتیں'' کہا جاتا تھا۔ فیوفان کے ان سبھی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ''مقدس ہفتے'' والی اتوار کو گرینڈ ڈچس میلیتسا نے اسے اپنا اعتراف سنانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے گھر فیوفان کی آمد میں تسلسل آ گیا۔ پھر ایک وقت آیا جب فیوفان ان کے گھر کا ہی فرد بن گیا۔ وہ میلیتسا کے ساتھ مطالعاتی نشستیں جماتا۔ فیوفان نے اس سائبیریائی دہقان کی اس قدر تعریفیں کیں کہ تجسس پسند اور مہم جو میلیتسا راسپوٹین سے ملاقات کے لیے مجبور ہو گئی۔

گھاگ راسپوٹین کو علم تھا کہ اسے اسی گھر سے شاہی محل تک رسائی ملے گی۔ اس کا وجدان یہ بھی بھانپ چکا تھا کہ وہ وقت اب دور نہیں جب خفیہ رستہ اس پر بھرپور شدت اور مکمل آمادگی کے ساتھ کھول دیا جائے گا۔

☆☆☆

فیوفان کی رہائش گاہ میں اپنے بستر پر لیٹا راسپوٹین گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کے پردۂ تصور پر شطرنج کی ایک بساط بچھی تھی جس کا ہر ایک مہرہ اپنے ماضی، حال اور مبینہ مستقبل کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔ فیوفان اور میلیتسا نے اسے حکومتی حالات سے کافی حد تک باخبر کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے تئیں بہت احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا لیکن وہ بے خبر تھے کہ راسپوٹین سے کوئی بھی بات پوشیدہ رکھنا ناممکن تھی، وہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ذریعے کسی نہ کسی طرح اصل بات اگلوا لیا کرتا تھا۔ اعلیٰ طبقے کی محفلوں میں شاہی خاندان کے متعلق ہونے والی چہ میگوئیاں بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ وہ کسی بھی شخص سے کوئی اہم بات سنتا تو اسے فوراً اپنے سحر میں لے کر اس بات کی گہرائی تک ضرور پہنچتا۔ ان سب کے علاوہ گریگوری راسپوٹین کا اہم ترین ہتھیار پیٹرز برگ کی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی وہ خواتین بھی تھیں جو اسے خاص اور نیک انسان مانتے ہوئے عقیدت کی انتہا تک پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ دوزانو ہو کر اس کے قدموں میں بیٹھتیں اور ناخن تراش کر اپنی جھولی میں بطور تبرک سمیٹ لیا کرتیں۔ ان سے کوئی بھی معلومات یا سچائی اگلوانا گریگوری کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انہی حالات و واقعات سے اسے علم ہوا کہ زار روس کا خاندان متصوفانہ سنسنی اور کئی المیوں سے دوچار تھا۔

''نکولس'' نے اپنی جوانی میں ہی تخت سنبھال لیا تھا۔ اس کے ذہن میں ہمہ وقت ایک سوچ کلبلاتی رہتی تھی کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے خاندان کی شہنشاہی کی تین سو ویں سالگرہ کا جشن منا لے۔ اسے تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ اسی بنا پر وہ ''رشین ہسٹاریکل سوسائٹی'' کا اعزازی چیئرمین بھی تھا۔ اسے تمام تر خاندانی روایات اور الجھنوں سے آگاہی تھی۔ ''رومانوف زار'' بہت کم سنی میں انتقال کر جایا کرتے تھے۔ انہیں سفاکی و بربریت سے تخت سے ہٹایا جاتا رہا تھا۔ خاندان میں ایسی کئی وحشت ناک مثالیں موجود تھیں۔ پیٹر دی گریٹ نے اپنے بیٹے الیکسس کو سازش کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نوجوان زار ''لوآن انیٹونووچ'' اور ''پیٹر سوم'' کے خلاف اٹھنے والی بغاوتیں کامیاب رہیں۔ ان دونوں کو نکولس کی نگڑدادی ''کیتھرین دی گریٹ'' کے دور میں قتل کیا گیا۔ نکولس کیتھرین سے بہت متاثر تھا۔ اس کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ محل میں اس کے پسندیدہ ترین کمروں میں نہ صرف کیتھرین کے دور کا فرنیچر تھا بلکہ ان کمروں میں خوشبو بھی وہی استعمال ہوتی تھی جو کبھی کیتھرین کے وجود کا خاصہ ہوا کرتی۔ نکولس کے محل میں ہر شے اسی ملکہ کی یادوں سے معمور تھی۔

خاندانی قتل و غارت اور انتقام کا یہ سلسلہ اٹھارھویں صدی میں بھرپور انداز میں جاری رہا۔ صدی کے اختتام پر کیتھرین کے بیٹے ''پال دوم'' کو چند سازشیوں نے سفاکی

www.urdupoint.com

سے قتل کروادیا۔ ان سازشیوں میں پال دوم کا سگا بیٹا ''الیگزینڈر'' بھی شامل تھا۔ اسی الیگزینڈر نے بعد میں نپولین کو بھی شکست دی تھی۔ اس کی اپنی زندگی بھی تنازعات اور غیر یقینی صورت حال کا شکار رہی۔ راسپوٹین کو کسی بھی ذریعے سے اس کے اصل انجام کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ سرکاری طور پر تو اعلان کیا گیا تھا کہ وہ ''لیگروگ'' میں مر گیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ افسانوی باتیں بھی مشہور تھیں۔ ذرائع کے مطابق وہ ''آوارہ گرد'' کا روپ اختیار کر کے سائبیریا روانہ ہو گیا تھا اور اس کی جگہ کسی اور کو اس کی قبر کا دائمی مکین بنا دیا گیا۔

زار نکولس کا چچازاد اور تاریخ نویس ''گرینڈ ڈیوک نکولائی میخائلووچ'' اسی بات پر قائم تھا کہ شاہی خاندان سے ناخوش الیگزینڈر ''فیودور کزیچ'' کی شخصیت اختیار کر چکا ہے۔ اس نے جانفشانی سے خاندان کی خفیہ دستاویزات کھنگالیں تو کیتھرین دی گریٹ کی خفیہ یادداشتوں سے علم ہوا کہ الیگزینڈر ''پال پیٹرسوم'' کا نہیں بلکہ کسی محبوب کا بیٹا تھا۔ اب وہ محبوب کون تھا؟ کس حیثیت کا مالک تھا؟ اس بات کا علم خود کیتھرین کو بھی نہیں تھا۔

زار نکولس کے شاہی خاندان کا ماضی ایسی ہی ''درخشندہ'' مثالوں سے بھرا پڑا تھا۔ دارالحکومت پیٹرزبرگ کو سفید آسیبی راتوں والا شہر کہا جاتا تھا جو ہزارہا مزدوروں کے خون سے تعمیر ہوا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرد ''پیٹر دی گریٹ'' نے اپنی اہلیہ ''ایودوکیا'' کو کانونٹ میں جلاوطن کر دیا تھا۔ اس نے دارالحکومت کو نہایت وحشت کے عالم میں ویران ہو جانے کی بددعا دی تھی۔ اس نے اپنے پڑدادا ''الیگزینڈر دوم'' کو انقلابیوں کی طرف سے کیے گئے دھماکے میں زخموں سے چور چور ہو کر عبرتناک موت سے بغلگیر ہوتے دیکھا تھا۔ اس حادثے نے نکولس کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ نکولس کی بہن نے محل کی خادماؤں اور خادموں سے مختلف قصے سن رکھے تھے۔ ملازمین کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے مقتول پال کی روح کو وہاں منڈلاتے اور اپنے لیے انصاف طلب کرتے ہوئے نوحہ کناں دیکھا تھا۔ بلوغت تک آنے کے بعد نکولس کی توہم پرستی مزید پروان چڑھ چکی تھی۔

اسے دعویٰ تھا کہ اس کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے وہ تمام عمر رنج و الم کا شکار رہے گا۔ تقدیر نے بھی اس کے دعوے کو زندگی کے ہر موڑ پر بڑے اہتمام سے آزمایا۔ نکولس کی شادی جرمن نژاد بلیس کی شہزادی ''الیکسس'' سے ہو گئی۔ وہ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کی نواسی بھی تھی۔ اس شادی کے لیے نکولس اپنی والدہ کی بے پناہ مخالفت کو بھی خاطر میں نہیں لایا تھا۔ توہم پرستی میں الیکسس شوہر سے بھی چار ہاتھ آگے تھی۔ اس نے ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ زارینہ ہونے کی حیثیت سے زار نکولس کے مقدر کی تباہی میں اس کا حصہ بھی ہو گا۔ اب یہ قسمت تھی یا عقائد کی آزمائش۔ بیسویں صدی کے آغاز پر ان کے سبھی خدشات و خواب حقیقت بن گئے۔ خونریزی روسی زندگی کا ایک اہم جزو بن چکی تھی۔ انقلاب پسندوں اور روسی دہشت گردوں نے بربریت و سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح متواتر بمباری کی کہ زار شاہی کے عالی مرتبت افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس موقع پر زار اور زارینہ کے مزاج کا تضاد پہلی بار سامنے آیا۔ نکولس کا خیال تھا کہ انسان کو خدا کی طرف سے لی جانے والی ایسی آزمائشوں میں عاجزی، انکساری اور استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس الیکسس نے تقدیر کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ آغاز ہی سے مستقبل میں پیش آنے والے حادثات سے بچاؤ کے لیے پیشگی تدابیر کرنے کی خواہشمند تھی۔ اس موقع پر میلیتسا اور اسٹینا نے اسے بہت حوصلہ دیا۔ اخلاقی ذمہ داریاں بندھاتی رہیں۔ یہ مونٹی نیگرو بہنیں ایک ایسے ملک کی رہائشی تھیں جہاں اشرافیہ اپنے عوام کے بہت قریب ہوتی ہے۔ انہوں نے زارینہ کے ذہن میں یہ بات راسخ کی کہ صداقت، کرامت، معجزات اور قوت درحقیقت سیدھے سادے اور عام بظاہر کچلے ہوئے لوگوں میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ لالچی امراء اور تکبر سے چور درباری روحانی اور اخلاقی دیوالیا ہوتے ہیں۔ زار اور عوام کا براہ راست رابطہ ہی ان کے مسائل کا حل ہے۔ زارینہ نے ان کی یہ بات اپنے پلو سے باندھی اور شوہر کو بھی اپنے نقطۂ نظر پر قائل کرنا شروع کر دیا۔ نکولس اپنی ملکہ کی بات ٹال ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے عام لوگوں سے تعلق استوار کرنے کا آغاز کیا اور محل میں پہلی بار عوام الناس کی آمد شروع ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الیکسس کے ہاں یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں مولود ہو چکی تھیں۔ وہ سخت ترین ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ اسے شدت سے ایک بیٹے کی تمنا تھی۔ اس نے مونٹی نیگرو بہنوں سے مدد طلب کرتے ہوئے مذہبی قوت اور روحانیت کے اعلیٰ درجوں پر فائز بزرگوں کو محل میں لانے کے لیے کہا۔ میلیتسا نے اسے معجزات کے ایسے قصے سنائے کہ زارینہ اپنے ہوش و حواس کھونے لگی۔ میلیتسا نے اسے فارسی ادب، زرتشت کے اسرار اور مونٹی نیگرو کے ان افراد کی قوت سے آشنا کروایا جو مُردوں سے بھی ہمکلام ہو سکتے تھے۔ زارینہ اس حیرت

www.urdtayeem.com

انگیز دنیا میں ڈوب ہی گئی۔ اس کے لیے یہ بات ہی بہت سحر انگیز تھی کہ عام لوگ جادوئی طاقتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ایکسس کو کسی بھی قیمت پر ایک بننا چاہیے تھا۔ اس نے میلیتسا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ محل میں ایسے شخص کا بندوبست کرے جو ولی عہد کی پیدائش کے لیے خصوصی دعائیں کرے۔

میلیتسا اپنی سہیلی کے دکھوں کا دلی طور پر مداوا کرنا چاہتی تھی۔ محل میں لایا جانے والا پہلا شخص "میتیا" تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے قصبے "کوزیلسک" کا رہائشی تھا۔ اس کے بال غیر معمولی لمبے تھے۔ سارا سال موسموں کی سختی سے بے نیاز ننگے پاؤں پھرتا۔ فقیروں سے بھی معمولی لباس پہنتا۔ عوام الناس میں اس کا اثر غیر معمولی تھا۔ عقیدت مندوں سے حاصل ہونے والی رقم غریبوں میں تقسیم کر دیا کرتا۔ اس کی پیشگوئیاں نہایت کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔ اسے باطنی علوم میں بھی خصوصی مہارت حاصل تھی۔ زارینہ ایک بار پھر ولی عہد کی پیدائش میں ناکام رہی۔

میتیا کے بعد برہنہ پا رہنے والی "میتر یونا" نے زار شاہی میں قدم رکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مقدس صحیفہ تھی۔ پھٹا پرانا لباس اور گم صم انداز دیکھ کر وہ ایک بار پھر خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی کہ اس کی امید ضرور بر آئے گی۔ میتر یونا نے قدیم یونان کی ڈیلفی کی پجارن کا تاثر دیتے ہوئے مشکل انداز میں چند پیشگوئیاں کیں تو زارینہ کے ذہن میں یہ سوچ پیدا ہونے لگی کہ ایسی مشکل زبان و انداز یقیناً خدا سے براہِ راست ہمکلامی کا ذریعہ ہوں گے۔ ایکسس کی یہ امید اس وقت پاش پاش ہوئی جب میتر یونا اچانک ہی دربار سے ایسے غائب ہوئی کہ پھر کسی کو کہیں نظر ہی نہ آسکی۔ زارینہ ایکسس بکھر کر رہ گئی۔ اس کی امیدوں کا شیش محل بہت بری طرح چکنا چور ہوا تھا۔ زار نکولس بھی ذہنی طور پر منتشر ہوگیا۔ زارینہ کے آنسو پونچھتے اس کی تڑپ کو ضبط کے دائرے میں لاتے اور خداوند سے شکوے کرتے نکولس کو اپنی زندگی سے بیزاری محسوس ہو رہی تھی۔

اس شاہی جوڑے کی زندگی اور دنیا ہی بہت عجیب تھی۔ وہ کرامات، بزرگوں اور مقدس یادگاروں میں گھرے رہتے تھے۔ پیٹرز برگ میں ان کا وجود بہت مصنوعی محسوس ہوتا تھا۔ روسی معاشرہ بڑی تیز رفتاری سے دہریت کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ دانشوروں کی اکثریت مذہب سے دور ہو چکی تھی۔ ان حالات میں یہ شاہی جوڑا دارالحکومت کی رنگا رنگ زندگی اور روشن خیالی نظر انداز کیے دور افتادہ بستیوں میں

سنہری باتیں

☆ عظمت ایک ایسا پھول ہے جسے حاصل کرنے کے لیے انسان کو محنت جیسے کانٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

☆ دکھوں سے نہ گھبراؤ، تم نے دیکھا نہیں کہ پھولوں کی نازک پتیاں کانٹوں کے ساتھ بھی گزارہ کرتی ہیں۔

☆ اپنی غلطی مان لینا فراخ دلی کی نشانی ہے، نہ کہ ندامت کی۔

☆ ماضی کو یاد ضرور رکھو..... لیکن اس میں جا کر رہو نہ۔

☆ خوش رہو اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

عشق دانشوروں کی نظر میں

☆ افلاطون کی رائے میں عشق بغیر فکر کے بے کار نفس کی ایک حرکت کا نام ہے۔

☆ ارسطو نے کہا..... عشق محبوب کے عیبوں کے ادراک سے اندھا ہوتا ہے۔

☆ سقراط کے نزدیک عشق دیوانگی ہے۔ اس کی بھی کئی اقسام ہیں۔

☆ فیثا غورث کے نزدیک عشق ایک ایسا لالچ ہے جو تباہ کن غم تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔

قابل غور

کہتے ہیں عورت اور مرد گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جب یہ دو پہیے ہیں تو آپ ان دونوں کو ایک ہی جگہ پر کیوں لانا چاہتے ہیں؟ کیا اس طرح گاڑی چل سکے گی؟ بے شک دونوں پہیوں کی اہمیت برابر ہے لیکن اپنی اپنی جگہ پر ایک دوسرے کی جگہ لینے میں نہیں۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

سیب

ایک سیب گرا اور قانون کشِ ثقل دنیا میں دریافت ہوگیا..... مگر افسوس کہ ہزاروں انسان گرے اور کبھی انسانیت دریافت نہ ہوسکی۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

www.alifbayiecom

جانے کے لیے مچلتا۔ دعائیں بڑھتی رہیں اور بالآخر وہ لمحہ آ گیا جب مونی نیکرو بینس زارینہ کے لیے ایک اور بزرگ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

اس نے کسی فرانسیسی شخص ''فلپ'' کی کرامات کے متعلق سنا جو ''لیون'' کا رہائشی تھا۔ پیش بینی اور شفا بخشنے میں اسے بھی ملکہ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ فلپ کا دعویٰ تھا کہ وہ نہ صرف مُردوں سے ہمکلام ہو سکتا ہے بلکہ دو دنیاؤں کی سرحد کا باسی بھی ہے۔ اسے فوری طور پر روس بلوا لیا گیا۔ وہ ایک پستہ قامت چالیس سالہ شخص تھا۔ بال اور مونچھیں سیاہ تھیں جبکہ لب و لہجے میں جنوبی فرانس کے لوگوں جیسی خوفناکی تھی۔

پہلی ملاقات میں اس نے فرانس اور مغرب میں مذہبی زوال کے متعلق گفتگو کی۔ وہ گہری نظروں سے ہر ایک چیز کا جائزہ لیتا رہا۔ فلپ نے زارینہ کی فطرت، ذہنی تناؤ اور روح میں پوشیدہ خوف و الجھنوں کو بہ آسانی بھانپ لیا۔ ان مسائل کا شکار خواتین کو سنبھالنے کا ہنر اسے بہت اچھی طرح آتا تھا۔ اس نے شیریں زبانی سے زارینہ کی بے حد تعریف کی کہ وہ ایک دہریت پسند معاشرے میں بھی نہ صرف مذہب کی طرف مائل ہے بلکہ مقدس روس کو اپنی زندگی میں عملی طور پر نافذ بھی کرنا چاہتی ہے۔ اس نے زار اور زارینہ کو ولی کا بھرپور تاثر دینا شروع کر دیا۔ فلپ کو علم تھا کہ کرامات کی طلب کو کس انداز میں پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس نے شعبدہ بازی کا ایسا عظیم الشان مظاہرہ کیا کہ زارینہ کے حواس چکا چوند ہو گئے۔ وہ ایک بار پھر اپنی زندگی کے دکھوں کے ساگر میں امید کی کشتی کھینے لگی۔ اسے فلپ پر جس قدر اعتماد تھا، درباریوں کی رائے اسی قدر خراب ہوتی جا رہی تھی۔ محل میں طنزیہ سرگوشیاں اور دبی دبی استہزائیہ مسکراہٹیں قہقہوں میں تبدیل ہونے لگیں تو زار نکولس کی والدہ چوکنا ہو گئی۔ وہ میلیتسا اور اسٹینا سے پہلے ہی خار کھاتی تھی۔ ''سیاہ عورتوں'' نے اپنے ملک کے تمام تر بوسیدہ رسم و رواج اور سیاہی سے پیٹرز برگ کا حسن گہنا سا دیا تھا۔ رسم و رواج اور اپنی تین سو سالہ روایات پر سختی سے عملدرآمد کے لیے اس خاتون نے محکمۂ پولیس کو حکم جاری کیا کہ پیرس میں موجود اپنے خفیہ ایجنٹوں سے فلپ کے ماضی کی بھرپور چھان بین کروائی جائے۔ اس کی ہدایات پر فوری عمل کیا گیا اور نتیجہ بے حد خوفناک برآمد ہوا۔ اہل فرانس کے نزدیک فلپ ایک فریبی اور مہم جو تھا۔ توہم پرست الیکسس اس معاملے میں آہنی اعصاب کی مالک ثابت ہوئی۔ اسے اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ درباری میلیتسا اور اس کے حوالے سے ہم جنس پرستی کی چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔ اسے ان درباریوں کی بھی کوئی پروا نہ تھی جو کھلے لفظوں میں کہنے لگے تھے کہ فلپ جادو کرنے کے لیے زار اور زارینہ کی خوابگاہ میں رہتا ہے تاکہ زارینہ کسی بیٹے کو جنم دے سکے۔ والدہ نے بیٹے کو بھرپور سرزنش کی۔ نکولس نے والدہ سے وعدہ بھی کیا کہ وہ کسی طرح فلپ سے چھٹکارا پا لے گا لیکن اس بار بھی الیکسس کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ وہ کسی چٹان کی طرح اپنے موقف پر قائم تھی کہ ''ہمارے دوست'' کو کوئی بری نیت سے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ وہ فلپ کے دام میں پوری طرح گرفتار تھی۔ آس و امید کے ہنڈولے میں وقت گزرتا رہا۔ شاہی خاندان میں ایک اور ولادت ہوئی۔ نومولود اس بار بھی بیٹی تھی..... چوتھی بیٹی..... زار روس کے اہلِ خانہ زارینہ کے مزید مخالف ہو گئے۔ ناپسندیدگی کی جڑیں ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

چوتھی بیٹی کی پیدائش نے زارینہ کے حوصلے بالکل ہی چکنا چور کر دیے۔ فلپ ایسے کسی بھی موقع کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے ہی تیار تھا۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے زارینہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اپنی مذہبی قوتوں، زار، زارینہ سے دوستی اور ریاضتوں کے بھرم میں اس ساری صورت حال کا ذمے دار الیکسس کے کمزور عقیدے کو ٹھہرا دیا۔ ولی عہد کی پیدائش میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کے خوف، خدشات اور تحفظات قرار دیے۔ زارینہ دہشت اور صدمے سے گنگ تھی۔ اس کی مشکلات کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ رومانوف خاندان فلپ کے متبادل کسی ایسے شخص کا بندوبست کرنے پر تلا تھا جو زار کو اپنے زیر اثر کر سکے۔ گرینڈ ڈیوک نکولائی میخائلووچ نے روس کے مقبول ترین شخص ''لیو ٹالسٹائی'' کو محل میں مدعو کیا لیکن اپنے مزاج سے مغلوب ٹالسٹائی نے زار پر اثر انداز ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ انوا ہیں، طنزیہ گفتگو اور زار کی والدہ کی ناراضگی حد سے زیادہ بڑھی تو نکولس اور الیکسس ملکی وقار اور سالمیت کو ترجیح دینے یا ترقی اور روشن پسندی کی طرف مائل ہونے کے بجائے ہر وقت متصوفانہ ذہنی کیفیت میں غرق رہتے تھے۔ وہ فلپ کے ساتھ ''زیمنیکا'' میں راتوں کو دیر تک عبادت کیا کرتے اور جب محل واپس آتے تو ان کی آنکھوں اور چہرے پر ایک عجیب خمار آلود کیفیت ثبت ہوتی تھی۔ خاندان کی چہ میگوئیوں میں تشویش کا عنصر غالب آنے لگا۔ ہر ایک فرد فلپ کی رخصتی کا مطالبہ کر رہا تھا لیکن

www.allurdu.com

الیکسس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ رومانوف خاندان کی ناراضگی کے بعد اس نے اپنی عزیز بہن ''گرینڈ ڈچس ایلزا ویٹا فیودوروونا'' عرف عام ''ایلا'' سے بھی تعلقات بگاڑ لیے۔ ایلا الیکسس کی بڑی بہن اور نکولس کے چچا کی اہلیہ تھی۔ اسی بہن کی شادی پر نکولس الیکسس کی طرف مائل ہوا تھا۔ ایلا کا شوہر ''گرینڈ ڈیوک سرگی الیکساندروویچ'' ماسکو کا گورنر جنرل تھا۔ روسی زارشاہی میں سب سے بڑا تضاد یہی تھا کہ دارالحکومت پیٹرزبرگ مغربیت زدہ تھا۔ یہاں اشرافیہ یورپ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ اس کے برعکس قومی تشخص کی علامت ''ماسکو'' تھا۔ یہ شہر ان گنت گرجا گھروں اور پیچ دار گلیوں والا شہر ہی روسی روح کا اصل آئینہ دار تھا۔ ایلا نے ہمیشہ اپنے مزاج کے برعکس مونٹی نیگرو بہنوں سے الیکسس کی دوستی برداشت کی تھی۔ اس نرمی کے باوجود وہ فلپ کی وضع قطع اور ماضی سے بالکل مطمئن نہیں تھی۔ اسے اپنی بہن کی فطرت اور مزاج کا بخوبی علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فلپ بر براہ راست تنقید اس کی سرکشی کو مزید تقویت دے گی۔ الیکسس کو موم کرنے کے لیے بہت نرمی اور حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ اس نے موقع دیکھ کر شیریں زبانی سے الیکسس کو سمجھایا کہ روسی زارشاہی کے مسائل کا حل عجیب و غریب وضع اور قوتوں کے حامل غیر ملکی افراد کے پاس نہیں ہو سکتا۔ ان کے اصل سرپرست تو آسمانوں میں ہیں جو طاقت اور روحانیت کا اصل منبع ہیں۔ یہ سرپرست درحقیقت وہ ولی ہیں جو کہ جنت میں اصل آسائشات حاصل کر کے زاروں اور ان کی رعایا کے محافظ بن چکے ہیں۔ اس دوٹوک گفتگو نے الیکسس کے دل و دماغ میں سوچ کے نئے در وا کیے۔ زارینہ نے میلیتسا کو اس نئی صورتِ حال کے متعلق اعتماد میں لیا۔ معاملہ فہم میلیتسا نے فوری طور پر فلپ اور زارینہ کی ملاقات کا بندوبست کر دیا۔

وہ فلپ کی ذہانت اور چھٹی حس بھی بھانپ چکی تھی کہ اب روس سے اس کا دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔ اس نے یہاں اپنے قیام کے دوران بے شمار مالی فوائد حاصل کیے تھے لہٰذا اس رخصتی سے کوئی خاص تردد بھی نہ تھا۔ فلپ نے بھی الیکسس سے مستقبل میں کسی روسی ولی سے ہی مدد حاصل کرنے کی تجویز دی، یہی مشورہ ایلا نے بھی دیا تھا۔ الیکسس فلپ کی روحانیت اور پیش بینی کی اس وقت مزید قائل ہو گئی جب ایلا اور میلیتسا ہی کی طرح اس نے بھی ''ساروف'' کے عظیم شخص ''سیرافیم'' کا نام لیا۔ اس لمحے زارینہ کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش فلپ روسی نژاد ہوتا تو وہ اس کی زندگی سے سبھی دکھوں کا خاتمہ کر دیتا۔ یہ خلش دل میں لیے الیکسس نے مرحوم بزرگ سیرافیم کی ذات سے تمام تر امیدیں وابستہ کر لیں۔ سیرافیم کا دنیاوی نام ''پروخور موشنن'' تھا۔ راسپوٹین کی طرح اس نے بھی سیلانیت اختیار کر کے گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ اپنی آبائی بستی میں سیرافیم کنواریوں، کرائسٹ کی دلہنوں کے ساتھ مگن رہتا۔ ان معمولات کے نتیجے میں اس کا تقدس مشکوک قرار پا گیا اور وہ محکمۂ پولیس کی تفتیش کی زد میں آ گیا۔ اپنی ساکھ داؤ پر لگتے دیکھ کر سیرافیم ایک طویل عرصے کے لیے منظر عام سے غائب ہو گیا۔ اس دوران وہ روحانیت کے زینے چڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ زارینہ سیرافیم سے پہلی بار ایک پیش گوئی ہی کے توسط متعارف ہوئی تھی۔ سیرافیم کو شاہی خاندان کا سرپرست ٹھہرا دیا گیا۔ کلیسائی مجلس کی مزاحمت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے زارینہ نے شوہر کو ایک بار پھر مجبور کر دیا کہ وہ اس پیشگوئی کی تکمیل کرے۔ نتیجتاً سیرافیم کو عیسائی اولیاء کی مسلمہ فہرست کا حصہ بنا دیا گیا۔ زارینہ کے پیش نظر سیرافیم کی ایک اور پیشگوئی کی تکمیل کا احساس تھا جس میں اس نے نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ زار اور اس کا خاندان ''ہمارے'' پاس ضرور آئے گا۔ اسی تشنگی کی تکمیل میں اٹھارہ جولائی 1903ء کو خصوصی عبادت کے بعد زار، پادری اور سب گرینڈ ڈیوکس نے سیرافیم کی خانقاہ کو مزید تکریم دیتے ہوئے اس کے مقدس تبرکات پر مشتمل تابوت اٹھا کر گرجا گھر کے گرد چکر لگایا۔ اس بھاگ دوڑ میں الیکسس کے ذہن سے ایک اور پیشگوئی بالکل محو ہو گئی جس میں سیرافیم نے دعویٰ کیا تھا کہ ان کے عہدِ حکومت میں ظلم و ستم کا بازار گرم ہونے کے بعد خون کے دریا بہیں گے۔ زارینہ صرف وہی کچھ دیکھتی، سنتی اور سوچتی تھی جس میں اسے اپنا کوئی ذاتی مفاد نظر آتا تھا۔

رات ڈھلے وہ نکولس کے ساتھ ندی میں غسل کرتی اور دونوں سیرافیم سے اپنے ولی عہد کے لیے بھیک مانگتے۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ سیرافیم خداوند کے حضور ان کی التجا پہنچائے گا تو زارینہ کو بیٹے کی ولادت میں بالکل وقت نہیں لگے گا۔ اسی یقین کے تحت انہوں نے فلپ کو پیرس روانہ کر دیا۔ فلپ نے جانے سے قبل پیشگوئی کی کہ وہ بہت جلد انتقال کر جائے گا لیکن پھر ایک اور جنم لے کر کسی دوسرے شخص کے روپ میں زارشاہی کی حفاظت کے لیے ضرور واپس آئے گا۔ اس پیشگوئی کے بعد الیکسس کا دل فلپ کی محبت سے مزید معمور

www.alhidayeem.com

ہو گیا اور پھر وہ وقت بھی آیا جب زار نکولس کے ولی عہد نے تیس جولائی 1904ء کو بروز جمعہ دوپہر ایک بج کر پندرہ منٹ پر ایک خوبصورت 'خاکستری آنکھوں والے بچے کو جنم دیا۔ اس بچے کا نام ان کے پسندیدہ زار الیکسس میخائلووچ رومانوف کے نام پر رکھا گیا۔ ولی عہد کی پیدائش کے باوجود اہل خانہ اور درباریوں کی چہ میگوئیوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان سب باتوں سے بے نیاز زارینہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھی۔ وہ فلپ کے متعلق سوچتی رہتی جو اپنی پیشگوئی کے مطابق 1905ء میں مر گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے کسی ولی کی آمد کی شدت سے ضرورت تھی۔ نوزائدہ شہزادے کو الیکسس کی خاندانی بیماری ''ہیموفیلیا'' نے دبوچ لیا تھا۔ اس کی نازک شریانیں کسی بھی چوٹ کی صورت میں خون کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ تمام تر احتیاط کے باوجود اگر کوئی چوٹ لگ جاتی تو جسم بری طرح متورم ہو جاتا اور خون کا بہاؤ روکنا ناممکن ہو جایا کرتا تھا۔

ولی عہد کی طرح یہی حالت روس کی عظیم الشان سلطنت کی بھی تھی۔ محل کے باہر زندگی بہت بھیانک تھی۔ سلطنت کی شریانیں بھی فرسودگی اور کمزوری کا شکار تھیں۔ اگر ایک بار خون کا بہاؤ شروع ہو جاتا تو اسے روکنا ناممکن ہو سکتا تھا۔ ملکی حالات پر قابو اور غیر ملکی سازشوں سے چھٹکارے کے لیے نکولس بے حد پریشان رہتا۔ اس دوران فوج نے اسے کسی نہ کسی طرح قائل کر لیا کہ اگر ''مانچوریا'' پر قبضہ کر لیا جائے تو ان کے لیے صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی۔ جاپان ایک حقیر قوت ہے۔ وہ جوابی حملے یا مزاحمت کے قابل نہیں ہے۔ اگر انہوں نے مزاحمت کی کوئی حماقت کرنے کی کوشش بھی کی تو روس مختصر سی جنگ کے بعد ہی فتح یاب ہو جائے گا۔ زار نکولس نے بغیر سوچے سمجھے پیش قدمی کی اجازت دے دی اور یوں جاپان کے ساتھ ایک خونریز نسل کا آغاز ہو گیا۔ فوج کے سربراہان کی توقعات کے برعکس وہ مختصر جنگ طویل ثابت ہو کر متوقع فتح کو شکست میں تبدیل کر گئی۔ یہ صورت حال زار نکولس کے لیے بے حد اذیت ناک اور اضطراب انگیز تھی۔ اسے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا کہ اس جنگ کی اجازت دے کر اس نے اپنے لیے مصائب مول لے لیے ہیں۔ اس کی مشکلات صرف اس جنگ تک ہی محدود نہ رہیں۔ یہ تو ایک تباہی کا محض آغاز تھا۔ 1905ء کا وہ سال اپنے دامن میں بہت سے کرب سمیٹے ہوئے تھا۔ ولی عہد کی بیماری نے بھی اصل رنگ ابھی دکھانے تھے۔ جنگ میں کسی طور فتح کی نوید سامنے نہیں آ رہی تھی۔ بات صرف یہیں تک محدود رہتی تو شاید سدھار کی کوئی صورت پیدا ہو ہی جاتی لیکن رومانوف شاہی لڑی کی تین سو سالہ تاریخ میں ایک انہونے واقعے نے تو ابھی رونمائی کی ہی نہ تھی۔ انقلاب زار شاہی کے محل پر بہت خونخوار انداز میں دستک دے رہا تھا۔ محنت کشوں اور عوام کے ایک جبر زدہ مخصوص طبقے نے احتجاج کے لیے جلوس کی شکل میں سرمائی محل کا رخ کر لیا۔ زار اپنے خاندان کے ساتھ ''زار کوسیلو'' میں مقیم تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں نکولس کے چچا ''ولادی میر الیکساندروویچ'' سے یہ صورت حال سنبھالی نہ جا سکی۔ وہ پیٹرز برگ گیریزن کا کمانڈر ہونے کے باوجود اس وقت ایسے ہولناک ذہنی تناؤ میں مبتلا تھا کہ نو جنوری کے اس احتجاج میں سیدھے فائر کھول دینے کا حکم دے دیا۔ پل بھر میں پیٹرز برگ کی وہ یخ بستہ سڑک لہو کا تالاب بن گئی۔ روسی تاریخ میں اس واقعے نے ملکی حالات کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس سفاکی کے نتیجے میں انقلاب پسند طبقہ کس طرح خاموش رہ سکتا تھا؟ ایک بھرپور منصوبہ بندی کے تحت ایک ماہ بعد ماسکو میں ایلا کے شوہر ''گرینڈ ڈیوک سرگی الیکساندروویچ'' کے بم سے چیتھڑے اڑا دیے گئے۔ اس ہولناک موت نے نکولس کو مزید ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ وہ شب بیداری کے مرض کا شکار ہو گیا۔ ادویات کے زیر اثر اگر کسی طرح نیند آ بھی جاتی تو خواب میں ایلا چلی آتی۔ وہ برہنہ سر ہوتی۔ خون میں لتھڑی ہوئی شوہر کی باقیات کا ہار بنا کر گلے میں ڈالے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گھسٹ رہی ہوتی۔ یہ مناظر دیکھ کر نکولس کا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ آنکھ کھلتی تو اس کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی ہوتی اور زبان سوکھے چمڑے کی طرح تالو سے چپک جاتی۔

روس بھر میں انتشار اور خوف کا دور دورہ تھا۔ ریلوے کی ہڑتال کے نتیجے میں ماسکو اور پیٹرز برگ ملک کے داخلی حصے سے کٹ چکے تھے۔ زار نکولس اور زارینہ اعصابی شکستگی کا شکار ہو چکے تھے۔ انہیں اپنی زندگی کے ان معاملات کی اصلاح اور ہمواری کے لیے فلپ اور سیرافیم جیسے کسی ولی کا انتظار تھا۔ ان کے ہمراہ صرف اپنی التجائیں اور خداوند پر اعتقاد تھا کہ وہ ان کی مشکلات کے حل کے لیے کوئی ولی ضرور بھیجے گا۔ خاندان نے میل جول بہت محدود کر لیا تھا۔ ان دونوں نے باہمی کوشش سے نکولس کو آئین کے نفاذ پر آمادہ کر لیا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ فوج اپنے مرکز سے بہت دور جاپانیوں سے پنجہ آزما ہے۔ داخلی محاذ پر باغیوں کو طاقت سے کچلنا ممکن نہیں اس لیے زار کو آئین کے نفاذ کی سخت ضرورت ہے۔

(جاری ہے)

ماخذات:

راسپوٹین.... ایڈورڈ ڈزنسکی

راسپوٹین.... از شاہد مختار

www.pkmagazine.com

کارٹر کا ریسٹورنٹ، جس میں ایک معقول قسم کا شراب خانہ بھی شامل تھا، پیرس کی ساحلی پٹی کے ایک دور افتادہ مقام پر، چھوٹے سے ایک ناکارہ بحری جہاز میں واقع تھا۔ جہاز کا عرشہ ٹیرس کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خشکی سے جہاز تک آمدورفت کے لیے چھوٹا سا ایک چوبی پل موجود تھا۔ کارٹر کی رہائش جہاز پر ہی تھی۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور اس نے تنہائیوں کے دامن میں پناہ حاصل کی تھی مگر یہاں بھی دنیا کے شر سے اسے نجات نہیں مل سکی تھی۔ کبھی کبھار کوئی نہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہی رہتا تھا۔

کارٹر کو تنہائی سے پیار تھا۔ تنہائی اس کی بہترین رفیق

بے قرار روح اور پیاسی محبت کا انوکھا ملاپ

ویرانیوں کے اسیر ہمیشہ کسی نہ کسی اذیت کا شکار رہتے ہیں... اسے بھی زندگی میں اکثر کسی ایسے چہرے کی تلاش تھی جس کے پیچھے کوئی دوسرا چہرہ نہ ہو مگر... فریب سے بھری اس دنیا میں یہ کیسے ممکن تھا... لیکن اس بار اسے چہروں نے اذیت سے دوچار نہیں کیا بلکہ حیرتوں کے جہان میں لا پھینکا... اس کی بوڑھی محبت جانے کب سے آزمائشوں میں مبتلا تھی اور جانے کب تک اسے یہ عذاب سہنا تھا کیونکہ جوانی اور بڑھاپے کی محبت کا سنگم ہمیشہ امتحانات کا در کھولے رکھتا ہے۔

بوڑھی محبت

ترجمہ: مودی

www.urdupoint.com

تھی۔ اس روز صبح کا اجالا نمودار ہوتے ہی وہ حسب معمول ٹیرس پر آن کھڑا ہوا اور اپنی تنہائی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اردگرد وہی شناسا نظارہ تھا۔ سمندر کی مضطرب لہریں، ریت کے ٹیلے، چند سائن بورڈز، ریت پر بکھرے ہوئے سیکڑوں مُردہ پرندے، ریت پر اَن گنت قدموں کے نشانات اور بہت دور ایک مخروطی سے جزیرے کا ہیولا۔ یہاں سے چند سو گز کے فاصلے پر ہائی وے تھا۔

کارٹر نے دن کا پہلا سگریٹ سلگایا اور ریلنگ کے سہارے کھڑے ہو کر ریت پر بکھرے ہوئے پرندوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے بعض پرندوں میں تھوڑی بہت جان تھی لیکن وہ اڑنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ شاید وہ صرف مرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ کارٹر تھوڑا سا شاعر بھی تھا۔ زیادہ تر خواب و خیال کی دنیا میں کھویا رہتا تھا اور ہر چیز کا جواز شاعرانہ انداز میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن پرندوں کے یہاں آ کر مرنے کا کوئی شاعرانہ جواز اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

کچھ دیر بعد کارٹر اپنے کیبن میں جا کر شیو بنانے لگا۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا باہر پڑے پرندوں کی طرح وہ بھی اسی ساحل پر مر جائے گا؟ اس کا دل کہتا تھا کہ ابھی اسے کچھ اور ٹھکانے بدلنے تھے۔ ہر جگہ وہ دو چار سال ٹکتا تھا۔ جب اس کے پاس کچھ رقم جمع ہو جاتی تھی تو اپنا کاروبار فروخت کر کے کسی اور طرف روانہ ہو جاتا تھا، کہیں اور قیام کر لیتا تھا۔ کوئی اور کاروبار شروع کر لیتا تھا۔

شیو بنا کر اور کافی کا پانی ابلنے کے لیے رکھ کر وہ ایک بار پھر ٹیرس پر آ گیا۔ اب صبح کا اجالا کچھ واضح ہو چکا تھا اور دور تک کی چیزیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ساحلی پرندوں کی آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔ اچانک اس کی نظر ریت کے ایک ٹیلے کے قریب اوندھے پڑے ایک نہایت دبلے سے شخص پر پڑی۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی جو غالباً خالی ہو چکی تھی۔

اس سے کچھ فاصلے پر ایک اور شخص آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر نیکر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پورے جسم پر نیلے پیلے پینٹ سے دھاریاں اور پھول بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ان کا تیسرا ساتھی ایک دیوقامت نیگرو تھا جو بے سدھ، چت پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر قدرے معقول لباس تھا مگر پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ وہ تینوں یقیناً کسی قسم کا جشن مناتے ہوئے وہیں گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے تھے۔ ایک موج انہیں بھگو کر جا چکی تھی، پھر بھی وہ ہوش میں نہیں آئے تھے۔ کارٹر شاید پہلے روشنی کم ہونے کی وجہ سے انہیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

کارٹر کی نظریں بھٹکتی ہوئی کچھ دور تک گئیں اور پھر اسے وہ لڑکی نظر آئی۔

وہ زمرد جیسے سبز رنگ کا ایک گاؤن پہنے ہوئے تھی اور اس وقت سمندر میں تقریباً گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچ چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبز اسکارف تھا جس کا ایک سرا پیچھے پانی میں ڈوبتا ابھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ لڑکی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے پانی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ صبح کے مدھم اجالے میں اس کے سیاہ بال لہرا رہے تھے۔ کوئی لہر اس کے پیروں تلے سے ریت نکال دیتی تو وہ ایک لمحے کے لیے لڑکھڑا جاتی مگر پھر سنبھل کر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگتی۔

کارٹر چند لمحے دم بہ خود سا کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا اور آخر اسے یقین ہو گیا کہ لڑکی پانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں بلکہ خودکشی کے ارادے سے سمندر میں آگے بڑھ رہی تھی۔ کارٹر جلدی سے، عرشے سے اتر کر چوبی پل پر پہنچا اور وہاں سے پانی میں چھلانگ لگا کر لڑکی کی طرف لپکا۔ اسے اندیشہ تھا کہ لڑکی تک پہنچنے میں اسے تاخیر نہ ہو جائے۔ پانی اس کی کمر سے اوپر ہو چکا تھا اور کوئی بھی سرکش موج، لڑکی کو اپنے دوش پر بیکراں سمندر میں لے جا سکتی تھی۔ پھر شاید اس کا نام و نشان ملنا بھی مشکل ہو جاتا۔

کارٹر چیخ چیخ کر لڑکی کو رکنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن وہ گویا گرد و پیش سے بالکل بے خبر تھی، کوئی آواز نہیں سن رہی تھی۔ تاہم کارٹر بروقت اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے لڑکی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ لڑکی نے پلٹ کر دیکھا اور مزاحمت کرنے لگی۔ اسی دوران ایک موج ان دونوں کے سروں پر سے گزر گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ دونوں ہی پانی میں ڈوبے رہے لیکن کارٹر نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔

موج لوٹ گئی تو وہ لڑکی کو تقریباً کھینچتا ہوا ساحل پر لے آیا۔ وہ دونوں ہی ہانپ رہے تھے۔ خشک ریت پر پہنچ کر کارٹر نے پہلی بار صحیح طور پر لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر کا درست اندازہ کرنا مشکل تھا، تاہم وہ نوجوان ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ سمندر کے پانی نے اس کے اجلے چہرے کو دھو کر گویا کچھ اور

www.aiitayjeem.com

اجلا کر دیا تھا۔ پانی کے شفاف قطرے اس کے لب و رخسار پر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں زمانے بھر کی افسردگی تھی لیکن اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ گھر سے وہ خوشی کی کسی تقریب میں شرکت کے لیے نکلی تھی۔

وہ ہیروں کا نیکلس، بُندے اور انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھی۔ کلائیوں میں ہیروں کے کنگن بھی تھے۔ یہ تمام زیورات بتا رہے تھے کہ اس کا تعلق کسی انتہائی دولت مند گھرانے سے تھا۔ اس کا گیلا اسکارف ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ کارٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صبح سویرے اس دور افتادہ ساحل پر کیا کرنے آئی تھی، کہاں سے آئی تھی؟ کیا وہ واقعی خودکشی ہی کرنے آئی تھی؟

''کاش تم نے مجھے گہرے پانی میں جانے دیا ہوتا!'' وہ انگریزی میں بولی۔ لہجہ برطانوی تھا۔ اس کی آواز میں اَن گنت سسکیاں پنہاں تھیں۔ کارٹر اس کی کلائی تھامے خاموش کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ حد سے زیادہ گوری تھی۔ اس کی گردن تو تقریباً شفاف ہی نظر آ رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا آنسو پیتے ہوئے بولی۔ ''تم انگریزی سمجھتے ہو؟ میں فرانسیسی نہیں بول سکتی۔''

''میں انگریزی سمجھ بھی سکتا ہوں، بول بھی سکتا ہوں۔ میں امریکی ہوں۔'' کارٹر نے بتایا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ''اگر تم صرف چند گز اور آگے چلی گئی ہوتیں تو شاید کوئی بھی تمہیں نہ بچا سکتا۔''

''میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے بچائے۔'' اس کے لہجے میں تاسف تھا۔ اس کے گاؤن کی طرح اس کی آنکھیں بھی زمرد کے سے رنگ کی تھیں اور اس کے حسن کا نمایاں ترین حصہ تھیں۔

''وہ یقیناً ایک ناکام محبت تھی۔'' کارٹر دل ہی دل میں گویا فیصلے پر پہنچ گیا، عام طور پر لڑکیاں محبت میں ناکام ہو کر ہی خودکشی کے لیے نکلتی تھیں۔

''تم یہاں کیوں موجود ہو؟'' اچانک لڑکی نے پوچھا۔

''میں یہاں ایک ریسٹورنٹ اور بار چلاتا ہوں۔'' کارٹر نے ناکارہ بحری جہاز کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرے پاس فرانس کی شہریت ہے۔ میں اسی جہاز میں رہتا بھی ہوں۔''

''کاش تم نے مجھے مر جانے دیا ہوتا۔'' وہ ایک بار پھر گویا سسکی لے کر بولی۔ وہ گویا اب بھی اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ پھر اس نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں تین آدمی اوندھے سیدھے، بے سدھ پڑے تھے۔ ان میں سے ایک ڈھانچا نما تھا۔ ایک رنگ برنگا اور ایک سیاہ فام دیو قامت تھا۔

''شہر میں رات نئے سال کا جشن منایا جا رہا تھا۔ شاید یہ وہیں سے آئے ہیں۔ لگتا ہے، انہوں نے شراب کے علاوہ دوسری منشیات بھی استعمال کر رکھی ہیں۔ اچھی خاصی ٹھنڈ ہے مگر یہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے ہیں۔'' کارٹر نے ان تینوں کے بارے میں تبصرہ کیا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' لڑکی نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔ کارٹر کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ وہ لڑکی کے اس جواب پر حیران بھی نہ ہو سکا۔ اس نے سوچا ہی نہیں کہ لڑکی کو ان تین آدمیوں کے بارے میں کچھ معلوم تھا تو کیسے؟

وہ اس کے مرمریں پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنے جوتے کہاں چھوڑ آئیں؟''

لڑکی نے جھک کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ اسے شاید احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ننگے پاؤں ہے۔ وہ ایک بار پھر سسکی لینے کے انداز میں بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم، میرے

انمول موتی

☆ دوست کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی حد سے زیادہ عزت کرو۔ اگر عزت کے بدلے عزت دیتا ہے تو انمول ہیرا ہے۔ اگر آپ کو کمزور اور خود کو اعلیٰ سمجھے تو سمجھ لو کہ وہ دوستی کے لائق نہیں۔

☆ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف محبت بانٹتے ہیں جب کہ انہیں محبت دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔

☆ دوست وہ ہے جو ڈھال کے مانند ہو۔ سلامتی میں پیچھے رہے اور مصیبت میں آگے۔

☆ اپنے دوست کے دشمن کو دوست نہ بناؤ، اس طرح تم اپنے دوست کے دشمن بن جاؤ گے۔

☆ اگر دنیا میں محبت نہ ہوتی تو لغت سے قربانی کا لفظ اڑ جاتا۔

☆ زبان میں ہڈی نہیں ہوتی لیکن یہ تمہاری کھوپڑی تڑوا سکتی ہے۔

☆ بعض لوگ حسین نہیں ہوتے لیکن میٹھی زبان کی وجہ سے یہ دل موہ لیتے ہیں۔

☆ جس شخص کی زبان اس پر حکمران ہو تو وہی اس کی ہلاکت اور موت کا فیصلہ کرتی ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

www.alifdayjeem.com

جوتے کہاں رہ گئے۔ میں یاد کرنا بھی نہیں چاہتی۔'' پھر اس کے لہجے میں ممنونیت کے بجائے شکوہ سا در آیا۔ ''تم نے مجھے کیوں بچالیا؟''

''کسی کو مرتے دیکھ کر کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھر کے تو نہیں بیٹھ سکتا۔ آؤ..... تم میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے لڑکی کا ہاتھ تھاما اور اسے بحری جہاز کی طرف لے چلا۔

ریسٹورنٹ کے ٹیرس پر پہنچ کر کارٹر نے اسے ایک میز پر بٹھایا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ اس کے لیے گرما گرم کافی کا مگ اور برانڈی کی بوتل لیے واپس آیا اور اس کے مدمقابل بیٹھ گیا۔ لڑکی اب گہری نظر سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

کارٹر کو نہیں معلوم تھا کہ لڑکی کی پریشانی کیا تھی، پھر بھی اس نے تسلی دی۔ ''تم پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے اپنی دانست میں لڑکی کا حوصلہ بڑھایا تھا مگر اس نے رونا شروع کر دیا۔ کارٹر نے مشفقانہ سے انداز میں اس کا سر میں کندھا تھپتھپایا۔ ''یہ لمحے گزر جائیں گے، تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔'' وہ بولا۔

''یہ سب کچھ میری برداشت سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ آخر اس طرح کب تک زندگی گزرے گی؟'' لڑکی خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

کارٹر نے اپنی دانست میں اس کی توجہ اس کے دل کے نامعلوم زخموں کی طرف سے ہٹانے کے لیے کہا۔ ''تم ٹھنڈ تو محسوس نہیں کر رہیں؟ لباس بدلنا چاہو تو میں تمہیں مردانہ کپڑے دے سکتا ہوں؟''

''نہیں..... شکریہ۔'' وہ دھیمے اور افسردہ لہجے میں بولی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے چاروں طرف کا جائزہ لے کر پوچھا۔ ''تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟''

''ہاں۔'' کارٹر نے جواب دیا۔

''میں کچھ دیر تمہارے ہاں ٹھہر سکتی ہوں؟ صرف تھوڑی سی دیر.....؟'' اس کے لہجے میں التجا پنہاں تھی۔

''تم جتنی دیر ٹھہرنا چاہو، ٹھہر سکتی ہو۔'' کارٹر نے جواب دیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں، مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو چلی ہے.....'' وہ ایک بار پھر سسکیاں لینے لگی۔

یہی وہ لمحہ تھا جب کارٹر کی زندگی بھر کی عادت عود کر آئی۔ دھوکا کھانے کی عادت۔ اس کی زندگی تجربات و حوادث سے بھری پڑی تھی اور اس نے زندگی میں جتنے دھوکے کھائے تھے ان کا بھی کوئی شمار نہیں تھا۔ اب اسے کوئی شوق نہیں رہا تھا کہ وہ کسی ادھوری اور بے انجام کہانی کا کوئی کردار بنے، مگر دل بے ایمان تھا، احمق تھا، سبق نہیں سیکھتا تھا۔

زندگی میں دو تین عورتوں سے اس نے شدید عشق کیا تھا مگر جب زخم بھر جاتے اور سارے منظر دھندلا جاتے تھے، آنکھیں سارے خواب بھول جاتی تھیں تو پھر کوئی نہ کوئی از سرِ نو سب کچھ یاد دلانے چلا آتا تھا۔ وہ جب اتنے بہت سارے پرندوں کو اس ساحل پر آ کر مرتے دیکھتا تھا تو سوچتا تھا، ان میں سے حسین ترین پرندے کو کسی طرح اپنے لیے بچا لے۔ تنہائیوں میں اس سے باتیں کرنے کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لے۔ اب گویا وہ حسین پرندہ اس کے سامنے تھا جس کے سینے میں ایک مجروح دل دھڑک رہا تھا۔

ایک بار پھر کارٹر کو اپنے آپ پر ترس آ گیا۔ وہ کچھ شاطر بھی تھا اور کسی حد تک خواب پرست بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ شاید وہ تھوڑا سا احمق بھی تھا۔ تنہائی کے سمندر میں ایک بار پھر تنکے کے سہارے تیرنے کی آرزو کو اپنے دل میں سر اٹھانے کا موقع دے رہا تھا۔

کارٹر نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ اب اس کا ہاتھ پہلے کی طرح سرد نہیں تھا۔ اب اس میں جذبوں کی کچھ حرارت تھی۔ کارٹر اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی، اس کے جسم پر اتنے زیورات کیوں موجود تھے اور وہ مرنا کیوں چاہتی تھی؟ مگر کارٹر یہ بھی چاہ رہا تھا کہ اپنے سوالوں کا اپنے دل میں ہی گلا گھونٹ دے۔ بعض اوقات وضاحتیں تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ شاید کبھی کبھی سوالوں کو جوابوں کے بغیر چھوڑ دینا بھی اچھا ہوتا ہے۔

''اب مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' لڑکی جھرجھری لے کر بولی۔ ''بلکہ ایسا لگ رہا ہے کہ میں یخ بستہ ہو کر مر جاؤں گی۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' کارٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

لڑکی کافی کے کپ میں تھوڑی سی برانڈی ملا کر پی چکی تھی۔

کارٹر کا کشادہ کیبن بار کے عقب میں تھا۔ اس کی کھڑکی سے بھی سمندر، ساحل، ریت کے ٹیلے سب کچھ نظر آتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کیبن میں آئی تو کھڑکی سے باہر ساحل کی طرف دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔ ٹیلے کے دامن میں ڈھانچا نما انسان اب حرکت میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چوپائے کی طرح کھڑا تھا اور شراب کی بوتل سے ایک گھونٹ بھر رہا تھا۔ دیو قامت نیگرو ابھی تک سو رہا تھا اور رنگ برنگی دھاریوں والا آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی زنانہ جوتیوں کی ایک جوڑی کو اِدھر اُدھر گھما کر دیکھ رہا تھا پھر

www.alfaayjeem.com

اس نے ڈھاٹا باندھا شخص سے کچھ کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔

کارٹر کے برابر کھڑی لڑکی نے سسکی لی۔ ''تم نے مجھے مر جانے دیا ہوتا تو بہتر تھا۔ کتنی شرم کی بات ہے..... !'' اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

پھر وہ کارٹر کے کچھ پوچھے بغیر ہی بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم، سب کچھ کیسے ہو گیا۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اس سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھی۔ لوگ نئے سال کی آمد کا جشن منا رہے تھے۔ سڑکوں پر ہجوم تھا۔ ہوٹلوں کے کارک کھل رہے تھے۔ ہر طرف موسیقی کا شور تھا، موج مستی تھی۔ کسی نے توجہ ہی نہیں دی کہ ان تینوں نے زبردستی مجھے گاڑی میں ڈال لیا اور یہاں لے آئے۔ ان تینوں کے سوا کسی کو نہیں معلوم کہ میری ساری رات کس اذیت میں گزری..... بلکہ شاید ان تینوں کو بھی نہیں معلوم..... ان پر تو ایک دیوانگی، ایک وحشت سی طاری تھی.....'' اس کی آواز گلے میں اٹک گئی اور وہ ہچکیاں لینے لگی۔

کارٹر غیر محسوس طور پر گہری سانس لے کر رہ گیا۔ آخر کار جواب سامنے آ گیا تھا۔ اسے اکثر یہ تجربہ ہوا تھا کہ انتظار کیا جائے تو کبھی نہ کبھی اکثر سوالوں کے جواب خود ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ بعض سوالوں کے جواب تو بہت جلد مل جاتے تھے۔

وہ لڑکی کے لیے گاؤن وغیرہ تلاش کرنے دوسرے کیبن میں آ گیا۔ اس کیبن کی کھڑکی سے بھی باہر کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس کھڑکی پر رک گیا۔ وہ تینوں آدمی اب بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ کارٹر کی میز کی دراز میں ہر وقت لوڈڈ ریوالور رکھا رہتا تھا۔ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ ریوالور لے کر باہر جائے اور ان تینوں کو گولی مار دے۔ اس نے بہ مشکل خود کو باز رکھا۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ آخر کار ایک نہ ایک روز وہ تینوں مر ہی جائیں گے اور شاید اس سے زیادہ تکلیف اٹھا کر مریں گے جتنی ریوالور کی گولی سے ہوتی ہے۔

وہ سوچنے لگا، لڑکی نے ان کے چنگل میں مزاحمت کی ہو گی، وہ چیخی چلائی ہو گی لیکن کارٹر کو اس بات پر حیرت نہیں تھی کہ وہ ایسی کوئی آواز سن نہیں سکا تھا۔ رات کو سمندر کا اپنا ایک شور برپا رہتا تھا جس سے بہت سی آوازیں دب جاتی تھیں لیکن یہ شور کارٹر کی سماعت کا حصہ بن چکا تھا۔ اسے گویا وہ سنائی ہی نہیں دیتا تھا۔ کبھی کبھی رات کو سمندری پرندے بھی چیختے تھے اور ان کی کرخت آوازیں بھی انسانی چیخوں سے ملتی جلتی لگتی تھیں۔

پھر کارٹر کو یہ سوچ کر ایک لمحے کے لیے حیرت ہوئی کہ ان تینوں نے لڑکی کے اتنے قیمتی زیورات نہیں اتارے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا، وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کسی وقت کی ہوس کچھ اور ہوتی ہے، کسی وقت کی کچھ اور..... مگر پھر بھی، جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا تھا۔ لڑکی کی عمر بیس سے بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ نہ جانے وہ شادی شدہ تھی یا غیر شادی شدہ؟ معلوم نہیں اس کا شوہر کہیں اس کا منتظر تھا یا اس کے والدین؟ وہ تینوں آدمی ابھی تک ساحل سے جاتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

کارٹر گاؤن لیے واپس آیا تو لڑکی اپنے گیلے گاؤن سے الجھ رہی تھی۔ گاؤن تبدیل کرنے کے بعد وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ ''کاش میں اپنے ہوٹل سے نکلی ہی نہ ہوتی۔ کاش میں نے اپنے آپ کو ہوٹل کے کمرے میں بند ہی رکھا ہوتا۔'' اس کے لہجے میں پچھتاوے تھے۔

''کیا تم چاہتی ہو کہ میں کسی کو تمہارے بارے میں آگاہ کروں یا پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دوں؟'' کارٹر نے پوچھا۔

''نہیں..... تم کچھ بھی مت کرو۔ میں پولیس کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ بہت بدنامی ہو گی۔ شاید مجھے کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے۔''

''وہ بھی ہو جائے گا۔ تم پریشان مت ہو اور کچھ دیر کے لیے کمبل اوڑھ کر لیٹ جاؤ۔ تم کانپ رہی ہو۔''

''شاید یہ کپکپاہٹ سردی کی وجہ سے نہیں ہے.....'' وہ گردن تک کمبل کھینچ کر بیڈ پر لیٹ گئی پھر بچوں کی طرح خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ناراض یا پریشان تو نہیں ہو نا؟ تمہیں مجھ پر غصہ تو نہیں آ رہا ہے؟''

وہ مسکرا دیا اور اس کے پاس بیٹھ کر اس کا سر سہلانے لگا۔ ''اس میں ناراض ہونے یا غصہ کرنے کی کیا بات ہے؟ تم اس واقعے کے بارے میں مت سوچو۔''

اس نے یوں کارٹر کا ہاتھ اپنے رخسار پر رکھ لیا جیسے ڈوبتا انسان تنکے کا سہارا تلاش کر رہا ہو۔ ''میں سوچتی ہوں، مجھے مر جانا چاہیے۔'' وہ مضبوطی سے اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر دبائے یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عجیب، رحم طلب سے انداز میں۔

کارٹر نے اپنی زندگی میں کبھی اتنا معصوم، اتنا پاکیزہ، اتنا صاف ستھرا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا.....!

کارٹر نے بارہا دیکھا تھا کہ ساحل پر پکنک منانے

www.aiinayeen.com

کے لیے آنے والوں کے ساتھ جو بچے ہوتے تھے، ان میں سے بعض بہت بے رحم ہوتے تھے۔ وہ ساحل پر مُردہ پڑے پرندوں کے درمیان پھرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ کسی پرندے میں تھوڑی بہت جان تو نہیں ہے۔ کوئی پرندہ انہیں ذرا بھی ہلتا جلتا نظر آتا تھا تو اس پر زور سے پاؤں مار کر اسے ٹھنڈا کر دیتے تھے۔ اس کی بچی کھچی سانسیں بھی اس سے چھین لیتے تھے۔ کارٹر کو جب بھی موقع ملا اس نے ایسے کئی لڑکوں کی پٹائی کی تھی..... لیکن اس وقت اسے اپنا آپ بھی ان لڑکوں جیسا محسوس ہوا۔ وہ بھی شاید ایک پھڑپھڑاتی فاختہ کی آخری سانسیں چھین رہا تھا..... مگر نہیں..... فاختہ اذیت میں تو نہیں تھی۔

''شکر ہے، تم مجھ سے نفرت محسوس نہیں کر رہے.....'' اس نے جذبات سے تھرتھراتی سرگوشی میں کہا۔ ''تم مجھے وہ بھیانک واقعہ بھول جانے میں مدد دے رہے ہو۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ اگر تم نے اجازت دی تو ہمیشہ کے لیے یہیں، تمہارے پاس رہ جاؤں گی۔''

کارٹر کو یوں لگا جیسے اسی منزل کی تلاش میں اس نے اب تک اتنی تنہائیاں کاٹی تھیں۔ اچانک اس نے ٹیرس پر کچھ آوازیں سنیں۔ شاید کوئی ٹیرس پر چلا آ رہا تھا۔ کارٹر کو وہی تینوں مدہوش یاد آئے جنہیں وہ ریت کے ٹیلے کے پاس دیکھ چکا تھا۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا اور اپنا ریوالور نکالنے کے لیے لپکا۔

باہر کسی نے مضطربانہ انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ ''خدا کی پناہ! اب بہت ہو چکی۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ آئندہ میں کبھی اس عورت کے ساتھ سیاحت کے لیے نہیں نکلوں گا۔''

کارٹر نے ٹیرس کا دروازہ کھولا۔ ٹیرس پر تقریباً ساٹھ سال کی عمر کا ایک شخص ایک میز کے قریب چھڑی کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ ڈنر سوٹ میں تھا اور اس سبز اسکارف کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جو لڑکی میز پر چھوڑ گئی تھی۔ اس کے استخوانی ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک مجہول سا آدمی تھا لیکن بعض لوگوں کی شخصیت خواہ کیسی بھی ہو، ان کے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ وہ دولت مند ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں افسردگی، خود استہزائی اور شاید جگ ہنسائی کی شرمساری بھی تھی۔

اس کے قریب ہی ایک وجیہہ نوجوان روٹھے روٹھے سے انداز میں سر جھکائے جنگلے کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ ان سے ذرا پیچھے لکڑی کی سیڑھیوں پر ایک باوردی ڈرائیور کھڑا تھا۔ اس کے بازو پر فر کا ایک نسوانی کوٹ لٹکا ہوا تھا جو نہایت قیمتی معلوم ہوتا تھا۔

عمر رسیدہ شخص نے کارٹر کو ادھ کھلے دروازے میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔ کارٹر نے ریوالور اندر ہی کرسی پر رکھ دیا اور دروازہ پورا کھول کر ٹیرس پر چلا گیا۔

''ایک بوتل اسکاچ پلیز.....'' ڈنر سوٹ والے، بڑی عمر کے آدمی نے ایک میز پر بیٹھتے ہوئے آرڈر دیا۔

''بار ابھی کھلا نہیں ہے۔'' کارٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تو پھر کافی ہی پلا دو، ہمیں اس وقت تک انتظار تو کرنا ہی ہوگا جب تک میڈم بیڈ روم سے باہر تشریف لائیں۔'' چھڑی کو گھماتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے کارٹر کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ''تم امریکی معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے میری بیوی کو امریکا کی یاد ستائی تھی جو اس نے تمہیں شرفِ قبولیت بخشا۔ ہم دو سال امریکا میں بھی رہے ہیں لیکن جس خوشی اور آسودگی کی میری بیوی کو تلاش تھی، وہ اسے امریکا میں بھی نہیں مل سکی۔ خوامخواہ کی مزید کچھ رسوائیاں لے کر ہمیں برطانیہ واپس آنا پڑا۔ اٹلی کے مرد بھی بڑے رومان پرست مشہور ہیں۔ یہ تم سامنے جس نوجوان کو کھڑا دیکھ رہے ہو، یہ بھی اطالوی ہی ہے۔ یہ میرا سیکریٹری ہے۔ میڈم کی نظرِ عنایت سے یہ بھی محروم نہیں رہا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ کنارے بھی سیلاب کو سنبھال نہیں سکے۔ مجھے تو لگتا ہے اطالویوں کی رومان پرستی کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے، وہ محض قصے اور افسانے ہی ہیں۔''

نوجوان کے چہرے کی سرخی بڑھ گئی، سر کچھ اور جھک گیا۔ اس کے چہرے پر قدرے خجالت کے آثار تھے۔ انگریز بوڑھے نے مڑ کر ساحل کی طرف دیکھا جہاں ٹیلے کے قریب ڈھانچا نما شخص بازو پھیلائے ریت پر چت لیٹا تھا۔ رنگ برنگی دھاریوں اور پھول بوٹوں والا شخص اب بوتل منہ سے لگائے بیٹھا تھا۔ نیگرو بھی نیند سے بیدار ہو چکا تھا اور اس وقت گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑا تھا۔

ڈنر سوٹ والا انگریز ان تینوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''مجھے امید نہیں ہے کہ ان تینوں کی رفاقت بھی میڈم کو وہ خوشی دے سکی ہوگی جس کی انہیں تلاش ہے۔ بعض مسائل کو حل کرنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ بعض گڑھوں کو کوئی بھی نہیں بھر سکتا۔ مجھے امید ہے کہ انہوں نے میڈم کی جیولری نہیں چھینی ہوگی۔ کئی ملین پاؤنڈز کے زیورات ہیں۔ اب تو انشورنس کمپنی والے بھی نقصان کی تلافی نہیں کریں

www.urdujeem.com

گے۔ وہ یہی کہیں گے کہ آخر وہ کب تک میری اہلیہ کی بے پروائی کے جرمانے بھرتے رہیں گے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ جس قسم کے لوگوں کے ساتھ وہ منہ اٹھا کر چل دیتی ہے، ان میں سے کوئی کسی روز اس کی نازک گردن نہ مروڑ دے۔''

کارٹر نے اپنے عقب میں ٹیرس کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی لیکن مڑ کر نہیں دیکھا۔ انگریز اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف دیکھ کر گردن کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے بولا۔ ''اوہ ڈیئر.....! تم آگئیں..... میں تو تمہارے بارے میں تشویش میں ہی مبتلا ہو چلا تھا۔ ہم تو یہاں سے کچھ ہی دور، چار گھنٹے سے کار میں بیٹھے سردی سے سکڑ رہے تھے۔ کار کے ہیٹر نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ تمہارے مشغلۂ شب میں دخل دینے کی جرأت کریں یا نہیں؟ دل کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ تمہیں کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے یا کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ اتنی سنسان جگہ ہے یہ.....!''

''بکواس بند کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے..... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ کیوں آئے ہو تم؟'' وہ چیخی۔ یہ آواز اس آواز سے بہت مختلف تھی جو کارٹر کافی دیر تک سنتا رہا تھا۔

''مائی ڈیئر! تمہارا غصہ بجا ہے لیکن.....'' انگریز کے لہجے میں دنیا جہاں کی مٹھاس اور ملائمت تھی۔

لڑکی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے تم سے نفرت ہے۔ گھن آتی ہے مجھے تم سے۔ تم کیوں میرا پیچھا کرتے ہو؟ تم نے وعدہ کیا تھا.....''

''میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ آئندہ ہوٹل سے نکلا کرو تو زیورات کمرے میں ہی چھوڑ دیا کرو۔ اس طرح کم از کم جان کا خطرہ نہیں ہوتا۔''

''تم ہمیشہ میری تذلیل کرنے کی کوشش کیوں کرتے رہتے ہو؟''

''تذلیل میری ہوتی ہے، مائی ڈیئر! کم از کم دنیا کے عام اخلاقی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو تذلیل کا پہلو میرے لیے نکلتا ہے لیکن خیر..... ہم لوگ ان روایتی پیمانوں سے بالاتر ہیں۔ ہم اونچے لوگ ہیں۔ ہر اعتبار سے خوش و خرم نظر آنے والا جوڑا ہیں۔ ہمارے اپنے وطن میں، اپنی سوسائٹی میں ہمارا ایک مقام ہے..... لیکن اس بار تم کچھ زیادہ ہی آگے نہیں چلی گئیں ڈیئر؟ مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔ کچھ لوگ محبت میں بہت اونچے اور سخت ہو جاتے ہیں، جھکنا بھول جاتے ہیں لیکن مجھے محبت اتھاہ پستیوں میں لے گئی ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا ڈیئر..... مجھے تم سے محبت ہے؟ جس کا ثبوت میں بارہا دے چکا ہوں۔ میں نے تو کبھی تم پر کوئی اعتراض کیا ہی نہیں۔ یہ جو میں تھوڑی بہت تشویش کا اظہار کر رہا ہوں، تمہاری ہی بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔ اس قسم کے واقعات میں تمہاری جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے..... اور کچھ نہیں تو اس قسم کے لوگ نشے اور ہیجان کی زیادتی میں ہی اندھے ہو کر تمہیں قتل کر سکتے ہیں..... اور ہم تمہیں کھونا نہیں چاہتے۔ کیوں ماریو..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟''

انگریز نے مڑ کر اطالوی نوجوان کی طرف دیکھا۔ نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔

بوڑھا دوبارہ اپنی بیوی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''میں تو تم سے صرف تھوڑی سی محتاط اور تھوڑی سی باعزت ہونے کی گزارش کرتا ہوں۔''

''تم اس وقت نشے میں بول رہے ہو۔'' وہ چیخی۔

''مایوس اور دل شکستہ آدمی ہی نشے کی آغوش میں پناہ لیتا ہے..... اور پھر ہمیں انتظار کی گھڑیاں بھی گزارنی تھیں۔ طرح طرح کے خیالات، بہت سے وسوسے دل میں آ رہے تھے۔'' انگریز کا لہجہ بدستور نرمی لیے ہوئے تھا۔

لڑکی سسکیاں لینے اور آنکھیں ملنے لگی۔ کارٹر کو یہ سسکیاں مصنوعی سی محسوس ہوئیں۔ وہ اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ اس کے حواس شل تھے۔ درحقیقت وہ کچھ دیکھنا اور سننا نہیں چاہتا تھا مگر آوازیں تھیں کہ تیروں کی طرح پردۂ سماعت میں پیوست ہوئے جا رہی تھیں۔

اچانک لڑکی کارٹر کی طرف دیکھ کر چیخی۔ ''کیا ضرورت تھی تمہیں مجھے مرنے سے بچانے کی؟ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتے۔ تم صرف ایک منٹ رک جاتے تو کوئی لہر مجھے بہا کر لے جا چکی ہوتی۔ قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ یہ سب کچھ میرے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہے۔''

بوڑھے انگریز نے کارٹر کی طرف مڑ کر گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔ ''میری بیوی کی بات کا بُرا نہ منانا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب تمہارے شکر گزار ہیں۔''

پھر وہ اپنی بیوی کی طرف مڑا۔ ''آؤ ڈیئر! واپس چلیں۔ فی الحال ہم اس بحث میں نہیں پڑ سکتے کہ یہ جنون دراصل ذہنی ہے یا جسمانی؟ ویسے کہا تو یہی جاتا ہے کہ جسم، ذہن ہی کے تابع ہوتا ہے۔ خواہشیں ذہن میں جنم لیتی ہیں۔ جسم ان کے لیے لپکتا ہے اور بعض خواہشوں سے کبھی تھکتا نہیں۔ بعض چیزوں سے انسان کا دل کبھی بھرتا نہیں۔ دولت ہی کو دیکھ لو۔ دولت سے کبھی انسان کا دل نہیں بھرتا۔ بہرحال، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت میں اندر

www.allmayeem.com

سے دکھی نہیں ہوں اور مجھے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔ تمہارے علاج کے لیے ہم جرمنی چلیں گے۔ وہاں پروفیسر بومین سے ملیں گے۔ سنا ہے وہ ان معاملات کا بہت بڑا معالج ہے۔ اس کی آج کل بڑی شہرت ہے۔ بڑے عجیب عجیب کیس ٹھیک کیے ہیں اس نے..... ہے نا ماریو؟'' اس نے اپنے اطالوی سیکریٹری کی طرف دیکھا، جس نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

انگریز سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ ''پروفیسر بومین واقعی بڑا قابل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں فرائڈ کا پیروکار ہے۔ بہت سی کتابیں لکھی ہیں اس نے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابھی تو کائنات کے ایک فیصد راز بھی آشکار نہیں ہوئے ہیں۔ اس نے اونچے طبقے کی ایک عجیب عورت کا علاج کیا جو صرف ایسے مرد سے دوستی کر کے زندگی کی خوشیاں پاتی تھی جن کا وزن پورے ایک سو پونڈ ہوتا تھا۔ ایک پونڈ زیادہ نہ ایک پونڈ کم۔ ڈاکٹر بومین نے ایک ایسی حسین عورت کا علاج بھی کیا تھا جس کا کیس بہت ہی عجیب تھا۔ خلوت کے لمحوں میں جب تک دروازے پر دستک نہ ہوتی، وہ بے چاری نہ ادھر کی رہتی تھی نہ ادھر کی۔ انسانی ذہن بھی کیسا گورکھ دھندا ہے۔ ڈاکٹر بومین کے پاس ایک اور عورت کا کیس آیا تھا جس کا شوہر ایک بینک کا مالک تھا۔ اس کے لیے قربتوں کا ہر معاملہ اس وقت تک بے معنی رہتا تھا جب تک وہ خطرے کے الارم کی آواز نہ سن لیتی.....''

اطالوی سیکریٹری نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنے باس کو مخاطب کیا۔ ''راجر! بس کرو..... اب بہت ہو چکی.....!''

مگر راجر نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''پروفیسر کے پاس ایک اور بھی عجیب و غریب کیس آیا تھا۔ ایک حسین عورت میں اس وقت تک زندگی کے آثار پیدا نہیں ہوتے تھے جب تک اس کا رفیقِ شب عین مناسب وقت پر اس کی کنپٹی پر پستول نہ رکھ دیتا۔ پروفیسر نے ان سب عورتوں کا علاج کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں یہ سارے کیسز لکھے ہیں۔ وہ یقیناً تمہارا علاج بھی کر دے گا ڈیئر!''

لڑکی اس پر نظر ڈالے بغیر اس کے قریب سے گزرتی ہوئی، لکڑی کی سیڑھیوں کی طرف چل دی۔ باوردی ڈرائیور نے نہایت مؤدبانہ انداز میں فر کا کوٹ اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔

انگریز نے گویا اپنی دھن میں بات جاری رکھی۔ وہ اپنی بیوی سے مخاطب تھا جو کئی قدم دور جا چکی تھی۔ ''کسی زمانے میں ایک ملکہ گزری ہے۔ اس کا نام میز الینا تھا۔ اس کا کیس بھی تمہارے جیسا تھا۔ اس کے جذبات کی کشتی کبھی کنارے نہیں لگتی تھی۔ اگر پروفیسر بومین اس کے دور میں ہوتا تو شاید اس کا علاج بھی کر دیتا۔ مجھے تمہارا علاج کرانے کے لیے دنیا کے کسی بھی کونے میں جانا پڑا، میں ضرور جاؤں گا اور جتنی بھی دولت خرچ کرنا پڑی، میں کروں گا کیونکہ میری محبت کی کوئی انتہا نہیں..... ہم پروفیسر بومین کے پاس ضرور چلیں گے۔ اس کے پاس ایک اور عورت کا کیس آیا تھا جو میں تمہیں بتانا بھول گیا.....''

اب گویا اطالوی سیکریٹری اپنے آپ پر ضبط نہ کر سکا۔ اس نے اپنی حیثیت کو بالائے طاق رکھ دیا اور آگے بڑھ کر اپنے باس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ راجر کا ردعمل نہ تو مالکانہ تھا اور نہ ہی جارحانہ۔ اس نے اپنے سیکریٹری کو کھڑے پیروں نوکری سے نکالنے کا اعلان بھی نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، جیسے کسی آبگینے کو ٹھیس لگ گئی ہو۔

اس کی بیوی اس وقت تک ساحل پر پہنچ چکی تھی اور سر اونچا کیے، ننگے پاؤں ریت پر چلی جا رہی تھی۔ سبز اسکارف اس کے ہاتھ میں تھا جس کا ایک سرا اس کے عقب میں گھسٹتا آ رہا تھا۔

تھپڑ کھا کر جیسے راجر کو قرار سا آ گیا، اس نے میز پر لڑکی کا چھوڑا ہوا برانڈی کا گلاس اٹھا کر اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ نہایت متانت سے اس نے بٹوے سے ایک نوٹ نکال کر ادائیگی کے لیے پلیٹ میں رکھ دیا۔ نوٹ بڑی رقم کا تھا۔

لڑکی اس وقت تک ریت کے ٹیلے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ تینوں آدمی نہ جانے کب وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ لڑکی نے ٹیلے کے دوسری جانب اترنے سے پہلے مڑ کر ریسٹورنٹ کی طرف دیکھا۔ راجر، اس کا سیکریٹری اور ڈرائیور اس کے پیچھے روانہ ہو چکے تھے۔ کارٹر اندر آ گیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ کسی اور منزل کی طرف جانے کے لیے۔ یہاں کی ویرانی اور تنہائی نے بھی اسے ایک نیا زخم دیا تھا۔ پناہ نہیں دی تھی۔ اسے زندگی میں ہمیشہ کسی ایسے چہرے کی تلاش تھی جس کے پیچھے کوئی دوسرا چہرہ نہ ہو..... مگر وہ چہرہ اسے یہاں بھی نہیں مل سکا تھا۔ اس کی تلاش میں اس نے اب کسی اگلی منزل کی طرف روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

⌘⌘⌘

www.alifbay.com

نئی کہانی

تنویر ریاض

شاید یہ آج تک کوئی نہ جان سکا کہ پہلے حقیقی کہانی نے جنم لیا یا تخیلاتی کرداروں نے... اسے بھی نئی نئی کہانیوں کی تلاش رہتی تھی کیونکہ اس کا قلم اور تخیلاتی منظر کشی اسے چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتے تھے اور بالآخر اس کی بے چینی کسی نہ کسی موضوع کو تلاش کر ہی لیتی تھی مگر اس بار تو حقیقی کہانی نے اس کے خیالات کی دنیا کو درہم برہم کر دیا۔

پرانے واقعات کے درمیان چھپی ایک انوکھی اور دلچسپ کہانی کا آغاز

www.aimsdigest.com

ایلس میزر کو پالرمو جاتے ہوئے ہائی وے پر کوئی آوارہ کتا نظر نہیں آیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ خارش زدہ بھوکے کتے اپنے گڑھوں سے نکل کر کھانے کی تلاش میں اچانک ہی ہائی وے پر آ جاتے ہیں اور اگر ڈرائیور محتاط نہ ہو تو ان میں سے کچھ تیز رفتار گاڑیوں کے نیچے آ کر کچلے جاتے ہیں۔ ان کا انجام دیکھ کر دوسرے کتے بھی محتاط ہو گئے اور ہائی وے پر نظر نہ آنے کی وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے۔

ایلس کے گھر سے پالرمو کی مسافت پندرہ منٹ کی تھی۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ زیادہ تر گھر ٹریلرز میں تھے

لیکن ان کے پیچھے پہاڑی کے دامن میں بہت اچھے مکانات بنے ہوئے تھے۔ وہ بیرٹی وال ربون سے ملنے جا رہا تھا۔ اس نے اخبار میں ایک مضمون پڑھ کر اسے فون کیا تھا جو اس کی کتاب کے بارے میں تھا جس میں بارھویں اسٹریٹ پر ہونے والی شوٹنگ کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ وہ کوئی مشہور مصنف نہیں تھا لیکن اس کی جرائم سے متعلق تین کتابیں اور چند ایک کہانیاں شائع ہو چکی تھیں جن کا تعلق لیکسار کا نا اور اس کے گردونواح میں ہونے والے جرائم سے تھا۔ اس کی تازہ ترین کہانی کا کچھ زیادہ ہی چرچا ہوا۔ اس لیے مقامی اخبار نے اسے معمول سے زیادہ جگہ دی اور یہ ہر اس ..... فرد کی توجہ کا مرکز بن گئی جو اپنے کسی پیارے مقتول کی یاد کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

بیرٹی بھی انہی لوگوں میں سے تھی۔ اس نے اخبار میں مضمون پڑھ کر ایلس کو فون کیا اور روتے ہوئے اسے اپنی بہن کے بارے میں بتایا جو کوئی تیس سال پہلے قتل کر دی گئی تھی اور ان پولیس والوں کو بھی برا بھلا کہا جو قاتل کو تلاش نہیں کر سکے، جیسے وہ کسی چوہے کے بل میں گھس گیا ہو۔ ایلس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کوئی سراغ رساں نہیں ہے (یقیناً ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔ بارھویں اسٹریٹ بھی ایک ایسا ہی کیس تھا اور اس نے ایک طرح سے اسے حل کرنے میں مدد دی تھی) لیکن جب کسی پر مایوسی کا غلبہ ہو تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایلس اس سے بنفسِ نفیس بات کرنے پر رضامند ہو گیا۔ صرف اس وجہ سے کہ بیرٹی جو کہنے کی کوشش کر رہی ہے اس میں کتنی معقولیت ہے۔ وہ ایک بجے اس جگہ پہنچ گیا۔ بیرٹی نے فون پر اس کا محل وقوع بتا دیا تھا۔ وہ تین کمروں کا مکان پہاڑی پر بنا ہوا تھا اور اس کے اردگرد تمام زمین پر ٹریلر کھڑے ہوئے تھے جن میں اس کی فیملی کے لوگ رہتے تھے۔ ہائی وے سے قریب ترین ٹریلر کے ساتھ ایک سبز رنگ کی پک اپ اور سفید کار کھڑی ہوئی تھی۔ یہ ٹریلر بیرٹی کا تھا جس میں وہ اپنے شوہر ٹام اور تین بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ جب ایلس نے اپنی کار ڈرائیو وے میں روکی تو ایک شخص ٹرک کے پیچھے سے نکل کر آیا اور ایلس کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''تم ایلس ہو؟'' اس آدمی نے دایاں ہاتھ پتلون پر رگڑا تھا تاکہ اس پر لگی ہوئی گریس صاف ہو جائے۔

ایلس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ایلس میزر اور تم یقیناً ٹام ہو؟''

''ہاں بشرطیکہ تم پولیس والے یا کوئی سرکاری اہلکار نہ ہو۔'' اس نے اپنے ہی لطیفے پر قہقہہ لگایا اور ایلس کو ٹریلر کے سامنے والے دروازے پر لے گیا۔

''بیرٹی، تم سے بات کرنے کے لیے بے چین ہے۔'' وہ ایلس کی طرف مڑا۔ اس کا چہرہ اداس ہو رہا تھا۔ ''میں تمہارے یا اس کے درمیان حائل ہونا نہیں چاہتا لیکن تم اسے کوئی جھوٹی امید مت دلانا۔ وہ بہت دکھ جھیل چکی ہے۔ میں نے چند برس پہلے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور اب میں دوبارہ وہ غلطی نہیں کروں گا لیکن تم بھی اسے کوئی جھوٹی امید نہ دلانا۔ میں اس کے علاوہ تم سے کچھ نہیں کہہ رہا۔''

ایلس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل، میں نے تمہاری بیوی سے فون پر کہہ دیا تھا کہ شاید میں کوئی مدد نہ کر سکوں۔ جب پولیس قاتل کو تلاش نہ کر سکی تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگ مختلف انداز میں سوچتے ہیں لیکن اسی طرح ہوتا ہے۔''

ٹام کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی..... ممکن ہے کہ وہ تمہاری بات سن لے۔'' اس نے دروازہ کھولا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ''بیرٹی! تمہارا رائٹر دوست آ گیا۔''

دو لڑکے قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے ہوئے لیونگ روم میں داخل ہوئے۔ ان کی عمریں دس بارہ سال کے قریب ہوں گی۔ عقب سے ایک عورت کے چلانے کی آواز آئی۔ ''باہر جا کر کھیلو۔''

ٹام مسکرایا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اتنے زور سے نہیں چلا سکتا۔ تم بیئر پیو گے؟''

''تم کہہ رہے ہو تو ضرور پیوں گا۔''

ٹام ایک بار پھر مسکرایا اور کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بیرٹی آنے ہی والی ہے۔''

ایلس ایک کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ لیونگ روم کا فرنیچر پرانا لیکن صاف ستھرا تھا جبکہ اس گھر میں تین بچے بھی تھے۔ ٹی وی آتش دان کے اوپر کارنس پر رکھا تھا اور ساتھ موٹر سائیکلوں کے ماڈلز کی ایک قطار تھی۔ ایلس اپنی جگہ سے اٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ اسی وقت ٹام بھی دو بیئر کی بوتلیں لے کر آ گیا۔

''تم موٹر سائیکل چلاتے ہو؟''

ایلس نے ایک بوتل پکڑی اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، کبھی نہیں چلائی لیکن مجھے ماڈلز اچھے لگتے ہیں۔''

ایلس واپس اپنے کاؤچ پر آ گیا۔ ٹام بھی اس کے سامنے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایلس ایک ریک میں

www.aiitayeen.com

رکھی ہوئی رائفلوں اور شاٹ گن کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ اچھا شوق نہیں ہے۔ کیا تم نے اپنی ٹانگ کے علاوہ بھی کسی کو زخمی کیا ہے؟''

ٹام نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''کبھی نہیں۔'' اسی وقت بیرٹی بھی آ گئی۔

اس نے ایلس سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ ''تمہارا شکریہ کہ مجھ سے ملنے آئے۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ دراصل میں تیار ہو رہی تھی۔'' پھر اس نے ایک دیوار پر ہاتھ مارا۔ ''حیرت ہے مجھے تمہاری گاڑی کی آواز نہیں سنائی دی حالانکہ یہ دیواریں بہت پتلی ہیں۔''

''بہرحال کم از کم میں یہ تو کر سکتا ہوں۔'' وہ ٹام کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن ایک بات میں واضح کر دوں مسز وال ربون۔ میں کوئی سراغ رساں نہیں ہوں جیسا کہ میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا۔ میں زیادہ تر اس وقت لکھتا ہوں جب کیس ختم ہو جاتا ہے۔'' اس نے اپنا سر جھکا لیا اور بولا۔ ''البتہ چند مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کبھی کوئی کیس حل کیا ہے۔''

بیرٹی نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لیے اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں سمجھتی ہوں لیکن کسی بھی بات سے مدد مل سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ تم بونی کے بارے میں لکھو تو کسی کی توجہ اس پر چلی جائے۔ اگر لوگ بونی کے بارے میں بات کریں گے تو میں جانتی ہوں کہ کسی نہ کسی کو کوئی بات یاد آ جائے گی جس سے قاتل تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔''

ایلس نے تائید میں سر ہلایا اور اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں جانتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کتنی پریشان کن ہو سکتی ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں، یہ میرا وعدہ ہے۔'' وہ تھوڑا سا مسکرایا۔ ''تم مجھے شروع سے پوری بات بتاؤ۔''

بیرٹی نے رونا شروع کر دیا پھر اسے کچھ احساس ہوا۔ اس نے اپنے گال صاف کیے اور مسکرانے کی کوشش کی پھر وہ کہانی شروع کی جو وہ اس سے پہلے کئی بار سنا چکی تھی۔

''بونی اور میں ڈانس کرنے جایا کرتے تھے۔ اس کلب کا نام کونیز تھا۔ انہوں نے اس کا نام تبدیل کیا اور چار پانچ مرتبہ اسے دوبارہ کھولا لیکن تیس سال پہلے اس کا نام کونیز ہی تھا۔ اس وقت میں تیرہ اور بونی اکیس برس کی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ڈانس پر لے جاتی تھی۔ اس وقت ہم نے کبھی ڈرنک نہیں کی لیکن ہمیں ڈانس کرنا اچھا لگتا تھا۔''

اس کی آنکھوں میں بیتے دنوں کی یادیں جھلملانے لگیں۔ ''پھر ایک دن وہ میرے بغیر کلب چلی گئی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ ایسا کر چکی تھی لیکن اس رات وہ گھر واپس نہیں آئی اور اس کی لاش ملی۔ اس کا ریپ کیا گیا۔ اور سر میں گولی مار دی گئی۔ اس کی لاش کلب کے باہر جنگل میں ملی۔ پولیس اس واردات کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی اور نہ ہی کسی پر شک کیا گیا۔ اس طرح کچھ دنوں بعد یہ کیس بند ہو گیا۔''

''پولیس نے کسی سے پوچھ گچھ نہیں کی؟''

بیرٹی نے قہقہہ لگایا۔ ''صرف مجھ سے۔ وہ ان سب لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے جن سے ہم ملتے تھے۔''

''تم نے پولیس کو کیا بتایا؟''

''میں صرف تیرہ سال کی تھی اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہمارے اردگرد بہت سے لوگ تھے۔ ان میں کچھ دیکھنے میں اچھے نہیں لگتے تھے لیکن ہمیں کسی نے پریشان نہیں کیا۔ بونی کی کچھ لوگوں سے دوستی تھی۔ وہ ملنے آتے اور چلے جاتے۔ مجھے ایک لڑکی کا نام یاد ہے۔ سب اسے سویٹ لو کہتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پولیس نے اس سے کچھ پوچھا یا نہیں۔''

ایلس نے کچھ لکھنے کے لیے نوٹ پیڈ نکالا۔ ایک لڑکی جس کی عمر بیس بائیس سال ہو گی، لیونگ روم میں آئی۔ ایلس نے اسے دیکھ کر سر ہلایا اور وہ مسکرا دی۔

''یہ میری بیٹی جینی ہے۔'' بیرٹی نے کہا۔

وہ لڑکی کچن میں چلی گئی۔ ایلس نے نوٹ پیڈ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس سلسلے میں کچھ لوگوں سے ملنا پڑے گا تاکہ کچھ مواد مل سکے۔ میں تمہاری توقعات بڑھانا نہیں چاہتا لیکن اس بارے میں لکھنے کے لیے میرے پاس کافی مواد ہونا چاہیے۔ کیا تم مجھے کسی ایسے شخص کا نام بتا سکتی ہو جس سے میں بات کر سکوں؟''

بیرٹی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم کونیز کے مالک سے بات کر سکتے ہو۔ اس کا نام پائن کون ہے۔ وہ ابھی زندہ ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ اب بھی اس عمارت کا مالک ہے۔ کلب تو اب بند ہو چکا ہے لیکن وہ زمین اور عمارت اسی کی ملکیت ہے۔ جینی اس کا اصل نام معلوم کر لے گی۔''

اس نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔ ''جینی۔''

ایلس نے بیئر کا آخری گھونٹ لیا اور بوتل میز پر رکھتے ہوئے ٹام سے بولا۔ ''بیئر کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔''

www.allpayjeem.com

ٹام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔''

ایلس کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے بیرٹی کے کندھے کو چھوتے ہوئے بولا۔ ''تم اس آدمی کا نام مجھے دے دو تاکہ میں اپنا کام شروع کر سکوں۔ دیکھتا ہوں کہ مجھے کیا معلوم ہوتا ہے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔''

بیرٹی نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے لیے دروازہ پکڑے کھڑی رہی۔ جینی کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ اس نے گہرا آئی لائنر لگا رکھا تھا اور چست ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی لیکن جب اس نے وہ کاغذ ایلس کو دیا تو سر جھکاتے ہوئے بولی۔ ''میری ماں کو ان سوالات کے جوابات چاہئیں جس نے اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ ہر روز صبح کو اپنی بہن کی تصویر دیکھ کر روتی ہے۔''

ایلس نے وہ چھوٹا سا کاغذ لے لیا اور بیرٹی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ایک بازو جینی کی گردن میں ڈال کر اسے بھینچ لیا۔ ''مجھے دیکھنا ہوگا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ اس وقت میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں۔''

پائن کون اونچا سنتا تھا تاہم جینی نے انٹرنیٹ سے تلاش کر کے جو نمبر دیا تھا، وہ کارآمد ثابت ہوا اور اس بوڑھے نے تیسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا۔ ایلس نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور بہانہ یہ بنایا کہ وہ اس کی پراپرٹی خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ کون نے اس سے ایک گھنٹے بعد ملنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

ٹیکسارکانا میں زیادہ تر لوگوں کو معلوم تھا کہ کون کہاں ملے گا۔ ایلس بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ہائی وے 67 کا اختتام ایک خالی گیس اسٹیشن پر ہوا تھا جہاں سے ایک راستہ کون کے کلب کی طرف جاتا تھا۔ ایلس نے اپنی گاڑی ایک نیم پختہ جگہ پر روکی۔ پہلی نظر میں وہ عمارت کسی مال کا ڈھانچا معلوم ہوئی۔ اس کے سامنے والے دروازے پر ایک چھجے کے نیچے ایک سفید پک اپ کھڑی ہوئی تھی اور ایک سائن بورڈ پر ''نیون کاؤ گرل'' کے الفاظ لکھے ہوئے تھے جو بند ہونے سے پہلے اس کا آخری نام تھا۔

پائن کون ٹرک کے نیچے سے لنگڑاتا ہوا نکلا۔ وہ چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال پوری طرح سفید ہو چکے تھے اور اس نے موٹے شیشوں کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ اس کے موٹے موٹے بازوؤں پر بہت سے ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ اس نے زوردار آواز میں کہا۔

''تم مسٹر میز ہو؟''

ایلس نے کندھے اچکائے اور تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ ''میزر۔'' اسے یہ لفظ تین مرتبہ ادا کرنا پڑا۔

پائن کون نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اندر سے دیکھنا چاہو گے یا تمہیں صرف اسی جگہ سے دلچسپی ہے؟''

ایلس اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ دراصل میں بونی جیسپر کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔''

پائن کون نے اپنی ایک آنکھ بند کی اور اپنا وزن ایک سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے بولا۔ ''اوہ..... تمہیں مسز دال ربون نے بھیجا ہے؟''

ایلس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''بہت برا ہوا۔'' اس نے اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کا میرے کاروبار پر بہت برا اثر ہوا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اس واقعے کو بھول چکا ہوں۔'' اس نے اپنے جوتوں پر جمی ہوئی گرد صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بے چاری لڑکی..... کیا تم رپورٹر ہو؟''

ایلس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، میں اجرائی پر مبنی سچی کہانیاں اور کتابیں لکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مسز دال ربون کو امید تھی کہ اس کیس کو بھی تھوڑی سی توجہ ملے گی۔''

''میں اسے الزام نہیں دیتا حالانکہ میڈیا میں اس واقعے کو اچھی طرح کوریج ملی تھی۔''

وہ ایلس کے پاس سے گزرا اور جنگل کے کنارے درختوں کی قطار کی جانب بڑھنے لگا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ میں دکھاتا ہوں کہ اس کی لاش کہاں سے ملی تھی۔''

جنگل میں جابجا پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ پائن کون لنگڑاہٹ کے باوجود بہت تیز چل رہا تھا۔ ایلس کو اس کا ساتھ دینے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑی۔ یہاں تک کہ وہ ایک موڑ پر پہنچ گئے۔ وہ جگہ درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ پائن کون نے ایک جھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کی لاش یہاں سے ملی تھی۔'' پھر اس کی انگلی ایک کھلی جگہ کی طرف مڑ گئی۔ ''وہاں اس کے کپڑے پڑے ہوئے تھے اور وہ برہنہ حالت میں خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی۔ اسے ریپ کرنے کے بعد گولی مار دی گئی۔ جب

www.alifdayjeem.com

ہم وہاں پہنچے تو وہ مر چکی تھی۔"

"تمہیں اس کی لاش یہاں سے ملی تھی؟"

"ہاں، میرے ساتھ کچھ لڑکے تھے۔ ہم ہر دوسرے تیسرے دن جلانے کے لیے جھاڑیاں کاٹنے آتے تھے۔ جب ہم کچھ جھاڑیاں ساتھ لے کر جا رہے تھے تو ایک لڑکے نے اس کی لاش دیکھی۔ اس کا نام والٹر تھا۔ وہ میرے ساتھ بار پر کام کرتا تھا۔ بعد میں جب ہم نے اس کا نام تبدیل کیا تو اس نے کلب کا انتظام سنبھال لیا اور میں اس سے الگ ہو گیا۔ کلب مونا کو یہ اسی کا آئیڈیا تھا۔"

ایلس کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا تھا جس کا کثرت سے کون کے پاس آنا جانا ہو لیکن وہ ایک ایسے شخص سے واقف تھا جس کے پاس کلب مونا کو کے بارے میں کئی کہانیاں تھیں۔ اس نے اینڈریو سے ان کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ جرائم پر مبنی کہانیاں لکھنے کے دوران اس نے کئی ساتھی بنائے تھے جن سے اسے بہت مدد ملتی تھی لیکن ان میں صرف اینڈریو کو ہی وہ اپنا پارٹنر سمجھتا تھا۔ ویسے تو وہ ایک جونیئر ہائی اسکول میں اسسٹنٹ پرنسپل تھا لیکن اس کے پاس پرائیویٹ سراغ رساں کا لائسنس بھی تھا۔ جب تک ایلس نے قتل اور گمشدگی کے کیسز کی بو سونگھنا نہیں شروع کی تھی، اس سے پہلے وہ بہت کم ہی اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتا تھا۔ گو کہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں دن بھر مصروف رہتا تھا لیکن ایلس کی ایک ٹیلی فون کال پر وہ منٹوں میں اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ایلس کا پیغام ملتے ہی وہ اس سے ملنے ایک آئس کریم پارلر پہنچ گیا۔ گرمی کی وجہ سے اس نے اپنا کوٹ اتار کر بازو پر لے لیا تھا لیکن اس نے اپنے گنجے سر کو چھپانے کے لیے ہیٹ نہیں اتارا۔ وہ ایلس کو دیکھتے ہی بولا۔ "تم میرے لیے جلدی سے آئس کریم منگوا لو۔ میں تین پرانے دوستوں سے پیچھا چھڑا کر یہاں آیا ہوں۔"

ایلس نے کونیز سے روانہ ہوتے ہی اینڈریو کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا اور... اس سے کہا کہ وہ کلب مونا کو کے کچھ پرانے لوگوں کو تلاش کرے اور خاص کر ان کو جو کونیز، میں اکثر آتے تھے۔

ایلس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "امید ہے کہ میں نے تمہیں گھر والوں کے ساتھ وقت گزارنے سے نہیں روکا ہوگا۔"

اینڈریو نے اس کی معذرت کو نظر انداز کرتے ہوئے آئس کریم کا پیالہ اپنے سامنے کر لیا جو ایلس نے اس کے لیے منگوائی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایلس نے پوچھا۔

"کیا تم نے کچھ ایسے لوگوں کو تلاش کیا جو اس دن کونیز، گئے تھے؟"

اینڈریو نے آئس کریم کا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولا۔ "ہاں لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس لڑکی کو جانتے ہیں لیکن انہیں وہ قتل یاد ہے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ میں کلب مونا کو کے زمانے میں ان سے ملتا رہتا تھا۔"

چند منٹوں میں اینڈریو کے تینوں دوست وہاں پہنچ گئے۔ وہ سب اینڈریو سے عمر میں کچھ بڑے تھے۔ ان کی سافٹ بال کھیلنے کی عمر گزر گئی تھی اور اب وہ اپنے پوتوں پوتیوں کو سنبھال رہے تھے۔ آئس کریم پر ہاتھ صاف کرنے اور کلب مونا کو کی یادیں تازہ کرنے کے بعد اینڈریو نے بونی کا ذکر چھیڑ دیا۔

ان تینوں کو خبروں کے ذریعے اس کہانی کا پتا چلا تھا لیکن ان میں سے صرف ایک کو بونی یاد تھی۔ اس شخص کا نام

من پسند

کہتے ہیں لندن میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی بھی لڑکی اپنی پسند کا شریکِ حیات چن کر لا سکتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک نوجوان لڑکی اس مقام تک پہنچی تو اسے اندر پہنچا دیا گیا۔ جب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو اسے دو دروازے نظر آئے۔ ایک پر لکھا تھا خوب صورت شوہر۔ دوسرے پر لکھا تھا کم خوب صورت شوہر۔ وہ خوب صورت شوہر والے دروازے کے اندر چلی گئی۔ وہاں اس نے دو دروازے پائے۔ ایک پر لکھا تھا، امیر شوہر جبکہ دوسرے پر تحریر تھا غریب شوہر۔ اس نے امیر شوہر والے دروازے کا انتخاب کیا۔ وہاں بھی دو دروازے اس کے منتظر تھے۔ ایک دروازے پر لکھا تھا بغیر ساس والا شوہر۔ دوسرے پر لکھا تھا ساس کے ساتھ شوہر۔ لڑکی نے بغیر ساس کے شوہر والے دروازے کو پسند کیا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو اندر ایک بہت بڑا آئینہ لگا ہوا تھا اور نیچے یہ عبارت لکھی تھی۔ "اے لڑکی! اگر تجھے اتنی خوبیوں والا شوہر چاہیے تو وقت آن پہنچا ہے کہ تو اس آئینے میں اپنی شکل دیکھ لے۔"

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

www.urdutaleem.com

جیری تھا۔ اس کی آواز اینڈریو کے مقابلے میں قدرے بلند تھی اور وہ قد میں اس سے ایک یا دو انچ چھوٹا تھا۔ ان دنوں وہ انشورنس کا کام کرتا تھا اور ایک ایسے گھر میں رہتا تھا جس میں دوسری سہولتوں کے علاوہ سوئمنگ پول بھی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جوانی کے دنوں میں وہ اپنا ہر ایک ویک اینڈ کونیز، میں گزارتا تھا۔ اس نے اپنا چشمہ اتارا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میں بونی کو جانتا ہوں۔ وہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی جس کی وجہ سے اکثر لوگ اس سے متاثر ہو جاتے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ خود بھی مسکرا دیا اور گنگنانے لگا۔ ''میری بونی مچھلی کی طرح سمندر میں تیرتی ہے۔''

ایلس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اس میں انوالو تھے؟''

اس شخص نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''اوہ..... میں اس میں انوالو ہونا چاہتا تھا بلکہ کونیز، میں آنے والے ہر شخص کی یہی خواہش تھی۔''

''کیا وہ تم میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی؟'' ایلس نے پوچھا۔

جیری نے اپنی بھویں اوپر اٹھائیں۔ ''یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ بونی جیسپر، بوبی نامی ایک شخص کے ساتھ نظر آئی تھی۔ مجھے اس کا پورا نام معلوم نہیں۔ وہ اس گروپ کا حصہ تھا جس سے تم کبھی نہیں الجھنا چاہو گے۔''

اینڈریو نے کہا۔ ''موٹر سائیکل گینگ یا ایسا ہی کوئی گروپ..... لگتا ہے کہ تم کہانیاں سنا رہے ہو۔''

جیری اپنا سر آگے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔ ''گینگ؟ میں نہیں جانتا۔ وہ سب گریزی لوگ تھے۔ ایک بار بونی، بوبی کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی اور کونیز، میں کوئی اتنا بے وقوف نہیں تھا جو بونی سے بات کرتا۔''

ایلس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہم بوبی کو کہاں تلاش کریں؟''

جیری نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ ''کہیں بھی نہیں، میرے خیال میں یہی اچھا ہوگا اور میں اسے تلاش کرنے نہیں جاؤں گا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ جس کسی نے بھی بونی کو قتل کیا، وہ شاید نہ ملے کیونکہ بوبی اور اس کے ساتھیوں نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہوگا اور اگر تم نے اسے تلاش کر لیا تو وہ تم سے بات نہیں کرے گا۔ ایسے لوگ جیل میں آتے جاتے رہتے ہیں۔''

اینڈریو نے اپنا چمچہ پلیٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔ ''پھر ہم سے کون بات کرے گا؟''

جیری کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''اس لڑکی کا نام کیا ہے جو رینڈیز، میں کام کرتی ہے، وہ بونی کے دوستوں میں سے تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس نے کبھی بوبی اور اس کے ساتھیوں کو منہ نہیں لگایا لیکن وہ ان کی غیر موجودگی میں ہمیشہ بونی کے پاس ہوتی تھی۔''

اس کا ایک ساتھی بولا۔ ''بوسیل؟ لوئیس؟''

جیری نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سویٹ لو۔ یہی اس کا نام ہے۔'' وہ اینڈریو اور ایلس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ رینڈیز میں ویٹرس ہے اور آج رات وہاں ہوگی۔ مارک ویلی اور ویلرس اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔ وہ تم سے بات کرے گی۔ ممکن ہے وہ اس سے زیادہ نہ جانتی ہو جو اس نے اس وقت پولیس والوں کو بتایا تھا لیکن تم اس سے بات کر کے دیکھو۔''

☆☆☆

سویٹ لو نے کونیز، تو چھوڑ دیا لیکن وہ ہائی وے 67 پر ہی رہی جہاں رینڈیز، کے نام سے ایک نیا بار اور ریستوران شروع ہوا تھا۔ بعد میں وہاں اسٹیج پروگرام بھی ہونے لگے اور وہ ٹیکسار کانا میں لائیو میوزک کا سب سے بہترین مرکز بن گیا۔ مارک ویلی اور ویلرس کے بینڈ کا تعلق جنوبی آرکنساس سے تھا۔ وہ ہر چند ماہ بعد اس شہر میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور انہیں سننے کے لیے بہت بڑی تعداد میں لوگ رینڈیز، آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اینڈریو کو اپنی پرانی ٹویوٹا ہائی وے پر کھڑی کرنا پڑی اور وہ پیدل چل کر رینڈیز، تک آئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ایک مقامی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

رینڈیز، کا ریستوران اوپر کی منزل پر تھا اور ہر ایک کے لیے کھلا ہوا تھا لیکن کنسرٹ میں جانے والے لوگوں کو ایک گیٹ سے گزرنا ہوتا تھا۔ اینڈریو نے وہاں بیٹھی ہوئی عورت سے سویٹ لو کے بارے میں پوچھا تو اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کنسرٹ میں جانے والے ہجوم کی طرف اشارہ کر دیا۔ اینڈریو نے ایلس کو ٹہوکا دیا اور اس نے دو ٹکٹوں کے لیے عورت کو بیس ڈالر پکڑا دیے۔

ریستوران کے نچلے حصے میں بیئر کے لیے میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ایلس کو ایک خالی میز مل گئی جبکہ اینڈریو دو گلاسوں میں بیئر لے کر آ گیا۔ اس نے جھک کر ایلس سے کہا۔ ''دوست! میرا خیال ہے کہ وہ انہی میزوں پر کام کرتی ہے لیکن یہاں کا مینیو بہت مختصر ہے۔ تمہیں مچھلی کی ایک ٹرے منگوانا ہوگی۔''

www.aitbayjeem.com

ایلس نے اسے گھورا اور بیس ڈالر کے دو نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔ جب موسیقی کا پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو ایک ویٹرس ان کی میز پر آئی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن لگتا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس نے منی اسکرٹ اور مارک ویلی کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے رت جگوں اور شدید محنت کی داستان سنا رہے تھے۔ تاہم اس کی مسکراہٹ بڑی جاندار تھی۔ اس نے انہیں مینیو پکڑا دیا۔ اینڈریو نے مچھلی پر نشان لگایا اور ویٹرس نے مسکراتے ہوئے اسے اپنے نوٹ پیڈ پر لکھ لیا۔ وہ وہاں سے جانے ہی والی تھی کہ ایلس نے کہا۔ ''کیا تمہارا نام لو، ہے؟''

وہ گھومی اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''پندرہ سال ہو گئے۔ مجھے کسی نے اس نام سے نہیں بلایا۔''

اینڈریو نے قہقہہ لگایا۔ ''سویٹ لو..... تمہیں کونیز، میں اسی نام سے بلایا جاتا تھا؟''

اس نے جوابی قہقہہ لگایا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کونیز.....؟ واؤ، تم دونوں کی عمر اتنی زیادہ تو نہیں لگتی کہ تم اس زمانے میں وہاں جاتے ہو گے؟''

ایلس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''ہم بونی جیسپر کے قتل کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔ تم دونوں دوست تھیں؟''

اس کی مسکراہٹ دھندلا گئی اور آنکھوں میں دکھ کا طوفان سمٹ آیا۔ ''ہاں۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ہم دونوں بہترین دوست تھیں۔''

اینڈریو نے اس کا بازو تھپتھپایا اور بولا۔ ''مجھے واقعی بہت افسوس ہے سویٹی۔'' اس نے نرم اور نیچی آواز میں کہا۔ ''ہمیں امید ہے کہ تم ہمیں وہ سب کچھ بتا دو گی جو تم نے اس وقت پولیس کو بیان دیا تھا۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میری پولیس سے کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

ایلس نے کہا۔ ''کیا؟ انہوں نے تم سے کوئی بات کیوں نہیں کی؟''

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں جانتی۔ ہر کوئی مجھے سویٹ لو، کہتا تھا کیونکہ بونی اور بیرلی مجھے اسی نام سے پکارتی تھیں۔ میں اور بونی ایک ساتھ بڑی ہوئی تھیں اور اسی نے میرے بھائی کو یہ نام لیتے ہوئے سنا تھا۔ ویسے میرا نام بلو ہے۔ بولینڈا الین انڈروڈ۔ ڈیڈی مجھے بلو کہتے تھے لیکن میرا بھائی ٹھیک طرح یہ نام نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے مجھے لو کہنا شروع کر دیا۔''

اس نے کندھے اچکائے اور گھبراہٹ کے عالم میں اپنا ہونٹ کاٹنے لگی۔ ''لیکن میں تم سے بات کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بونی کو کس نے قتل کیا..... بونی نے لیکن کسی نے پولیس کو یہ بات نہیں بتائی۔''

اینڈریو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تم نے خود پولیس کو کیوں نہیں بتایا؟''

بولینڈا کچھ کہنے والی تھی کہ موسیقی پھر شروع ہو گئی جس میں اس کی آواز اور خیالات دب گئے۔ اس نے نوٹ پیڈ سے ایک صفحہ پھاڑا اور اس پر کچھ لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ اس کی عبارت کچھ یوں تھی۔ ''مارک ویلی کے آئٹم کے بعد میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔ مجھ سے عقبی پارکنگ لاٹ میں ملو۔ ہم وہاں بات کر سکتے ہیں۔''

مارک ویلی اور ویلرس کی پرفارمنس بہت شاندار تھی۔ انہوں نے اوریجنل سیٹ کے ساتھ کچھ مشہور گانے بھی سنائے۔ اس دوران ایلس نے دو بیئر کے گلاس حلق میں اتار لیے اور اینڈریو کو مچھلی کھانے کا موقع دے دیا۔ بولینڈا نے ان کی میز کے گرد دو تین چکر لگائے لیکن انہوں نے مصلحتاً اس کی طرف نہیں دیکھا۔ آخری گانا ختم ہوا تو لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اینڈریو نے ایک کارکن سے عقبی لاٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اسٹیج کی جانب اشارہ کر دیا۔ ایلس نے سیکیورٹی والوں کو اپنا پریس کارڈ دکھایا اور وہ دونوں اسٹیج کے پچھلے حصے سے باہر آ گئے۔

عقبی لاٹ درختوں سے گھری ہوئی تھی اور زیادہ تر گاڑیاں صنوبر کے درختوں کے درمیان کھڑی ہوئی تھیں تاکہ اسٹیج کے پیچھے کھڑے ہوئے ٹریلر کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ مارک ویلی اور اس کا بینڈ مقامی گروپوں اور چند دوستوں میں گھرا ہوا تھا، ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں اور قہقہے ٹریلر سے باہر بھی سنائی دے رہے تھے۔ کاروں کی قطار کے درمیان ایلس کی نظر ایک سرخ رنگ کے فورڈ ٹرک پر گئی۔ اس نے اینڈریو کو اشارہ کیا اور وہ تیز تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھے۔

جب وہ ٹرک کے پاس پہنچے تو وہاں گہری خاموشی تھی اور ہجوم کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ اب وہ صرف جھینگروں اور مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں سن سکتے تھے۔ ایلس کے دل میں ایک انجانا سا خوف اتر آیا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا۔ اس نے ٹرک کے گرد ایک چکر لگایا۔ اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ وہ کسی چیز سے ٹکرایا تھا۔

www.aftabjeem.com

بولینڈا اپنے ٹرک کے ایک طرف دونوں ہاتھ پھیلائے چت پڑی ہوئی تھی اس کا چہرہ زرد بلکہ تقریباً نیلا ہو چکا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس کی گردن مڑی ہوئی تھی اور اس پر انگلیوں کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ کسی نے بڑی بیدردی سے اس کا گلا گھونٹا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں اور وہ آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد ایلس اور اینڈریو ایک پک اپ کے بمپر پر بیٹھے پولیس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایلس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اینڈریو نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ''تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔''

ایلس نے سر اٹھایا اور بولا۔ ''تمہارے خیال میں اسے کیوں قتل کیا گیا؟''

''کیونکہ کسی بدمعاش کو کچھ سن گن مل گئی ہوگی۔ ہم نے کوئی صحیح بٹن دبایا ہے۔ اب صرف یہ جاننا ہے کہ وہ کون سا ہے۔''

ایلس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اینڈریو کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا سائرن کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ان کے سامنے ایک پولیس کار آ کر رک گئی تھی۔

رونڈو سنگر نے ان کی جانب انگلی اٹھائی اور کسی ناراض اسکول ٹیچر کی طرح انہیں دیکھا۔ رونڈو ان دو پولیس سراغ رسانوں میں سے تھا جن سے ایلس کے برسوں پرانے تعلقات تھے۔ عام طور پر وہ سیاہ رنگ کی پتلون اور آدھی آستین کی قمیص پہنتا تھا اور گنجے سر کو چھپانے کے لیے ٹوپی استعمال کرتا تھا۔ لیکن اس رات اسے نیند سے بیدار ہونا پڑا تھا اور وہ جلدی میں نیلی جینز اور ٹی شرٹ پہن کر باہر نکل آیا تاہم وہ اپنے سر پر ٹوپی رکھنا نہیں بھولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور وہ مسلسل اونگھ رہا تھا۔

جب ایلس اور اینڈریو اس کے قریب آئے تو اس نے اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں اس عورت کی موت کے ذمے دار ہو؟''

اینڈریو نے ایلس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''اتنا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں رونڈو۔'' وہ اطالوی زبان میں بولا۔ ''پہلے پوری بات تو سن لو۔''

رونڈو نے ایلس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ کس بارے میں بات کر رہا ہے؟''

ایلس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہم بولینڈا سے ایک کیس کے بارے میں سوالات کر رہے تھے اور ہمارا خیال ہے کہ وہ ہمیں کچھ معلومات دینے والی تھی لیکن اس سے پہلے ہی کسی نے اسے قتل کر دیا۔''

رونڈو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ کام دن میں کیوں نہیں کرتے..... کیا تمہیں نیند پیاری نہیں ہے؟''

اینڈریو نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ رونڈو نے اسے روک دیا اور ایلس سے کہا۔

''اسے بتاؤ کہ ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا۔'' پھر اس نے لاٹ کے کھلے حصے کی جانب چلنا شروع کیا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے بتاؤ کہ کیا قصہ ہے؟''

''تم نے بونی جیسپر کے کیس پر کام کیا تھا؟'' ایلس نے کہا۔ ''ہم اسی بارے میں بولینڈا سے بات کرنے آئے تھے۔''

رونڈو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا اور کسی پر شک نہیں کیا جا سکا۔ لہٰذا انہوں نے ہر سمت میں نظر دوڑائی اور ہر نشان کا پیچھا کیا۔ میں نے اس سلسلے میں ان کی ہر ممکن مدد کی۔''

اینڈریو نے پوچھا۔ ''ان میں سے کوئی سرابولی نامی شخص کی طرف بھی جاتا تھا؟''

رونڈو نے ایک سیکنڈ کے لیے سوچا اور آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔''

ایلس نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اس کا پورا نام معلوم ہے؟''

رونڈو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بولی اس کا اصلی نام نہیں ہے۔ وہ نسل پرستوں کے ایک گروپ کا سرغنہ تھا۔ میں نے اس پر خاص توجہ دی۔ اس کا اصل نام ٹام وال ربون ہے۔''

☆☆☆

رونڈو کی کار کئی اسکواڈ کاروں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ اس لیے جب دو کاروں کے ذریعے تصدیق ہو گئی کہ ٹام ایک مقامی ٹائر فیکٹری کی نائٹ شفٹ میں کام کر رہا ہے تو اینڈریو نے رونڈو کو اپنی کار میں لے جانے کی پیشکش کی۔ ایلس بہت تھک چکا تھا اس لیے وہ ان کے ساتھ نہیں گیا۔ رونڈو نے ایک پیٹرول مین سے کہا کہ وہ اسے گھر لے جائے اور اس پر نظر رکھے۔ ٹام کا نیٹ ورک اب بھی موجود ہوگا جو اسے قتل کرنا چاہے گا تاکہ بونی کے قتل کا معما کبھی حل نہ ہو سکے۔

ایلس جانتا تھا کہ اسے اس وقت تک گھر میں دروازے بند کر کے رہنا ہوگا جب تک اسے اینڈریو کی جانب سے یہ اطلاع نہیں مل جاتی کہ ٹام گرفتار ہو گیا ہے لیکن

www.allbookpdf.com

جیسے ہی پولیس والے وہاں پہنچے تو وہ فیکٹری سے نکل چکا تھا۔ اسے غالباً اطلاع مل گئی تھی کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔

ایلس رات کے تین بجے پوری رفتار سے گاڑی چلاتا ہوا پالرمو کی طرف جا رہا تھا۔ وال ریون کے ٹریلر میں تاریکی تھی، صرف کچن کی کھڑکی سے نائٹ بلب کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ٹرک ابھی تک وہیں کھڑا ہوا تھا اور اس کا بونٹ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی کار اس کے برابر میں کھڑی کی اور باہر آ گیا۔ اس نے ٹریلر کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک آواز رات کے سناٹے میں گونجی۔

''تم جہاں کھڑے ہو وہیں رک جاؤ۔'' ٹام نے کہا۔

ایلس رک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ یہ کون تھا۔

''آہستہ آہستہ پیچھے آؤ اور خاموش رہو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اٹھ جائے۔''

ایلس نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ وہ جیسے ہی مڑا تو اس نے چاند کی روشنی میں دیکھا کہ ٹام کے سیدھے ہاتھ میں ایک بڑا لوہے کا ہتھوڑا جھول رہا تھا۔ اس نے ڈنگری پہن رکھی تھی۔ ایلس نے تھوک نگلا اور کار کی چابیاں جیب میں رکھ لیں۔

ٹام سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اندازہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ مجھے وہاں تلاش نہیں کر سکے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

ایلس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، مجھے معلوم ہو گیا تھا۔''

ٹام نے ٹریلر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تم بیرٹی کو اس بارے میں بتانے آئے تھے؟''

ایلس نے کہا۔ ''ہاں، میں اسے بتاؤں گا۔''

ٹام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''

ایلس نے ٹریلر کی سیڑھیوں کی ریلنگ مضبوطی سے پکڑ لی۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا۔ ''تم نے اس سے شادی کیوں کی؟ کیا تم اس پر نظر رکھنا چاہتے تھے؟ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ بہن کی موت کا اس پر کیا اثر ہوا..... اسے اذیت دینا چاہتے تھے؟''

ٹام کا چہرہ اس طرح سکڑ گیا جیسے وہ رونے والا ہے۔ ''اسے اذیت دینا چاہتا تھا؟ تم کچھ نہیں جانتے۔'' اس نے اپنے دوسرے ہاتھ سے ناک صاف کی اور بولا۔ ''میں بیرٹی سے محبت کرتا ہوں۔ اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ ہاں، جب مجھے تکلیف پہنچی تو میں نے اس کا فیس بک پیج چیک کیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا وہ کوئی اندازہ لگانے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اسے قاتل کی تلاش ہے لہٰذا میں اس کے قریب ہو گیا تاکہ معلوم کر سکوں کہ وہ اس بارے میں کیا جانتی ہے لیکن پھر.....''

ایلس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم یہ کہو گے کہ پھر ہمیں محبت ہو گئی تو مجھے متلی ہونے لگے گی۔''

ٹام نے اس کی جانب ہتھوڑا کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنا منہ بند رکھو۔ ہاں ایسا ہی ہوا تھا۔ میں اس سے اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تیس سال پہلے میں نے کیا کیا تھا۔'' وہ رونے لگا۔ ''ایک احمقانہ غلطی۔''

ایلس نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم اسے غلطی کہہ رہے ہو؟ تم نے اس کی بہن کو قتل کیا تھا۔''

''وہ ایک حادثہ تھا۔'' ٹام نے اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یونی میرے پیچھے پڑ گئی تھی اور اس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں صرف اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

ایلس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور یولینڈا؟ کیا تم اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے یا یہ بھی ایک حادثہ تھا؟ کیا اس نے بھی تمہیں پریشان کر رکھا تھا اور تم صرف اسے.....''

ٹام غرایا اور ایلس کی طرف بڑھا۔ اس نے ہتھوڑا اپنے سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔ ایلس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ وہ کسی بھی طرح اپنے آپ کو ٹام کے حملے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ عین اسی وقت ایک فائر ہوا۔ ٹام کے ہاتھ سے ہتھوڑا گر پڑا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا خون آلود بازو پکڑ رکھا تھا اور بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ رونڈ دوڑتا ہوا اس کی جانب بڑھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی پھر اس نے ایمبولینس کو فون کیا تاکہ ٹام کو اسپتال پہنچایا جائے۔

فائرنگ کی آواز سن کر بیرٹی اور جینی بھی ٹریلر سے باہر آ گئیں۔ بیرٹی پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ایلس کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ بیرٹی کے لیے حد درجہ ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ جس شخص سے وہ بے انتہا محبت کرتی تھی، وہی اس کی بہن کا قاتل ہے تو وہ ایک بار پھر ٹوٹ کر بکھر جائے گی۔ وہ سوچنے لگا کہ کاش وہ اس معاملے میں نہ پڑتا تو بیرٹی دوسری بار یہ صدمہ نہ سہتی۔ دوسری جانب اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اسے اپنی نئی کہانی کے لیے مواد مل گیا تھا۔

⌘⌘⌘

www.taleemi.com

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

شہ زور

اسما قادری

قسط: 3

www.aanchalyeena.com

حنین کی آنکھ کھلی تو اس نے معاذ کو غائب پایا۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی کہ وہ توجہ دیتا۔ وہ خیمے سے باہر آ گیا۔ باہر اچھی خاصی رونق تھی اور شاید تمام لوگ ہی جاگ چکے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے آرام سے بیٹھے ناشتا کرنے یا گپیں لگانے میں مصروف تھے جبکہ کچھ صبح جاگنے کے بعد کے معمولات وضروریات انجام دینے کی تگ ودو میں لگے ہوئے تھے۔ حنین بھی اس دوسرے گروہ میں شامل ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ بھی ناشتا کرنے والوں کے درمیان موجود تھا۔ کھلے ماحول میں لکڑیوں کے چولہے پر تیار کردہ پراٹھوں اور آملیٹ کا ناشتا کرنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آملیٹ دیسی گھی میں تیار کیا گیا تھا اس لیے خاصا مختلف محسوس ہو رہا تھا۔ حنین نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا اور آخر میں کاغذی کپ میں چائے لے کر اپنے ایک کلاس فیلو کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''معاذ نظر نہیں آ رہا، کیا ابھی تک سو رہا ہے؟'' علی نامی اس لڑکے نے حنین سے دریافت کیا۔

''نہیں، سو تو نہیں رہا۔ میرے خیال میں تو وہ کافی پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ ہاں، نظر مجھے بھی ابھی تک نہیں آیا۔ ہوگا کہیں مصروف۔'' حنین اطمینان سے علی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ معاذ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کس مقام پر موجود ہے۔ چائے پی کر بھی وہ اسی اطمینان کے ساتھ ساتھیوں کے سنگ گپ شپ لگاتا رہا۔ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے اور اب آج کے دن کی پلاننگ کر رہے تھے۔ ان کے پروگرام میں صرف ایک رات کا قیام شامل تھا اس لیے آج ہی انہیں اپنا وزٹ مکمل کر کے واپس شہر لوٹنا تھا۔ مختصر سی بحث کے بعد پروگرام فائنل ہو گیا کیونکہ اصل میں تو پروگرام پہلے ہی سے طے تھا اور وہ لوگ فضول میں اپنی ذاتی رائے دینے بیٹھ گئے تھے۔ ان کے ساتھ آئے پروفیسر تقی نے طے شدہ شیڈول کے بارے میں بتا کر جلدی تیار ہو جانے کا حکم دیا تو وہ سب پھرتیاں دکھانے لگے۔ تیاری کے دوران حنین کو معاذ کی طرف سے تھوڑی سی فکر لاحق ہوئی۔ وہ پتا نہیں کہاں تھا اور یہاں اگلی منزل کی طرف روانگی کا مرحلہ قریب آن پہنچا تھا۔

تیار ہونے کے بعد وہ باہر آیا تو اس نے ساتھیوں سے معاذ کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ ہر ایک کی طرف سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔ صبح اٹھنے کے بعد سے کسی کی معاذ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا تھا۔ حنین نے دوستوں کے علاوہ سلطان اور اس کے ساتھیوں سے بھی معاذ کے بارے میں دریافت کر ڈالا۔ ان کی طرف سے بھی لاعلمی کا اظہار کیا گیا تو حنین کی تشویش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ معاذ صبح بہت جلدی اٹھ گیا ہوگا اور اپنی بے چین روح کی پکار پر لبیک کہتا ہوا اکیلے ہی سیر کے لیے نکل گیا ہوگا لیکن اسے اب تک واپس آ جانا چاہیے تھا۔ یہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ اکیلا آدمی بہت دور تک تنہا سیر کے لیے چلا جائے پھر معاذ تو کسی خاص تیاری کے ساتھ بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ معاذ کا بیگ خیمے میں ہی رکھا ہوا ہے اور اس نے پانی کی بوتل بھی اپنے ساتھ نہیں لی ہے۔ اس علاقے میں بغیر کسی گائڈ کے وہ بھی پانی کے بغیر کہیں دور تک جانا حماقت تھی اور حالات بتا رہے تھے کہ معاذ یہ حماقت کر چکا ہے۔ ناچار اسے پروفیسر تقی کو اس بارے میں آگاہ کرنا پڑا۔ ان کا پہلا ردعمل غصے کا تھا۔ معاذ کے پسندیدہ شاگرد ہونے کے باوجود انہیں یہ بات پسند نہیں آئی تھی کہ وہ ان کی ہدایات کے خلاف اکیلا کیمپ سے نکل گیا تھا۔ اس بات پر بہرحال وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ابھی تک معاذ کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ابتدائی کارروائی کے طور پر انہوں نے مقامی گائڈز کے ساتھ دو دو لڑکوں کے گروپس بنا کر انہیں مختلف سمتوں میں معاذ کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ پون گھنٹے بعد ایک ایک کر کے سارے گروپس ناکام لوٹ آئے جس سے تشویش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی صورت نہیں تھی کہ وہ مرکز پر واپس جائیں اور اس سلسلے میں مدد طلب کریں۔

معاذ پسندیدہ طالب علم تھا اور زیادہ تر لوگوں کو اس کی طرف سے تشویش تھی لیکن کچھ افراد ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ معاذ کی بے پروائی نے سب کی تفریح خراب کر دی ہے۔ کسی حد تک یہ بات ٹھیک بھی تھی لیکن موجودہ حالات میں جبکہ ایک انسانی زندگی کی طرف سے فکر لاحق ہو چکی تھی، ایسی بات کہے جانا مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ سینٹر واپس پہنچ کر اس سلسلے میں انتظامیہ سے درخواست کی گئی تو فوراً ہی کارروائی شروع کر دی گئی۔ نیشنل پارک میں تعینات رینجرز اہلکاروں کو بھی مطلع کیا گیا۔ پروفیسر تقی سمیت طلبہ کے ساتھ اس وزٹ پر آئے ہوئے دیگر اساتذہ اس واقعے پر اتنے فکرمند تھے کہ انہوں نے تمام طلبا و طالبات کو ریسٹ ہاؤس تک ہی محدود رہنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا اور کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ابھی تک کہیں سے کوئی حوصلہ افزا خبر نہیں آئی تھی۔ پتا ہی نہیں

www.allhayeem.com

چل رہا تھا کہ معاذ کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی تھی۔ تقریباً چھ گھنٹوں کی تلاش کے بعد جو خبریں سامنے آئیں انہوں نے تشویش کو کم کرنے کے بجائے اس میں مزید اضافہ کر دیا۔ پروفیسر تقی نے حنین کو بلا کر اسے ایک موبائل فون دکھاتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس موبائل کو پہچانتا ہے؟ حنین نے فوراً ہی شناخت کر لیا کہ وہ معاذ کا موبائل ہے۔ اس کے دل میں امید کی ایک کرن سی جاگی کہ شاید معاذ کا کوئی کھوج مل گیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے پروفیسر تقی کے ساتھ وہاں موجود رینجرز کے ایک اہلکار نے جو اطلاعات فراہم کیں وہ بہت زیادہ تشویش ناک اور مایوس کن تھیں۔ رینجرز اہلکار نے بتایا کہ جس جگہ سے یہ موبائل ملا ہے..... وہاں ایک ترچھی ڈھلان پر کسی کے لڑھکنے کے آثار موجود ہیں اور نیچے ایک تنگ سے پلیٹ فارم پر خون کے دھبے اور انسانی قدموں کے نشانات موجود ہیں لیکن کسی ذی روح کا وجود نہیں پایا گیا۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس پلیٹ فارم پر گرنے کے بعد زخمی معاذ نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی لیکن شاید اسے چکر آ گیا اور وہ مزید نیچے لڑھک گیا۔ نیچے بہت گہری کھائی تھی۔ رینجرز کے جوان رسوں کی مدد سے کھائی میں اتر کر مزید تلاش کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے لیکن ابھی تک کوئی حوصلہ افزا نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اس اطلاع نے حنین کے دل کو بری طرح مٹھی میں بھینچا تو اسے فوراً معاذ کے گھر والوں اور خصوصاً امی کا خیال آیا۔ وہ تو بیٹے کے ذرا سی تاخیر سے گھر پہنچنے پر پریشان ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کی گمشدگی اور ممکنہ حادثے کے بارے میں سن لیتیں تو ان کے دل پر کیا گزرتی؟

☆☆☆

معاذ کی گمشدگی ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔ رینجرز کے جوان زندہ یا مُردہ کسی بھی حال میں اسے تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ ان کی طرف سے بس چند اندازے ہی لگائے جا سکے تھے۔ خیال تھا کہ معاذ پاؤں پھسلنے سے نیچے لڑھک گیا تھا اور اس چٹانی پلیٹ فارم پر گر کر زخمی ہو گیا تھا جہاں اس کے خون کے دھبے پائے گئے تھے۔ اس کے بعد کی آراء دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ ایک خیال یہ تھا کہ اس چٹانی پلیٹ فارم سے بھی وہ مزید نیچے لڑھک گیا تھا اور کھائی میں گر کر ناقابلِ رسائی ہو گیا تھا۔ رینجرز کے جوانوں نے اس کھائی میں رسوں کی مدد سے ممکنہ حد تک نیچے جا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کا سراغ لگانے میں ناکام رہے تھے۔ ایسی صورت میں معاذ کی زندگی سے مایوسی کے علاوہ کوئی اندازہ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ایک رائے اور دی جا رہی تھی۔ رینجرز کے جوانوں کو ایک دو ایسی نشانیاں ملی تھیں جن کی مدد سے انہوں نے ایک دوسری رائے بھی قائم کی تھی۔ ان کے مطابق معاذ چٹانی پلیٹ فارم پر گر کر زخمی تو ضرور ہوا تھا لیکن مزید نیچے نہیں لڑھکا تھا اور کوئی شخص اسے وہاں سے نکال کر لے گیا تھا۔ انہیں وہاں کسی شخص کے قدموں کے چند نشانات بھی ملے تھے۔ اگرچہ نشانات بہت زیادہ واضح نہیں تھے لیکن ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی بڑے ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ پھر بھی یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی تھی کہ کوئی اکیلا شخص ایک جوان اور صحت مند لڑکے کو اکیلا اس چٹانی پلیٹ فارم سے اٹھا کر اوپر اور پھر وہاں سے کہیں اور لے گیا تھا۔ وہاں زمین ایسی نہیں تھی کہ قدموں کے واضح نشانات بن پاتے بس چند ایک ہی نشانات ملے تھے اور ان کے بارے میں بھی سوچا جا رہا تھا کہ ضروری نہیں جس شخص کے قدموں کے وہ نشانات تھے وہ معاذ کے گرنے کے بعد ہی وہاں آیا ہو اور معاذ کو اٹھا کر وہاں سے لے گیا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ کوئی معاذ کے گرنے سے پہلے ہی وہاں سے ہو کر گیا ہو اور اس کے قدموں کے نشانات وہاں رہ گئے ہوں۔ حقیقت کیا تھی اس بارے میں تو کسی کو بھی علم نہیں تھا اور اندازوں پر اندازے لگائے جا رہے تھے۔ موقع پر ملنے والے معاذ کے موبائل کا سیکیورٹی لاک کھول کر موبائل کی بھی جانچ کر لی گئی تھی۔ اس موبائل سے آخری بار کھینچی گئی تصویریں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ سچ مچ معاذ اپنی بے چین طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اکیلا ہی سیر کے لیے نکل گیا تھا اور جگہ جگہ مناظر کی تصویریں کھینچتا اور سیلفیز لیتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے وہ نیچے لڑھکا تھا۔ اس کے موبائل میں آخری لی جانے والی تصویر سندھ آئی بیکس کے چہرے کا کلوز اپ تھا۔ اس تصویر کے علاوہ بھی آئی بیکس کی کئی تصویریں تھیں اور اس مقام کو شناخت کر لیا گیا تھا جہاں آئی بیکس کھڑا ہوا تھا۔ یہ اس جگہ سے کچھ بلند مقام تھا جہاں سے معاذ کا اسمارٹ فون ملا تھا اور اندازہ لگایا جا رہا تھا کہ بلندی پر موجود آئی بیکس کی تصویریں کھینچنے کے چکر میں معاذ گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا، چنانچہ کسی ایسے مقام پر پیر رکھ بیٹھا جہاں وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا اور نیچے لڑھک گیا لیکن سوال پھر وہی تھا کہ لڑھکنے کے بعد وہ کہاں گیا؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا اور اس سوال نے متعلقین کی حالت خراب کر دی تھی۔

معاذ کی ماں اور بہن کی رو رو کر حالت بُری ہو گئی تھی۔ ہر وقت اس سے شاکی رہنے والے اس کے ابو بھی کم

www.urdumajlis.com

گم ہو گئے تھے اور چھوٹے سعد کی شوخیاں غائب ہو گئی تھیں۔ اس کے دوست، رشتے دار اور محلے دار اس کی طرف سے تشویش میں مبتلا اس کی خیریت کے لیے دعا گو رہتے تھے۔ لاہور سے پھپھو اور ثوبیہ بھی آ گئی تھیں۔ ثوبیہ کو رہ رہ کر اپنا خواب یاد آتا تھا جس میں اس نے معاذ کو تکلیف اور پریشانی کی حالت میں دیکھا تھا۔ اس بُرے خواب کو سچ ہونے سے روکنے کے لیے اس نے اپنا خواب کسی کو نہیں سنایا تھا پھر بھی اس خواب کی بُری تعبیر سامنے آ گئی تھی۔ معاذ سے اس کا قلبی تعلق ان حالات میں اس کو کتنے کرب میں مبتلا رکھے ہوئے تھا، یہ وہی جانتی تھی لیکن وہ سعیدہ بیگم اور علینہ کی طرح کھل کر رو دھو نہیں سکتی تھی۔ وہ ماں، بہن تھیں، انہیں اپنے غم کے اظہار کی پوری آزادی حاصل تھی اور لوگوں کی دلی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں لیکن وہ ان کی طرح کھل کر روتی دھوتی تو افسانہ طرازیاں شروع ہو جاتیں۔ وہ دل کی بات دل میں رکھنے کی قائل تھی اور سمجھتی تھی کہ قبل از وقت سرِعام محبت کا اظہار محبت کے تقدس کو مجروح کرتا ہے، سو وہ کھل کر نہیں روتی تھی اور اس کے آنسو چپکے چپکے اس کے دل پر گرتے رہتے تھے۔ آنکھوں کی ہلکی سی نمی پر البتہ اسے قابو نہیں تھا اور وہ نم نم آنکھیں لیے ادھر سے ادھر گھر کا انتظام سنبھالتی پھرتی تھی۔

سعیدہ بیگم جن کا اوڑھنا بچھونا ان کا گھر تھا، جو گھر کا ایک ایک کونا اپنے ہاتھوں سے چمکاتی تھیں، جنہیں اپنے بچوں اور شوہر کو نت نئے تازہ اور صحت بخش کھانے کھلانے کا شوق تھا اور جو اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود بھی بڑی ٹک سک سے رہتی تھیں، موجودہ حالات میں ہر طرف سے بیگانی ہو گئی تھیں۔ انہیں معاذ کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے لیے آنسو بہاتے ہوئے وہ ہر دم اس کی راہ تکتی رہتی تھیں۔ انہیں سلانے کے لیے بھی ٹرنکولائزرز دینی پڑ رہی تھیں۔ گھر میں مسلسل اوراد و وظائف کا سلسلہ جاری تھا اور عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایسے میں ثوبیہ اور اس کی والدہ نے مل کر گھر کا سارا انتظام سنبھال رکھا تھا اور کوشش کر رہی تھیں کہ سعیدہ بیگم کا بہت سنبھال کر رکھا گیا گھر ان کے حواس بحال ہونے پر انہیں اسی حالت میں ملے جس حالت میں وہ اسے رکھتی تھیں۔

خاور صاحب کی مشکل دُہری تھی۔ انہیں بیوی بچوں کو دلاسا بھی دینا تھا اور معاذ کی بازیابی کے سلسلے میں کوشش بھی کرنی تھی۔ وہ متعلقہ حکام اور اداروں سے مسلسل رابطے میں تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ معاذ کی تلاش کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ دوسرے امکان کو سامنے رکھتے ہوئے کیرتھر کے اطراف کی آبادیوں میں بھی معاذ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ اگر ان آبادیوں میں سے کسی آبادی کا بندہ معاذ کو وہاں سے نکال کر لے گیا ہو گا تو ضرور اس کا سراغ مل جائے گا اور یہی واحد امید تھی جس کے سہارے انہوں نے گھر والوں کو بہلا رکھا تھا ورنہ خود ان کا دل تو جانے کتنے خدشوں سے لرزتا رہتا تھا۔ انہوں نے دل کڑا کر کے متعلقہ افسر سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ اگر معاذ کا کوئی سراغ نہیں ملتا تو اس کی ڈیڈ باڈی ہی تلاش کر کے دے دی جائے کہ یہ ایک حقیقت تھی کہ مرے ہوئے پر صبر آ جاتا ہے لیکن کھوئے ہوئے پر صبر کرنا مشکل ہوتا ہے اور انسان ساری زندگی امید و بیم کے درمیان ہی لٹکا رہتا ہے۔

گھر والوں سے ہٹ کر بھی بہت سے لوگ اس کے لیے پریشان تھے جس میں سرفہرست اس کے دوست تھے۔ حنین عالم شاہ اور بشریٰ سمیت اس کے بے شمار دوست اس کے لیے تشویش میں مبتلا اس کی بہ خیریت واپسی کے لیے دعا گو تھے۔ بستر پر دراز آہستہ روی سے صحت مندی کی منزلیں طے کرتی بشریٰ پر اس حادثے کی خبر کیسی قیامت بن کر ٹوٹی تھی، یہ وہی جانتی تھی لیکن وہ بہادر لڑکی تھی اور کم عمری میں ہی مصائب سے لڑنے کا ہنر جانتی تھی۔ اس نے اس حادثے کو بھی بہت خاموشی سے سہہ لیا تھا اور حقائق پر نظر رکھتے ہوئے معاذ کے متعلق کوئی خبر آنے کی منتظر تھی۔ اس نے حنین کے سامنے اس خدشے کا بھی اظہار کیا تھا کہ کہیں معاذ کے غیاب میں سلطان کا کوئی ہاتھ نہ ہو لیکن آثار کی روشنی میں یہ خدشہ درست محسوس نہیں ہو رہا تھا اور لگتا یہی تھا کہ معاذ کسی حادثے کا ہی شکار ہوا ہے۔ حنین کو بشریٰ، معاذ کے حوالے ہی سے جانتی تھی۔ ان کی آپس میں دوستی نہیں تھی لیکن اس واقعے کے بعد ان کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ بشریٰ خود کہیں آنے جانے سے قاصر تھی۔ اس لیے فون پر حنین سے ہی معلومات حاصل کرتی رہتی تھی کیونکہ ان حالات میں معاذ کے گھر والوں کو ڈسٹرب کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے والد گلزار عاصم اور والدہ عائشہ ایک بار اخلاقاً معاذ کے گھر کا چکر لگا کر آ چکے تھے۔ عائشہ اپنے طور پر مسلسل بشریٰ کی دلجوئی میں لگی رہتی تھیں۔ بشریٰ بظاہر اپنے والد سے زیادہ قریب تھی لیکن حقیقتاً وہ ایک زیرک و معاملہ فہم ماں کی حیثیت سے اپنی بیٹی کو دنیا میں سب سے زیادہ بہتر طور پر جانتی تھیں۔ انہوں نے معاذ کے معاملے میں اس کی قلبی کیفیات کا بھی اندازہ لگا لیا تھا اور جانتی تھیں کہ ان کی

www.paksociety.com

حوصلہ مند بیٹی اس وقت اندر سے بہت دکھی اور پریشان ہے۔ انہیں خود بھی معاذ بہت پسند آیا تھا۔ صاف ستھرے کردار کا، شفاف باطن کا حامل لڑکا اگر ان کی بیٹی کا نصیب بن جاتا تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن ابھی وہ مرحلہ بہت دور تھا۔ دونوں کے تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور اب درمیان میں یہ مشکل آ گئی تھی۔ اس وقت وہ بشریٰ کے مستقبل سے بھی زیادہ معاذ کے لیے متفکر تھیں اور اس کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ نماز کے بعد معاذ کے لیے خصوصی دعا مانگنے کے بعد بشریٰ سے چائے کا پوچھنے اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ ان کے پوچھنے پر وہ بولی۔

''تھوڑی دیر رک جائیں امی! حسین آنے والا ہے۔ وہ آ جائے تو اس کے ساتھ ہی چائے پی لوں گی۔''

''خیریت! حسین اس وقت کیسے آ رہا ہے؟'' عائشہ، بشریٰ کی زبانی سن سن کر تقریباً سب ہی لوگوں کو جانتی تھیں اور انہیں علم تھا کہ حسین شہر سے ذرا ہٹ کر رہنے کی وجہ سے عموماً شام تک اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے۔

''جی، میں نے ہی اسے بلوایا ہے۔ وہ معاذ کا موبائل فون لے کر آ رہا ہے جس میں معاذ کی کیرتھر میں لی ہوئی تصویریں ہیں۔ گرنے سے معاذ کے موبائل کو زیادہ نقصان تو نہیں پہنچا ہے لیکن کوئی ایسی خرابی ہو گئی ہے کہ اس سے تصویریں وغیرہ سینڈ نہیں ہو رہی ہیں۔ میری درخواست پر معاذ کے ابو حسین کے ذریعے مجھے تصویریں دیکھنے کے لیے اس کا موبائل بھجوا رہے ہیں۔'' اس نے انہیں تفصیل سے بتایا۔

''کوئی خاص بات ہے ان تصویروں میں؟'' عائشہ نے پوچھا۔

''سب سے خاص بات تو یہی ہے کہ وہ تصویریں معاذ نے لی ہیں اور ان میں وہ تصویریں بھی شامل ہیں جو اس نے غائب ہونے سے پہلے لی تھیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ معاذ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہوا، وہ کیرتھر سے مجھے تصویریں اور ویڈیوز وغیرہ سینڈ کرتا رہے گا اور جو رہ جائیں گی وہ واپس آنے کے بعد مجھے دکھائے گا تاکہ ان لوگوں کے ساتھ نہ جا سکنے کے باوجود بھی میں خود کو وہاں محسوس کر سکوں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا تھا۔ میرے پاس اس کی بھیجی ہوئی چند تصویریں آپ بھی دیکھ چکی ہیں اور اب میرا دل باقی تصویریں دیکھنے کی بھی خواہش کر رہا ہے تو میں نے اس کا موبائل منگوا لیا ہے۔'' اس نے مزید وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ معاذ کا موبائل اس کے گھر والوں کے پاس موجود ہے۔ اصولاً جب تک اس کیس پر کام ہو رہا ہے، اس کا موبائل متعلقہ محکمے کے کسی افسر کی تحویل میں ہونا چاہیے تھا۔'' انہوں نے اعتراض کیا۔

''آپ بھول جاتی ہیں مائی ڈیئر مام کہ آپ انگلینڈ میں نہیں پاکستان میں ہیں۔ وہاں معاذ کا موبائل اس کے گھر والوں کو مل جانا بھی غنیمت ہے ورنہ یہاں تو بندے کے ساتھ ساتھ اس کی چیزیں بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح ایسے غائب کر لی جاتی ہیں کہ ساری زندگی سر پٹختے رہو، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہاں پر معاذ کی تلاش کے لیے سر توڑ کوششیں کی جا رہی ہوں گی؟ مجھے پورا یقین ہے کہ چند کوششوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا یا ہو چکا ہو گا۔ یہ وہ ملک نہیں ہے جہاں ملی کے بچے کو بھی ریسکیو کرنے کے لیے تمام وسائل جھونک دیے جاتے ہیں۔ یہاں کے انسان بہت ارزاں ہیں اور وسائل کی کمی کا رونا رو کر ایسے کسی بھی کام کو زیادہ آگے نہیں بڑھایا جاتا۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ متاثرہ شخص کوئی خاص بڑی حیثیت بھی نہ رکھتا ہو۔'' بولتے ہوئے بشریٰ کی آنکھیں اندرونی کرب سے سرخ ہو گئی تھیں۔ اس کا تعلق ایسے گھرانے سے تھا جہاں ہر دم باخبر رہنے کا رواج تھا اس لیے وہ اس سسٹم کی بے حسی سے بے خبر ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا۔ حقیقتاً وہ معاذ کے گھر والوں کے مقابلے میں بہت ہی کم پُرامید تھی کہ اس کی بازیابی کے سلسلے میں حکومتی سطح پر کوئی خاص کوششیں کی جائیں گی۔ اب جو بھی تھا، تقدیر پر ہی بھروسا کرنا تھا۔ عائشہ جو گزار عاصم سے شادی کے بعد پاکستان آئی تھیں، ان کے ساتھ رہ کر ان حقائق کو سمجھنے لگی تھیں۔ چنانچہ بشریٰ کے تلخ جملوں پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں اور پھر نہایت متانت سے بولیں۔

''دعا کرو بیٹا! جب کہیں کوئی راستہ نظر نہ آ رہا ہو تو دعا کی طاقت سے بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ دعا کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جب کوئی کمزور اور بے بس شخص مدد کے لیے اپنے رب کو پکارتا ہے تو اس کی رحمت ضرور جوش مارتی ہے اور اس کے بس میں ہے کہ جہاں کوئی وسیلہ، کوئی راستہ، کوئی سہارا نظر نہ آ رہا ہو، وہاں بھی وہ آسانیاں عطا کر دیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ معاذ کے سلسلے میں بھی جلد ہمیں کوئی اچھی خبر سننے کو ملے گی۔ بس دعاؤں کا سلسلہ نہیں رکنا چاہیے۔ اس وقت ہم سب کو اور معاذ کو بس اسی ایک چیز کی سب سے

www.pdfbyjeem.com

زیادہ ضرورت ہے۔'' وہ اپنی بات کہہ کر وہاں رکنے کے بجائے باہر نکل گئیں۔ ان کے ساتھ یہ بڑا عجیب معاملہ تھا کہ وہ گلزار عاصم کی محبت میں مبتلا ہونے کے بعد اسلام کی طرف متوجہ ہوئیں۔ اس کا مطالعہ کیا اور اچھی طرح اسلام کو سمجھنے کے بعد مسلمان ہوئیں اور برسوں سے ایک خوش عقیدہ مسلمان کی حیثیت سے دین کے تمام احکامات کی سختی سے پابندی کی کوشش کرتے ہوئے زندگی گزار رہی تھیں لیکن گلزار عاصم ایک اچھے انسان ہونے کے باوجود اتنے زیادہ دین دار آدمی نہیں تھے اور بشریٰ بھی کچھ کچھ باپ کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔

عائشہ کے وہاں سے اٹھ جانے کے بعد بھی وہ سوچتی رہی کہ اس کی ماں اتنی خوش عقیدہ اور خوش امید عورت تھی تب ہی تو اتنی مطمئن رہتی تھی۔ حنین کی آمد تک وہ اسی طرح کی سوچوں میں الجھی رہی۔ حنین آیا تو وہ اس سے گفتگو میں مصروف ہوگئی۔ عائشہ نے اس کی آمد کے فوراً بعد ہی کچھ لوازمات کے ساتھ چائے پیش کر دی تھی اس لیے بے چینی کے باوجود اخلاقیات نبھاتے ہوئے بشریٰ نے پہلے حنین کے چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کا انتظار کیا اور اس دوران اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہی۔ وہ اپنے بستر پر تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی تھی۔ چائے کے بعد حنین نے خود اسے معاذ کا موبائل پیش کیا تو وہ پورے انہماک سے تصویریں دیکھنے لگی۔ چند تصویریں تو وہی تھیں جو معاذ اسے بھجوا چکا تھا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی تصویریں اور چند ویڈیوز تھیں۔ وہ ایک، ایک کر کے سب دیکھتی چلی گئی۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے اسے سچ مچ یہی لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی کیرتھر کے ماحول میں موجود ہو لیکن معاذ..... معاذ نہیں تھا جس کی موجودگی میں وہ یہ سب دیکھتی تو اس کا دل خوشی محسوس کرتا۔ پھر بھی یہ تصویریں اسے معاذ کا احساس دلا رہی تھیں۔ خصوصاً سیلفیز میں اس کا ہنستا مسکراتا، ہشاش بشاش چہرہ دیکھ کر تو دل ماننے کو راضی ہی نہیں تھا کہ یہ شخص کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ ایک بار ساری تصویریں اور ویڈیوز دیکھنے کے بعد دوبارہ پھر خصوصیت سے ان تصویروں کو دیکھنے لگی جو آخری بار کھینچی گئی تھیں۔ کیرتھر کی صبح کے پس منظر میں ہلکی سی روشنی میں کھینچی گئی وہ تصویریں سب سے زیادہ منفرد اور خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ایک سیلفی پر آ کر بشریٰ رک گئی۔ معاذ کا روشن اور تروتازہ چہرہ اس کے سامنے تھا اور پس منظر میں پہاڑ اور جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس تصویر میں بشریٰ کو کوئی بات غیر معمولی محسوس ہوئی۔ فوری طور پر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا اور وہ غور سے تصویر کو دیکھنے لگی۔ غور سے دیکھنے پر جو احساس ہوا، اس کی تصدیق کے لیے اس نے تصویر کو زوم کر کے دیکھا اور اس کے چہرے پر جوش کے تاثرات ابھر آئے۔

''کیا بات ہے بشریٰ! کیا کوئی خاص بات محسوس ہو رہی ہے اس تصویر میں؟'' حنین نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا۔

''ہاں..... آپ بھی دیکھیں.....'' اس نے موبائل حنین کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''معاذ کی بیک پر پہاڑ کی رائٹ سائڈ دیکھیے گا۔'' حنین غور سے دیکھنے لگا اور وہ بھی چونک گیا۔

''یہ کیا..... یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ پہاڑ کے پیچھے سے کوئی جھانک رہا ہے، کوئی انسانی چہرہ.....''

''بالکل..... ایک نظر دیکھنے پر اس کا احساس نہیں ہوتا اور ایسا لگتا ہے کہ یہ پہاڑ ہی کا کوئی ابھرا ہوا حصہ ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی انسان ہے، یعنی غائب ہونے سے پہلے معاذ اس جگہ پر بالکل اکیلا نہیں تھا۔ وہاں کوئی اور بھی موجود تھا۔ حادثے کا ذمے دار یا چشم دید گواہ.....'' وہ جلدی، جلدی بول رہی تھی۔

''بشریٰ.....!'' حنین نے تصویر پر نظریں جمائے، جمائے اسے پکارا اور ایک پل کے لیے تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بولا۔

''یہ چہرہ۔ کہیں یہ سلطان تو نہیں ہے..... نقوش اتنے واضح نہیں ہیں لیکن فیس کٹ اور نہ نظر آنے والے خشخشی بالوں کی وجہ سے اس کا گنجا نظر آنے والا سر دیکھ کر مجھے شک ہو رہا ہے کہ یہ سلطان ہی ہے۔''

''مجھے دکھائیں.....'' وہ بے چین ہوگئی۔ حنین نے موبائل دوبارہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''واقعی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ سلطان ہی لگ رہا ہے۔ شاید یہ چھپ کر فاصلے سے معاذ کا پیچھا کر رہا تھا اور اتفاقاً اس سیلفی میں اس کا چہرہ آ گیا ہے۔ معاذ کو پتا ہی نہیں چلا ہوگا کہ یہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ فاصلہ بھی کافی زیادہ ہے اور بس اتفاقاً ہی سلطان کے جھانکنے کی وجہ سے اس کی شکل اس تصویر میں آ گئی ہے۔'' وہ تصویر دیکھتے ہوئے حنین کی تائید کرنے کے ساتھ، ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتی جا رہی تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ معاذ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ حادثہ نہیں تھا۔ سلطان نے اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی ہے اور اب اس سے سچائی اگلوانی پڑے گی۔'' حنین نے مزید

www.urdumajlis.com

اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑائے۔

''ہاں، ہمیں معاذ کے ابو سے بات کرنی چاہیے تاکہ وہ پولیس سے رابطہ کر کے اس سلسلے میں کوئی کارروائی کروا سکیں۔ اس خبیث سلطان کو بچ کر نکلنے نہیں دینا ہے۔ یہ ہی ہے جو بتا سکتا ہے کہ معاذ کے ساتھ کیا ہوا۔'' اس کے تنِ مردہ میں جیسے جان سی پڑ گئی تھی۔ اگر وہ بستر سے اتر کر چلنے پھرنے کے لائق ہوتی تو شاید خود ہی خاور صاحب کے پاس دوڑی چلی جاتی۔

''لاؤ، یہ موبائل مجھے دے دو۔ اب اس کی حیثیت ایک اہم ثبوت کی ہو گئی ہے۔ میں اسے انکل کے پاس لے کر جاتا ہوں۔ وہاں سے ہم تھانے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی اس معاملے میں انوالو ہونا پڑے کیونکہ تمہارا ذکر کیے بغیر معاذ کی سلطان اور کامی سے دشمنی کی وجہ سامنے نہیں آ سکے گی۔''

''ڈونٹ وری..... میں پولیس کو سب بتا دوں گی۔ اپنے معاملے میں تو مجھے اور میرے گھر والوں کو اس لیے خاموش رہنا پڑا تھا کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت ہی نہیں تھا لیکن اس معاملے میں ایک معمولی سا سہی، ثبوت موجود تو ہے۔ کم از کم اس کی بنیاد پر سلطان سے تفتیش تو کی جا سکتی ہے۔'' بشریٰ نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ تو ویسے بھی حق کا بول بالا کرنے کی قائل تھی۔ اب اتنے اہم موقع پر سچ کا اظہار کرنے سے کیسے رک جاتی۔

☆☆☆

معاذ کا موبائل ہاتھ میں لیے خاور صاحب حیرت سے حسین کی بات سن رہے تھے جو انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ معاذ کسی حادثے کے بجائے سازش کا شکار ہوا ہے۔ اس نے انہیں تصویر پر غور کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ تصویر میں اتفاقاً آ جانے والا چہرہ ان کے ایک یونیورسٹی فیلو سلطان کا ہے جس سے معاذ کی دشمنی چل رہی تھی۔

''لیکن معاذ کی اس سے کیا دشمنی تھی؟'' خاور صاحب کی حیرانی میں مزید اضافہ ہوا۔ حسین ذہنی طور پر اس سوال کے لیے تیار تھا۔ اس نے انہیں اس ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا جسے اب تک معاذ نے گھر والوں کی پریشانی کے خیال سے ان سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ خاور صاحب آنکھیں پھاڑے سب سنتے رہے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا بیٹا ایسے حالات سے گزر رہا تھا۔ بشریٰ گلزار کے ساتھ ہونے والے واقعے کا البتہ انہیں علم تھا اور وہ یہ سوچ کر لرز گئے تھے کہ جن لوگوں نے ایک قابل سرجن کو دن دہاڑے بھری سڑک پر ہلاک کر دیا تھا اور جن کی وجہ سے بشریٰ گلزار موت کے منہ سے واپس آ کر بستر پر معذوروں کی طرح پڑی ہوئی تھی، ان سے دشمنی میں معاذ کا کیا انجام ہوا ہوگا۔ وہ خود کو بیٹے کی زندگی کی طرف سے مزید ناامید محسوس کر رہے تھے۔

''پھر انکل! آپ چل رہے ہیں نا ایف آئی آر کروانے؟'' انہیں سوچوں میں ڈوبے دیکھ کر حسین نے پوچھا۔

''شاید اس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔'' انہوں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

''کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی تو نہیں بیٹھا جا سکتا نا۔'' حسین نے انہیں سمجھایا۔

''یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ٹھیک ہے میں ایف آئی آر کروانے چلتا ہوں۔'' وہ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ قریبی تھانے تک پہنچنے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا۔

''تم باہر ہی ٹھہرو بیٹا! ایف آئی آر کروانے میں اکیلا ہی جاؤں گا۔'' تھانے کے سامنے پہنچ کر انہوں نے حسین کو ہدایت کی۔

''وہ کیوں انکل؟'' وہ حیران ہوا۔

''یہ خطرناک لوگوں کا معاملہ ہے۔ میں نے تفصیلات سن کر اندازہ لگا لیا ہے کہ تمہارا ان معاملات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے میں تمہیں اس چکر میں ملوث کر کے... خوامخواہ مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ تم نے بتایا ہے کہ بشریٰ اس سلسلے میں گواہی دینے کے لیے تیار ہے اور دیکھا جائے تو یہ معاملہ اصل میں تعلق بھی اسی سے رکھتا ہے تو بہتر ہے کہ اپنی ایف آئی آر میں اسے ہی اپنی معلومات کا ذریعہ قرار دوں..... تمہیں خوامخواہ اس معاملے میں ملوث کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا تو وہ خاموش ہو گیا۔ خاور صاحب اکیلے ہی تھانے کے اندر چلے گئے۔ اپنا تعارف کروانے کے بعد انہوں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا کہ انہیں ایک ایف آئی آر درج کروانی ہے۔ ڈیوٹی پر موجود اہلکار نے ایف آئی آر کی نوعیت معلوم کی اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کن لوگوں کے خلاف ایف آئی آر درج کروانا چاہتے ہیں تو وہ چونک گیا اور بولا۔

''معاف کیجیے گا خاور صاحب! میں ان لوگوں کے خلاف اپنی مرضی سے پرچہ نہیں کاٹ سکتا۔ مجھے صاحب کو بتانا ہوگا۔'' پھر وہ اپنے صاحب کو بتانے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد خاور صاحب کی بھی طلبی ہو گئی۔

''جی جناب! پہلے آپ مجھے تفصیلات بتائیے کہ اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ آپ کی کیا دشمنی ہو گئی ہے تب ہی میں

www.aiidayjeem.com

ایف آئی آر کاٹنے کے سلسلے میں آپ کو کوئی جواب دے سکوں گا۔'' وہ نفیس سی مونچھوں والا قبول صورت آدمی تھا جس کا جسم عام پولیس والوں کی طرح بے ڈھنگا نہیں تھا اس لیے اس پر پولیس کی وردی جچ رہی تھی۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ایس ایچ او تھا اور عمر تقریباً چالیس سال معلوم ہوتی تھی۔ اس نے خاور صاحب کو کرسی پر بٹھانے کے بعد ان سے نرمی سے گفتگو کا آغاز کیا تھا اور انہیں کچھ، کچھ اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی ڈھنگ کے پولیس والے کے سامنے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کھل کر اسے اپنی آمد کا مقصد بتا دیا۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے معاذ کے موبائل میں موجود تصویر بھی اسے دکھائی۔ وہ پوری سنجیدگی اور متانت سے ان کی بات سنتا رہا۔ تصویر بھی بہت غور سے دیکھی۔ درمیان میں چند سوالات بھی کیے اور جب خاور صاحب خاموش ہو گئے تو بولا۔

''مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے خاور صاحب! آپ کا جوان بیٹا غائب ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ آپ اس کی بازیابی کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتا ہوں لیکن فوری طور پر ایف آئی آر کاٹنے سے قاصر ہوں۔ اصل میں یہ میرے لیول کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ آپ جن دو لڑکوں سے اپنے بیٹے کی دشمنی کا ذکر کر رہے ہیں، ان دونوں ہی کے باپ بہت باحیثیت اور مشہور شخصیات ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف کچھ کرنا ہمارے لیے آسان نہیں ہوتا۔ اوپر سے بہت دباؤ آ جاتا ہے۔ آپ ثبوت کے طور پر جو تصویر ساتھ لائے ہیں، وہ بھی اتنی واضح نہیں ہے لیکن پھر بھی میں اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ آپ بس مجھے ایک دن کی مہلت دیں تاکہ میں اوپر والوں سے اس سلسلے میں اجازت لے لوں۔''

وہ اتنے اخلاق سے بات کر رہا تھا کہ خاور صاحب کچھ کہہ ہی نہیں سکے۔ یہ طعنہ تک نہیں دیا کہ باحیثیت اور مشہور شخصیات کی انوالومنٹ کی وجہ سے ایک عام شہری کو ایف آئی آر تک کٹوانے کی سہولت نہیں ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہمارے ہاں کے تھانوں میں یہی کلچر ہے۔ پولیس کبھی بھی ایسے لوگوں کے خلاف آسانی سے پرچہ کاٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور درخواست گزار کو ہی ڈرا دھمکا کر بھگا دیتی ہے۔ یہاں تو پھر بھی غنیمت تھا کہ ایس ایچ او ان سے تہذیب سے پیش آ رہا تھا اور ایف آئی آر کاٹنے کے لیے ایک دن کی مہلت طلب کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے ایس ایچ او صاحب! میں کل آ جاؤں گا۔ آپ میرے بیٹے کا موبائل دے دیں۔ میں کل پھر اسے اپنے ساتھ لے آؤں گا۔'' انہوں نے موبائل لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ارے نہیں جناب.....! یہ موبائل آپ میرے پاس رہنے دیں..... میں اپنے افسر کو ثبوت دکھا کر ہی تو اس سے ایف آئی آر کاٹنے کی اجازت طلب کروں گا۔'' اس نے موبائل دینے سے انکار کرتے ہوئے معقول وجہ پیش کی تو خاور صاحب کو اس کی بات ماننی پڑی۔ وہ تھانے سے باہر نکلے تو حنین ان کا منتظر تھا۔

''کیا ہوا انکل.....؟'' انہیں دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے دریافت کیا جواب میں انہوں نے ساری تفصیل سنا دی۔

''معاذ کا موبائل آپ اپنے پاس ہی رکھتے انکل..... کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے، ہمارے پاس سلطان کے خلاف وہی ایک مبہم سا ثبوت تھا۔'' حنین متفکر ہوا۔

''ایس ایچ او اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا بیٹا اس لیے میں نے اس کی بات مان لی۔ ویسے بھی پولیس والوں کے ہاتھ میں چلی جانے والی چیز واپس حاصل کرنے پر آدمی کا اختیار کب چلتا ہے۔'' انہوں نے حقیقت بیان کی تو حنین نے خاموشی اختیار کر لی۔ انہیں ان کے گھر پر چھوڑنے کے بعد اس نے فون پر بشریٰ سے رابطہ کر کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اس ایس ایچ او کا نام معلوم ہے؟'' بشریٰ نے صورتِ حال جان کر تشویش سے پوچھا۔

''شفقت شاہ نام بتا رہے تھے انکل اس کا۔''

''اوہ مائی گاڈ.....! میں جانتی ہوں اس شخص کو..... بظاہر وہ بڑا سلجھا ہوا اور مہذب آدمی دکھائی دیتا ہے لیکن اصل میں بڑا کرپٹ بندہ ہے۔ انکل اس کے ظاہر کو دیکھ کر بہت بڑا دھوکا کھا گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کیس میں مخالف پارٹی سے ٹھیک ٹھاک رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور ہم یہاں انصاف کے حصول کے لیے سر پٹختے رہ جائیں گے۔'' شفقت شاہ کا نام سنتے ہی بشریٰ کی تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

''اب کیا ہو سکتا ہے..... کل تک انتظار کر کے دیکھ لیتے ہیں پھر کوئی لائحہ عمل سوچیں گے۔'' حنین نے جواب دیا۔ دوسرے دن خاور صاحب دوبارہ تھانے گئے تو بشریٰ کے اندیشے بالکل درست ثابت ہوئے۔ گزشتہ روز ایس ایچ او سے قبل جس اہلکار سے ملاقات ہوئی تھی، وہ ہی ان سے بے حد رکھائی سے پیش آیا۔ ایف آئی آر کے بارے

www.urdutrayeem.com

میں کچھ بتاتا تو دور کی بات، وہ ان سے ڈھنگ سے بات کرنے پر بھی راضی نہیں تھا اور خود کو بے حد مصروف ظاہر کر رہا تھا۔ ایس ایچ او کے متعلق پوچھنے پر صاف بتا دیا تھا کہ صاحب آج تھانے نہیں آئے ہیں اور کچھ خبر نہیں کہ آئیں گے بھی یا نہیں..... خاور صاحب تھانے میں گھنٹوں خوار ہو کر باہر نکلے تھے اور پھر تو جیسے یہ خواری ان کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ تین دن تک وہ مسلسل چکر لگاتے رہے لیکن ان کی ایس ایچ او شفقت شاہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

''اب آپ وہاں مت جائیے گا انکل! اب ہم کچھ اور کریں گے۔'' حنین جو انہیں تھانے لا، لے جا رہا تھا..... تیسرے دن ان سے بولا۔

''کیا کرو گے تم لوگ؟'' انہوں نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

''ہم گلزار عاصم صاحب کے گھر ایک پریس کانفرنس رکھیں گے اور اس میں پولیس سمیت سب کا کچا چٹھا کھولیں گے۔'' اس نے انہیں بتایا۔

''کل مجھے ایک کوشش اور کر لینے دو بیٹا! بڑے لوگوں کے ساتھ، ساتھ پولیس سے بھی دشمنی مول لے لینا مناسب نہیں ہے۔'' وہ شریف آدمی تھے اس لیے پڑھے لکھے ہونے اور مناسب عہدے پر ملازمت کرنے کے باوجود اس قسم کے معاملات میں ڈرتے تھے۔ ناچار حنین کو ان کی بات ماننا پڑی۔

دوسرے دن وہ حنین کی آمد سے قبل ہی صبح سویرے گھر سے نکل کر تھانے کے سامنے جا بیٹھے۔ گھر پر وہ ہدایت کر کے گئے تھے کہ حنین آئے تو اسے ان کے انتظار میں بٹھا لیا جائے اور اگر وہ انتظار کرنے کے لیے راضی نہ ہو تو اس سے کہا جائے کہ خاور صاحب خود اس سے بعد میں رابطہ کر لیں گے۔ وہ حنین کو تھانے آنے سے روکنا چاہتے تھے اور خود آج ہر حال میں شفقت شاہ سے ملاقات کا ارادہ رکھتے تھے۔ انتظار کرتے، کرتے کافی وقت ہو گیا۔ موسم زیادہ گرم نہیں تھا لیکن چڑھتے سورج کی تپش بہر حال متاثر کر رہی تھی۔ پیاس سے ان کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے کہ کہیں چند منٹ بھی اِدھر اُدھر ہو جانے سے شفقت شاہ سے ملنے کا موقع ضائع ہو جائے۔ خدا، خدا کر کے ساڑھے گیارہ بجے انہوں نے شفقت شاہ کی گاڑی تھانے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھی۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ بڑے کروفر سے کسی اعلیٰ افسر کی طرح پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ خاور صاحب اس کی گاڑی کے پیچھے ہی لپک کر کھلے گیٹ سے تھانے کے اندر داخل ہو گئے اور تھانے کے اندر ایک جھٹکے سے جا رکنے والی شفقت شاہ کی گاڑی کے قریب پہنچ گئے لیکن اس دوران پولیس والے بھی شور مچاتے ہوئے ان کے قریب آ کر انہیں پکڑ چکے تھے۔

''چھوڑو مجھے..... مجھے ایس ایچ او صاحب سے ملنا ہے۔'' انہوں نے اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کی۔ اسی وقت شفقت شاہ گاڑی سے نیچے اترا۔ کلف لگی یونیفارم چمچماتے جوتوں اور قیمتی سن گلاسز میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔

''یہ کیا ہنگامہ ہے؟ کون ہے یہ آدمی.....؟'' سن گلاسز اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے اپنے عملے کو سخت لہجے میں مخاطب کیا اور خاور صاحب پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ اس کی نظروں میں قطعی اجنبیت تھی اور لگتا تھا کہ اس نے پہلی بار خاور صاحب کو دیکھا ہے۔

''میں خاور احمد ہوں ایس ایچ او صاحب..... ابھی تین دن پہلے میں اپنے بیٹے کی گمشدگی کی ایف آئی آر کٹوانے کے سلسلے میں آپ سے ملا تھا۔ آپ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میرے بیٹے کا موبائل جس میں ایک اہم ثبوت تھا، وہ بھی آپ نے اپنے پاس رکھ لیا تھا کہ اپنے اعلیٰ افسر سے بات کریں گے۔ پلیز مجھے بتائیں کہ اس سلسلے میں کوئی پیش رفت ہو سکی ہے یا نہیں.....؟'' خاور صاحب کو دو پولیس والوں نے پکڑ رکھا تھا جن کی پروا کیے بغیر وہ جلدی جلدی شفقت شاہ کے سامنے اپنے مدعا بیان کر رہے تھے۔ ان کی بات سن کر شفقت شاہ نے بھویں اچکائیں اور غور سے ان کی شکل دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر! مجھے آپ کی کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی۔ میں نے تو آج سے قبل آپ کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔''

''شکل نہیں دیکھی؟ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو میں اپنے بیٹے کی گمشدگی کے سلسلے میں آپ سے ملا تھا۔ اتنی جلدی آپ مجھے کیسے بھول سکتے ہیں؟'' خاور احمد بیک وقت حیرت اور صدمے سے دوچار ہوئے۔

''لگتا ہے ان صاحب کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہے جس سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ تم لوگ ان کی تلاشی لے کر دیکھو کہ ان کی جیبوں میں کوئی شناختی کارڈ وغیرہ موجود ہے یا نہیں۔ اس پر سے پتا دیکھ کر انہیں عزت سے ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ ایسی دماغی حالت والا بندہ گھر سے نکل پڑے تو گھر والے بھی پیچھے پریشان ہوتے رہتے

www.oldtaylem.com

ہیں۔'' وہ بڑے نرم اور ہمدرد لہجے میں ان کے متعلق اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ خاور احمد پہلے تو دنگ سے اسے دیکھتے رہ گئے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ واقعی ایک پُرخلوص افسر ہو لیکن پھر انہوں نے اس کی آنکھوں میں اس کی مکاری پڑھ لی اور چیخ پڑے۔

''پاگل نہیں ہوں میں..... مجھے پاگل قرار دے کر تم مجھ سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔ ایف آئی آر بھلے سے نہ کاٹو لیکن میرے بیٹے کا موبائل تمہیں واپس کرنا ہوگا۔ میں اتنا اہم ثبوت تمہیں ہڑپ نہیں کرنے دوں گا۔'' وہ اچھے خاصے سمجھدار اور بردبار آدمی تھے لیکن شفقت شاہ کے دھوکے نے انہیں دھچکا لگایا تھا اور معاذ کے واحد سراغ کو کھو دینے کے خیال سے ان پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی تھی اس لیے زور زور سے چیخنے کے ساتھ ہی انہوں نے خود کو پولیس والوں کی گرفت سے چھڑا کر شفقت شاہ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام رہے اور پولیس والوں نے انہیں اور بھی زیادہ مضبوطی سے جکڑ لیا۔

''چھوڑو..... چھوڑو مجھے..... تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو، تمہارے منہ کو حرام لگا ہوا ہے اسی لیے کسی مظلوم کی دادرسی نہیں کرتے۔'' بے بسی کی انتہا پر وہ نتائج سے بے پروا ہو کر جو جی میں آرہا تھا بول رہے تھے۔

''اٹھا کر باہر پھینکو اس خبطی بڈھے کو۔ یہ تھانہ ہے کوئی تھیٹر ہال نہیں جہاں اسے ڈرامے کرنے کی اجازت دی جاسکے۔ نکالو باہر اسے۔'' شفقت شاہ کی متانت کا خول بھی آخر ٹوٹ گیا اور وہ پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں حکم دے کر اندر جانے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ وہ برآمدے تک بھی نہیں پہنچا ہوگا کہ ماتحت عملے نے دھکے دے کر خاور صاحب کو گیٹ سے باہر کر دیا۔ وہ بہت زور سے زمین پر گرے اور لباس خاک آلود ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ہتھیلیاں اور گھٹنے بھی چھل گئے۔ وہ ایک اچھے عہدے پر کام کرنے والے معزز پڑھے لکھے آدمی تھے جنہیں ان کا ماتحت عملہ بڑی عزت سے سلام کرتا تھا اور افسران قدردانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنی ایسی درگت پر ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ایک تو جوان بیٹے کی گمشدگی کا صدمہ ہی کم نہیں تھا اس پر سے ان کے ساتھ انصاف کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ انہیں ایسا لگا کہ وہ اب کبھی اس جگہ سے نہیں اٹھ سکیں گے۔ ایسے میں دو ہاتھوں نے انہیں شانوں سے تھام لیا۔ انہوں نے تھامنے والے کو دیکھنا چاہا لیکن آنسوؤں کی دھندلاہٹ کے باعث نہ دیکھ سکے۔

''اٹھیے انکل! ہمت کیجیے..... بس یہیں دو قدم پر میری گاڑی کھڑی ہے۔'' کوئی تھا جو بہت محبت اور عزت سے ان سے مخاطب تھا۔ وہ اس کے مضبوط بازوؤں کے سہارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ سہارے ہی سے انہیں سچ مچ دو قدم کے فاصلے پر کھڑی اپنی گاڑی تک لے گیا اور فرنٹ سیٹ پر بٹھایا۔

''پانی پی لیں انکل.....'' وہ جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے اور ہاتھوں کو صاف کر رہے تھے کہ اس نے منرل واٹر کی بوتل ان کی طرف بڑھائی۔ کچھ دیر قبل انہیں شدید پیاس لگ رہی تھی اور اب بھی حلق میں کانٹے اگے ہوئے تھے پھر بھی وہ دو گھونٹ سے زیادہ پانی نہیں پی سکے اور بوتل منہ سے ہٹا کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ ان کے معاذ ہی کی طرح لمبا چوڑا، مضبوط کاٹھی کا لڑکا تھا جس کی امارت اس کی گاڑی اور کپڑوں سے ہی نہیں، چہرے سے بھی چھلک رہی تھی۔

''کون ہو بیٹا تم.....؟'' انہوں نے اس سے دریافت کیا۔

''آپ معاذ کے ابو ہیں نا.....؟ میں اس کا دوست عالم شاہ ہوں۔ ایک بار میں حنین اور کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ آپ کے گھر بھی آیا تھا لیکن شاید آپ کو یاد نہیں رہا۔'' اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

''معاف کرنا بیٹا! آج کل میری ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ کسی بات پر زیادہ دھیان دے سکوں۔ تم یقیناً گھر آئے ہوگے لیکن مجھے تمہاری شکل یاد نہیں ہے۔'' انہوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں اسے جواب دیا۔

''پلیز انکل! ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ آج کل آپ کس تکلیف سے گزر رہے ہیں۔ میں خود بھی معاذ کے لیے بہت فکرمند ہوں لیکن عملی طور پر اس لیے کچھ نہیں کر پا رہا کہ میرے بابا یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آنے سے پہلے انہوں نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ یہاں آئے تو پتا چلا کہ انہیں دل کی تکلیف پریشان کر رہی ہے۔ میں ان کا چیک اپ وغیرہ کروانے میں مصروف ہو گیا۔ ان کی رپورٹس ٹھیک نہیں تھیں۔ ڈاکٹرز نے انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کروانے کا مشورہ دیا لیکن وہ ضد کر کے گھر آگئے کہ گھر پر ہی دوائیں وغیرہ لیتا رہوں گا۔ دو دن خیریت سے بھی گزر گئے لیکن پھر تیسری رات ان کی حالت بہت بگڑ گئی۔ میں ایمرجنسی میں انہیں اسپتال لے کر بھاگا۔ ڈاکٹرز بہت ناراض تھے کہ ہم نے اسی لیے انہیں ایڈمٹ کروانے کا مشورہ دیا تھا کہ ان کی حالت

www.aiffaytech.com

ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ میں کیا کہہ سکتا تھا۔ جو کچھ ہوا اس میں بابا کی مرضی کا دخل تھا۔ بہرحال اسپتال میں ان کا ٹریٹمنٹ شروع ہو گیا اور ڈاکٹرز نے فوری طور پر انجیو پلاسٹی کا فیصلہ سنا دیا۔ اللہ کا شکر ہے، یہ مرحلہ بھی گزر چکا ہے اور بابا آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے ہیں لیکن مجھے سارا دن ان کے ساتھ ہی گزارنا پڑتا ہے۔ میں نے گاؤں میں ان کی حالت کے بارے میں کسی کو خبر نہیں دی تھی کہ ماں اور بہنیں پریشان ہو جائیں گی اس لیے میں ان کا واحد تیماردار ہوں جسے وہ اپنے پاس سے ہلنے بھی نہیں دینا چاہتے۔ اس وقت بھی میں صرف تھوڑی دیر کے لیے گھر گیا تھا کہ فریش ہو جاؤں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میری آپ پر نظر پڑی تو رک گیا۔ آپ اس حال میں تھانے کے باہر کیا کر رہے تھے؟'' وہ چاہتے ہوئے بھی معاذ کی گمشدگی کے معاملے میں اس کے گھر والوں کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا، اس بات کا اسے شدت سے احساس تھا چنانچہ خاور صاحب کو اپنے عذر سے آگاہ کرتے ہوئے ان سے ان کے بارے میں سوال کیا۔

''بس بیٹا! معاذ کے سلسلے میں ہی بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہوں۔ کہیں سے اس کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔'' انہوں نے تفصیل بتانے کے بجائے مختصر بات کی۔

''جی اس کا تو مجھے بھی معلوم ہے۔ میں حنین سے اس سلسلے میں معلوم کرتا رہتا ہوں۔ بہرحال آپ حوصلہ رکھیں، اللہ نے چاہا تو جلد اس کے بارے میں کوئی اچھی خبر ملے گی۔'' اس نے انہیں تسلی دی تو وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئے۔ ان تسلیوں کے سہارے ہی دن پر دن گزر رہے تھے اور ہر گزرتا دن مایوسی میں اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ معاذ کے موبائل سے ملنے والی تصویر نے ذرا امید بندھائی تھی لیکن شفقت شاہ کے دھوکے کے بعد وہ امید بھی ٹوٹ چکی تھی اور حقیقتاً اس وقت وہ ایک ٹوٹے اور ہارے ہوئے انسان کی طرح سر جھکا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عالم شاہ نے ان سے کچھ پوچھے بغیر ہی گاڑی ان کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔ چند منٹوں کا وہ فاصلہ خاموشی سے کٹ گیا۔ عالم شاہ نے گاڑی ان کے دروازے پر لے جا کر روکی ہی تھی کہ پیچھے سے حنین کی بائیک بھی آ کر رکی۔ عالم شاہ کی گاڑی میں خاور صاحب کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

''یہ خاور انکل کہاں مل گئے تمہیں؟'' عالم شاہ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

''تھانے کے سامنے سے لا رہا ہوں انہیں۔ میرے خیال میں چکر آنے سے گر گئے تھے۔ پریشانی میں صحت بھی تو کتنی خراب ہو گئی ہے۔ کمزوری سے چکرا گئے ہوں گے۔ اچھا ہوا کہ وہاں سے گزرتے ہوئے میری نظر پڑ گئی۔ میں بابا کے پاس اسپتال جا رہا تھا۔'' اس نے بتایا تو حنین چونک کر خاور صاحب کو دیکھنے لگا۔ انہوں نے اس سے نظریں چرا لیں۔ وہ سمجھ گیا کہ گڑبڑ ہے لیکن فی الحال کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے عالم شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہارے بابا کی؟ مجھے ٹائم ہی نہیں ملا کہ ایک بار کے بعد دوبارہ ان کی خیریت معلوم کرنے اسپتال آ سکتا۔''

''بابا ٹھیک ہو رہے ہیں اور مجھے تمہارے دوبارہ نہ آ سکنے پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ معاذ کی وجہ سے تمہاری مصروفیت بڑھی ہوئی ہے۔ اگر بابا کی ایسی کنڈیشن نہ ہوتی تو میں بھی تمہارا ساتھ دے رہا ہوتا۔'' عالم شاہ نے اسے جواب دیا۔

''تم لوگ اندر تو چلو بیٹا! کیا یہیں کھڑے کھڑے ہی ساری باتیں کرتے رہو گے؟'' خاور صاحب جو گاڑی سے نیچے اتر آئے تھے، ان دونوں کو ٹوکتے ہوئے بولے۔

''نہیں انکل! میں تو فی الحال اندر نہیں آ سکوں گا۔ بابا سو رہے تھے تو میں اسپتال سے نکلا تھا۔ اب وہ جاگ چکے ہوں گے اور مجھے نہ پا کر پریشان ہو جائیں گے اس لیے میرا اسپتال پہنچنا ضروری ہے۔'' عالم شاہ نے فوراً معذرت کر لی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم جاؤ، تمہاری مجبوری ایسی ہے کہ میں تم سے اصرار بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ تم جیسی خدمت گزار اور سعادت مند اولاد ہر ایک کو دے۔'' خاور صاحب نے اسے دعا دی اور ان دونوں سے مصافحہ کر کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ حنین جس کو پہلے ہی معاذ کے قریبی دوست کی حیثیت سے سب اچھی طرح جانتے تھے، ان چند دنوں میں گھر والوں سے اور بھی قریب ہو گیا تھا اور بالکل گھر کے افراد کی طرح وہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ خاور صاحب کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے گیا۔ گھٹنوں پر آنے والی چوٹوں کی وجہ سے انہیں چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ حنین کے علم میں تھا کہ ان دنوں معاذ کے گھر میں مقیم اس کی پھوپی زاد ثوبیہ میڈیکل کی طالبہ ہے چنانچہ گھر میں جاتے ہی ثوبیہ کو بلا کر خاور صاحب کے زخموں کو دیکھنے کی تاکید کی۔ خراشیں زیادہ گہری نہیں تھیں۔ ثوبیہ نے صفائی کر کے ایک مرہم لگا دیا۔ اسے بھی یہی بتایا گیا کہ چکر آ کر گرنے سے خراشیں آ گئی ہیں۔ سن کر اس نے پین کلر کے ساتھ زبردستی انہیں ایک گلاس دودھ پینے پر مجبور کر دیا۔ وہ اور اس کی والدہ ہی تھیں جن کے دم سے

www.aliboyjeem.com

گھر والوں کے پیٹ میں تھوڑی بہت غذا چلی جاتی تھی ورنہ وہاں تو کسی کو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ پین کلر دینے کے ساتھ ساتھ اس نے احتیاطاً انہیں ٹینشن کا انجکشن بھی لگا دیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حنین نے ان سے حقیقت دریافت کی تو وہ چھپا نہیں سکے اور سب بتا ڈالا۔

''مجھے اور بشریٰ کو ایسے ہی خدشات تھے انکل! بہر حال آپ فکر نہیں کریں، اب ہم لوگ دوسرے طریقے سے اس معاملے سے نمٹیں گے۔'' حنین نے انہیں تسلی دی اور خود بشریٰ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے ساری تفصیل بتائی تو وہ بولی۔

''وہی ہوا جس کا پہلے ہی اندازہ تھا۔ میرے خیال میں تو شفقت شاہ نے اس سلسلے میں سلطان کے باپ سے رابطہ کر کے لمبی رقم کھینچ لی ہو گی۔ بہر حال، ہمیں ان کا پیچھا چھوڑنا نہیں ہے، پریس کانفرنس کا سارا انتظام میں کر چکی ہوں۔ شام چھ بجے تک میری کال پر کئی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے نمائندے یہاں آ جائیں گے۔ تم خاور انکل کو لے کر یہاں آ جانا۔ شفقت شاہ کی بھی ٹھیک سے کھچائی ہو جائے گی اس پریس کانفرنس میں۔''

شام چھ بجے حسب پروگرام سب جمع ہو چکے تھے۔ بشریٰ نے وہیل چیئر پر کانفرنس میں شرکت کی اور یزدانی بلڈرز والوں سے اپنی اور معاذ کی دشمنی کی وجہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ یزدانی والوں کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں معاذ نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا اس لیے ہم دونوں کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ اس نے سرجن قیوم صدیقی کے قتل اور اپنے زخمی ہونے کا الزام بھی ان ہی لوگوں پر لگاتے ہوئے اندیشہ ظاہر کیا کہ معاذ کے غیاب میں سلطان کا ہاتھ ہے۔ سلطان اور کامران کی دوستی کے علاوہ بھی دونوں خاندانوں میں گہرے دوستانہ اور کاروباری مراسم اور مشترکہ مفادات کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے معاذ کے موبائل فون میں موجود تصویر سے لے کر پولیس کے ایف آئی آر درج نہ کرنے اور شفقت شاہ کی دھوکا دہی تک ہر بات کھل کر بیان کر دی۔ اس موقع پر خاور صاحب کے ہاتھوں پیروں پر آنے والی خراشیں بھی خاص طور پر صحافیوں کو دکھائی گئیں۔ صحافیوں کی طرف سے بھی کچھ نرم اور کچھ گرم سوالات کیے گئے بہر حال پریس کانفرنس خوش اسلوبی سے نمٹ گئی اور ہر چینل پر اس کے متعلق خبریں چلنے لگیں۔ مخالفین کی طرف سے بھی ردِعمل ظاہر کیا گیا اور ہر الزام کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے جواب میں الزام لگایا گیا کہ بشریٰ گلزار ان کے مخالفین کے لیے کام کر رہی ہے اور انہیں مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ نیک نامی کو بھی داغ دار کرنا چاہتی ہے کیونکہ سلطان کے والد عرفان اللہ جو کہ ایک سماجی کارکن ہیں اس بار الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر چکے ہیں اور ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے صاف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مقابل کو تمکین سوپ کر دیں گے۔ شفقت شاہ کی طرف سے بھی صاف انکار کیا گیا تھا کہ خاور احمد اس کے پاس آئے تھے اور انہوں نے اسے کوئی موبائل فون دیا تھا۔

مخالفین کے اس موقف کے بعد تبصروں اور تجزیوں کا ایک سیلاب سا آ گیا تھا۔ مخالفین کی طرف سے بشریٰ کے ساتھ ساتھ گلزار عاصم صاحب کو بھی رگیدا جا رہا تھا اور ان کی نیک نامی کو خاطر میں لائے بغیر ان پر الزامات کی بوچھاڑ کی جا رہی تھی کہ وہ عرفان اللہ کے مخالف سیاسی ٹولے کے لیے کام کر رہے ہیں لیکن خود سامنے آنے کے بجائے بیٹی کو آگے کر دیا ہے۔ بشریٰ اینڈ کمپنی کی جانب سے ان سارے الزامات کے جواب میں صرف ایک موقف اختیار کیا گیا تھا اور وہ یہ کہ سلطان کے خلاف معاذ کی گمشدگی کی ایف آئی آر کاٹ کر کسی ایماندار پولیس آفیسر سے اس کیس کی تفتیش کروائی جائے لیکن ایف آئی آر ہنوز نہیں کاٹی گئی تھی۔ ذرائع ابلاغ پر جاری اس لڑائی سے ہٹ کر گلزار عاصم کے پاس ایک فون کال آئی تھی۔ یہ کال شفقت شاہ نے کی تھی اور صرف ایک پیغام دیا تھا کہ کامران کی ٹانگ میں جو گولی ماری گئی تھی، وہ آج بھی محفوظ ہے اور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ یہ گولی اسی پسٹل سے چلائی گئی ہے جو بشریٰ گلزار کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اس پیغام کے بعد وہ لوگ ذرا سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بشریٰ کا کہنا تو یہی تھا کہ اس پیغام کو خاطر میں نہ لایا جائے اور اس بات کو سامنے آنے دیا جائے۔ وہ بھی سب کو بتا دے گی کہ کامران اور سلطان کے غلط عزائم سے بچنے کے لیے اس نے سیلف ڈیفنس میں گولی چلائی تھی لیکن گلزار عاصم جہاندیدہ آدمی تھے انہیں معلوم تھا کہ ان معاملات میں لڑکیوں کو کتنی بری طرح رگیدا جاتا ہے پھر شروع میں ان کی طرف سے ایسی کوئی بات کی بھی نہیں گئی تھی۔ یہاں تک کہ سرجن قیوم صدیقی اور بشریٰ پر کیے جانے والے قاتلانہ حملے کے بعد بھی خاموشی اختیار کر لی گئی تھی۔ اس سے یہ سوال اٹھتا کہ اب کیوں زبان کھولی جا رہی ہے اور موقف تبدیل کیے جا رہے ہیں۔ گلزار عاصم کی دلیل کے مطابق بار بار موقف بدلنے والے سچے ہونے کے باوجود بھی جھوٹے سمجھے جاتے ہیں اس لیے اس پیغام کو

www.urdtaylibrary.com

نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہے، ہاں یہ کوشش کی جا سکتی ہے کہ سلطان کے خلاف نہ سہی لیکن ایف آئی آر ضرور کٹ جائے اور معاذ کے غیاب کو محض ایک حادثے کی نہیں، سازش کی نظر سے بھی دیکھا جائے۔ بشریٰ پہلے ہی بستر پر تھی۔ گلزار عاصم کی مخالفت کے بعد اسے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا لیکن کوئی اور تھا جو ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور اسی سے بشریٰ کی امید بھی بندھی ہوئی تھی۔ اگر یہ امید نہ ہوتی تو شاید وہ گلزار عاصم کی مخالفت کے باوجود بھی اپنی زبان بند نہ رکھ پاتی۔

☆☆☆

''فراری کی سواری ہو، لڑکی اس میں پیاری ہو..... او.....'' سلطان بڑی ترنگ میں گاتا ہوا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور لہجے کی لڑکھڑاہٹ سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے اور یہ نشہ صرف شراب کا نہیں تھا۔ اس میں بہت دخل اس الٹرا ماڈ لڑکی کا بھی تھا جو کیل کانٹوں سے لیس اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ادائے دلربائی سے مسکرائے جا رہی تھی اور اس کی بے سری آواز کے ساتھ ساتھ بے ہودہ حرکات کو بھی بڑی خوش دلی سے برداشت کر رہی تھی۔ رات کے اس پہر سلطان ایک پارٹی سے واپس آ رہا تھا۔ اس پارٹی میں اسی کی طرح کے بگڑے ہوئے امیر زادے شریک ہوئے تھے۔ کھانا پینا، شراب نوشی اور ناچ گانا سب ہوا تھا اس پارٹی میں۔ دل بشوری کے لیے کچھ پیشہ ور لڑکیوں کو بھی بلوایا گیا تھا جنہوں نے اپنے ناچ گانے اور اداؤں سے محفل کو ان کے حساب سے چار چاند لگا دیے تھے۔ سونا نام کی یہ لڑکی سلطان کو زیادہ ہی پسند آ گئی تھی۔ لڑکی خود بھی اس پر خاصی مہربان ہو رہی تھی اس لیے پارٹی کے اختتام پر سلطان اس کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا اور اپنی باقی ماندہ رات کو بھی رنگین بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نہایت ترنگ میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے اندازہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ تعاقب کرنے والی گاڑی نے ایک سنسان سڑک پر اسے اوورٹیک کیا، تب بھی اس نے توجہ نہیں دی کیونکہ اس وقت وہ سونا کے گولڈن بالوں کی لٹ اپنی انگلی میں لپیٹ کر نہایت رومانوی موڈ میں اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اوورٹیک کرنے والی گاڑی آگے نکلنے کے بعد روڈ پر ترچھی ہو کر کھڑی ہو گئی اور سونا نے زور سے چیخ ماری تو اس نے بڑی مشکل سے اپنی گاڑی کو بریک لگائے۔ اچانک بریک لگنے سے زوردار جھٹکا لگا تھا اور سونا کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا تھا۔ خود سلطان بھی اپنے آپ کو بہ مشکل سنبھال سکا تھا اور اسے اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ اپنا ریوالور نکال سکے۔ اس کے کچھ کرنے سے قبل ہی رکی ہوئی گاڑی سے پہلے ہی اتر کر پوزیشن سنبھال لینے والوں نے اسے گھیر لیا تھا اور ایک مشین پسٹل کی نال اس کی کنپٹی سے آ لگی تھی۔

''فوراً نیچے آ جاؤ ورنہ تمہارا بھیجا باہر آ جائے گا۔'' مشین پسٹل کی نال اس کی کنپٹی پر رکھنے والے نقاب پوش نے خوفناک لہجے میں اسے حکم دیا۔

''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟'' سلطان نے خود کو سنبھال کر سوال کرنے کی ہمت کی۔ اس صورتِ حال نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا تھا اور وہ اندازہ لگا رہا تھا کہ یہ ڈاکو ہیں جو اسے رقم اور قیمتی اشیا سمیت شاید اس گاڑی سے بھی محروم کر دینا چاہتے ہیں۔

''بکواس بند کر اور نیچے اتر۔'' نقاب پوش کو اس کا سوال کرنا پسند نہیں آیا اور پسٹل کے دستے سے اس کے جبڑے پر ایک ہلکی سی ضرب لگائی۔ سلطان بلبلا کر رہ گیا۔ پچھلے دنوں معاذ کے ہاتھوں اس نے اپنے سامنے کے دانت گنوائے تھے، اب مزید نقصان نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ برابر والی سیٹ پر سونا سراسیمہ اور ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈیش بورڈ سے ٹکرانے کے باعث اس کے سر پر گومڑا ابھر آیا تھا اور ساری شوخی ہوا ہو گئی تھی۔

''چل گاڑی میں بیٹھ۔'' نقاب پوش نے سلطان کے اندازے کے برخلاف اسے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا تو وہ چونک گیا۔

''گاڑی میں کیوں بیٹھوں؟ تمہیں جو کچھ چاہیے لے لو اور میری جان چھوڑ دو۔'' اس نے ایک بار پھر اڑنے کی کوشش کی۔

''ہمیں تیری جان کے علاوہ کچھ نہیں چاہیے۔ چل شرافت سے بیٹھ گاڑی میں۔'' اکھڑ لہجے میں اسے حکم دینے کے ساتھ ہی اس کی تشریف پر زوردار لات رسید کی گئی تو وہ لڑکھڑا کر گاڑی کے قریب پہنچ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کسی نے گریبان پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔ وہ کوئی مزاحمت کر پاتا اس سے قبل ہی اس کے سر پر زوردار وار کر کے اسے بے ہوش کر دیا گیا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں وہ گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو پوزیشن کچھ یوں تھی کہ سلطان پائیدان پر پڑا ہوا تھا اور پچھلی نشست پر براجمان دونوں افراد نے بڑے اطمینان سے اپنے پیر اس کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔

www.aldhayeen.com

تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اس گاڑی نے جلد انہیں ان کی منزل پر پہنچا دیا۔ ایک بڑی سی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے ہارن دیتے ہی گیٹ کھل گیا۔ ڈرائیور گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی اندر رکتے ہی پچھلی نشست پر سوار افراد پھرتی سے نیچے اترے اور پائیدان میں بے ہوش پڑے سلطان کو کھینچ کر نیچے اتارا۔ اس کے بعد دونوں اسے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اندرونی حصے کی طرف لے جانے لگے۔ ان کے چہروں پر اطمینان تھا۔ اپنے نقاب انہوں نے راستے میں ہی اتار دیے تھے اور اب سلطان کو اٹھائے نیچے تہ خانے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ہر کام طے شدہ منصوبے کے مطابق کر رہے ہیں۔ تہ خانے میں پہنچ کر انہوں نے سلطان کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ باندھنے کے دوران وہ ذرا سا کسمسایا تھا اور لگتا تھا کہ اب ہوش میں آنے والا ہے۔ انہوں نے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کیا اور ان میں سے ایک نے اس کے بائیں گال پر زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ تھپڑ کھاتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور الوؤں کی طرح دیدے گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ فوراً ہی اس کے دائیں گال پر دوسرا تھپڑ رسید کر دیا گیا۔ اس تھپڑ کو کھا کر اس کے حواس مکمل طور پر کام کرنے لگے اور اسے یاد آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

''کون ہو تم لوگ اور مجھے اغوا کرنے کا کیا مقصد ہے؟'' سلطان نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''معاذ کہاں ہے؟ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟'' جس شخص نے اسے تھپڑ رسید کیے تھے، اسی نے اسے گھورتے ہوئے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''اوہو، وہ چڑی مار تو بڑا شریف زادہ بنا پھرتا تھا پھر اس کا تم جیسے بدمعاشوں سے کیا رشتہ نکل آیا جو تم اس کے لیے یوں ہلکان ہو رہے ہو؟'' سلطان نے طنز کے تیر چلائے۔ دو تھپڑ کھا چکنے کے باوجود وہ خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میری بات غور سے سنو..... کی اولاد۔ ہمیں حکم ملا ہے کہ ہمیں تم سے معاذ کے بارے میں معلوم کرنا ہے اور وہ ہم معلوم کر کے رہیں گے چاہے اس کے لیے ہمیں تمہاری کھال ہی کیوں نہ اتارنی پڑے۔'' صرف ایک شخص تھا جو سلطان سے مخاطب تھا۔ وہ اردو بول رہا تھا لیکن ادائیگی کا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ وہ سندھی ہے۔

''میں معاذ کے بارے میں تمہیں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں باقی اسٹوڈنٹس کی طرح اپنے خیمے میں تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں گیا اور کس حادثے کا شکار ہوا۔ اس کی وجہ سے تو ہم سب کی پکنک بھی خراب ہو گئی۔'' سلطان نے منہ بنا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''یہ ایسے سچ نہیں بتائے گا سچل! تم پیچھے ہٹ جاؤ میں خود اس سے سچ اگلوا لوں گا۔'' وہ آدمی جواب تک پیچھے ہٹ کر خاموش کھڑا ہوا تھا، آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ بھی اس کے سندھی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

''تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔ میرا باپ اس ملک کا ایک بارسوخ آدمی ہے۔ اسے میرے اغوا کی خبر ملے گی تو وہ سارے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔'' اس کے سنگین ارادوں کو محسوس کرتے ہوئے سلطان نے اسے دھمکی دی۔

''تمہارے باپ کے کچھ کرنے سے قبل ہم تمہارے ساتھ بہت کچھ کر چکے ہوں گے۔'' وہ شخص سلطان کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا اور اس کے مقابل کھڑا ہو کر یوں اس کا جائزہ لینے لگا جیسے قصائی ذبح کرنے والے جانور کا جائزہ لے رہا ہو۔ اچھی طرح جائزہ لے چکنے کے بعد اس نے سر ہلایا اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یار سچل! ایسے کھڑے کھڑے تو یہ سیٹھ کی اولاد تھک جائے گا۔ اس کے لیے میز کرسی کا انتظام کر دو تاکہ میں ٹھیک سے اس کی خاطر کر سکوں۔'' سچل نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا اور چند منٹوں کے اندر وہاں میز کرسی نظر آنے لگی۔ سلطان کو کرسی پر بٹھا کر باندھ دیا گیا۔ پھر میز پر ایک چھوٹی سی ٹرے لا کر رکھی گئی۔ ٹرے میں ایک باریک چمٹی، برش اور شیشے کے چھوٹے سے جار کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جار کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا اور اس سے دھواں سا نکل رہا تھا۔ سلطان حیرت سے ان چیزوں کو دیکھتا رہا۔

''تم بڑی زوردار دعوت اڑا کر آ رہے ہو۔ وہاں تمہاری بڑی خاطر ہوئی ہو گی لیکن جو خاطر ہم تمہاری کریں گے، اس کا تمہیں کبھی تجربہ نہیں ہوا ہو گا۔'' اس نے ٹرے میں سے چمٹی اٹھائی اور سلطان کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ اگلے ہی لمحے سلطان کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔ اس شخص نے باریک چمٹی کی مدد سے گدی کے پاس سے اس کا ایک بال اکھاڑ لیا تھا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم نے آج کل کے چھوکروں کی طرح لمبے لمبے بال نہیں رکھے ہوئے۔ تمہارا بالوں کا اسٹائل سب سے ہٹ کر ہے اور اب میں اسے اور بھی شاندار لک دے دوں گا۔'' اس نے سلطان کے خشخشی بالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی چیخ کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور بولتے بولتے ہی

www.urdtaylem.com

اس کا دوسرا بال بھی کھینچ چکا تھا۔ اس بار سلطان ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے اس کے منہ سے چیخ نہیں نکلی اور وہ بس ہلکی سی سسکاری لے کر رہ گیا۔

''میں ذرا منفرد ہیئر اسٹائلسٹ ہوں اس لیے بالکل الگ طریقے سے بالوں کی سیٹنگ کرتا ہوں۔ اس چمٹی سے تمہارے بال اکھاڑتا ہوا میں گدی سے پیشانی تک ایک لکیری بنا دوں گا اور پھر اسے پرمنٹ کرنے کے لیے اس پر تیزاب لگاؤں گا۔ یہ جو سامنے جار میں محلول نظر آ رہا ہے یہ گندھک کا تیزاب ہے۔ یہ بہت طاقتور تیزاب ہوتا ہے۔ میں برش سے نہایت صفائی سے مطلوبہ مقامات پر یہ تیزاب لگاؤں گا تو پھر کبھی دوبارہ اس جگہ بال نہیں نکلیں گے۔'' وہ سلطان کو تفصیل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ چمٹی سے تیزی سے اس کے بال بھی اکھاڑتا جا رہا تھا۔ اپنے سندھی لہجے کے باوجود وہ ایک پڑھا لکھا شخص محسوس ہو رہا تھا جس کے انداز میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ کچھ دیر پہلے اکڑ کا مظاہرہ کرنے والا سلطان اب اس سے خوف محسوس کر رہا تھا لیکن پھر بھی ابھی تک اس نے زبان کھولنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

''میرے خیال میں، میں پورا اسٹائل بنانے سے پہلے تمہیں اس تیزاب کا ٹیسٹ کروا دیتا ہوں تاکہ تم میرے کام کی کوالٹی کا اندازہ لگا سکو۔'' اس نے اچانک ہی چمٹی ٹرے میں واپس رکھ کر اس میں پڑا ہوا پتلا سا برش اٹھایا اور اس کا سرا تیزاب میں ڈبو کر سلطان کے سر پر اس مقام پر پھیرا جہاں سے بال اکھیڑے تھے۔ بال اکھیڑنے کی وجہ سے وہ پہلے ہی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ تیزاب لگا تو چیخ نکل گئی۔ تیزاب اتنا طاقتور تھا کہ لگاتے ہی گوشت کے جلنے کی بو محسوس ہونے لگی۔

''اسٹاپ، اسٹاپ اٹ۔'' سلطان بری طرح بلبلا کر چیخا۔

''ابھی تو یہ اسٹارٹ ہے۔ سر کے بالوں کے بعد میں تمہاری آئی بروز کو نیا لک دوں گا اور مزید ضرورت محسوس ہوئی تو جسم کے دوسرے حصوں پر بھی نقش و نگار بناؤں گا لیکن یاد رکھنا کہ میں منفرد ہیئر اسٹائلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد پینٹر بھی ہوں اور پینٹنگ کے لیے کلرز کے بجائے تیزاب استعمال کرتا ہوں۔'' سلطان کے تڑپنے کی پروا کیے بغیر وہ ایک بار پھر اس کے سر کے بال نوچنا شروع کر چکا تھا اور اسے اپنے باقی پروگرام سے آگاہ کر رہا تھا۔

''چھوڑ دو، پلیز مت کرو۔'' سلطان گڑگڑانے لگا۔

''تم بہت ناشکرے اور بدذوق آدمی ہو یار..... میں تمہیں ایک نیا لک دے رہا ہوں اور تم ہو کہ شور مچائے جا رہے ہو۔'' اس نے لہجے میں بڑی اپنائیت بھری خفگی سموتے ہوئے سلطان سے شکوہ کیا۔

''پلیز..... تم جو کچھ پوچھو گے، میں تمہیں سب بتا دوں گا۔'' التجائیہ لہجے میں بولتے سلطان کا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ باپ کے پیسے کے بل پر غنڈا گردی کرنا الگ بات تھی اور اس قسم کے تشدد کو سہنا الگ بات۔ منٹوں میں ہی اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔

''ٹھیک ہے، تم ایسا چاہتے ہو تو ایسے ہی سہی لیکن یہ سوچ کر رکھنا کہ تمہیں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ تمہاری زبان رکی تو میرا ہاتھ چلے گا اور اب میں سیدھا تمہارے چہرے پر کام کروں گا۔ یہ جو تم لیڈی کلر بنے پھرتے ہو نا، کسی کو اپنی صورت دکھانے کے لائق نہیں رہو گے۔'' اس نے دھمکی دی۔

''مجھے منظور ہے لیکن پہلے مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔ میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔'' سلطان نے فوراً ہامی بھر لی تو سچل نے اسے اس کی فرمائش پر پانی پلا دیا۔ پانی پی کر اس کی حالت کافی بہتر نظر آنے لگی۔

''میں تمہاری رسیاں کھلوا رہا ہوں لیکن کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

''میں نہیں کروں گا۔'' سلطان نے یقین دہانی کروائی۔ ویسے بھی وہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے مخاطب نے اپنی جیب سے ایک پسٹل نکال کر اس کا رخ اس کی طرف کر دیا ہے۔

''ہاں، اب بتاؤ کہ تم نے معاذ کے ساتھ کیا کیا تھا اور وہ کہاں ہے؟'' سچل، سلطان کی رسیاں کھول چکا تو اس پر پہلا سوال داغا گیا۔

''وہ کہاں ہے، اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں ہے لیکن میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ اس دن کیا ہوا تھا۔ صبح کی روشنی پھیلنے سے کچھ دیر قبل میں حاجت محسوس ہونے پر اپنے خیمے سے باہر نکل کر کچھ فاصلے پر چلا گیا تھا اور فارغ ہو کر واپس آ ہی رہا تھا کہ میں نے معاذ کو دیکھا۔ وہ بہت مگن سی کیفیت میں آگے کی طرف جا رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت تھی کیونکہ اس کی دخل اندازی کی وجہ سے ایک تو بشریٰ ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی دوسرے کامی کو ٹانگ پر گولی کھانے کے علاوہ مجھے بھی اپنے دانتوں سے محروم ہونا پڑا تھا۔ بشریٰ کے معاملے میں کامی کے فادر نے ہمیں کچھ بھی کرنے سے روک رکھا تھا اس لیے اس کے خلاف تو ہم نے کوئی پلاننگ نہیں کی لیکن معاذ کو ہم معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس روز اتنی صبح کے وقت

www.dilkaysjeelte.com

میں نے اسے اکیلا جاتا دیکھا تو مجھے لگا یہ ایک اچھا موقع ہے۔ میرا پسٹل میری جیب میں تھا اس لیے میں بے خطر اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں کافی فاصلے اور احتیاط سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ خود بھی بڑا محتاط تھا اس لیے اسے احساس بھی نہیں ہو سکا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میں اس کا پیچھا کرنے میں بری طرح ہانپ گیا تھا لیکن وہ مزے سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے وہ موقع مل گیا جس کی تلاش میں، میں اس کے پیچھے گیا تھا۔ وہ بہت انہماک سے ایک پتھر پر کھڑا پہاڑی بکرے کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے گیا اور وہیں پڑا ایک پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ نیچے گر گیا۔ میں یہ دیکھنے کے لیے وہاں نہیں رکا کہ وہ گر کر کہاں لڑھکا ہے۔ میں فوراً ہی واپس پلٹ گیا تاکہ دوسرے لوگوں کے جاگنے سے پہلے اپنے خیمے میں پہنچ جاؤں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ سب کو پتا ہے۔ میں بھی حیران ہوں کہ معاذ کہاں گیا۔'' اس نے ایک ہی سانس میں پوری تفصیل کہہ سنائی۔

''ایس ایچ او شفقت شاہ کے پاس معاذ کا موبائل تھا اور اس میں ایک سیلفی تھی جس میں تمہارا چہرہ بھی آ گیا تھا۔ بعد میں ایس ایچ او نے وہ موبائل ہی ہضم کر لیا..... کیوں؟''

''وہ ایس ایچ او بڑا چالاک بندہ ہے۔ اس نے دیکھا کہ معاذ کے باپ سے تو اسے کچھ ملے گا نہیں اور خوامخواہ کیس میں جان مارنی پڑے گی اس لیے وہ میرے والد سے ملا اور ان سے سودا کر لیا۔ اس سیلفی میں میرا چہرہ اتنا نمایاں نہیں تھا پھر بھی میرے والد نے رسک نہ لینا ہی مناسب سمجھا اور شفقت شاہ کی ڈیمانڈ پوری کر دی۔'' سلطان نے اس سوال کا بھی شرافت سے جواب دے دیا۔ بشریٰ اور سرجن قیوم صدیقی پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بارے میں البتہ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس سے قبل بشریٰ اور معاذ کے تعاقب اور فائرنگ کے حوالے سے بھی وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

''ٹھیک ہے، فی الحال تم آرام کرو۔ دیکھتے ہیں تمہارے بارے میں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔'' تمام ضروری سوالات کرنے کے بعد سلطان کو حکم دیا گیا۔ وہ کچھ بولتا اس سے قبل ہی اس کے پیچھے کھڑے پچل نے اس کی کھوپڑی بجا ڈالی۔ نتیجتاً وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

''تم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دو، میں سائیں سے اگلا حکم معلوم کرتا ہوں۔'' پچل کا ساتھی اس سے کہہ کر تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ اوپر کوٹھی کے ایک کمرے میں حسنین اور عالم شاہ اس کے منتظر تھے۔

''ویری ویل ڈن سرمد! تم نے سارا کام بہت اچھے طریقے سے کیا۔'' اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی عالم شاہ نے اسے شاباش دی۔ سلطان کو اغوا کر کے اس سے حقیقت اگلوانے کا آئیڈیا عالم شاہ کا ہی تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا شمار وڈیروں کی شریف قسم میں ہوتا تھا لیکن زمین داری کے اپنے بکھیڑے ہوتے ہیں۔ مخالفین سے نمٹنے اور اپنے تحفظ کے لیے بہرحال ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو وقت پڑنے پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہیں۔ سرمد بھی ان ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہ پڑھا لکھا نوجوان تھا اور اپنے مالکوں پر جان چھڑکتا تھا۔ اس وقت بھی بڑی عاجزی سے بولا۔

''میں تو آپ کے حکم کا غلام ہوں سائیں! جو آپ نے کہا میں نے کر دیا لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے دوست کا پتا پھر بھی نہیں چل سکا۔''

''ہاں اس پر تو مجھے بھی افسوس ہے لیکن اس کے دشمن کو تو اس کے انجام تک پہنچانے کا موقع مل گیا ہے۔ سلطان کے اعتراف کی یہ ویڈیو اس کے خلاف ایک اہم ثبوت ثابت ہوگی۔'' عالم شاہ کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ سلطان کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ سرمد نے اس پر جو پسٹل تان رکھا ہے، اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسپائی کیمرا بھی منسلک ہے۔ اس کیمرے نے جو ویڈیو بنائی تھی، وہ عالم شاہ اور حسنین اوپر بیٹھے بیٹھے عالم شاہ کے موبائل پر دیکھتے رہے تھے۔

''آگے حکم دیں سائیں کہ اس بندے کا کیا کرنا ہے؟'' سرمد نے دریافت کیا تو عالم شاہ نے سوالیہ نظروں سے حسنین کی طرف دیکھا۔

''اسے چھوڑنا پڑے گا۔ اپنا مقصد تو ہم حاصل کر ہی چکے ہیں۔'' حسنین نے جواب دیا۔ وہ سیدھی سادی زندگی گزارنے والا متوسط خاندان کا لڑکا تھا جو اس ساری صورتِ حال پر کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ کسی بندے کی ریکی کر کے اسے اغوا کروانا اور پھر اس پر تشدد کر کے اس سے سچ اگلوانا..... ان سب چیزوں کو اس نے بس اسکرین پر ہی دیکھا تھا اور کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح کی کسی صورتِ حال سے اس کا بھی کوئی واسطہ پڑ سکتا ہے۔

''ہونے کو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلطان آج کی رات کی صبح نہ دیکھے۔'' عالم شاہ کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ میں اور بشریٰ ایسا کچھ نہیں

www.aftabjeem.com

چاہتے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم اتنی کارروائی پر بھی صرف اس لیے راضی ہوئے تھے کہ ہمیں معاذ کے بارے میں کچھ معلوم ہونے کی امید تھی ورنہ ہم قانون کو ہاتھ میں لینے والے لوگ نہیں ہیں۔'' حسین نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے شدت سے انکار کیا۔

''کوئی بھی شریف آدمی قانون کو ہاتھ میں لینا پسند نہیں کرتا دوست لیکن جس قانون کو شفقت شاہ جیسے لوگوں نے یرغمال بنا رکھا ہو، اسے ہاتھ میں نہ لیں تو کیا کریں؟'' عالم شاہ نے دلیل دی۔

''جتنی ضرورت تھی، ہم نے قانون کو ہاتھ میں لے لیا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں چاہتے۔'' حسین کا لہجہ روکھا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے یار! میں بھی ایسے ہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔ سلطان کو پھنسانے کے لیے اس کی یہ اعترافی ویڈیو ہی کافی ہے۔ ہم اس ویڈیو کو میڈیا کے ذریعے پبلک کے سامنے لائیں گے پھر دیکھیں گے کہ پولیس کیسے کچھ نہیں کرتی۔'' عالم شاہ نے ہنس کر اسے تسلی دی پھر سرمد کی طرف رخ کر کے بولا۔

''اسے اس کے گھر کے آس پاس کہیں پھینک آؤ۔ ہوش میں آئے گا تو خود ہی اٹھ کر گھر واپس چلا جائے گا۔''

''جو حکم سائیں۔'' سرمد سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

''یہ کام تو ہو گیا۔ اب ایسا کرو کہ تم سو جاؤ۔ صبح ناشتے کے بعد اس ویڈیو کو بشریٰ تک پہنچا دینا۔ وہ آگے کی کارروائی نمٹا دے گی۔'' سرمد کے جانے کے بعد عالم شاہ حسین سے مخاطب ہوا تو وہ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔ عالم شاہ نے ایک ملازم کو آواز دی کہ وہ حسین کو گیسٹ روم میں پہنچا دے اور خود حسین سے مصافحہ کر کے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے واپس اسپتال جانا تھا۔ اس اہم کام کو نمٹانے کے لیے وہ چند گھنٹوں کے لیے وہاں سے گھر آ گیا تھا لیکن چاہتا تھا کہ صبح جب اس کے والد کی آنکھ کھلے تو وہ وہاں ان کے سامنے موجود ہو۔

☆☆☆

ظالموں کی رسی بڑی دراز ہوتی ہے اور انہیں مسلسل چھوٹ ملتی رہتی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ کبھی تائب ہو جائیں اور سیدھے راستے پر چلنے لگیں لیکن عموماً دیکھا یہی گیا ہے کہ اس چھوٹ کو اپنی کامیابی اور خوش قسمتی سمجھتے ہوئے ایسے لوگ تسلسل سے اپنی کارروائیاں جاری رکھتے ہیں۔ سلطان، کامران اور ان کے باپوں کا شمار بھی اسی قبیل کے لوگوں میں ہوتا تھا۔ سلطان کے اغوا کی خبر اس کے گھر پہنچ چکی تھی۔ وہ جس کال گرل کے ساتھ تھا، اس نے تو اس معاملے میں ملوث ہونا پسند نہیں کیا تھا اور خاموشی سے جائے وقوعہ سے بھاگ گئی تھی لیکن پولیس کی ایک گشتی ٹولی نے سلطان کی گاڑی کو سڑک پر کھڑا دیکھ لیا تھا۔ اس گشتی ٹولی میں ایک ایسا پولیس والا بھی موجود تھا جو سلطان کے باپ کا نمک خوار تھا اور اس کی گاڑی کو پہچانتا تھا۔ فوراً ہی رابطہ کر کے گاڑی کی وہاں موجودگی کی اطلاع دی گئی اور سلطان کے باپ کا آرڈر ملتے ہی پولیس نے پھرتیاں دکھانا شروع کر دیں۔ سیدھے سادے کیس حل نہ کرنے والی ہڈحرام پولیس جب کام کرنے پر آئے تو اس کی کارکردگی قابلِ دید ہوتی ہے۔ فوراً ہی پتا چلا لیا گیا کہ سلطان اپنے ایک دوست کے گھر سے ایک کال گرل سونا کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ کسی کال گرل تک پہنچنا پولیس کے لیے کیا مشکل بات تھی۔ پولیس والوں کے سامنے سونا نے اعتراف کر لیا کہ سلطان کے اغوا کے وقت وہ اس کے ساتھ گاڑی میں موجود تھی لیکن اغوا کاروں کی نشاندہی کے سلسلے میں وہ کوئی مدد نہیں کر سکی۔

بیٹے کے اغوا کی تصدیق ہوتے ہی عرفان اللہ نے پولیس کے محکمے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ممکن تھا کہ میڈیا کو بھی خبر مل جاتی لیکن اس سے قبل ہی عرفان اللہ کے گھر کی طرف آنے والی ایک پولیس موبائل نے راستے میں بے ہوشی کی حالت میں پڑے سلطان کو دیکھ لیا۔ فوراً سیل فونز کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ نتیجتاً سلطان کو فوری طور پر ایک مہنگے پرائیویٹ اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کی حالت کوئی ایسی خاص خراب نہیں تھی۔ ابتدائی طبی امداد ملتے ہی وہ ہوش میں آ گیا لیکن عرفان اللہ کے اشارے پر ڈاکٹرز نے پولیس والوں کو سلطان سے ملنے کی اجازت نہیں دی اور پہلے بند کمرے میں باپ بیٹے نے تفصیلی ملاقات کی۔ عرفان اللہ نے بیٹے سے ساری تفصیل سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔

''یقیناً انہوں نے تمہارے اعتراف کی ویڈیو بنالی ہو گی۔'' چالاک عرفان اللہ کے لیے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

''معلوم نہیں، میں نے انہیں ایسا کچھ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' سلطان نے جواب دیا۔

''انہوں نے خفیہ طور پر ویڈیو بنائی ہو گی تاکہ تمہیں معلوم نہ ہو سکے۔ تمہارا کہنا ہے کہ تم ان لوگوں کو نہیں پہچانتے لیکن انہوں نے تم سے جو کچھ پوچھا اس سے یہ تو واضح ہے کہ وہ جو بھی تھے، ان کا تعلق معاذ سے تھا۔'' عرفان اللہ بالکل درست سمت میں سوچ رہا تھا۔

www.urdupoint.com

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ ٹھیک ہے لیکن میں حیران ہوں کہ معاذ کے دوستوں اور ہمدردوں میں سے کون اتنا بااختیار ہوسکتا ہے کہ اتنی بڑی کارروائی کر سکے۔ ان لوگوں نے جس انداز میں مجھے اغوا کیا، وہ انداز بالکل پروفیشنل تھا۔ ان کی گاڑی بھی بہت شاندار تھی اور اسلحہ بھی زبردست تھا۔ مجھے جس تہ خانے میں رکھا گیا، وہ بھی بہت وسیع و عریض تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ کسی بڑی عمارت کا حصہ تھا۔ میرے اغوا سے لے کر اب تک چند گھنٹے کا ہی عرصہ گزرا ہے جس کا مطلب ہے کہ مجھے شہر کے اندر ہی کسی جگہ لے جایا گیا تھا اور میں نہیں جانتا کہ اس شہر میں اتنے وسائل رکھنے والے کس شخص کو معاذ سے ہمدردی ہے۔''

سلطان الجھا ہوا تھا، جواباً عرفان اللہ کے چہرے پر ایک مکارانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''بے شک ہم اتنے وسائل رکھنے والے معاذ کے ہمدرد کو نہیں جانتے لیکن ایک ایسی ہستی کو تو جانتے ہیں جو ہمیں اس ہمدرد تک پہنچا سکتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے.....'' سلطان کی آنکھیں چمکیں۔

''تم ٹھیک سمجھے ہو اور اب ہمیں جو بھی کرنا ہے، بہت تیزی سے کرنا ہے۔ ورنہ صبح شاید ہر نیوز چینل پر تمہاری اعترافی ویڈیو چل رہی ہو۔ تم یہاں آرام کرو، جب تک میری اجازت نہیں ہوگی ڈاکٹرز پولیس والوں کو تمہارے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیں گے۔ میں یہ اہم کام کرلوں تو پھر پولیس والوں کو بھی نمٹا دوں گا۔ ان سے ہمارا گھر جیسا معاملہ ہے۔ ان سے میں جو بھی کہوں گا وہ اسے آسانی سے مان لیں گے۔''

''ٹھیک ہے ڈیڈ! آپ جو ٹھیک سمجھیں کریں۔ مجھے تو اب نیند آرہی ہے۔'' سلطان نے ایک زوردار جماہی لی۔ عرفان اللہ محبت سے بیٹے کا شانہ تھپک کر باہر نکل گیا۔ اپنے بیٹے کے لیے اتنی محبت دل میں رکھنے والے کو معاذ کے باپ کے جذبات کا قطعی احساس نہیں تھا کہ کیسے وہ مجبور باپ اپنے بیٹے کے لیے تڑپ رہا ہوگا۔

☆☆☆

عائشہ گلزار مصلے پر بیٹھی بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگنے میں مصروف تھیں۔ اس وقت معاذ ان کی دعاؤں کا خصوصی مرکز تھا۔ چند دن میں عزیز ہو جانے والے اس لڑکے کی سلامتی کے لیے وہ چوبیس گھنٹے کے دن کے اس حصے میں سب سے زیادہ ارتکاز سے دعا مانگتی تھیں جب رب خود اپنے بندوں کو پکارتا ہے کہ ہے کوئی مجھے پکارنے والا۔ مجھ سے مدد مانگنے والا۔ عائشہ پیدائشی مسلمان نہیں تھیں جو دین کو بھی ماں باپ سے ورثے میں ملی ہوئی دیگر چیزوں کی طرح برتتے ہیں۔ انہوں نے اسلام کو اچھی طرح سمجھ کر اسے اپنایا تھا۔ اس لیے بہت سے پیدائشی مسلمانوں سے زیادہ اچھی مسلمان تھیں اور معاملات میں دیانت داری اور اصول پسندی کے ساتھ ساتھ عبادات پر بھی خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ رات کے آخری پہر تہجد کے لیے جاگنا ان کا برسوں کا معمول تھا۔ آج بھی وہ اسی معمول کے مطابق عبادت میں مصروف تھیں اور اپنا دامن اس رب کے حضور پھیلا رکھا تھا جو دنیا کی ساری ماؤں سے بڑھ کر مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ دعا مانگتے ہوئے ان کا انہماک اتنا شدید تھا کہ وہ ان مدھم آوازوں کو بھی نہیں سن سکی تھیں جو گھر میں بنا اجازت گھس آنے والوں کی آمد سے ابھری تھیں۔ ان کا ارتکاز تو اس وقت ٹوٹا جب دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور دو اسلحہ بردار دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کی آمد کا انداز ایسا تھا کہ گہری نیند سوئی ہوئی بشریٰ کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اس کے اسپتال سے آنے کے بعد سے عائشہ اسی کے کمرے میں سونے لگی تھیں تاکہ کسی وقت کوئی ضرورت پڑنے پر اسے پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟'' ان کی آمد کے تہلکہ خیز انداز کے باوجود عائشہ نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے میڈم! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' انہیں یہ جواب دینے والا وہ تیسرا مسلح آدمی تھا جو گلزار عاصم کو اسلحے کے زور پر ہاتھ اٹھوائے کمرے کے اندر لا رہا تھا۔

''اگر تم ڈاکو ہو تو جان لو کہ اس گھر میں لوٹنے کے لیے کوئی قیمتی شے موجود نہیں ہے۔ بس تھوڑی سی رقم ہے جو میں بغیر مزاحمت کے تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' عائشہ نے انہیں پیشکش کی۔

''کہاں سے کیا لوٹنا ہے یہ ہم خود اچھی طرح جانتے ہیں۔ قیمتی چیزوں کو بھی ہماری آنکھیں فوراً پہچان لیتی ہیں۔'' مکروہ لہجے میں کہتے ہوئے اس شخص نے جن نظروں سے عائشہ کو سر سے پیر تک دیکھا، وہ جوان بیٹی کی ماں ہوتے ہوئے بھی کانپ گئیں۔ انہوں نے انگلینڈ کے آزاد ماحول میں پرورش پائی تھی۔ اپنی تہذیب اور معاشرے کے اعتبار سے کھلا ڈلا لباس بھی پہنتی رہی تھیں لیکن ایسی چھیدتی ہوئی

www.aiffaayeem.com

نظروں سے ان کا پہلی بار واسطہ پڑا تھا اور سر سے پیر تک مکمل لباس میں ہوتے ہوئے بھی انہیں ایسا لگا تھا کہ اس شخص نے ان کے پورے جسم کو کھنگال ڈالا ہو۔ وہ اس شخص سے محض نظریں چرا کر رہ گئیں۔

''اولڈ از گولڈ کا مقولہ سنا تھا لیکن تجربہ پہلی بار ہو رہا ہے۔ آج تک ہم نے دیسی جوانیوں کے ذائقے ہی چکھے ہیں، آج ذرا ولایتی میم بھی چکھ کر دیکھیں گے۔'' عائشہ کے سرتاپا مشرقی لباس میں ہونے کے باوجود اس نے پہچان لیا تھا کہ ان کا تعلق مشرق سے نہیں تھا۔

''بکواس بند کرو اور سیدھی طرح بتاؤ کہ تمہاری یہاں آمد کا مقصد کیا ہے؟'' اس کی بے ہودگی نے گلزار عاصم کے ضبط کا پیمانہ لبریز کر دیا اور اسلحے کی زد میں ہونے کے باوجود انہوں نے سخت مشتعل لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''اوہو، اس اولڈ مین کے جسم میں بھی جوانی انگڑائیاں لے رہی ہے، خون جوش مار رہا ہے۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اس کا کوئی علاج کرنا پڑے گا۔ چل نمبر نو ذرا اسے کرسی سے باندھ کر تو بٹھا دے۔ خوامخواہ بجھتی جوانی کی لو پھڑک کر ہمارا کام خراب کرے گی۔'' گلزار عاصم کے بول پڑنے کا مذاق اڑاتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو حکم دیا جس پر فوراً عمل کیا جانے لگا۔ انہوں نے مزاحمت کی تو ان کے ساتھ بدسلوکی کی گئی اور دو تین تھپڑ جڑ کر زبردستی کرسی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔

''اب ٹھیک ہے۔ اب ہم آرام سے کھیلیں گے۔'' اس نے یوں اطمینان کا اظہار کیا جیسے گراؤنڈ میں کھیل کے لیے جمع ہونے والے بچے اپنے حسبِ منشا ماحول ترتیب دے کر خوش ہوتے ہیں۔

''اتنی بدتمیزی کرنے سے بہتر ہے تم اپنی آمد کا مقصد بیان کر دو۔'' اس بار بشریٰ نے قدرے سخت لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ وہ بغیر سہارے کے بستر سے اتر کر چل پھر نہیں سکتی تھی اس لیے ابھی تک بستر پر ہی موجود تھی اور صرف اتنا کر سکی تھی کہ اپنے بالائی دھڑ کو اوپر اٹھا کر تکیے کے سہارے مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اپنی یہ معذوری اس وقت اسے بہت زیادہ کھٹک رہی تھی۔ عمومی حالات میں وہ بہت پھرتیلی تھی اور خود حفاظتی کے خیال سے اس نے تھوڑے بہت ہاتھ پیر چلانے سیکھ رکھے تھے لیکن ابھی تو اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھا اپنا پسٹل بھی نکالنے سے قاصر تھی۔ اگر تندرست ہوتی تو شاید مسلح افراد کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اپنے والدین سے بدسلوکی پر حرکت میں آ جاتی۔ اس نے دیکھا تھا کہ گلزار عاصم کو باندھتے اور مارتے دیکھ کر عائشہ بے ساختہ ہی حرکت میں آئی تھیں اور گلزار عاصم اور ان لوگوں کے درمیان رکاوٹ بننے کی کوشش کی تھی لیکن ان میں سے ایک نے انہیں بے دردی سے کھینچ کر پیچھے ہٹا دیا تھا اور اس کھینچا تانی کے دوران ان کا نماز کے لیے سر پر لپٹا ہوا بڑا سا دوپٹا کھل گیا تھا۔ دوپٹا کھل جانے کی وجہ سے ان کے خوب صورت بھورے بال نظر آنے لگے تھے اور ان کی شخصیت کی خوب صورتی کچھ اور واضح ہو گئی تھی۔ وہ کوئی بہت زیادہ عمر رسیدہ خاتون نہیں تھیں۔ چالیس سال سے کچھ ہی متجاوز عمر تھی ان کی لیکن دیکھنے میں اس سے کم ہی نظر آتی تھیں۔

''مقصد تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے مس بشریٰ گلزار! اتنی سی عمر میں تم اتنے بڑے بڑے پنگے لیتی ہو اور بستر پر معذور ہو کر لیٹنے کے باوجود تمہیں یہ بات سمجھ نہیں آئی ہے کہ ہر بندے سے پنگا نہیں لیا جاتا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے پنگا لینا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہوتا ہے۔'' ایک ایک لفظ چبا کر بولتے ہوئے وہ براہِ راست بشریٰ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ایسی کاٹ تھی کہ بشریٰ اچھی خاصی بولڈ ہونے کے باوجود تھوک نگل کر رہ گئی۔ شکل و صورت اور قد کاٹھ کے اعتبار سے وہ عام سا شخص تھا جو لوگوں کے ہجوم میں کھڑا ہو تو الگ سے نمایاں بھی نظر نہ آئے لیکن اس کی آنکھیں..... جب وہ ان آنکھوں میں کوئی تاثر سمو کر سامنے والے کو دیکھتا تھا تو وہ تاثر پوری شدت سے مقابل کو منتقل ہو جاتا تھا۔ جیسے پہلے عائشہ نے اس کی نظروں سے اس کے اندر کی ہوس اور گندگی کو محسوس کیا تھا اور اب بشریٰ اس کے غضب اور دھمکی کو محسوس کر رہی تھی۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے بہت دھیمی آواز میں اس شخص سے دریافت کیا۔

''اپنے دو سوالوں کے جواب۔ نمبر ایک سلطان کو کس نے اغوا کیا تھا اور نمبر دو وہ ویڈیو کہاں ہے جس میں سلطان نے اعترافی بیان دیا ہے؟'' اب وہ سیدھا مطلب پر آ گیا اور بشریٰ پر واضح ہو گیا کہ وہ کس کا ہرکارہ ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''تم غلط جگہ یہ سوال کر رہے ہو۔ تم دیکھ چکے ہو کہ تم یہاں آئے تو میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی اس لیے میرے کسی اغوا میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے

www.pakistanipoint.com

تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ سلطان اغوا ہو چکا ہے۔'' اسے عالم شاہ کے منصوبے کا علم تھا لیکن اسے مستقل جو دوائیں کھانی پڑ رہی تھیں، ان میں کوئی دوا ایسی بھی تھی جس کو کھانے کے بعد وہ زیادہ دیر تک جاگ نہیں پاتی تھی اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ عائشہ نے اپنی نگرانی میں اسے دوا کھلائی تھی اور وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ عالم شاہ کا منصوبہ کہاں تک پہنچا ہے۔ اسے صرف اس بات کا علم تھا کہ کامیابی کی صورت میں حنین صبح صبح وہ ویڈیو لے کر اس کے پاس آ جائے گا اور اس کو یہ انتظام کرنا تھا کہ اپنے جاننے والے ایک چینل سے وابستہ صحافی کے ذریعے اس ویڈیو کو منظر عام پر لے آئے لیکن حنین سے پہلے ہی یہ لوگ آ دھمکے تھے۔

''اتنی دین دار ماں کی بیٹی ہوتے ہوئے عین اذانوں کے وقت جھوٹ بول رہی ہو؟'' بشریٰ کا جواب سن کر اس نے استہزائیہ لہجے میں اس پر طنز کیا۔ اس وقت واقعی مساجد سے فجر کی اذانوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں اور بشریٰ کا اندازہ تھا کہ ایک آدھ گھنٹے میں حنین ویڈیو لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔ ساتھ ہی وہ اس شخص کے اندازِ گفتگو پر بھی حیران تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ان کے بارے میں کافی معلومات رکھتا ہے ورنہ کسی غیر متعلق شخص کو کیسے علم ہو سکتا تھا کہ عائشہ ایک دین دار خاتون ہیں۔

''اب کیوں خاموش ہو گئیں؟ میری بات کا جواب نہیں ہے تمہارے پاس؟'' بشریٰ کے خاموش ہو جانے پر اس نے طنز کا تیر چلایا۔ وہ اکیلا ہی ساری گفتگو کر رہا تھا اور اس کے ساتھی اسلحہ تھامے چوکنے کھڑے گویا حکم کے منتظر تھے۔

''دیکھو مسٹر! یہ ایک صحافی کا گھر ہے۔ ہم صرف خبریں تلاش کرتے ہیں۔ غنڈے موالیوں کی طرح لوگوں کو اغوا نہیں کرتے پھرتے۔'' اس بار گلزار عاصم اسے ٹوکنے سے باز نہ رہ سکے۔

''یہ جونی نسل ہے نا یہ تم جیسے پرانی نسل کے صحافیوں سے بالکل الگ ہے۔ یہ وقت پڑنے پر شرلاک ہومز بھی بن جاتی ہے اور غنڈے موالی بھی اس لیے بہتر ہے کہ تم اپنا منہ بند رکھو اور مجھے اپنی بیٹی سے بات کرنے دو۔'' اس نے زہریلے لہجے میں گلزار عاصم کو جواب دیا اور ایک بار پھر اپنی نظریں بشریٰ پر جما دیں۔

''بابا نے ٹھیک کہا ہے۔ مجھے سلطان کے اغوا اور ویڈیو وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ تم کہیں اور جا کر اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈو۔'' اس کی نظریں بشریٰ کے وجود میں گڑی جا رہی تھیں اس کے باوجود اس نے ہمت کر کے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

''ٹھیک ہے تمہاری مرضی، اپنی طرف سے میں نے تمہیں بہت موقع دیا تھا کہ تم سیدھی طرح سے سچ اگل دو لیکن تم شاید خود کو کوئی اونچی چیز سمجھتی ہو اس لیے مجھے ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پائیں۔ اب دیکھو کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ تمہاری یہ انگریزنی ماں جو خود کو بڑا ڈھانک کر اور چھپا کر رکھتی ہے، اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ سلطان کی اعترافی ویڈیو کسی چینل پر چلنے سے پہلے تمہاری ماں کی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہو جائے گی۔ اس پردے کی بوبو کے جسم کے ایک، ایک انچ کی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر ڈالیں گے ہم..... یہ جس ذلت اور رسوائی سے گزرے گی اس پر صرف یہ نہیں تم اور تمہارے باپ دونوں خودکشی پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''یو باسٹرڈ..... تم اپنی گندی زبان بند رکھو.....'' گلزار عاصم دیکھ رہے تھے کہ اس کے ہر لفظ کے ساتھ عائشہ کی رنگت زرد پڑتی جا رہی ہے اس لیے ایک بار پھر اپنا ضبط کھو بیٹھے اور اس پر غصہ کرنے لگے۔

''اولڈ مین کا منہ بھی بند کر دو..... اس کی بک، بک میرا مزہ خراب کر دے گی۔'' اس نے حکم دیا تو اس کے ایک ساتھی نے گلزار عاصم کی تمام تر مزاحمت کے باوجود ان کے منہ پر کپڑے کا ایک گولہ ٹھونس دیا۔

''تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو..... یہ مت سمجھو کہ یہ سب کر کے تم بچ جاؤ گے۔'' بشریٰ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں اسے ٹوکا۔

''میں تم سے بھی کم عمر تھا تب سے یہ سب کرتا آ رہا ہوں اور کبھی نہیں پکڑا گیا اس لیے تم میرے بچنے کی فکر کرنے کے بجائے اپنی ماں کی فکر کرو اور سوچو کہ کیا اس بے چاری نے اس لیے انگلینڈ جیسے ملک کو چھوڑ کر تمہارے باپ کو اپنایا تھا اور پاکستان آئی تھی کہ ایک دن اپنی بیٹی کی وجہ سے سب کچھ کھو بیٹھے گی۔ مجھے تو خود اس بے چاری پر رحم آ رہا ہے لیکن تم جانے کیسی بیٹی ہو جسے اپنی ماں کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔'' مصنوعی تاسف سے بولتا وہ ایک، ایک کر کے اپنی قمیص کے بٹن کھول رہا تھا۔ کھلے گریبان سے اس کی چوڑی چھاتی اور چھاتی پر موجود کسی ریچھ جیسے گھنے بال جھلک دکھاتے اس کے ناپاک ارادوں کی خوفناکی کو کچھ اور بھی واضح کر رہے تھے۔

www.alifbayeem.com

بشریٰ نے ایک نظر اپنی ماں کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں خوف تھا اور وہ بری طرح دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کچل رہی تھیں۔ وہ کبھی ننگے سر نہیں رہتی تھیں لیکن اس وقت ان کے سر پر ان کا دوپٹا موجود نہیں تھا۔ وہ گلے میں جھول رہا تھا۔ ان کے پیچھے کھڑے ریوالور بدست نے انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ کھینچا تانی میں بے ترتیب ہو جانے والے دوپٹے کو دوبارہ سلیقے سے اوڑھ لیں۔ اس شخص نے قمیص کے سارے بٹن کھولنے کے بعد اسے اتار کر بشریٰ کے بیڈ پر پھینکا اور اپنے اور عائشہ کے درمیان موجود دو تین قدموں کا فاصلہ طے کر کے ان کے مقابل پہنچ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر گلزار عاصم نے اذیت اور بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں جبکہ ان میں سے ایک جدید ماڈل کا موبائل فون نکال کر ویڈیو بنانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ وہ اس رخ سے کھڑا تھا کہ ویڈیو میں اس کے ساتھی کی صرف پشت یا پہلو ہی آ پاتے لیکن عائشہ پوری طرح نمایاں ہوتیں۔ ان پر ریوالور تان کر کھڑا شخص بھی اس موقع پر فریم سے نکلنے کے لیے تھوڑا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

عائشہ نے سراسیمگی کے عالم میں اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی اندر تک اتر جانے والی آنکھوں میں اس وقت کچھ اور بھی زیادہ گندگی اور سفاکی اتر آئی تھی۔ ان سے نظریں ملنے پر وہ خباثت سے مسکرایا اور عائشہ کے گلے میں پڑا دوپٹا کھینچ کر دور پھینکا۔ دوپٹا کھینچے جانے سے ان کے گلے پر معمولی سی رگڑ لگی تھی اور بے ساختہ ہی ان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ اس چیخ میں تکلیف سے زیادہ دہشت کا عنصر شامل تھا۔ یقینی طور پر وہ اس شخص کو اپنے ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر کمربستہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھیں اور دوپٹے کے بغیر یوں لرزہ براندام کھڑی تھیں کہ لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے گر پڑیں گی۔ ادھر وہ محظوظ ہونے والے انداز میں ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ سوتی پرنٹڈ شلوار قمیص میں ملبوس ان کا جسم سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور وہ ایسی للچائی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا جیسے کسی بچے کے منہ میں لالی پاپ دیکھ کر پانی بھر آتا ہے۔ اسی کیفیت میں اس نے ان کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن بالکل غیر متوقع طور پر ان کی ٹانگ حرکت میں آئی اور انہوں نے پوری قوت سے اس کے دائیں پیر پر ضرب لگائی۔ ان کی حرکت غیر متوقع ہونے کے باوجود اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور جھپٹ کر ان کی گردن پکڑ لی۔ عین اسی وقت بشریٰ نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا کلاک اٹھا کر اس کی طرف پھینکا۔ بھاری ٹیبل کلاک اس کی پشت سے آ کر ٹکرایا اس کے باوجود اس نے عائشہ کا گلا نہیں چھوڑا البتہ اس کا ساتھی جھپٹ کر بشریٰ تک پہنچ گیا اور پے در پے اس کے منہ پر کئی تھپڑ جڑ دیے۔

''بیڈ سے نیچے اتار کر پھینکو حرام زادی کو۔ اب یہ دیکھے گی کہ اس کی ماں کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' وہ کسی درندے کی طرح غرایا اور اس کے ساتھی نے بشریٰ کے زخمی ہونے کی پروا کیے بغیر اسے بستر سے نیچے دھکیل دیا۔ تکلیف سے بشریٰ کے منہ سے کراہیں نکل گئیں۔ گلزار عاصم جنہوں نے اٹھا پٹخ کی آوازوں پر آنکھیں کھول دی تھیں۔ تڑپ کر خود کو بندشوں سے آزاد کروانے کی کوشش کرنے لگے لیکن انہیں اتنی مضبوطی سے باندھا گیا تھا کہ وہ خود کو آزاد کروانے سے قاصر تھے۔ ادھر اس شخص کی آنکھوں سے ہوس کے ساتھ ساتھ جنون بھی جھلکنے لگا تھا۔ ایک ہاتھ سے عائشہ کا گلا پکڑے دوسرے ہاتھ سے وہ انہیں بیڈ کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اس نے ان کا گلا اتنی قوت سے پکڑا ہوا تھا کہ انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور بتدریج چہرے کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ سانس لینے کی فطری خواہش کے زیر اثر ان کا منہ میکانکی طور پر کھل گیا تھا اور زبان باہر آ گئی تھی۔ پھیپھڑوں کو آکسیجن میسر نہ آنے کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیر بے دم ہوتے جا رہے تھے اور وہ کوئی قابل ذکر مزاحمت کیے بغیر اس کے ساتھ بیڈ کی طرف کھنچتی چلی گئی تھیں۔ اس نے انہیں بیڈ پر پٹخ کر ان کا گلا چھوڑا تو وہ جلدی جلدی گہرے گہرے سانس لینے لگیں لیکن اس نے انہیں ڈھنگ سے سانس لینے کا موقع بھی نہیں دیا اور جسم کے پورے بوجھ سمیت ان پر آن پڑا۔ ان کے حلق سے ایک چیخ نکلی جس کے جواب میں پہلے اس نے انہیں ایک تھپڑ رسید کیا پھر ان کے گریبان کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کمرے میں کپڑا پھٹنے کی آواز گونجی اور فرش پر پڑی تکلیف سے کراہتی بشریٰ کے اعصاب چیخ گئے۔ وہ اپنی ماں کو جانتی تھی۔ ایک آزاد معاشرے سے آ کر اسلام اور مشرق کے ماحول میں رچنے بسنے والی اس کی ماں اتنی باحیا اور باکردار تھی کہ اس نے کبھی کسی نامحرم کے سامنے اپنے سر سے دوپٹا بھی نہیں سرکنے دیا تھا۔ وہ کیسے اس باحیا عورت کو یوں بے عزت ہوتا دیکھ سکتی تھی چنانچہ ہار مان لی اور بولی۔

''اسٹاپ، پلیز اسٹاپ اٹ۔ تم میری ماں کو چھوڑ دو۔ میں تمہیں سچ بتا دیتی ہوں۔''

www.eidayjeem.com

''تم بتاتی جاؤ، بتادوگی تو میں تمہاری ماں کو چھوڑ دوں گا۔'' اس نے اپنی دست درازیاں جاری رکھتے ہوئے اسے حکم دیا۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ عائشہ پوری آواز سے چیخ بھی نہیں پارہی تھیں اور ان کے گلے سے بس گھٹی گھٹی سی آوازیں ہی نکل رہی تھیں۔

''وہ معاذ کا دوست ہے۔ سلطان کی ویڈیو لے کر وہ کچھ دیر بعد یہاں آتا ہی ہوگا۔ میں وہ ویڈیو اپنے ایک جاننے والے صحافی کو دینے والی تھی لیکن اب تم اسے اپنے ساتھ لے جانا لیکن پلیز اب تم میری ماں کو چھوڑ دو۔ ان پر اتنا بڑا ظلم مت کرو۔'' اس نے اپنی جگہ پڑے پڑے سسکتے ہوئے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیے۔

''گڈ گرل! ابھی تھوڑی دیر میں ہم دیکھ لیں گے کہ تم نے ہم سے سچ بولا ہے یا نہیں لیکن افسوس کہ تم نے سچ بولنے میں ذرا دیر کر دی۔ مجھ پر اس ولایتی شراب کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ اب میں پوری بوتل پیے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' اس نے مکارانہ لہجے میں بشریٰ کو جواب دیا اور ایک بار پھر عائشہ پر پل پڑا۔ ان کی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لیے اس نے ان کی قمیص کا ہی ایک بڑا سا پھٹا ہوا ٹکڑا ان کے منہ میں ٹھونس دیا تھا۔ اس کی یہ شیطانیت دیکھ کر بشریٰ کا ضبط جواب دے گیا اور وہ، وہ ساری گالیاں جنہیں کبھی اس نے زبان پر لانے کا نہیں سوچا تھا، اسے دینے لگی لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ وحشیانہ ہنسی ہنستا وہ عائشہ کو ربڑ کی گڑیا کی طرح برت رہا تھا۔ بشریٰ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو عالم جنون میں اپنے زخموں اور تکلیف کی پروا کیے بغیر اس دراز کی طرف لپکی جس میں اس کا پسٹل رکھا ہوا تھا۔ دراز کھول کر وہ..... اپنا پسٹل نکال پاتی اس سے قبل ہی اس کے سر پر ایک زوردار لات پڑی اور وہ الٹ کر نیچے گر گئی۔ جوش جذبات میں وہ شیطان کے ان چیلوں کو فراموش کر چکی تھی جو اس کا ساتھ دینے کے لیے ہی یہاں آئے تھے۔ پہلی ٹھوکر کے فوراً بعد ہی اس کی کنپٹی پر دوسری ٹھوکر رسید کی گئی اور وہ اتنی زوردار تھی کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اسے علم نہیں تھا کہ آج کی صبح اس کی ماں کی عصمت ہی نہیں، باپ کی زندگی بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ حق گو اور اصول پرست گلزار عاصم اپنی محبوب بیوی کو بچانے کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ صدمے سے اپنی دل کی دھڑکن ہی کھو بیٹھے۔ کارڈیک اریسٹ..... طبی اصطلاح میں ان کی موت کو شاید یہی نام دیا جاتا۔

☆☆☆

وجہ

شوہر بڑے پیار سے بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے۔ ''کیوں بھئی بیگم، واک کرنے چلوگی میرے ساتھ؟''

بیوی: ''تمہارا کیا خیال ہے میں بھی تمہاری طرح موٹی ہوتی جارہی ہوں کیا؟''

شوہر: ''ارے بھئی، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تم نہیں جانا چاہتیں تو تمہاری مرضی، نہ جاؤ۔''

بیوی: ''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں ست ہوں چلنا نہیں چاہتی؟''

شوہر: ''بیگم! تم تو غصہ کر رہی ہو۔''

بیوی: ''تمہارا مطلب ہے کہ میں جھگڑا کر رہی ہوں۔ جھگڑالو ہوں نا؟''

شوہر: ''اُفوہ بیگم! میں نے ایسا کب کہا ہے۔''

بیوی: ''تو کیا میں جھوٹی ہوں، جھوٹ بول رہی ہوں؟''

شوہر زچ ہو کر۔ ''اچھا بابا! تم نہ جانا۔ میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں۔''

بیوی: ''اب سمجھی کہ آپ اکیلے جانے کے لیے میرے ساتھ اتنی دیر سے جھگڑا کر رہے تھے۔''

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ حیدرآباد

عالم شاہ کے گھر کے پُرآسائش مہمان خانے میں بھی حسین کو پرسکون نیند نہیں آئی تھی۔ وہ معاذ کے قریبی دوستوں میں سے تھا اور معاذ کی گمشدگی کا معما حل کرنے کے لیے عالم شاہ کے منصوبے میں شامل ہوگیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ جو کچھ ہوا تھا، وہ اس کے اعصاب کے لیے ایک بوجھ تھا۔ معاذ کے ساتھ وہ اس کے ہر ایڈونچر میں شریک رہتا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ کئی مقامات کی سیر کی تھی، مختلف کھیلوں میں حصہ لیا تھا، مصیبت زدہ لوگوں کے لیے فنڈ ریزنگ کی تھی۔ یہاں تک کہ زیادہ دلچسپی نہ ہونے کے باوجود وہ معاذ کے ساتھ بدرو کے اکھاڑے پر بھی چلا جاتا تھا لیکن وہ لوگ کبھی کسی ایسی کارروائی میں ملوث نہیں رہے تھے جسے مجرمانہ قرار دیا جاسکے۔ وہ جانتا تھا کہ کامی اور سلطان جیسے لڑکوں کے دن رات کئی مجرمانہ مشاغل میں گزرتے ہیں لیکن پھر بھی اس کا ذہن سلطان کے اغوا کے جرم میں شامل ہونے کے

www.allpaytech.com

لیے راضی نہیں تھا اور وہ صرف اور صرف دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عالم شاہ کی تجویز پر راضی ہو گیا تھا۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے اس بات کی تصدیق تو ہو گئی تھی کہ معاذ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ سلطان نے ہی کیا تھا لیکن اس سے آگے پھر تاریکی تھی۔ اگر اس واقعے میں معاذ کی موت ہو گئی تھی تب بھی اس کی لاش تو ملنی چاہیے تھی۔ لاش نہیں ملی تھی اور ایک موہوم آس سی تھی کہ شاید معاذ زندہ ہو لیکن یہ بات بھی الجھن کا باعث تھی کہ وہ زندہ ہے تو کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ اس نے اب تک کسی سے رابطہ کیوں نہیں کیا ہے اور اس کی طرف سے رابطے کا نہ ہونا ایک بار پھر مایوسی کو جنم دیتا تھا اور یہ وہم ستانے لگتا تھا کہ شاید سلطان کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد وہ کیرتھر کی اس گہری کھائی میں جا گرا ہو جسے رینجرز کے جوانوں نے بھی بساط بھر کھنگال کر دیکھ لیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ کھائی اتنی گہری تھی کہ اس کی تہ تک وہ رسائی حاصل نہیں کر سکے تھے اور ایک امکان یہ تھا کہ معاذ کی لاش تہ میں کہیں پڑی ہو۔

ایک طرف دوست کی طرف سے اندیشے اور وسوسے تھے اور دوسری طرف وہ ایک ایسے کام میں شریک ہو گیا تھا جو اس کی فطرت اور تربیت کے بالکل خلاف تھا اس لیے اس کے اعصاب پر بہت بوجھ تھا۔ اس اعصابی بوجھ کے باعث ہی وہ گہری اور پُرسکون نیند سے محروم رہا تھا اور جاگنے کے بعد پُرتکلف ناشتے سے بھی ڈھنگ سے لطف اندوز نہیں ہو سکا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے اپنی تیاری مکمل کی۔ بشریٰ کے گھر سے ہوتے ہوئے اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس لیے اس کی کتابوں کا بیگ بھی تیار تھا۔ اسی بیگ میں اس نے وہ... یو ایس بی بھی رکھ لی تھی جس میں سلطان کا اعترافی بیان موجود تھا۔ ساری تیاری ہو جانے کے بعد وہ نکلنے ہی والا تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی تو اس کے گھر کا لینڈ لائن نمبر نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی والدہ کا فون ہے۔ اس نے فوراً کال ریسیو کر لی۔

''السلام علیکم امی!''

''وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو، ناشتا کر لیا؟'' انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''جی امی! آپ فکر نہیں کریں۔ بہت زبردست ناشتا کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی فارغ ہوا ہوں اور اب یونیورسٹی کے لیے نکلنے والا ہوں۔'' اس نے ان کی تسلی کے لیے ہنس کر بتایا۔

''خیر سے جاؤ بیٹا۔'' انہوں نے فوراً دعا دی اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ''یونیورسٹی سے آج سیدھے گھر واپس آ جانا۔ کسی اکھاڑے یا کلب ولب جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں، کوئی خاص بات ہے کیا؟'' ان کے لہجے میں موجود اصرار کو محسوس کر کے وہ چونکا۔

''نہیں بس تمہارے ابو تھوڑے سے ناراض ہو رہے تھے تمہارے گھر سے باہر رات گزارنے پر۔''

''ابو نے پہلے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے سارے دوست اچھے لڑکے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی کسی بری عادت میں مبتلا نہیں ہے۔'' ان کے آگاہ کرنے پر وہ ابو کے رویے پر حیرت کا اظہار کرنے لگا۔

''یہ بات نہیں ہے بیٹا! انہیں تمہارے دوستوں پر کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے لیکن معاذ والے واقعے کے بعد سے ہم سب ہی اندر سے خوف زدہ ہیں۔ کتنا پیارا بچہ تھا وہ۔ اللہ جانے اس کے ساتھ کیا ہوا۔ دنیا کا کچھ پتا نہیں ہے، لوگ اس لیے بھی اچھے لوگوں کے دشمن بن جاتے ہیں کہ وہ اچھے کیوں ہیں، ایسے میں ہم جیسے شریف اور بے وسیلہ لوگوں کو یہی بھلائی دیتا ہے کہ جتنی احتیاط سے زندگی گزار سکتے ہیں گزار دیں۔'' ان کے لہجے میں اضطراب سا تھا۔ حنین اپنی جگہ شرمندہ سا ہو گیا۔ رات جو کچھ ہوا تھا اگر وہ اس کے والدین کو معلوم ہو جاتا تو ان کے دلوں پر کیا گزرتی۔

''آپ فکر مت کریں امی! میں یونیورسٹی سے سیدھا گھر آ جاؤں گا۔'' اس نے انہیں تسلی دی۔

''جلدی آ جانا بیٹا! پتا نہیں کیوں رات سے میرا دل بڑا گھبرا رہا ہے۔'' انہوں نے اسے ہدایت کی۔

''آپ کہیں تو میں یونیورسٹی جاتا ہی نہیں ہوں؟'' اس نے ان کی فکر کو اپنی ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی۔

''اب میں نے یہ بھی نہیں کہا ہے، تمہاری تعلیم تمہاری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ پڑھو لکھو، اچھا مقام حاصل کر کے اپنے ابو کا بازو بنو۔ اللہ وہ دن جلد لائے کہ تمہارے سر پر سہرا بندھے اور ہم پوتے پوتیوں کو کھلانے کا ارمان پورا کریں۔'' انہوں نے اپنے دل کی خواہش بیان کی تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

''آپ سب ماؤں کے خواب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بیٹے کا سہرا، بہو سے پھڈے اور پوتے پوتیوں کے لاڈ۔ اس سے آگے ہماری مشرقی ماؤں کی سوچ جاتی ہی نہیں ہے۔''

''ہم عام سی سیدھی سادی مائیں ہیں بیٹا، ہماری یہ چند خواہشیں ہی پوری ہو جائیں تو ہمارے لیے کافی ہے۔ ہم

www.aiffaryicom

چاند پر پہنچنے کی خواہش تو کرنے سے رہیں۔'' انہوں نے سادگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

''جی، چاند تک پہنچنے کی خواہش تو نہیں کر سکتیں ہماری مشرقی مائیں..... بس چاند سی بہو لا کر اس پر ستم ڈھانے کے خواب ہی دیکھتی رہتی ہیں۔'' اس نے جان کر شرارت سے انہیں چھیڑا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں تمہیں ایسی دکھائی دیتی ہوں کیا کہ کسی کی بچی گھر لا کر اس پر ظلم کروں؟'' انہوں نے خفگی کا اظہار کیا۔

''میں تو بس ایسے ہی آپ کو چھیڑ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری امی کتنی اچھی خاتون ہیں۔'' اس نے فوراً ہی وضاحت کی اور پھر بولا۔

''اچھا امی، اب اجازت دیجیے۔ میری روانگی کا وقت ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جاؤ، اللہ نگہبان۔'' انہوں نے اسے اجازت دی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے لختِ جگر کو کن ظالموں کے چنگل میں جانے کی اجازت دے رہی ہیں۔

حنین نے انہیں اللہ حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کیا تو وہ کافی حد تک ریلیکس ہو چکا تھا اور رات سے اعصاب پر جو بوجھ تھا، اس میں کافی کمی واقع ہو گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ عارضی اطمینان ہے اور اس کی ماں کے دل کی گواہی سچی ہے۔ عالم شاہ کے گھر سے نکل کر بشریٰ کے گھر جاتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہاں اس کے لیے کون سی مصیبت منتظر ہے۔ بشریٰ کے گھر کے سامنے بائیک روک کر گھنٹی بجاتے ہوئے وہ بالکل ویسے ہی ریلیکس تھا جیسے ہم میں سے ہر ایک اپنے کسی عزیز سے ملاقات کے لیے اس کے گھر جانے پر ہوتا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ گھنٹی بجا کر اپنے لیے مصیبت کا دروازہ کھلوا رہا ہے۔ حنین کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ایک دوست کے گھر کے دروازے کے پیچھے شکاری اس کے لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اس کے گھنٹی بجاتے ہی دروازہ کھلا۔ فطری طور پر وہ دروازے کے کچھ اور قریب ہو گیا لیکن اس وقت وہ بری طرح سٹپٹا گیا جب کسی نے اسے گریبان سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ حواس باختگی کے عالم میں جب اس نے اپنے اردگرد دیکھا تو چار مسلح افراد کو پا کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ لوگ کون تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سلطان اپنے گھر پہنچ چکا ہے اور ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ سلطان کے اغوا کے پیچھے موجود لوگوں تک پہنچنے کے لیے انہیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ اصل میں وہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے تجربہ کار لوگ تھے جبکہ یہاں یہ حال تھا کہ چند ناتجربہ کار نوجوانوں نے ایک منصوبہ بنایا تھا اور دور تک کے نتائج نہیں سوچ سکے تھے۔ خاص طور پر حنین کی گھبراہٹ کی وجہ سے انہوں نے سلطان کو آزاد کرنے میں بہت جلدی کا مظاہرہ کیا تھا اور دوسری طرف سے فوراً ردعمل سامنے آ گیا تھا۔ ان لوگوں کو یہاں موجود پا کر اسے بشریٰ اور اس کی فیملی کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی لیکن پھر اسے زیادہ فکرمند ہونے کا بھی موقع نہیں ملا۔ کسی نے بہت زور سے اس کے سر پر کچھ رسید کیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ اسے اس کے بیگ سمیت ایک گاڑی میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک تنگ کمرے میں فرش پر بندھا ہوا پڑا تھا اور ایک شخص چہرے پر سخت خشونت لیے اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس شخص کو اس نے بشریٰ کے گھر پر بھی دیکھا تھا۔

''تو تمہیں ہوش آ گیا۔ اب فوراً بولنا شروع ہو جاؤ اور بتاؤ کہ تم نے کیسے سلطان صاحب کو اغوا کیا تھا؟ اس کام میں کون تمہیں سپورٹ کر رہا تھا اور تمہارے پاس موجود... یو ایس بی میں سلطان صاحب کی جو ویڈیو ہے، اس کو تم نے مزید کہاں کہاں سیو کر رکھا ہے۔ یاد رکھنا کہ تمہارے پاس انکار کرنے یا جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت تم باذل کے سامنے ہو جو گونگوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میرے سوالوں کے جواب نہ دے کر تمہیں اپنی مشکلات میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔'' اس کا لہجہ بے حد سخت اور سرد تھا۔ حنین کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یو ایس بی کے حوالے کے بعد وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس انکار یا جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ اسے سب کچھ سچ بتا سکتا تھا؟ سچ بتانے سے دوستی پر حرف آتا تھا۔ وہ اس چکر میں معاذ کی خاطر شامل ہوا تھا۔ معاذ جو اس کا گہرا دوست تھا اور جس کے حوالے سے اس کی عالم شاہ سے دوستی ہوئی تھی۔ عالم شاہ نے نئی نئی دوستی کے باوجود معاذ کی خاطر انتہائی قدم اٹھایا تھا تو کیا وہ اپنی پرانی دوستی کے لیے اتنا نہیں کر سکتا تھا کہ اس شخص کے سوالوں کے جواب میں خاموش رہے اور اس سے عالم شاہ کا کوئی ذکر نہ کرے۔

''تو تم آسانی سے میرے سوالوں کے جواب نہیں دو گے؟'' اسے سرد نگاہوں سے گھورتے باذل نامی اس شخص

www.aiffoyjeem.com

کی آنکھوں سے سفاکی جھلکنے لگی۔ حنین کی خاموشی سے اسے نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی سفاک طبیعت اسی امر کی خواہاں تھی۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والے اگلے جملے نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''بہت خوب! مجھے آسانی سے جواب مل جانے پر خوشی ہوتی بھی نہیں ہے۔'' اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر سفاک سی مسکراہٹ دوڑ گئی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک کونے میں رکھی گول سی ٹوکری اٹھا کر حنین کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں موجود وہ ٹوکری اس پٹاری سے مشابہ تھی جس میں سپیرے سانپ کو بند کرتے ہیں اور گلی گلی سانپ کا رقص دکھاتے پھرتے ہیں لیکن فرق یہ تھا کہ یہ ٹوکری سرکنڈوں وغیرہ سے نہیں بلکہ کسی دھات سے بنی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور اس کے ڈھکن پر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ حنین کی طرف محظوظ نظروں سے دیکھتے ہوئے باذل نے اس دھاتی ٹوکری کو اس سے کچھ فاصلے پر رکھا اور پیر کی ہلکی سی ٹھوکر لگا کر ٹوکری کا ڈھکن ہٹا دیا۔ ڈھکن ہٹا تو حنین کو لگا کہ اس میں سے کوئی سانپ پھن پھیلاتا ہوا باہر نکلے گا لیکن ٹوکری میں سے جو مخلوق برآمد ہوئی اسے دیکھ کر پہلے اس کی آنکھوں میں حیرت اور پھر خوف جاگ اٹھا۔ وہ کتھئی مائل رنگت کے چھوٹے چھوٹے چوہے تھے جن کی دمیں باریک نائیلون کی ڈوریوں سے بندھی ہوئی تھیں اور ان ڈوریوں کا دوسرا سرا اندر ٹوکری میں ہی گم ہو رہا تھا۔ وہ ایک کے بعد ایک اچھل اچھل کر ٹوکری میں سے برآمد ہو رہے تھے۔

''یہ ہمہ خور ہیں لیکن گوشت ان کی سب سے مرغوب غذا ہے۔ اتفاق سے آج یہ بہت زیادہ بھوکے بھی ہیں اس لیے امید ہے کہ تمہارے جسم پر بھرپور دعوت اڑائیں گے۔'' باذل بول رہا تھا لیکن حنین کی توجہ اس کے الفاظ سے زیادہ چوہوں پر تھی۔ وہ چھ سات کی تعداد میں تھے اور پھدکتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ باذل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ان میں سے دو اس کے جسم پر چڑھ چکے تھے۔ ان کے نکیلے پنجوں کی چبھن اپنے جسم پر محسوس کر کے اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ وہ انہیں اپنے وجود سے جھٹک دینا چاہتا تھا لیکن اسے اتنی بری طرح باندھا گیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔ حرکت کرنے کی کوشش میں اس کا جسم تڑپ اور پھڑک کر رہ گیا تھا لیکن وہ ان ظالم چوہوں کو اپنے وجود سے جھٹکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

پنجوں کے بعد جب ان چوہوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے تیز اور نکیلے دانت اس کے وجود میں گاڑنا شروع کیے تو وہ محدود سا جس زدہ کمرا اس کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ بیک وقت چھ سات جگہ سے چوہوں کے کترنے کی تکلیف اتنی معمولی نہیں ہوتی کہ انسانی جسم اسے آسانی سے برداشت کر سکے۔ وہ بھی برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور وحشت اور تکلیف سے مسلسل چیختا جا رہا تھا۔ اس طرح کا تشدد سہنے کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس پر یہ غیر انسانی تشدد کرنے والا وہ باذل نامی آدمی بڑے پُرلطف انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی بے حد تاثر دینے والی آنکھوں میں اس وقت ایسی چمک تھی جیسے وہ اپنا من پسند تماشا دیکھ رہا ہو۔

''پلیز ہٹاؤ انہیں، فار گاڈ سیک انہیں ہٹاؤ۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔'' چیخوں کے درمیان اس نے بہت مشکل سے یہ چند جملے ادا کیے۔ وہ پورا ایک منٹ بھی اس تشدد کو نہیں سہہ سکا تھا۔

''بہت جلد ہار مان لی تم نے۔ ابھی تو میرے ان پالتو چوہوں کا پیٹ بھی نہیں بھرا۔''

باذل نے اس انداز میں کہا جیسے اسے حنین کے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دینے پر افسوس ہو رہا ہو کہ اسے زیادہ دیر یہ پُرلطف تماشا دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس نے اس تماشے کو مزید جاری نہیں رکھا تھا اور چوہوں کی دموں سے بندھی باریک نائیلون کی ڈوریوں کو کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ چوہے یقیناً بہت بھوکے تھے جو پالتو ہونے کے باوجود اپنے مالک کے ڈوریاں کھینچنے پر اتنی آسانی سے حنین کے جسم سے علیحدہ ہونے کے لیے راضی نہیں تھے۔ کھینچے جانے سے ان کی اپنی دموں پر نائیلون کی ڈوریاں کسنے کی تکلیف پیدا نہ ہوتی تو شاید وہ اس شاندار ضیافت کو کبھی نہ چھوڑتے۔ وہ بہت مجبوری میں ڈوریوں کے ساتھ کھنچتے ہوئے پیچھے آئے تھے اور باذل نے ایک بار پھر بڑی مہارت سے انہیں دھاتی پٹاری نما ٹوکری میں بند کر دیا تھا۔ اس ذرا سی دیر میں ہی حنین کا جسم خونچکاں ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹ جانے والا لباس سرخ ہو گیا تھا۔ ایک چوہے نے اس کے کان پر حملہ کیا تھا اور کان کی لو کتر ڈالی تھی جہاں سے قطرہ قطرہ خون ٹپکتا اس کی گردن سے بہتا ہوا نیچے فرش پر گر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، اب تم بولنا شروع ہو جاؤ۔ ہر بات کا جواب چاہیے مجھے۔ اگر کہیں تمہاری زبان رکی یا مجھے جھوٹ

www.alidayeem.com

کا شک ہوا تو ایک بار پھر یہ چوہے آزاد ہو جائیں گے اور دوبارہ میں انہیں بند نہیں کروں گا۔'' سرد اور سخت لہجے میں حکم دیتے باذل کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اپنی دھمکی پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی حسین نے سچ بولنا شروع کر دیا۔ تکلیف کے باعث اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور چیخنے سے خشک پڑ جانے والے حلق کے باعث بولنے میں دشواری پیش آ رہی تھی پھر بھی وہ..... وہ سب کچھ بولتا اور بتاتا جا رہا تھا جو باذل اس سے جاننا چاہتا تھا۔

''بہت خوب! سچ بول کر تم نے اپنی مشکل کو آسان کر لیا ہے۔ تمہارے اس تعاون کے انعام کے طور پر میں نے تمہیں آسان موت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔'' اس سے اپنے ہر سوال کا جواب حاصل کرنے کے بعد باذل نے یوں مسکرا کر اس سے کہا جیسے وہ اسے کوئی بہت ہی اچھی اطلاع دے رہا ہو۔ ویسے وہ جس متشدد طبیعت کا مالک شخص تھا اس کی طرف سے کسی کو آسان موت ملنے کا اعلان بھی ایک اچھی ہی اطلاع شمار کیا جا سکتا تھا۔ ہنوز رسیوں سے جکڑے حسین کے پاس کوئی تدبیر نہیں تھی کہ وہ اس فیصلے کو بدل سکتا۔ گفتگو سے تعلیم یافتہ محسوس ہونے والے باذل کے چہرے پر جو سختی اور سفاکی ثبت تھی، وہ خود اعلان کر رہی تھی کہ اس شخص سے رحم کی اپیل کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا اور التجا کے الفاظ اس کی حسِ اذیت رسانی کی تسکین کے سوا کچھ حاصل نہ کر پائیں گے۔ حسین خاموش ہو گیا۔ وہ لڑکا جو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا، تین بہنوں کا اکلوتا بھائی، بہت سے خوابوں کا مرکز، یونیورسٹی کا ایک ہونہار طالب علم اور دوستوں کا سچا خیر خواہ تھا..... اپنی موت کے فیصلے پر خاموش ہو گیا تھا کیونکہ اس نے جان لیا تھا کہ وہ جس سفاک بھیڑیے کے خونی پنجوں میں پھنس گیا ہے، اس کے پاس اس کے لیے موت کے سوا کچھ نہیں ہے چنانچہ اس نے اپنی آسان موت کے فیصلے کو ہی بھیڑیے کا رحم جان کر قبول کر لیا تھا۔

باذل نامی اس بھیڑیے نے اس کی اس خاموشی کو غور سے دیکھا اور مسکراتا ہوا اس کے اتنے قریب آ کھڑا ہوا کہ اس کے زخموں سے بہہ کر زمین پر گرنے والا خون اس کے جوتوں کے تلوؤں کو بھگو گیا۔ باذل نے خون آلود جوتے والا اپنا پاؤں ذرا سا بلند کیا اور بالکل اچانک حسین کی گردن پر رکھ کر اس کی شہ رگ کو مسلنے لگا۔ عالم مجبوری میں اپنی موت کے فیصلے کو قبول کر لینے والے حسین کا جسم فطری ردعمل کے طور پر بری طرح پھڑکا۔ مضبوطی سے بندھا ہوا ہونے کے باعث وہ باقاعدہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس کا جسم وہ فطری ردعمل پوری شدت سے دے رہا تھا جو ایک صحت مند اور توانا جسم زبردستی جسم سے روح کا رشتہ منقطع کیے جانے پر دیتا ہے۔ جسم جانتا ہے کہ روح کے بغیر اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں اس لیے جب روح اس کا ساتھ چھوڑ کر جا رہی ہوتی ہے تو جسم بری طرح تڑپتا ہے۔ اس کا جسم بھی تڑپ رہا تھا لیکن کسی سانڈ کی سی طاقت سے اس کی شہ رگ کو کچلتے باذل کے پیر کا دباؤ ایک ثانیے کے لیے بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنا قاتل پیر اسی وقت حسین کی گردن سے ہٹایا تھا جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ جسم کے اس پنجرے سے روح کا پنچھی اڑ چکا ہے۔

☆☆☆

وہ لمبے قد کی دبلی پتلی اور سانولی رنگت والی لڑکی تھی جو اونچے نیچے پہاڑی راستے پر لکڑی کا گٹھر اٹھائے یوں چلی جا رہی تھی جیسے اس کے قدموں کے نیچے ہموار زمین بچھی ہوئی ہو۔ اس نے مٹیالے سے رنگ کی خاصی پرانی پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی اور اس لباس میں اس کی جسامت نمایاں تھی۔ پتلی اور لچکیلی کمر کے ساتھ قدرے چوڑے شانے نسوانیت اور مضبوطی کا عجیب انوکھا سا امتزاج پیش کر رہے تھے۔ آدھی آستینوں سے جھانکتے اس کے سانولے بازو سڈول اور خوب صورت تھے۔ لکڑی کا گٹھر تھامے اس کے لمبے انگلیوں والے سانولے ہاتھوں کی ساخت سے ظاہر تھا کہ ان ہاتھوں سے سخت محنت کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ ہاتھ بھدے یا بدصورت محسوس نہیں ہوتے تھے۔ وہی مضبوطی اور نسوانیت کا بھرپور امتزاج تھا جو دیکھنے والوں کو حیرت میں مبتلا کر سکتا تھا لیکن وہاں اسے دیکھنے کے لیے کوئی موجود ہی کہاں تھا۔ ویران اور غیر ہموار راستے پر وہ یوں چلی جا رہی تھی جیسے کسی خوب صورت و پررونق باغ میں چہل قدمی کر رہی ہو۔ اس کے گھنگرالے سیاہ بال بے رونق سے تھے اور کپڑے کی ایک دھجی سے پونی ٹیل کی شکل میں بندھے اس کی گردن پر پڑے ہوا سے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ وہ معمولی نقش و نگار کی مالک تھی لیکن چہرے پر موجود معصوم تاثر کی وجہ سے بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے کی یہ معصومیت یقیناً اس کی کم عمری کے باعث تھی۔ وہ کسی طرح بھی سولہ سترہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں بھید دیتی تھیں کہ اس نے اس کم عمری میں بھی بہت کچھ دیکھ اور سہہ رکھا ہے۔ کم عمر اور معصوم نظر آنے کے باوجود وہ کوئی عام سی

www.dilbaytcom

لڑکی محسوس نہیں ہوتی تھی اور اس بات کی گواہی اس کی پتلی کمر پر بندھی چرمی بیلٹ سے لٹکا بائیس بور کا ریوالور بھی دے رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے اطراف سے بے نیاز کھلنڈرے سے انداز میں آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کی حسیات جنگل کے کسی جانور کی طرح بالکل چوکنی تھیں اور وہ کچھ نہ دیکھتے ہوئے بھی اپنے آس پاس سے اچھی طرح باخبر تھی چنانچہ ایک موڑ پر مڑتے ہی جب اچانک ایک سیاہ پوش اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو ذرا بھی نہ چونکی اور راستے میں حائل ہو جانے والے اس شخص کو خشمگیں نگاہوں سے گھورنے لگی۔

''تو تو بنا گولی چلائے نظروں سے ہی بندے کو مار ڈالنا جانتی ہے۔'' اسے روکنے والا بھی سانولی رنگت کا جوان العمر شخص تھا جو اس کی خشمگیں نگاہوں سے ڈرنے کے بجائے ہنس کر اسے چھیڑ رہا تھا۔

''تجھ جیسا ڈھیٹ نظروں سے کیا گولی سے بھی مشکل سے مرے گا۔ تجھے مارنے کے لیے تو پوری چھ کی چھ گولیاں تیرے سینے میں اتارنی پڑیں گی، تب ہی دھرتی کا بوجھ ہلکا ہوگا۔'' اس نے جھلا کر چھیڑنے والے کو جواب دیا۔

''نر بچہ ہوں آخر۔ مجھے بھلا کوئی کیسے آسانی سے مار سکتا ہے۔'' وہ اس کے جھلانے سے محظوظ ہوا اور چڑانے والے انداز میں چھاتی پھلا کر جواب دیا۔

''چل ہٹ راستے سے۔ میں نے ایک آدھ ہاتھ دکھا دیا تو ساری مردانگی دھری رہ جائے گی۔'' اس نے نخوت سے سر جھٹک کر اسے حکم دیا۔

''تیری بات الگ ہے لیلیٰ! تیرے تو ایک اشارے پر میں اپنی جان بھی وار سکتا ہوں۔'' وہ اسے مخموری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دعویٰ کرنے لگا۔

''چل ہٹ مرا! تیرا بابا ہمارے ڈیرے پر آئے گا نا تو اسے تیری اس عاشقی معشوقی کا بتا دوں گی۔ ایک دم تیری طرح سیدھا کر دے گا تجھے۔'' اس نے دھمکی دی۔

''سوچ لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بابا بن کر تیرے بابا کو تیرے لیے بیاہ کا پیغام دے دے۔'' وہ قطعی اس کی دھمکی سے متاثر نہیں ہوا۔

''تجھ سے بیاہ کرتی ہے میری جوتی۔'' وہ جھلا کر کہتی یوں آگے بڑھی جیسے اسے ٹکر مار کر اپنے راستے سے ہٹا دینے کا ارادہ رکھتی ہو لیکن ایسا کچھ کرنے سے قبل ہی وہ ہنستا ہوا اس کے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا اور پھر قدرے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''میں تو ایسے ہی تجھے چھیڑ رہا تھا لیلیٰ! چل ناراضگی چھوڑ دے اور یہ گٹھر مجھے دے دے۔ میں اسے تیرے ڈیرے تک پہنچا دیتا ہوں۔'' یہ پیشکش کرتے ہوئے اسے لیلیٰ کے پیچھے بھاگتے ہوئے قدموں سے بڑھنا پڑ رہا تھا کیونکہ وہ بغیر رکے بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

''تو جانتا ہے مراد کہ لیلیٰ اتنی نازک نہیں کہ اتنا سا گٹھر بھی نہ اٹھا سکے۔ تو سیدھی طرح میرا پیچھا چھوڑ دے ورنہ.....'' اس نے ورنہ کے بعد اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا لیکن مراد نے اپنے قدم اپنی جگہ روک لیے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ لیلیٰ کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔ وہ اس سے ڈرتا نہیں تھا، بس محبت کرتا تھا اور یہ محبت اسے ایک حد سے آگے جا کر لیلیٰ کو زچ کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اب بھی وہ اپنی جگہ کھڑا، مسکراتے ہوئے لبوں سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ لیلیٰ بھی اپنی پشت پر اس کی نظروں کو محسوس کر رہی تھی لیکن ایسے انجان بنی ہوئی تھی جیسے اسے کوئی خبر ہی نہ ہو۔ اسی بے نیازی سے چلتی ہوئی وہ مراد کی نظروں کی حد سے نکل گئی۔

کچھ فاصلہ اور طے کرنے کے بعد وہ اپنے ڈیرے تک پہنچ گئی۔ اس جگہ گھاس پھونس اور لکڑیوں کی مدد سے بنائی گئی چند جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سب سے بڑی جھونپڑی کے سامنے چارپائی ڈالے ایک پچاس سال سے اوپر کا آدمی نیم دراز، حقے کے کش لگا رہا تھا۔

''لے آئی لکڑیاں۔ چل اب جلدی سے کھانا پکا لے۔ بڑے دن بعد پہاڑی بکرا ہاتھ لگا ہے۔ کھانے کو طبیعت بے چین ہو رہی ہے۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی چارپائی پر نیم دراز آدمی چہک اٹھا۔

''ابھی پکاتی ہوں بابا! ذرا اندر سے ہو کر آ جاؤں۔'' اس نے تحمل سے اس شخص کو جواب دیا اور خود جھونپڑی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کی آنکھوں میں بہت نرم اور پیارا سا تاثر تھا۔ اس تاثر نے اسے مکمل نسوانیت میں ڈھال دیا تھا اور اب دور دور تک اس سختی کا نام و نشان نہیں تھا جو کسی خول کی طرح اس کے وجود کے ساتھ لپٹی رہتی تھی۔ اس وقت وہ مکمل طور پر ایک لڑکی تھی۔ نرمی، محبت اور ملائمت سے گندھی لڑکی.....

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

www.afkaryjeem.com

چنگاری

انجم فاروق ساحلی

انتقام کی چنگاری نے جب دھیرے دھیرے بھڑکتے شعلوں کا روپ دھارا تو ہر منظر... ہر چہرے سے گویا نقاب سا اٹھ گیا... وہ جو کوکھ کے اجڑنے کے غم میں آہستہ آہستہ موت سے قریب تر ہوتی جارہی تھی مگر... جاتے جاتے اپنے غم کا سبب بن جانے والوں سے بھی حساب چکتا کر جانا چاہتی تھی بہرحال ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا جیسا کوئی کرنا چاہے۔

بکھر کر جانے کی لگن میں کچھ بھی نہ کرنے والی حسینہ کی بے بسی

www.urdupoint.com

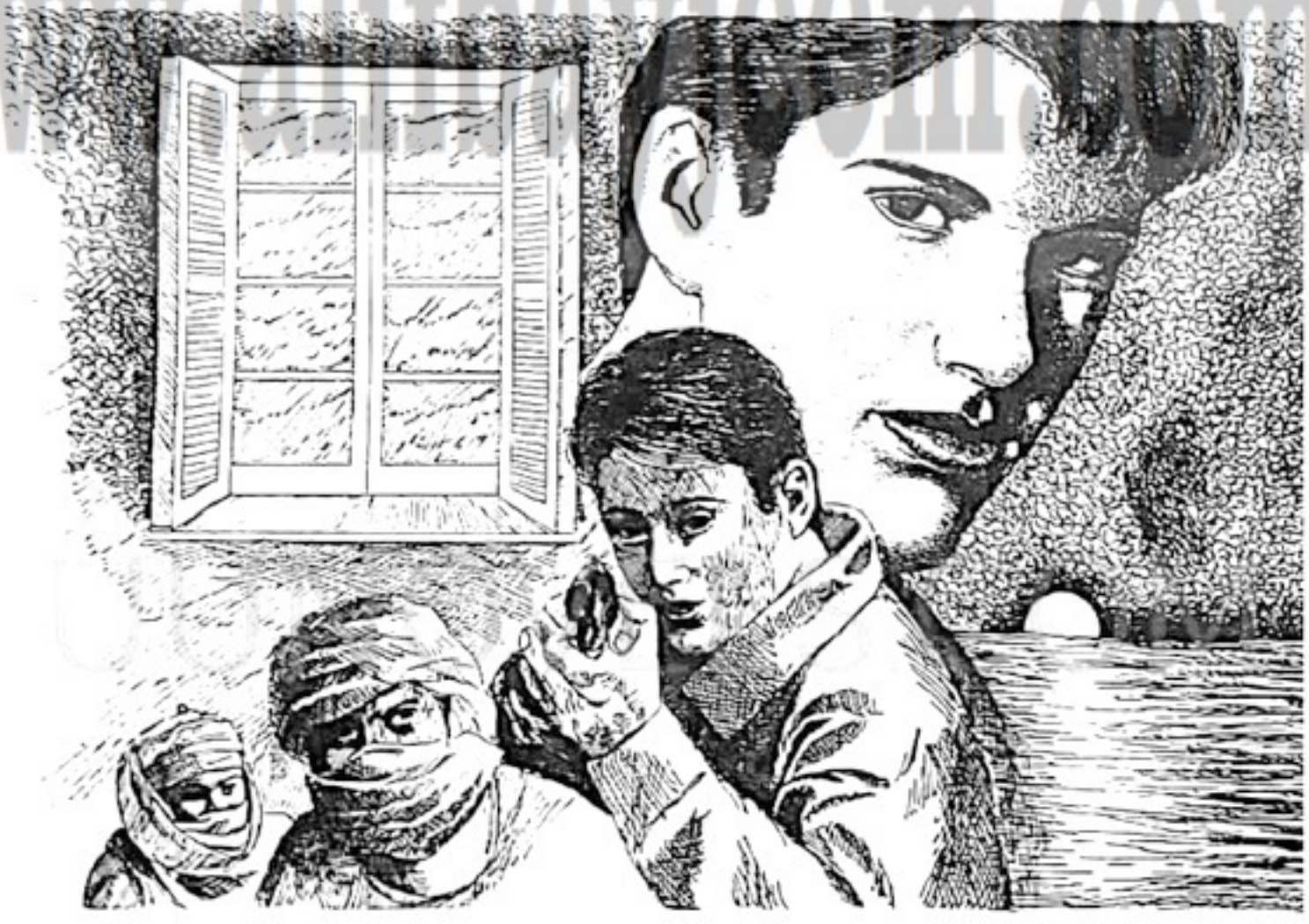

ملازمہ حلیمہ نے کمرے میں داخل ہوکر چائے کی ٹرالی سیٹھ شوکت راز کے بیڈ کے قریب روکی اور ادب سے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ یہ اس کا معمول تھا۔ حلیمہ کا انتظار لمبا ہوگیا۔ دن کے دس بجے کا وقت ہورہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے آنکھ کھولی اور نہ ہی انگلی سے چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ وہ چونک کر سیٹھ کو سر سے پاؤں تک دیکھنے لگی۔

گرمی کا موسم تھا چنانچہ سیٹھ کندھوں تک مہین چادر اوڑھے بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ حلیمہ دھک سے رہ گئی۔ سیٹھ کی بے نور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں اور سانس بھی رکی ہوئی تھی۔ اس نے دو تین آوازیں دے کر سیٹھ کو تھوڑا ہلا

جلا کر دیکھا لیکن زندگی کے آثار مفقود ہو چکے تھے۔

وہ بدحواسی کے عالم میں مڑی اور ٹرالی سے ٹکراتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بھاگی۔ دفعتاً دروازے میں رک کر پلٹی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سیٹھ پر ایک اداس نگاہ ڈالی۔ پھر باہر کاریڈور میں بھاگنے لگی۔ دوسرے نوکر اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

وہ دوڑتی ہوئی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ایک کرسی پر جا گری۔ مسز شوکت اور ان کے دونوں بیٹے ناصر اور یاسر آگے بڑھ کر پُرتشویش نگاہوں سے ملازمہ حلیمہ کی بدحواسی کی کیفیت کو دیکھنے لگے۔ ''وہ..... وہ..... اب۔''

حلیمہ نے اٹک اٹک کر کہا اس کی آواز گھٹ گئی۔ ''کیا اول فول بک رہی ہو، ٹھیک سے بتاؤ۔'' مسز شوکت نے آگے بڑھ کر اسے کندھے سے جھنجوڑا۔ حلیمہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ خلا میں گھورتی رہی۔ اس پر خوف اور اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ مسز شوکت نے ایک بار پھر اس کا شانہ ہلایا تو وہ بیگم صاحبہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''سیٹھ صاحب بالکل بے حس و حرکت پڑے ہیں، وہ بولتے ہی نہیں، شاید وہ اب.....'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں..... نہیں۔'' بیگم صاحبہ باہر کی طرف بھاگیں۔ ناصر اور یاسر بھی دوڑ پڑے۔ سیٹھ صاحب کے کمرے میں داخل ہو کر تینوں بستر کے قریب پہنچے اور جب جھنجوڑنے پر بھی وہ نہ بولے تو مسز شوکت کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں۔ ناصر اور یاسر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے پھر آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر ناصر جو بڑا تھا، کچھ سنبھلا اور یاسر سے کہنے لگا۔

''جاؤ جا کر انسپکٹر سلطان کو اطلاع دو، وہ ابھی دفتر کے لیے نہیں نکلے ہوں گے۔ وہ ہمارے نئے پڑوسی ہیں اور ایک بار آتش زدگی سے ابا جان کی جان بچا چکے ہیں۔''

یاسر تیزی سے باہر کی طرف بھاگا تو ناصر والدہ کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے بولا۔ ''امی جان! بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سانس رکنے سے ابو داعیِ آب و گل سے عالمِ جاوید کو سدھار گئے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوئی دشمن ان کی جان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔''

''بیٹے! میرا بھی یہی خیال ہے بلکہ یقین ہی سمجھو۔ کوئی نادیدہ دشمن اس گھر میں موجود ہے اور وہ اپنا وار کر چکا ہے۔ میں خواب میں ان کے بیڈروم کے باہر ایک سیاہ وجود کو ٹہلتے دیکھ چکی ہوں جس کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں خنجر تھا۔ اس وجود کی آنکھیں تازہ لہو جیسی سرخ تھیں۔'' مسز شوکت کو جھرجھری سی آ گئی۔

انسپکٹر گھر سے باہر نکل رہا تھا کہ یاسر نے ہانپتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا اور دونوں بھاگم بھاگ سیٹھ شوکت کے بیڈروم میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر سلطان نے آگے بڑھ کر بستر اور سیٹھ شوکت کے ساکت وجود کو نظروں کے حصار میں لے لیا۔ سیٹھ مر چکا تھا۔ انسپکٹر سلطان نے اس کا بدن چھو کر دیکھا۔ جسم ابھی پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ انہیں جو بھی ہوا علی الصباح ہی ہوا ہے۔'' وہ بڑبڑا کر تکیے کو غور سے دیکھنے لگا۔ تکیے پر ہلکی ہلکی سلوٹیں موجود تھیں جو غیر فطری معلوم ہو رہی تھیں۔ انسپکٹر سلطان نے تکیہ سر کے نیچے سے نکال لیا اور اسے الٹ کر دیکھنے لگا۔ تکیے کے سفید غلاف پر بنے پھولوں کے درمیان سرخ رنگ کا ایک بڑا سا دھبا موجود تھا اور اس جگہ تکیے پر دباؤ ڈالنے سے ایک گڑھا سا بن گیا تھا۔

انسپکٹر سلطان اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ''آپ کس نتیجے پر پہنچے؟'' لڑکوں سے پہلے مسز شوکت بول اٹھیں۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''انہیں صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل تقریباً آدھے پون گھنٹے کے اندر اندر قتل کیا گیا ہے۔ تکیے پر سلوٹیں ہیں اور پچھلے حصے پر ایک گڑھا بھی بنا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے خاموشی سے کمرے میں داخل ہو کر سیٹھ کے سرہانے آ کر تکیہ کھینچا اور تیزی سے سیٹھ کے منہ پر رکھ کر دبا دیا جس سے تکیے پر سلوٹیں پڑ گئیں کیونکہ غلاف دھلا ہوا اور استری شدہ ہے۔ گڑھے کے درمیان سرخ رنگ کا ایک دھبا بھی موجود ہے۔ شاید یہ ان کا خون ہے جو منہ سے نکلا ہے۔ مجھے یاد ہے، انہیں تھوک میں خون آنے لگا تھا۔'' اسی وقت انسپکٹر سلطان آگے بڑھتا ہوا رک گیا۔

ناصر کا فون سن کر ڈاکٹر رحمانی فوراً آ پہنچا۔ وہ سیٹھ شوکت کا فیملی ڈاکٹر اور لنگوٹیا یار بھی تھا۔ انسپکٹر سلطان نے افسردہ انداز سے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''مرحوم میرے بھی دوست بن چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب! ان کے منہ میں پان کے سرخ رنگ کے علاوہ خون بھی موجود ہوگا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ انہیں تھوک میں خون آنے کی شکایت لاحق ہو چکی تھی۔'' ڈاکٹر نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور نڈھال سا ہو کر آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ مرحوم کے ان پر کئی احسانات تھے۔ ڈاکٹر

www.aiman.com

رحمانی نے معائنہ کرتے ہوئے منہ کھول کر دیکھا اور منہ کے اندر موجود رطوبت کو انگلی سے نکال کر اسے شیشے کے ایک لمبے ٹکڑے پر ڈال کے محدب عدسے سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پان کی سرخی میں خون کی آمیزش شامل تھی جو سیاہی مائل ہونے کے قریب تھی۔

''آپ کا اور اہلِ خانہ کا خیال درست ہے۔ کسی دشمن نے انہیں سانس روک کر موت سے ہمکنار کیا ہے۔ پھیپھڑوں پر سانس رکنے سے دباؤ کے آثار موجود ہیں پھر منہ میں خون ملا تھوک کافی مقدار میں ملا ہے۔'' انسپکٹر سلطان نے تکیہ اٹھا کر ڈاکٹر کے سامنے کر دیا۔ ڈاکٹر تکیے کا پچھلا حصہ غور سے دیکھ کر چونک اٹھا اور اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''انہیں تکیے کی مدد سے سانس روک کر قتل کیا گیا ہے۔''

کچھ دیر بعد فنگر پرنٹ کا عملہ بھی آپہنچا انسپکٹر سلطان نے انہیں فون کر دیا تھا۔ انگلیوں کے نشانات اٹھائے جانے لگے۔ پھر بیرونی دروازے کے ہینڈل پر بھی ایکسپوزر پاؤڈر چھڑکا گیا۔

انسپکٹر سلطان کمرے میں دیوار کے قریب لگی نشست گاہ پر آبیٹھا۔ اس نے سب سے پہلے ملازمہ حلیمہ کو طلب کیا۔ ''لاش سب سے پہلے تم نے دریافت کی تھی؟'' انسپکٹر سلطان نے حلیمہ کے بیٹھتے ہی اسے گھورا۔

''انسپکٹر صاحب! میں حسب معمول چائے کی ٹرالی لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو صاحب بے حس و حرکت پڑے تھے۔ میں نے ہلا جھلا کر دیکھا، وہ ساکت تھے۔ میں نے بھاگ کر بیگم صاحبہ اور لڑکوں کو اطلاع دی۔''

''کمرے کا بیرونی دروازہ رات کے وقت کھلا رہتا ہے؟''

''ہاں انسپکٹر صاحب! گرمی کا موسم ہے اور صاحب کو اے سی کی ٹھنڈک پسند نہیں، انہیں سردی لگ جایا کرتی تھی۔ چنانچہ اس مرتبہ انہوں نے اے سی کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ وہ رات کے وقت کمرے کا خارجی دروازہ اور کھڑکیاں کھول کر سویا کرتے تھے بصورتِ دیگر انہیں گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔''

حلیمہ نے کھلی کھڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جن کے پٹ اندر کی طرف کھلے ہوئے تھے لیکن لوہے کی سلاخیں حائل تھیں۔

یہ پرانے طرز کی کھڑکیاں تھیں مگر آرائش اور خوبصورتی قابلِ دید تھی۔ کمرا بھی آراستہ و پیراستہ اور قیمتی اشیا سے سجا ہوا تھا۔ سیٹھ شوکت شان و شوکت سے زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ وہ گارمنٹس کی کئی فیکٹریوں کا مالک تھا۔

''کیا آپ نے کسی کو مشکوک انداز میں رات کے وقت سیٹھ شوکت کے کمرے کے گرد منڈلاتے دیکھا تھا.....

جو آج صبح سیٹھ کی سالگرہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں اور اس وقت سو رہے ہیں۔''

''نہیں انسپکٹر۔'' حلیمہ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

انسپکٹر سلطان کی تیز نگاہیں اس پر مرتکز تھیں۔ ''کیا آپ کو علم ہے کہ چند روز قبل جب سیٹھ صاحب اپنے عقبی باغ کے ساتھ موجود فارم کے شکاری ہٹ میں صبح کے وقت ناشتا کر رہے تھے انہیں کیبن کے گرد آگ بھڑکا کر زندہ جلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ آپ اس وقت کہاں تھیں؟''

حلیمہ کچھ سراسیمہ سی دکھائی دینے لگی پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔ ''انسپکٹر صاحب! میں انہیں چائے اور ناشتا دے کر واپس آرہی تھی انہیں میرے ہاتھ کی چائے بہت پسند تھی بلکہ وہ چائے کے دیوانے تھے۔''

''آپ نے اس طرف کسی اور کو دیکھا تھا؟''

''یاد پڑتا ہے، غالباً ڈرائیور کچھ دور گھوم رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے، آپ جا سکتی ہیں۔'' انسپکٹر سلطان نے ناصر اور یاسر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں تھکے تھکے بوجھل قدموں کے ساتھ غم زدہ حالت میں ان کے سامنے آبیٹھے۔

''حوصلہ کیجیے، گھر سنبھالنے کی ذمے داری اب آپ دونوں پر ہے۔''

انسپکٹر سلطان نے انہیں تسلی دی۔ ''سیٹھ صاحب کے کمرے کا دروازہ رات بھر کھلا رہتا تھا۔'' پھر وہ سگریٹ جلا کر بولا۔ ''لہٰذا قاتل کے لیے کوئی مشکل نہ تھی۔''

''آپ کا خیال درست ہے۔'' دونوں نے بیک زبان اعتراف کیا۔

''آپ کے خیال میں قاتل کون ہو سکتا ہے کیونکہ باہر سے کسی کے آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔'' انسپکٹر سلطان نے انہیں کریدا۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جب سے پاپا نے ڈرائیور مظہر کو اپنی لاٹھی سے پیٹا تھا، وہ کچھ ناراض اور خائف دکھائی دیتا تھا۔ وہ سزا یافتہ بھی ہے جس کی بنا پر اس پر شبہ ہو رہا ہے۔'' ناصر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے ڈرائیور کو کیوں پیٹا تھا؟''

''اس کمبخت نے بہت ہی بے پروائی کا ثبوت دیتے ہوئے مون مارکیٹ اقبال ٹاؤن میں لوڈشیڈنگ کے وقت اندھیرے میں سڑک پار کرتے ہمارے چچا شمس راز کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ڈیڈی نے کار سے باہر نکل کر بھائی کو سنبھالا لیکن ان کا غصہ آسمان پر تھا۔ کشیدگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایک انویسٹر نے ایک زرعی رقبہ پہلے ہمارے والد سیٹھ شوکت راز کو فروخت

www.pdfbaiyeem.com

کیا اور پھر دوسرے جعلی کاغذات کی مدد سے ہمارے چچا کو بھی بیچ دیا اور خود غائب ہو گیا۔ اس سلسلے میں عدالت میں کیس بھی چل رہا ہے۔'' ناصر نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''چچا ابھی پچھلے ہفتے ہی وہیل چیئر سے اٹھ کر چلنے کے قابل ہوئے ہیں۔'' ناصر نے اس طرف آتے چچا کو ایک اداس نگاہ سے دیکھا۔

انسپکٹر سلطان نے انہیں کچھ دور بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر تیز نظروں سے دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم دونوں بھی شک سے بری نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' دونوں اچھل ہی پڑے۔

''آپ دونوں کا لکڑی کے کیبن والے واقعے سے ایک روز قبل سیٹھ شوکت سے جھگڑا ہوا تھا جس میں آپ دونوں نے انہیں سخت الفاظ میں کنجوس قرار دیتے ہوئے برا بھلا کہا تھا۔ آپ دونوں کرکٹ کے میچوں پر خطیر رقم میں جوئے بازی کرنے کے عادی ہیں۔ آپ دونوں ان دنوں بحران کا شکار ہیں۔ آپ نے ایک بڑی رقم کا سیٹھ صاحب سے تقاضا کیا تھا لیکن انہوں نے مطالبہ مسترد کر دیا۔ جس پر آپ دونوں مشتعل ہو گئے اور اپنے باپ کے ساتھ بدکلامی کی۔ یہ بات سیٹھ صاحب نے ہی مجھے بتائی تھی۔''

''وہ سب وقتی ردعمل تھا لیکن ہم انہیں قتل کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔'' دونوں نے نظریں جھکا لیں۔ انسپکٹر سلطان نے ان کے چچا شمس راز کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور دونوں بھائیوں کو رخصت کر دیا۔

''شمس صاحب! آپ کے اور سیٹھ شوکت کے درمیان زمین کی ملکیت کا جھگڑا چل رہا تھا۔ بقول سیٹھ شوکت کے آپ نے انہیں اسپتال میں برا بھلا کہا اور یہ الزام بھی عائد کیا کہ انہیں انہی کی ہدایت پر حادثے کا شکار کرنے کی دانستہ کوشش کی گئی ہے اور یہ بھی کہ .... سیٹھ شوکت زمین پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ درست ہے کہ مجھے وقتی طور پر مقدمے کی وجہ سے سخت غصہ آیا تھا لیکن میں کسی حالت میں بھی انہیں قتل نہیں کر سکتا۔ آخر وہ میرے بڑے بھائی تھے، باپ برابر۔''

''آپ ان کی سالگرہ میں شرکت کرنے کے لیے ساتھ والی خواب گاہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو آپ کے والد سیٹھ شمشاد علی راز کی قیام گاہ ہوا کرتی تھی۔''

''جی ہاں انسپکٹر صاحب! آپ کی اطلاع درست ہے۔ میں آنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن دونوں گھروں کے بچوں کی ضد کے آگے ہار مان بیٹھا۔''

''آپ علی الصباح انتقامی جذبات دل میں لیے بستر سے اٹھے اور بیڈ روم اور خواب گاہ کے مشترکہ واش روم کا دروازہ کھول کر گزرتے ہوئے سیٹھ شوکت کے بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ آپ دستانے پہنے ہوئے تھے۔ آپ نے تکیہ کھینچ کر منہ پر رکھا اور دبا دیا۔ آپ کے بازو خاصے مضبوط ہیں۔'' انسپکٹر سلطان نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔

شمس راز پھٹی پھٹی نگاہوں سے انسپکٹر سلطان کو دیکھتا ہوا چلا اٹھا۔ ''آپ..... آپ..... آپ تو بدترین قسم کی الزام تراشی کر رہے ہیں۔''

''یہ تفتیش کا طریقہ کار ہے۔ ہمیں مقتول کے گرد موجود تمام افراد کو شک و شبہے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر تحقیقی مراحل میں ہی ہم اکثر قاتل تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں اگر آپ نے برا محسوس کیا۔'' انسپکٹر سلطان نے اس بار ملائمت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن شمس راز مسلسل غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''ٹھیک ہے، آپ جا سکتے ہیں۔'' انسپکٹر سلطان نے اسے فارغ کر دیا۔ شمس راز پاؤں پٹختا ہوا اہل خانہ کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک ملازم قریب چلا آیا اور انسپکٹر سلطان کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر سلطان کا اسسٹنٹ انسپکٹر فرحان ڈرائیور مظہر جبار کو لے کر قریب آ گیا۔ انسپکٹر سلطان نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ڈرائیور گھبرا گیا۔ ''تم سزا یافتہ مجرم ہو؟''

''ہاں، یہ درست ہے لیکن میں اب برے دھندے چھوڑ چکا ہوں اور اس ملازمت سے اخراجات اور زندگی کا بارِ گراں اٹھا رہا ہوں۔''

''تم نے کس کے کہنے پر شمس راز کو کچلنے کی کوشش کی تھی؟''

''وہ..... وہ ایک اتفاقیہ حادثہ تھا۔ دانستہ کوشش نہیں تھی۔ مون مارکیٹ میں اچانک غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ سے اندھیرا چھا گیا تھا۔ شمس صاحب ایک ریسٹورنٹ سے نکلے اور اچانک گلشن اقبال کی طرف سے آنے والی ہماری کار کی زد میں آ کر زخمی ہو گئے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ انتہائی بے احتیاطی سے سڑک عبور کر رہے تھے۔'' ڈرائیور نے قدرے سنبھلتے ہوئے دفاع کیا۔

''سیٹھ صاحب، تمہاری غفلت اور حادثے سے ناراض ہوئے، غصے میں آئے اور انہوں نے گھر آ کر تمہیں اپنی پیتل کی چھڑی سے پیٹ ڈالا۔ تمہارے جسم پر نیل پڑ گئے۔ تم نے مالی کے سامنے برے جذبات کا اظہار کیا جو چھپا نہ رہ سکا۔'' انسپکٹر سلطان نے ایک ایک لفظ چبا، چبا کر ادا کیا۔

www.urdupoint.com

''ایسا..... ایسا..... کچھ بھی نہیں، وقتی طور پر کسے خوامخواہ مار کھانے کے بعد غصہ نہیں آتا۔'' ڈرائیور نے سر جھکا کر کہا۔

''اس کے علاوہ ایک ملازم نے تمہیں اپنے سرونٹ کوارٹر سے نکل کر عقبی راستے سے عمارتی حصے میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ عقبی راستہ گھوم کر سیدھا سیٹھ کے کمرے کے باہر واقع کاریڈور سے آملتا ہے۔ وہ تم تھے جو انتقامی جذبات سے مجبور ہو کر سیٹھ کے کمرے میں علی الصباح داخل ہوئے اور انہیں تکیے کی مدد سے موت کی نیند سلا دیا۔''

ڈرائیور ہکا بکا رہ گیا اور انسپکٹر سلطان کا منہ تکنے لگا۔

''اُف..... آپ تو خوامخواہ مجھے ملوث کر رہے ہیں بلکہ قاتل سمجھ رہے ہیں۔ علی الصباح میں چھٹی لینے کے لیے عمارتی حصے کی طرف آیا تھا لیکن واش روم میں چلا گیا۔ رات سے مجھے موشن آرہے تھے۔ میں سیٹھ صاحب کے کمرے کے قریب پہنچا لیکن پھر پیٹ میں ایسا مروڑ اٹھا کہ قریبی واش روم بھاگنا پڑا لہٰذا سیٹھ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی اور وہ چل بسے۔''

''بہرحال تم پر قوی شبہ قتل ہے، تم اس حویلی سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے، فی الحال باہر نکلنے کی بھی اجازت نہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ کل صبح تک قاتل میری گرفت میں ہوگا۔ میں اسے گرفتار کر کے ہی اس حویلی سے باہر جاؤں گا۔'' انسپکٹر سلطان نے مستحکم لہجے میں میز پر مکا جما دیا۔

انسپکٹر سلطان نے فنگر پرنٹ رپورٹ کو جیب میں رکھ لیا اور دن بھر اہل خانہ اور ملازموں سے پوچھ گچھ کرتا رہا لیکن شام کے وقت صورتِ حال ایک نیا رخ اختیار کر گئی۔

ناصر دوسری منزل پر واقع اپنے خوبصورت بیڈروم سے باہر نکلا اور اپنے دوست سے ملنے کے لیے زینے کے قریب پہنچا تو اس کے دائیں شوز کا تسمہ کھلا ہوا تھا۔ وہ تسمہ باندھنے کے لیے جھکا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ زینے پر آر پار جنگلے میں پیانو کا موٹا تار بندھا ہوا تھا۔ وہ دھک سے رہ گیا۔ اگر غفلت سے تسمہ کھلا نہ رہ جاتا تو وہ تار سے الجھ کر طویل زینے سے لڑھک کر موت کے منہ میں چلا گیا ہوتا۔ اس نے انسپکٹر سلطان کو بلایا۔ انسپکٹر سلطان نے تار کو احتیاط سے کھول کر محفوظ کر لیا۔ اس پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھانا مشکل تھا۔

یاسر چہل قدمی کرنے سوئمنگ پول کی طرف نکل گیا۔ جیسے ہی وہ ٹینس کورٹ کے قریب پہنچا جہاں اس کی کزن اس کی منتظر تھی۔ اچانک ایک فائر ہوا اور خوش قسمتی سے اس کا پیر کسی شے سے پھسل گیا۔ وہ نیچے گر کر گولی سے بچ نکلا۔ اس نے لڑھک کر نزدیکی درخت کی آڑ لے لی اور دوسری منزل کے سامنے والے برآمدے کو دیکھنے لگا جہاں ایک سیاہ سایہ نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔

یاسر نے پھسلنے والی شے کا جائزہ لیا۔ وہ کیلے کا ایک چھلکا تھا جو کسی نے بے احتیاطی سے روش پر پھینک دیا تھا لیکن اس نے اس کی جان بچائی تھی۔ یاسر نے وہ چھلکا جیب میں ڈال لیا۔

انسپکٹر سلطان رات کے وقت حویلی میں سیکیورٹی راؤنڈ لے رہا تھا کہ ایک جگہ چونک کر رک گیا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

''الوداع سانپ کے بچو! تم بھی اپنے باپ کے مانند موت کی نیند سو چکے ہو۔'' سیاہ وجود نے ناصر اور یاسر کی طرف بڑھتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا۔ دونوں بستروں پر بازو پھیلائے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ اچانک کمرے میں ایک بارعب آواز گونجی۔

''مگر یہ دونوں تو زندہ ہیں اور تم سے اپنے باپ کے

تابعداری

بیگم نے پچاس روپے کے دو نوٹ دیے اور کہا۔ ''پچاس کی پیاز، پچاس کے آلو لے آئیں۔''

شوہر کچھ دیر بعد واپس آیا اور بولا۔ ''پیاز والا نوٹ کون سا ہے؟''

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

وزیر ریلوے

کافی پرانا لطیفہ ہے۔ جب پاکستان میں افغان مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک افغان مہاجر نے اپنا تعارف ریلوے کے وزیر کے طور پر کرایا۔ مخاطب نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''وہ کیسے؟ افغانستان میں تو ریلوے ہی نہیں ہے۔''

افغان مہاجر ہنس کر بولا۔ ''پاکستان میں بھی تو وزیر قانون ہے۔''

مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال

www.aiibayeem.com

قتل کا سبب پوچھنا چاہتے ہیں۔'' سیاہ وجود دروازے میں اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کے ماحول کو دیکھنے لگا پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لمبی نال والا ریوالور نکال لیا۔ وہ در و دیوار اور الماریوں کو گھورنے لگا۔

''یہ پستول پھینک دو، اس کی گولیاں میرے پاس ہیں۔'' سامنے کھڑکی کے بھاری پردے کے پیچھے سے انسپکٹر سلطان ریوالور کے ٹریگر پر دباؤ ڈالتا ہوا باہر نکلا۔ سیاہ وجود نے اپنے پستول کے چیمبر کا جائزہ لیا اور غصے سے پستول انگلی میں گھمانے لگا۔

''نقاب اتار دو، ظالم عورت۔ تمہارا بہروپ خوب تھا لیکن میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔ تم سیٹھ شوکت کی دوسری گمنام بیوی ہو جو اب بیوہ ہو چکی ہے۔ تمہارا منصوبہ اچھا تھا اگر میں بیچ میں نہ آتا۔ میں نے سیکیورٹی گشت کے دوران رات کے پچھلے پہر تمہیں بڑبڑاتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تم نے کیوں سیٹھ شوکت کو قتل کیا۔'' دونوں اس طرح اچھل کر بستروں سے فرش پر کھڑے ہو گئے جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔ وہ شعلہ بار نظروں سے سیاہ وجود کو گھورنے لگے۔

''تم حلیمہ ہو، ملازمہ حلیمہ جس کے ہاتھ کی چائے سیٹھ صاحب کو بہت پسند تھی۔'' سیاہ وجود نے اب نقاب اتار دیا تھا۔ دونوں بیٹے زور سے اچھلے۔ حلیمہ کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ ''تم نے پیانو کے تار سے ناصر اور رائفل کے فائر سے یاسر کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ بچ نکلے تو تم نے رات کے وقت دودھ میں زہر ملا کر انہیں مارنے کی کوشش کی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔'' انسپکٹر سلطان نے میز پر لڑھکتے ہوئے دودھ کے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دونوں دودھ پینا ہی چاہتے تھے کہ بیڈ کے نیچے سے ان کی پالتو بلی نکل کر زبان منہ سے باہر لٹکائی ہوئی اپنی بھوک کا اعلان کرنے لگی۔ ناصر نے تھوڑا سا دودھ اس کے برتن میں ڈال دیا جو میز کے نیچے پڑا رہتا ہے۔ بلی دودھ پیتے ہی لیٹ گئی۔ وہ مر چکی تھی۔ دونوں چونک اٹھے اور موبائل فون پر مجھے اطلاع کر دی۔ میں نے دودھ محفوظ کر لیا اور لیبارٹری روانہ کر دیا۔ تم نے دودھ میں ایسا زہر ملا دیا تھا جس سے فوراً موت واقع ہو جاتی ہے۔'' انسپکٹر سلطان سانس لینے کے لیے رکا پھر دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''تم نے ہی سیٹھ شوکت راز کے فارم پر واقع کیبن کے گرد آگ بھڑکا کر اسے زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔ میں اس وقت اپنی چھت پر ٹہل رہا تھا۔ میں نے وہ منظر دیکھ لیا تھا اور فائر بریگیڈ کو فون کیا، اتفاق سے وہ قریبی سڑک سے ہی گزر رہے تھے چنانچہ میری ہدایت پر وہ عقبی گیٹ توڑ کر اندر گھسے اور آگ بجھاتے ہوئے سیٹھ کو بچا لیا۔ اس کے بعد تم نے صبح کی چائے لے جانے سے آدھا گھنٹا پیشتر ان کے کمرے میں جا کر تکیے کی مدد سے ان کا سانس بند کر دیا۔'' انسپکٹر رک کر دوبارہ بولنے لگا۔ ''سیٹھ نے پشیمانی کے عالم میں جو خطوط تمہیں راجن پور بھیجے تھے، وہ بھی میں نے تمہارے بیگ کی خفیہ جیب سے برآمد کر لیے ہیں۔''

حلیمہ خونی نگاہوں سے انسپکٹر سلطان کے بجائے دونوں کو گھورنے لگی۔ ''اس بار بھی بچ گئے لیکن اگر زندگی رہی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ غرا کر بولی۔ وہ غضب کے عالم میں مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

''تمہاری ہماری دشمنی کیا ہے؟ اگر تم ان کی دوسری بیوی ہو تو مسئلہ کیا ہے؟'' ناصر نے چونک کر پوچھا۔

''تمہارے باپ نے راجن پور میں میرے ہاتھ کی چائے پسند کرتے ہوئے دوستی کی اور پھر شادی بھی کر لی۔ وہ ان دنوں شکار کے سلسلے میں وہاں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ میں ماں بننے والی تھی۔ اس نے تمہارے دادا سے میرا تذکرہ کیا۔ تمہارے دادا نے کہا کہ اسے چھوڑ کر لاہور رائے ونڈ حویلی میں آ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں جائداد سے عاق کر دوں گا۔ تمہارے دادا خاندان سے باہر شادی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ تمہارا بزدل باپ ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرا کر جائداد کے لالچ میں مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے طلاق نہ بھیجی لیکن میری زندگی کو عذاب بنا دیا۔ میرا باپ صدمے سے چل بسا۔ بستی کے لوگوں نے مجھے دھکے دے کر بستی سے نکال دیا۔ میں نے ایک لاوارث بچے کو جنم دیا۔ پالا پوسا، بڑا کیا لیکن ایک رات کھلے آسمان تلے نمونیہ کی حالت میں وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا۔ میری گود اجڑ گئی۔ میں نے تنہا ہی اپنے چاند کو آنسوؤں کے ساتھ دفن کیا اور قسم کھائی تھی کہ اگر سیٹھ شوکت مل گیا تو اسے اور اس کی اولاد دونوں کو قتل کر دوں گی۔ میرے سینے میں انتقام کی چنگاری سلگ رہی تھی، جو بھڑک کر... آگ کا الاؤ بن گئی۔ میں نے سیٹھ کو تلاش کر لیا۔''

انسپکٹر سلطان کے اشارے پر رؤف اور اسرار نے اندر آ کر اسے ہتھکڑی لگا دی۔ وہ باہر جاتے ہوئے مڑ کر بولی۔ ''رئیس زادو! اگر میں بچ نکلی تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ آگ ابھی بجھی نہیں ہے۔''

⌘⌘⌘

www.allbayjeem.com

کارساز

صبا مغل

کبھی کبھی غلط فہمیاں بھی کسی قدر درست سمت میں چلنے کا سبب بن جاتی ہیں۔۔۔ جیسے کہ اس کی ایک ذرا سی غلطی نے کتنی بڑی نیکی کا دروازہ کھولا جس کا اندازہ اسے بہت بعد میں ہونے والا تھا۔

بے بس لوگوں کا وسیلہ بن جانے والی کارساز ذات کی مہربانی

www.alifbyi.com.com

کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات اور قصے ہوتے ہیں جو ہماری ''دوستوں کی بیٹھک'' کا لازمی جزو بن جاتے ہیں اور انہیں ہر دفعہ دہرانے اور سننے میں اتنا ہی لطف آتا ہے جتنا پہلی بار میں آتا ہے۔

ان دنوں ہماری رہائش شہر کے پسماندہ علاقے میں تھی۔ میری دکانداری بھی بالکل معمولی سی تھی۔ بس اتنا تھا کہ ہانڈی چولہا اچھے سے چل جاتا تھا اور بیوی بچوں کا خرچہ پورا ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ضروری اخراجات کی

لسٹ کو کم سے کم تر کرنے کی کوشش ہوتی تھی۔ رمضان کا چاند نظر آیا تو مجھے دن میں تارے نظر آنے لگے تھے۔ روزانہ کے خرچے نے ایسی اسپیڈ پکڑی تھی کہ روکو تو کیسے روکو اور کس کو روکو۔ یہ شاید رمضان کی برکت ہی تھی جو روزانہ کا خرچہ پورا ہو رہا تھا۔ ورنہ سوچو تو سمجھ نہیں آتا تھا۔ جو پیسا جیب میں آ رہا تھا، وہ لگ رہا تھا۔

مہینا ڈیڑھ مہینا پہلے اہلیہ کی کزن کی شادی پر دوسرے شہر جانا ہوا۔ اس سلسلے میں مجھے کبیر کریانہ اسٹور والے سے پانچ ہزار روپے ادھار لینے پڑے۔ کبیر سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ اکثر رات کو عشا کی نماز کے بعد ہم اس کی دکان پر ہی تھوڑی دیر کے لیے گپ شپ کرتے۔ کبھی کبھی چائے کا دور بھی چل پڑتا۔ کبیر کی ہمشیرہ نائلہ بہن گھر کے نیچے والے پورشن میں میاں اور بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ کبھی کبھار کبیر اس سے ملنے آتا تھا لیکن گھر کی خواتین کے پردے کا لحاظ کرتے ہوئے ہم گھر سے باہر ملنے کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

پچھلے دو دن سے میں اپنی قمیص کے اندر والی خفیہ جیب میں پانچ ہزار کا نوٹ لے کر گھوم رہا تھا۔ خرچوں کے بیچوں بیچ بڑی مشکل سے اس کی گنجائش بنی تھی اور یہ نوٹ میں کسی صورت تڑوانے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر سو روپے کے لیے بھی میں نے اس کا چینج لے لیا تو پھر ان سارے پیسوں کو ہوا ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ میں جلد از جلد کبیر کو ادھار واپس کرنا چاہ رہا تھا۔

آج بھی کبیر کی دکان بند دیکھ کر میں مایوسی سے واپس گھر لوٹ رہا تھا۔ میں عید کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کا ادھار واپس کرنے کے لیے بے چین تھا۔ گھر کی گلی کے شروع میں مجھے وہی فقیر دوبارہ نظر آیا۔ اس نے بجھی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر صدا لگائی۔

''صاحب نوں بھاگ لگن..... مجبور کی مدد کردو۔''

اس کے ہمراہ وہی میلے کچیلے فراک میں بکھرے ہوئے شہد رنگ بالوں والی بچی تھی۔ یہ فقیر شروع رمضان سے ہماری گلی میں سحری کے وقت صدا لگا رہا تھا۔ شام کو افطاری سے پہلے بھی اسی گلی میں پایا جاتا تھا۔ پر اب دو دن سے میرا اس سے سامنا ہو رہا تھا۔ اب بھی اسے خنظر دیکھ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کل ہی کی طرح جیب بھی خالی تھی۔ جو تھوڑے بہت کھلے پیسے تھے، میں ان سے دہی اور چاٹ کا سامان لے چکا تھا۔ آج بھی جیب ٹٹولتے ہوئے اندرونی جیب میں پڑے پانچ ہزار کے نوٹ کی کڑکڑاہٹ نے جیسے مجھے گھرک دیا تھا۔

''خبردار! یہ کڑکڑاہٹ بھی اس بے چارے تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ کہاں وہ غریب چند چھوٹے نوٹوں کا سوالی..... کہاں تو پانچ ہزار کا نوٹ لیے پھر رہا ہے۔''

''بھئی آج بھی کوئی کھلے پیسے، ریزگاری نہیں میرے پاس۔ ورنہ میں ضرور دیتا۔'' فقیر سر ہلاتا ہوا پھر سے مجھے دعائیں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں واقعی اس کو کچھ دینا چاہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑی چھوٹی بچی کی زرد ہوتی آنکھیں، اترا ہوا چہرہ دل کو ٹھیس پہنچاتا تھا۔ پر عجیب بات تھی، دو دن سے میرے سامنے وہ اس وقت آتا تھا جب میری جیب خالی ہوتی تھی یعنی کھلے پیسے نہیں ہوتے تھے سوائے اس پانچ ہزار کے نوٹ کے۔

اگلے دن شام کو اسی طرح ادھار واپسی کی امید لیے میں کبیر کی دکان پر گیا۔ دکان تو کھلی تھی پر کبیر کسی کام سے گھر گیا ہوا تھا، مدد گار لڑکا البتہ دکان پر موجود تھا۔ بہر حال اس لڑکے کو تو کسی صورت میں پانچ ہزار کا نوٹ نہیں تھما سکتا تھا۔ میں نے کھلے پیسوں سے بچوں کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لیں اور پھر گھر کا رخ کیا اور پھر..... گھر کی گلی مڑنے سے پہلے ہی اسی فقیر سے سامنا ہو گیا۔ اس کی اور اس کے ساتھ کھڑی معصوم سی خستہ حال بچی کی نگاہیں پھر سے مجھ پر جمی تھیں۔ میں نے جلدی سے جیبیں ٹٹولیں۔ ایک دس روپے کا نوٹ اور دو دو روپے کے سکے میرے ہاتھ میں آئے، باقی خالی جیب میرا منہ چڑا رہی تھی۔ اس دوران میں وہ دونوں میرے قریب آ چکے تھے۔ اتنے دن انتظار کروانے کے بعد اب چودہ روپے ہاتھ پر رکھتے ہوئے مجھے ندامت محسوس ہو رہی تھی۔

''اُف..... بابا! کیا کروں اب میں..... آج پھر پیسے نہیں بچے۔'' میں نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔ بابا بہ دستور انہی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا پھر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''چلو بابا! وعدہ ہے تم سے۔ کل خوش کر دوں گا۔''

''اچھا صاحب جی! کل تو ویسے بھی آخری دن ہے یہاں میرا۔'' فقیر صدا لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ کل سو روپے بابا کو دے دوں گا اور ایک سو کا نوٹ اس بچی کو پکڑا دوں گا۔

اگلے دن میری سسرال میں افطار کی دعوت تھی۔ میں جلدی گھر آ گیا تھا۔ اہلیہ اور بچے ابھی تیار ہو رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر کے لیے ٹی وی لگا لیا اور خبریں سننے لگا۔ میرا

www.urdunovels.com

چھوٹا چھ سالہ بیٹا احمد ٹیرس میں بال سے کھیل رہا تھا۔ ٹیرس کا دروازہ بند تھا۔ میں کھڑکی سے اسے بڑی محویت سے دیکھتا رہا۔ وہ آج کل بہت شرارتی ہوگیا تھا۔ ہر کام اس سے الٹا ہوتا تھا اور مجھے اس پر رہ رہ کر غصہ آتا تھا لیکن اس وقت اکیلے بال سے کھیلتا مجھے وہ بہت ہی معصوم لگا۔ مجھے بے طرح پیار آیا اس پر۔ میں اٹھ کر باہر ٹیرس میں اس کے پاس جانے لگا تو سیڑھیوں کے پاس نیچے سے مجھے کبیر کی آواز آئی۔ وہ اپنی بہن سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ عجلت میں ہے اور بیٹھے گا نہیں۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھول کر احمد کو اندر بلایا۔

''بیٹا! کبیر انکل نیچے آئے ہیں۔ انہیں یہ پیسے دے آؤ۔'' میں نے پانچ ہزار کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ وہ فرمانبرداری سے سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔ اسی دوران میں کمرے کے اندر میرے فون کی گھنٹی بجی اور میں ادھر بھاگ گیا..... عید سے دو دن پہلے عشا کے بعد کبیر سے دکان پر ملاقات ہو ہی گئی۔

میں نے کہا۔ ''یار! تو نے اچھا تنگ کیا ہے مجھے۔ کسی نے ادھار لینے کے لیے اتنے چکر نہیں لگائے ہوں گے جتنے میں نے واپس دینے کے لیے لگا دیے ہیں۔ بڑا بوجھ تھا میرے اوپر۔ وہ تو شکر ہے اس دن تو باجی سے ملنے گھر آگیا تو میں تجھے تیرے پیسے دے کر آزاد ہوا۔''

بسکٹ کا پیکٹ کھول کر میرے سامنے رکھتے ہوئے کبیر جیسے اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔

''کون سے پیسے یار؟'' اس کی آنکھوں میں ازحد حیرت اور الجھن تھی۔ ''مجھے تو کوئی پیسے نہیں ملے۔'' اب کی بار جیسے دھماکا ہوا تھا، میرے سر کے اندر۔ دکان سے لے کر گھر تک کا راستہ نہ جانے میں نے کیسے طے کیا تھا۔

احمد ٹی وی پر اپنے پسندیدہ کارٹون دیکھ رہا تھا۔ اہلیہ نے مجھ سے مطلوبہ چیزوں کا پوچھا، پر اس وقت بوکھلاہٹ میں مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

''احمد..... اس دن جو پیسے میں نے تمہیں نیچے انکل کو دینے کے لیے دیے تھے، وہ کہاں ہیں؟'' میں نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر گرجتے ہوئے پوچھا۔ وہ میرے اس اچانک رویے پر خوفزدہ سا ہو کر کانپنے لگا تھا۔

''وہ..... وہ تو..... میں نے دے دیے تھے۔ فقیر انکل کو۔''

''فقیر انکل..... کون سے فقیر انکل.....؟'' میری آواز پہلے سے زیادہ اونچی تھی۔ وہ اب باقاعدہ رونے لگا تھا۔ رونے کے درمیان ہی اٹک اٹک کر وہ بولا۔

''وہی فقیر انکل جو روز آواز دیتے ہیں۔ نیچے گلی میں ان کی آواز آرہی تھی..... تبھی تو آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ نیچے فقیر انکل آئے ہیں۔ انہیں یہ پیسے دے آؤ۔'' وہ بری طرح سہما ہوا تھا۔ میری بیوی بھی پاس کھڑی الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

احمد تو معصوم تھا۔ اس کو نہ تو پیسوں کی پہچان تھی نہ ہی اس کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت تھی۔ اس کے لیے اہمیت تھی تو صرف باپ کے حکم کی۔ دوسری طرف سماعت کے دھوکے نے کبیر کو فقیر بنا کر وہ پانچ ہزار کا نوٹ اس تک پہنچا دیا تھا جس کے نصیب میں وہ لکھا جا چکا تھا اور وہ فقیر..... وہ واقعی حیران ہوگا کہ آج صاحب نے وعدے کے مطابق مجھے خوش کیا اور کیا خوش کیا.....

جو پیسے کبیر تک پہنچ نہیں پا رہے تھے، اصل میں وہ اسی فقیر کے نصیب کے تھے اور وہ اس تک پہنچ گئے تھے۔ اس وقت تو بہت قلق ہوا لیکن بعد میں دل کو تسلی بھی ہوئی کہ وہ بہت ضرورت مند تھا۔

ایک شام میں افسردہ سا بیٹھا تھا کہ اب کبیر کو کیا جواب دوں گا کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ احمد نے ہی دروازہ کھولا اور بولا۔ ''ایک انکل آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' میں نے باہر جا کر دیکھا۔ وہ میری دکان سے فرنیچر خرید کر لے جانے والا ایک پرانا کسٹمر تھا۔ بڑا دبنگ قسم کا دودھ دہی فروش تھا۔ کافی عرصے سے میرے کچھ پیسے دبائے بیٹھا تھا۔ میری ہمت نہیں تھی کہ اس سے ادھار واپس لے سکتا۔

سلام دعا کے بعد اس نے میرے ''ڈوبے ہوئے پندرہ ہزار روپے'' میری ہتھیلی پر رکھ دیے اور عاجزی سے بولا۔ ''معاف کرنا باؤ یار! کچھ دیر ہوگئی۔ تجھے تکلیف تو ہوئی ہوگی۔ میں شرمندہ ہوں۔''

''ب..... بہت بہت شکریہ ملک جی۔'' میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ ''عید کے بعد تیری بھابی کے گردے کا آپریشن ہے۔ تم بھی دعا کرنا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔'' وہ بولا۔

''انشاء اللہ..... انشاء اللہ!'' میں نے صدق دل سے کہا اور مجھے اللہ کی شان کو سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ خدا کیسے ڈوبے ہوئے کو تیراتا ہے۔ سبحان اللہ۔ وہ بہت بڑا کارساز ہے۔

ꕥ ꕥ ꕥ

www.aldmyjeem.com

عذرِ لنگ

مرزا امجد بیگ

کہیں پہ تیر کہیں پہ نشانہ... دنیا میں اکثر لوگ ایسی ہی چال چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں لیکن... یہ ضروری نہیں کہ ہر بار تیر نشانے پر جا لگے... اس بار اس کا نشانہ بھی چُوک گیا اور یہی چُوک اسے عدالت کے کمرے تک لے گئی کیونکہ مجرم چاہے کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو کہیں نہ کہیں سقم چھوڑ ہی دیتا ہے اور مرزا امجد بیگ جیسے زیرک وکیل اس سقم سے ایسا راستہ نکالتے ہیں کہ مجرم کو پھر کہیں بھی جائے پناہ نہیں مل پاتی۔

شاطر بیوی اور جہاندیدہ شوہر کے درمیان خونی معرکہ آرائی کا احوال

ماہِ اکتوبر کی ایک سہانی شام میں اپنے آفس میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ میری سیکریٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی۔ ''سر! عزیزی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ کال میرے کمرے میں ٹرانسفر کر دیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔

صفدر عزیزی سے میری دیرینہ یاداللہ ہے۔ وہ سالہا سال سے ایک فلاحی ادارہ چلا رہے ہیں۔ ہماری ملاقات تو بہت کم ہو پاتی ہے لیکن ہم ایک دوسرے کے لیے گاہے بہ گاہے کام نکالتے رہتے ہیں۔ اس طرح راہ و رسم کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اگلے ہی لمحے عزیزی صاحب لائن پر تھے۔

''ہیلو بیگ صاحب.....'' ان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''آپ کیسے ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ سنائیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' وہ بولے۔ ''آپ کی مصروفیت کیسی چل رہی ہے؟''

''میں آج کل بہت زیادہ مصروف ہوں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

میری اس بے ساختگی کے پیچھے ایک مصلحت پوشیدہ تھی۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا تھا کہ عزیزی صاحب جب بھی میری مصروفیت کے بارے میں استفسار کرتے تھے تو اس سے اگلا قدم یہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی کیس میرے سپرد کرنے کی بات کیا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی اس کوشش میں بہ ظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان کے توسط سے ملنے والے کیسز میں مجھے بہت زیادہ رعایت کرنا پڑتی تھی۔

www.urdtbayjeem.com

"میرا آفس آپ کے آفس اور آپ کے گھر کے درمیان ایک مرکزی شاہراہ پر پڑتا ہے۔" عزیزی صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر آج آپ گھر جاتے ہوئے مجھے مل کر لیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"سب خیریت تو ہے نا؟" میں نے تولنے والے انداز میں پوچھا۔

"جی، خیریت ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "میں دراصل ایک کیس آپ کے حوالے کرنا چاہتا..."

"عزیزی صاحب! یوں سمجھ لیں کہ ان دنوں تو مجھے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔" میں ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ "اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو یہ کیس کسی اور وکیل کو دے دیں۔"

"ہیگ صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ "نمبر ایک ..... یہ کیس فری کھاتے کا یا رعایتی فیس والا نہیں ہے۔ نمبر دو ..... یہ کیس جس شخص کی معرفت سے مجھ تک پہنچا ہے میں اسے ٹال نہیں سکتا۔ نمبر تین ..... میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کیس کو آپ ہی اچھے انداز میں ہینڈل کر سکتے ہیں لہٰذا....." لمحاتی توقف کر کے انہوں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"اس وضاحت کے بعد مجھے امید ہے کہ آپ اپنی بے پناہ مصروفیت میں سے اس کیس کے لیے ضرور وقت نکال لیں گے.....!"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے لیے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ یہ کیس فری کھاتے کا یا رعایتی فیس والا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے، آپ کو میری سوچ کا یہ انداز عجیب سا لگ رہا ہو مگر سچی بات یہ ہے کہ وکالت میرا پیشہ ہے اور ہر پیشے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جنہیں نبھانا ضروری ہوتا ہے۔ گھوڑا اگر گھاس کے ساتھ دوستی کر لے تو پھر اسے بھوک سے مرنا پڑتا ہے۔

"یہ ایک قتل کا کیس ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "ملزم اس وقت ریمانڈ پر پی سی (پولیس کسٹڈی) میں ہے۔ میں آپ کو ملزم کے والد سے ملوانا چاہتا ہوں۔ آپ یہاں تشریف لے آئیں۔ باقی باتیں آمنے سامنے بیٹھ کر کریں گے۔"

"اوکے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا پھر الوداعی کلمات کے بعد ان سے رابطہ میں رہنے کا وعدہ کیا۔ "میں آ رہا ہوں عزیزی صاحب۔"

☆☆☆

عزیزی صاحب سے ملاقات کے لیے مجھے کسی خاص نوعیت کی سڑک نوردی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا آفس میرے راستے میں پڑتا ہے۔ اپنے دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں عزیزی صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

صفدر عزیزی صاحب جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، ایک فلاحی ادارے کے روح رواں تھے۔ ان کی سماجی خدمات کی تاریخ بہت پرانی تھی۔ یہ ادارہ ان کے والد محترم قادر عزیزی نے قیام پاکستان کے بعد کراچی میں قائم کیا تھا۔ قادر صاحب کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب اس ادارے کو صفدر صاحب بڑی کامیابی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ صفدر عزیزی کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہوگی۔ وہ ایک خوش اخلاق، ملنسار اور خدا ترس انسان تھے۔

اس وقت عزیزی صاحب کے علاوہ آفس میں ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی عمر ساٹھ کے اریب قریب رہی ہو گی۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے ایک روایتی دیہاتی نظر آتا تھا جس کا تعلق یقیناً پنجاب کے کسی گاؤں سے تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد عزیزی صاحب نے مذکورہ دیہاتی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

"ان کا نام علی نواز ہے۔ یہ حاصل پور سے آئے ہیں۔ میں نے ٹیلی فون پر آپ سے جس کیس کا ذکر کیا تھا وہ علی نواز کے بیٹے عارف کا ہے۔ پولیس نے عارف کو قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔"

"حاصل پور میں.....؟" میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"نہیں، کراچی میں۔" عزیزی صاحب نے بتایا۔ "عارف پچھلے دو سال سے کراچی میں رہائش پذیر ہے اور قتل والا واقعہ سترہ اکتوبر کی شام ادھر ہی پیش آیا تھا۔"

آج اکتوبر کی بیس تاریخ تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ عزیزی صاحب قتل کی جس واردات کا ذکر کر رہے تھے وہ واقعہ تین روز پہلے کا تھا۔ میں نے بغور علی نواز کا جائزہ لیا اور عزیزی صاحب سے پوچھا۔

"آپ نے بتایا تھا کہ یہ کیس کسی تگڑی معرفت سے آپ کے پاس پہنچا ہے؟"

"ادھر حاصل پور میں میرے ایک دوست ملک سکندر علی رہتے ہیں۔" عزیزی صاحب وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "سکندر صاحب اپنے علاقے کے یونین کونسلر ہیں۔ علی نواز کو انہوں نے ہی میرے پاس بھیجا ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا، میں سکندر صاحب کے کسی کام سے انکار نہیں کر سکتا لہٰذا میں چاہتا ہوں، یہ کیس آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جہاں تک آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات کا معاملہ ہے تو

www.allmayeem.com

اس سلسلے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"معاملہ صرف میری فیس تک محدود نہیں ہے عزیزی صاحب....." میں نے ان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولے۔ "میں سمجھا نہیں بیگ صاحب! آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں، صاف صاف کہہ ڈالیں۔"

"اپنی محنت کا معاوضہ تو میں خیر لوں گا ہی۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ مجھے اس امر کا اطمینان ہونا چاہیے، میں ایک بے گناہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے رہا ہوں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "یہ آپ کا حق ہے۔ آپ جس طرح چاہیں، اپنی تسلی کر لیں۔ جہاں تک میں اس معاملے کو سمجھ پایا ہوں اس کے مطابق، علی نواز بھی اس کیس کے حوالے سے زیادہ نہیں جانتا۔ آپ کو ملزم عارف سے ایک تفصیلی ملاقات کرنا ہوگی۔ تب جا کر صورتِ حال واضح ہو سکے گی۔" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر متعلقہ تھانے کا ذکر کرنے کے بعد وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عارف اس وقت ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہے۔ میں نے آج علی نواز کی اس سے ملاقات کرا دی ہے۔ علی نواز صبح واپس حاصل پور چلا جائے گا۔ آپ کل کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر عارف کا انٹرویو کر لیں پھر آپ جو فیصلہ کریں گے اس کے مطابق، میں دوبارہ علی نواز کو کراچی بلا لوں گا۔ میں نے آج کی رات کے لیے ان کے قیام کا بندوبست کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے، یہ مستقل طور پر کراچی میں ڈیرا ڈال کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ادھر حاصل پور میں ان کی اپنی مصروفیات ہیں پھر موجودہ صورتِ حال میں گھر کے دیگر افراد کو سنبھالنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کا اپنے گھر میں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔"

"آپ حاصل پور میں یقیناً کاشت کاری کرتے ہوں گے؟" میں نے علی نواز کی طرف دیکھتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"نہیں وکیل صاحب۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر میرے پاس زرعی اراضی ہوتی تو میں لازماً کھیتی باڑی کرتا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے اس لیے میں دکان داری کرتا ہوں مگر میری دکان داری کا تعلق زراعت ہی سے ہے۔"

"کیا آپ نے زرعی آلات کی کوئی دکان کھول رکھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ میرے اندازے کی نفی کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے حاصل پور میں مختلف فصلوں کے بیج، کھاد، کیمیکلز اور دیگر کیڑے مار ادویات کا ایک اسٹور بنا رکھا ہے۔ اللہ کے فضل سے کام اچھا چلتا ہے۔"

"میرا ایک مرتبہ حاصل پور سے گزر ہوا تھا۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔"

علی نواز کے کان کھڑے ہو گئے۔ "آپ حاصل پور سے گزر کر کہاں گئے تھے؟" اس نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"بہاول نگر!" میں نے بتایا۔ "میرے ایک سینئر بلکہ ایک لحاظ سے استاد وکیل صاحب کا تعلق بہاول نگر سے تھا۔ ہم لوگ بائی روڈ کراچی سے بہاول پور اور پھر بہاول پور سے بہاول نگر گئے تھے۔ حاصل پور، بہاول پور اور بہاول نگر کے درمیان کہیں پڑا تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔" علی نواز عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "حاصل پور، بہاول پور سے لگ بھگ ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور بہاول نگر، حاصل پور سے کم و بیش اسی کلومیٹر کی دوری پر ہے۔"

"علی نواز! ایک، ڈیڑھ کلومیٹر کے فرق سے آپ کا بیان بالکل درست ہے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "اسی طرح بہاول پور سے ملتان بھی اتنی ہی مسافت پر ہے۔"

"جی جی....." علی نواز جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بہاول پور سے حاصل پور اور ملتان کا فاصلہ تقریباً ایک جیسا ہی ہے لیکن یہ دو الگ روٹ ہیں۔"

علی نواز کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک شریف النفس انسان تھا۔ بیٹے پر ٹوٹنے والی افتاد نے اسے پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ ظاہر ہے، یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ عارف اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو پچھلے دو سال سے کراچی میں مقیم تھا۔ اس کے علاوہ علی نواز کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک عارف سے بڑی خالدہ اور دوسری عارف سے چھوٹی عابدہ۔ خالدہ شادی شدہ تھی اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ لودھراں میں رہتی تھی۔ اگر بہاول پور سے ملتان کا رخ کریں تو اس روٹ پر سب سے پہلے لودھراں پڑتا ہے۔

اس شام علی نواز کی زبانی عارف کے بارے میں اور

www.aitbayjeetv.com

بعدازاں عارف کی زبانی اس کیس کے حوالے سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے کماحقہ آگاہ ہوجائیں۔ واضح رہے کہ میں نے دانستہ چند چیزوں پر پردہ ڈال دیا ہے جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مقامات پر کیا جائے گا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں نے کون سا طلسمی چراغ رگڑ کر اپنے حسبِ منشا، تھانے کی حوالات میں، ایک تفصیلی ملاقات کے بعد وکالت نامے، درخواستِ ضمانت اور دیگر اہم قانونی کاغذات پر عارف کے دستخط کرا لیے تھے۔ گویا میں نے عارف کی بپتا کی روشنی میں اس کی بے گناہی کا یقین کرلیا تھا۔

☆☆☆

ملزم عارف کی عمر ستائیس سال تھی۔ وہ مضبوط کاٹھی کا مالک ایک دراز قامت اور وجیہہ و شکیل شخص تھا۔ صنفِ مخالف کے لیے اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ اس نے حاصل پور کے ہائی اسکول سے مڈل تک تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے پاس کوئی باقاعدہ پیشہ نہیں تھا البتہ اس نے کسی حد تک ڈرائیونگ سیکھ رکھی تھی۔ کافی عرصے تک وہ دکان داری کے معاملات میں اپنے باپ علی نواز کا ہاتھ بٹاتا رہا تھا پھر ایک روز وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حاصل پور سے کراچی آ گیا اور یہ لگ بھگ دو سال پہلے کی بات تھی۔ اس اچانک اور پراسرار شفٹنگ کے پیچھے بھی عارف کی ایک دلچسپ کہانی تھی۔

جیسا کہ علی نواز نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے پاس ذاتی زرعی اراضی نہیں تھی اسی لیے اس نے بیجوں، کھاد اور کیمیکلز والا اسٹور کھول لیا تھا جو اچھا خاصا چلتا تھا جس کی آمدنی سے ان لوگوں کی شاندار گزر بسر ہو رہی تھی لیکن علی نواز کے چھوٹے بھائی علی فراز کے پاس بڑی زرخیز زمین تھی اور وہ اپنے علاقے کا چھوٹا زمیندار کہلاتا تھا۔ گاؤں دیہات چاہے کسی بھی صوبے کا ہو، وہاں پر اسی شخص کی زیادہ عزت ہوتی ہے جس کے پاس اپنی زمین ہو۔ اس اصول کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ حاصل پور میں علی نواز کی عزت نہیں تھی تاہم اس کے مقابلے میں علی فراز کی حیثیت زیادہ وزنی تھی۔

علی فراز کی صرف ایک ہی اولاد تھی یعنی مصباح نامی اکلوتی بیٹی جس کی عمر کم و بیش پچیس سال تھی اور اہم بات یہ تھی کہ عارف دل و جان سے اپنی چچازاد مصباح کو پسند کرتا تھا اور اس "پسند" سے عارف کی ماں بلقیس بی بی اچھی طرح واقف تھی۔ ایک رات اس نے اپنے شوہر سے کہا۔

"علی نواز! میں نے سنا ہے، آج کل مصباح کے رشتے کا معاملہ خاصا گرم ہے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔" علی نواز نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مصباح ہماری عابدہ سے تین سال بڑی ہے۔ اس کی شادی کی عمر ہو چکی ہے۔ میری دعا ہے، مصباح جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے۔"

"ہمارے گھر کی کیوں نہ ہو جائے۔" بلقیس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

علی نواز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"ہمارے اکلوتے بیٹے عارف کی عمر بھی شادی کی ہو گئی ہے نا" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اگر ہم مصباح کو اپنی بہو بنا کر اس گھر میں لے آئیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟"

"قباحت تو کوئی نہیں مگر میں نے کبھی اس انداز میں سوچا نہیں۔" علی نواز ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میری خواہش اور کوشش یہی ہے کہ پہلے عابدہ کی شادی ہو جائے۔ اس کے بعد عارف کی شادی کے بارے میں سوچیں گے۔"

"ہمیں اپنی خواہش کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کی خواہش کا بھی خیال کرنا چاہیے۔" بلقیس نے بیٹے کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا وقت بہت سادہ تھا۔ آج کل کے دور کے تقاضے کچھ اور ہیں علی نواز....."

"یہ آج تم بجھارتوں میں بات کیوں کر رہی ہو عارف کی ماں؟" علی نواز نے آنکھیں سکیڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ "جو بھی کہنا چاہتی ہو، کھل کر کہو۔"

"میں تمہیں صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اپنا عارف، مصباح کو پسند کرتا ہے۔" بلقیس بی بی نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ اچھا موقع ہے کہ ہم بھی عارف کا رشتہ ڈال دیں۔ اس کی شادی چاہے عابدہ کے بعد یا عابدہ کے ساتھ کریں لیکن فوری طور پر ہمیں منگنی کر لینا چاہیے۔"

"اوہ..... تو یہ بات ہے۔" علی نواز ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے عارف کی پسند کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔"

"اب تو میں نے واضح الفاظ میں تمہیں اندازہ کرا دیا ہے نا....." وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "میری بات پر سنجیدگی سے غور کرو علی نواز۔ اگر ہم نے دیر کر دی تو یہ رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور ظاہر ہے، اس سے عارف کا دل بھی ٹوٹے گا۔"

www.dilkayicom.com

''ہوں.....'' علی نواز نے پُرخیال انداز میں ہنکارا بھرا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اس سلسلے میں علی فراز سے بات کروں گا۔''

چند روز بعد علی نواز نے اپنے چھوٹے بھائی علی فراز سے ملاقات کی اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اپنے مقصد پر آ گیا۔ علی فراز نے بڑی توجہ سے اس کا مدعا سنا اور اس کی بات مکمل ہونے پر وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''بھائی صاحب! آپ نے دیر کر دی۔ مجھے افسوس ہے، میں کسی کو زبان دے چکا ہوں۔''

چھوٹے بھائی کے اس دوٹوک جواب کے بعد کسی سوال یا جرح بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ تہذیب یافتہ اور وضع دار لوگوں کے نزدیک زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مصباح، علی فراز کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اگر وہ اس کے رشتے کے حوالے سے کسی کو زبان دے چکا تھا تو پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ علی نواز چھوٹے بھائی کے گھر سے خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

بلقیس بی بی بڑی بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ علی نواز نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا، وہ اسے لے کر الگ کمرے میں بیٹھ گئی اور دلچسپی بھرے انداز میں استفسار کیا۔

''ہاں بھئی علی نواز..... کیا رہا؟''

''کھیل ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہم نے بہت دیر کر دی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' بلقیس نے الجھن زدہ نظر سے اپنے شوہر کو گھورا۔

''علی فراز نے مصباح کا رشتہ کہیں طے کر دیا ہے۔'' علی نواز نے جواب دیا۔

''کہاں؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم نے علی فراز سے پوچھا کہ اس نے اپنی بیٹی کی بات کس سے پکی کی ہے؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ مصباح کے سلسلے میں کسی کو زبان دے چکا ہے تو پھر میں نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔''

''تمہارے سارے کام اسی طرح کے لولے اور لنگڑے ہوتے ہیں علی نواز.....'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''کم از کم تم اپنے بھائی سے یہ تو اگلواتے کہ اس نے مصباح کے رشتے کے لیے کسے زبان دی ہے۔''

''اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''مصباح ان کی بیٹی ہے۔ وہ لوگ جہاں چاہیں، اس کا رشتہ کریں۔ ہم کون ہوتے ہیں اس تفتیش اور تصدیق میں پڑنے والے.....''

''ہم عارف کے والدین ہوتے ہیں۔'' وہ علی نواز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں اپنے بیٹے کے جذبات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے علی نواز۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔'' وہ جھلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر مجھے عارف کی خواہش اور پسند کا خیال نہ ہوتا تو میں علی فراز کے پاس ہرگز نہ جاتا۔''

''مجھے تو لگتا ہے، علی فراز نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' علی نواز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ اپنی بیٹی کا رشتہ ہمارے عارف کو دینا نہیں چاہتا اس لیے اس نے ''زبان دینے'' کا بہانہ کر دیا ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ ''اور اس کے پیچھے یقیناً اس کی بیوی شاہدہ کا ہاتھ ہے۔ شاہدہ کا رجحان اپنے میکے کی طرف ہے اور علی فراز، شاہدہ کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں رکھتا۔''

''علی فراز زن مرید ہے یا واقعتاً وہ مصباح کے رشتے کے حوالے سے کسی کو زبان دے چکا ہے، ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔'' علی نواز نے بیزاری سے کہا۔ ''ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ عارف کی مصباح سے شادی نہیں ہو سکتی۔''

''اتنا کافی نہیں ہے علی نواز۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''میں اس معاملے کی تہ تک پہنچ کر ہی رہوں گی۔''

''آخر تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟'' علی نواز نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ بدستور پُرمعنی انداز میں بولی۔ ''میں یہ جان کر ہی دم لوں گی کہ علی فراز نے تم سے جھوٹ کیوں بولا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''مجھے تو ان لوگوں میں تیل نظر نہیں آتا۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔''

آئندہ چند روز میں بلقیس بی بی نے بڑے پُرعزم انداز میں اپنے وسائل کے تمام گھوڑے سرپٹ دوڑائے اور نتیجتاً یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ اس کا خدشہ سراسر غلط تھا اور علی فراز نے کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ مصباح کے رشتے کے معاملے میں ایک زمیندار چودھری فیضان کو زبان دے چکا تھا۔

فیضان کا تعلق بہاول نگر سے تھا اور وہ ایک بڑا زمیندار

www.urdubaytcom

تھا۔ اس کے پاس علی فراز سے کہیں زیادہ زرعی اراضی موجود تھی۔ چودھری فیضان نے اپنے بیٹے چودھری سلمان کے لیے مصباح کا رشتہ مانگا تھا اور علی فراز نے اسے "ہاں" کردی تھی۔

یہ سفاک حقیقت سامنے آجانے کے بعد کسی کے لیے کچھ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ والدین اپنی اولاد کے سچے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ علی فراز نے مصباح کا بھلا سوچ کر ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں اسی سال چودھری سلمان اور مصباح کی شادی ہوگئی اور عارف..... حاصل پور کو خیر باد کہہ کر کراچی چلا آیا۔

کراچی، پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اسے ملکی معیشت کی بیک بون بھی کہا جاتا ہے۔ عرفِ عام میں یہ "غریب پرور" شہر کہلاتا ہے۔ ملک کے طول و عرض سے لوگ تلاشِ معاش کے سلسلے میں کراچی کا رخ کرتے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ اس شہر نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ کراچی کی یہ تمام خصوصیات رہیں ایک طرف، اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ داغِ دل کی یہ بڑی شانی مرہم پٹی بھی کرتا ہے۔

عارف نے جب کراچی میں قدم رکھا تو مصباح کی یاد نے اس کے جگر کو چھلنی کر رکھا تھا۔ ان دونوں کے بیچ محبت کی پینگیں بڑھی تھیں اور نہ ہی انہوں نے اپنے سنہرے مستقبل کے بارے میں سہانے خواب بُنے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو گواہ بنا کر کسی قسم کے عہد و پیماں بھی نہیں کیے تھے۔ یہ دراصل "ون وے ٹریفک" کی طرز کی ایک لو اسٹوری تھی جو عارف کی خواہش سے شروع ہو کر اس کی مایوسی پر ختم ہو جاتی تھی۔ بے چاری مصباح، عارف کی یک طرفہ چاہت اور پسندیدگی سے قطعی ناواقف تھی..... اس کے جذبات اور احساسات کو چھونا تو بہت دور کی بات ہے۔

کراچی میں روزگار کی تلاش کے دوران میں عارف کی، عاصم نامی ایک شخص سے ملاقات ہوگئی اور یہ ملاقات ایک ہی دن میں دوستی میں بدل گئی۔ عاصم کا تعلق رحیم یار خان سے تھا۔ وہ کراچی میں رکشا چلاتا تھا اور اس کی رہائش اعظم بستی میں تھی۔ عاصم کے بیوی بچے رحیم یار خان ہی میں تھے۔ وہ اعظم بستی میں کرائے کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ عارف اور عاصم بنیادی طور پر سرائیکی بیلٹ سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا عاصم، عارف کو اپنے کوارٹر ہی میں لے آیا۔

عارف کچا پکا ڈرائیور تو تھا ہی، عاصم نے اس کی ٹریننگ کی اور اسے پرفیکٹ ڈرائیور بنا کر ایک بھاڑے کا رکشا بھی دلوا دیا۔ عارف نے کچھ عرصہ رکشا چلایا، پھر اس نے ایک کالی ٹیکسی کا کام پکڑ لیا۔ یہ لگ بھگ چالیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں کراچی میں پرائیویٹ چھوٹی سواری کے طور پر رکشا اور کالی ٹیکسی ہی چلا کرتے تھے۔

عارف نے دو ماہ تک کالی ٹیکسی چلائی پھر ایک "رینٹ اے کار" کا ملازم ہوگیا۔ وہ ایک ذہین اور محنتی شخص تھا۔ اس کے اندر سیکھنے کی صلاحیت بہ درجہ اتم موجود تھی۔ ایک سال کے عرصے کے دوران میں اس نے خود کو ایک ماہر ڈرائیور بنانے کے ساتھ ساتھ مختلف پٹریاں بدلیں اور ایک کار ڈیلر کے پاس مستقل ملازمت اختیار کرلی جبکہ اس کا دوست عاصم ہنوز رکشا ہی چلا رہا تھا۔ دونوں اب بھی اعظم بستی والے کوارٹر ہی میں رہائش پذیر تھے۔

حفیظ اللہ نامی کار ڈیلر کا شوروم خالد بن ولید روڈ پر تھا اور رہائش ڈیفنس سوسائٹی میں۔ وہ بہت زیادہ پیچ والا ایک سرد و گرم چشیدہ انسان تھا۔ اگرچہ بہ ظاہر وہ کاروں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا لیکن در پردہ وہ میدانِ سیاست کا کھلاڑی تھا۔ اس نے اپنی ذاتی حیثیت میں کبھی الیکشن نہیں لڑا تھا مگر سننے میں یہی آیا تھا کہ وہ سیاسی امیدواروں کی سیاسی انتخابی مہمات کے لیے ایک فنانسر کا کردار ادا کرتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک کاروباری شخص تھا اور سیاسی امیدواروں کو وہ ریس کے گھوڑے تصور کرتا تھا اسی لیے انہیں انتخابات میں کامیاب کرانے کے لیے وہ اپنی رقم انویسٹ کیا کرتا تھا۔ بعد ازاں جب اس کے چنیدہ من پسند گھوڑے ریس جیت جاتے تو وہ ان کے سیاسی مقام کو استعمال کر کے سود در سود اپنی رقم وصول کرلیا کرتا تھا۔ وہ اس کھیل کو "بزنس" کا نام دیتا تھا، ایسا بزنس جس میں حفیظ اللہ نے کبھی نقصان نہیں اٹھایا تھا۔

عارف کی ڈیوٹی حفیظ اللہ کے شوروم پر تھی جہاں وہ مختلف نوعیت کے کام سرانجام دیا کرتا تھا جس میں بہ وقتِ ضرورت، ڈرائیونگ بھی شامل تھی۔ اس کی تعلیم تو واجبی سی تھی لیکن پڑھے لکھے، صاحبِ ثروت لوگوں کے ساتھ میل جول کی بہ دولت اس نے اپنے طرزِ زندگی میں بھی کافی بدلاؤ پیدا کرلیا تھا۔ وہ اچھی ڈریسنگ کرتا اور سامنے والے کو اس کی حیثیت کے مطابق بڑے شائستہ انداز میں ہینڈل کرنا سیکھ گیا تھا۔ اگر کوئی پہلے سے عارف کو جانتا نہ ہوتا اسے دیکھ کر یہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا کہ وہ حفیظ اللہ کا ایک ادنیٰ سا ملازم ہے۔ عارف کے اسٹائل نے اسے حاصل پور والا ایک دیہاتی عارف نہیں رہنے دیا تھا۔ اس نے شلوار قمیص کو ترک کر کے پینٹ شرٹ اور جینز ٹی شرٹ کو اپنا مستقل پہناوا بنا لیا تھا۔

عارف کی دیہاتی اور شہری زندگی کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس وقت قتل کے

www.pdfmyfiles.com

جس مقدمے میں پھنسا ہوا تھا اس میں عارف کے انداز حیات کے تقابلی جائزے کی مرکزی حیثیت تھی۔ فوری طور پر تو نہیں لیکن آگے چل کر آپ میرے بیان کردہ اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے۔

ایک روز ڈیوٹی ختم کرتے وقت حفیظ اللہ نے عارف کو اپنے کمرے میں بلایا اور پوچھا۔

''تم صبح کتنے بجے اٹھ جاتے ہو؟''

حفیظ اللہ کا شوروم دن میں گیارہ بجے تک کھلتا تھا اور حفیظ اللہ خود بارہ بجے کے بعد ہی شوروم پہنچتا تھا مگر اس وقت وہ عارف کی بیداری کے بارے میں استفسار کر رہا تھا۔ اپنے مالک کا سوال اس کی سمجھ میں تو نہیں آیا لیکن اس نے جواب میں کہا۔

''سر! میں روزانہ فجر کے وقت اٹھ جاتا ہوں۔''

''کیا کل ذرا اور بھی جلدی اٹھ سکتے ہو؟'' حفیظ اللہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

یہ سوال حفیظ اللہ کے پہلے سوال سے بھی زیادہ پیچیدہ اور الجھن زدہ تھا تاہم اس نے ایک فرماں بردار اور اطاعت گزار ملازم کی طرح سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''سر! آپ جتنے بجے کہیں گے، میں اٹھ جاؤں گا۔ یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' پھر اس نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں..... خیریت ہے۔'' حفیظ اللہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کرم داد گاؤں گیا ہوا ہے اور مجھے کل صبح چار بجے ایک ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ مطلب، صبح چار بجے ائرپورٹ پہنچنا ہوگا۔ کیا تم یہ ڈیوٹی کرلو گے؟''

''جی سر، کرلوں گا۔'' عارف نے کہا۔

''ٹھیک ہے، کل صبح ساڑھے تین بجے تم بنگلے پر پہنچ جانا۔'' حفیظ اللہ نے کہا۔ ''کل میری بیٹی امریکا سے واپس آرہی ہے۔ اس کی فلائٹ ساڑھے چار بجے کے درمیان لینڈ کرے گی۔ تم میری بات سمجھ گئے نا؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا سر۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

یہ بات عارف کے علم میں تھی کہ اس کے باس حفیظ اللہ کی اکلوتی بیٹی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے امریکا گئی ہوئی تھی۔ حفیظ اللہ نے اپنی بیٹی ناجیہ کے لیے ''واپس آرہی ہے'' کے الفاظ استعمال کیے تھے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اپنی اسٹڈی مکمل کر کے وطن لوٹ رہی تھی۔ عارف، ناجیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے کوارٹر کی جانب روانہ ہوگیا۔

اگلی صبح وہ ٹھیک ساڑھے تین بجے حفیظ اللہ کے بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ڈور بیل بجائی تو چوکیدار اللہ بخش نے اس کے لیے گیٹ کھول دیا۔ اللہ بخش کو عارف کی آمد کے بارے میں بتا دیا گیا تھا اس لیے وہ جاگ رہا تھا۔ اللہ بخش کی معیت میں وہ ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار حفیظ اللہ کے بنگلے پر آچکا تھا۔ اللہ بخش اسے بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچا کر واپس گیٹ پر چلا گیا تو ندرت وہاں پہنچ گئی۔

''میڈم آپ.....!'' وہ بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

ندرت، حفیظ اللہ کی دوسری بیوی تھی۔ اس کی پہلی بیوی نگہت یعنی ناجیہ کی والدہ کا کم و بیش پانچ سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ حفیظ اللہ نے چودہ ماہ پہلے ندرت سے شادی کی تھی۔ ندرت ایک طرح دار اور پرکشش کم عمر حسینہ تھی جو ناجیہ سے ایک دو سال ہی بڑی تھی۔ یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دس ویں حصے میں اس کے ذہن سے گزرے۔ اگلے ہی لمحے ندرت کی مترنم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''عارف! تمہارے صاحب تو آج کافی دیر سے سوئے ہیں۔'' ندرت نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا تمہیں اکیلے ہی گاڑی لے کر ائرپورٹ جانا ہوگا۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں جاسکیں گے۔''

''او کے میڈم، میں چلا جاؤں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا پھر اپنی پیشانی مسلتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''لیکن ایک مسئلہ ہے.....!''

''کیسا مسئلہ؟'' ندرت نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں ناجیہ صاحبہ کو پہچانوں گا کیسے؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''میں نے کبھی انہیں دیکھا ہی نہیں۔''

''میں نے بھی صرف اس کا نام ہی سنا ہے یا پھر تصاویر میں دیکھا ہے۔'' ندرت بیزاری سے بولی۔ ''بہرحال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حفیظ صاحب نے ناجیہ کے نام کا ایک پلے کارڈ تیار کرا دیا ہے جو گاڑی کے اندر ہی رکھا ہوا ہے۔ تم وہ کارڈ اٹھا کر وہاں کھڑے ہو جانا جہاں سے مسافر باہر آرہے ہوں گے۔ تمہارے ہاتھ میں پلے کارڈ دیکھ کر ناجیہ خود تم تک رسائی حاصل کرلے گی پھر تم اسے پک کر کے یہاں لے آنا۔''

''سمجھ گیا۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے میری ایک بہت بڑی مشکل کو آسان کر دیا۔''

''آئندہ بھی.....'' وہ معنی خیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہاری زندگی میں کوئی مشکل کھڑی ہو جائے تو سیدھا میرے پاس آجانا۔ میں تمہارا مسئلہ حل کر دوں گی۔''

www.aiteaj.com

"جی ضرور....." وہ اضطراری لہجے میں جلدی سے بولا۔

ندرت بڑی ادا سے زیرِ لب مسکرا کر رہ گئی۔

عارف نے اپنی میڈم کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی لے کر بنگلے سے ائرپورٹ کی سمت روانہ ہو گیا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں وہ مسلسل اپنے باس کی نوعمر اور حسین و جمیل بیوی ندرت کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

ندرت کی عمر پچیس کے اریب قریب تھی۔ وہ ایک متناسب قد اور شاداب و زرخیز بدن کی مالک تھی۔ حفیظ اللہ اس سے دوگنا سے بھی زیادہ عمر کا تھا۔ وہ کم و بیش حفیظ اللہ کی بیٹی ناجیہ کی ہم عمر تھی۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ حفیظ اللہ نے اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی سے شادی کیوں کی۔ عارف کی الجھن کا سبب ندرت کا مخصوص غلط فہمی بلکہ خوش فہمی پیدا کر دینے والا انداز تھا۔ عارف کے ساتھ اس کا رویہ بڑا نرم اور مہربانی بھرا تھا۔ ان کی جب بھی ملاقات ہوتی، گفتگو کے دوران میں ندرت مسلسل ٹٹولنے اور کریدنے والی نگاہ سے اس کے وجود کے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف رہتی تھی۔ ندرت کا یہ انداز عارف کے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دیتا تھا۔ وہ اپنے جذبات کو تھپک تھپک کر بڑی مشکل سے یہ سمجھانے میں کامیاب ہو پاتا تھا کہ ندرت کا تعلق اونچی سوسائٹی سے ہے۔ یہ لوگ بڑے بے باک اور اوپن مائنڈڈ ہوتے ہیں۔ اسے ندرت کے کھلے ڈلے انداز سے اپنے دماغ کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔

اس وقت بھی وہ خود ترغیبی کی مدد سے ندرت کے معنی خیز انداز اور دلکش سراپا کو اپنی سوچ سے کلیئر آؤٹ کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ ائرپورٹ پہنچنے تک وہ اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل کر چکا تھا لیکن ائرپورٹ کی عمارت میں رونما ہونے والے ایک ناخوش گوار واقعے نے اسے بڑی واہیات صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔

وہ مسافروں کا انتظار کرنے والے افراد کے بیچ کھڑا اس گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے، ایک کے بعد ایک مسافر باہر نکل رہے تھے۔ ناجیہ نے بھی یہیں سے برآمد ہونا تھا۔ ناجیہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اس نے ڈنڈی والا ناجیہ کے نام کا پلے کارڈ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا مگر ناجیہ کا دور دور تک اتا پتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کا انتظار، بوریت کی حدود میں داخل ہونے ہی والا تھا کہ اسے اپنے بائیں کندھے پر نرماہٹ بھری تھپکی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

اس کی نگاہ ایک الٹرا ماڈرن حسینہ پر جم کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرالی تھی جس پر دو تین بیگ لدے ہوئے تھے۔ مذکورہ لڑکی نے اسکن ٹائٹ جینز اور اوپن شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ گھنگرالے بال شولڈر کٹ کے ساتھ اس کے حسن اور دلکشی میں چار چاند لگا رہے تھے۔ عارف یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

وہ عارف کی حیرت کو تار تار کرتے ہوئے، اپنے سینے پر انگلی رکھ کر ایک ادا سے بولی۔ "میں ناجیہ فرام ڈیلس..... لگتا ہے، تم میرے انتظار میں یہاں کھڑے ہو.....؟"

عارف نے حیرت اور ندامت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ "ہاں..... مجھے حفیظ صاحب نے آپ کے لیے یہاں بھیجا ہے مگر....."

"مگر کیا؟" ناجیہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"میں نے ایگزٹ پر مسلسل نگاہ جمائی ہوئی تھی۔" وہ اپنی الجھن بیان کرتے ہوئے بولا۔ "آپ گیٹ سے نکل کر میرے عقب میں کیسے پہنچ گئیں۔ میں نے آپ کے نام کا پلے کارڈ بھی اٹھا رکھا تھا۔"

"پلے کارڈ....." وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "میں اس پلے کارڈ کو دیکھ کر ہی تمہاری طرف متوجہ ہوئی ہوں اور عقب سے اس لیے کہ..... تم نے یہ کارڈ الٹا پکڑ رکھا ہے۔"

عارف نے بے ساختہ پلے کارڈ کی جانب دیکھا۔ کارڈ کی ڈنڈی تو اس کے ہاتھ میں موجود تھی مگر اس ڈنڈی سے منسلک نیم پلیٹ کا رخ پچھلی طرف تھا۔ عارف کو بالکل اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ پلے کارڈ کا رخ کس وقت الٹ گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ناجیہ کو اپنے نام کا کارڈ نظر نہیں آیا تھا اور وہ ایگزٹ سے نکل کر متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے عارف کے پچھواڑے پہنچ گئی تھی۔

"آئی ایم سوری میڈم!" عارف نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میری غلطی کی وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔" پھر وہ ٹرالی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لائیں، یہ مجھے دے دیں۔"

ناجیہ نے سامان والی ٹرالی اس کے حوالے کر دی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچ گئے۔ عارف نے ناجیہ کے تمام بیگز کار کی ڈکی میں رکھے اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ جب وہ مین روڈ پر آئے تو ناجیہ نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"عارف!" اس نے جواب دیا۔

"کیا کرم داد نے کام چھوڑ دیا ہے؟"

www.urdtaylem.com

''نہیں میڈم، وہ چھٹی پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔'' عارف نے بتایا۔ ''اسی لیے حفیظ صاحب نے مجھے آپ کو ریسیو کرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

''تم شکل صورت، پہناوے اور بات چیت سے ڈرائیور تو نہیں لگتے ہو۔'' ناجیہ نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''کیا کسی مجبوری کے تحت اس لائن میں آئے ہو؟''

''میں دراصل حفیظ اللہ صاحب کے شوروم میں کام کرتا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ڈرائیونگ میری ایکسٹرا کوالٹی ہے۔''

''اوہو.....'' وہ ذومعنی انداز میں بولی پھر پوچھا۔ ''ڈیڈی کے پاس کب سے کام کر رہے ہو؟''

''آٹھ، دس ماہ سے۔'' عارف نے بتایا۔

''میں اپنی تعلیم مکمل کر کے امریکا سے واپس آگئی ہوں۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''میری خواہش تو یہی تھی کہ ادھر امریکا ہی میں اپنے کیریئر کا آغاز کروں مگر ڈیڈی بنیاد پرست اور پرانی سوچ کے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے، ادھر پاکستان ہی میں کروں لیکن مجھے امریکا کا آزادانہ ماحول زیادہ پسند ہے۔ دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ ڈیڈی کی ضد کی جیت ہوتی ہے یا میرے خواب کی تکمیل۔ میں بھی انہی کی بیٹی ہوں۔ آسانی سے ہار نہیں مانوں گی حالانکہ.....''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی تو عارف پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''حالانکہ کیا؟''

''ڈیڈی ایک تجربہ کار اور کہنہ مشق سیاست داں ہیں۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ان کی جہاں دیدگی پر کوئی شک نہیں ہے۔ وہ ایک باتدبیر انسان ہیں۔ میں جان چکی ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنے کی خاطر میرے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کی بڑی کامل پلاننگ کر رکھی ہے.....''

یہ ناجیہ سے عارف کی پہلی ملاقات تھی مگر ناجیہ کے اندازِ گفتگو سے عارف کو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے بیچ برسوں کی شناسائی ہو۔ عارف کے خیال میں اس کے بنیادی دو اسباب تھے۔ اول، ناجیہ کا تعلق معاشرے کے بالائی طبقے سے تھا جہاں خوداعتمادی اور بے تکلفی کا فقدان کہیں نظر نہیں آتا۔ دوم، وہ پچھلے چند سال سے دنیا کے سب سے تیز رفتار اور آزاد خیال ماحول کا حصہ رہی تھی لہٰذا اس نے خود کو اسی سوسائٹی کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ چنانچہ اس کی بول چال اور انداز و اطوار میں ایک خاص قسم کی من مانی اور فرینڈ شپ پائی جاتی تھی۔

''میڈم! اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں ایک اندازہ لگانا چاہتا ہوں۔'' ناجیہ کے بے تکلف دوستانہ انداز کو دیکھتے ہوئے عارف نے کہا۔

وہ بڑے اسٹائل سے بولی۔ ''نیور مائنڈ۔ کم آن۔''

''میں سمجھتا ہوں، حفیظ صاحب نے یہاں پر آپ کی شادی کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔'' عارف نے کہا۔

''رائٹ یو آر!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تم ایک ذہین اور شارپ انسان ہو۔ ڈیڈی اپنے ایک دوست شاکر علی کے بیٹے کامران علی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ شاکر علی ایک سٹنگ منسٹر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ڈیڈی کی اس خواہش کے پیچھے ان کے کچھ سیاسی مقاصد ہیں۔ ڈیڈی جوڑ توڑ کے ماہر ایک زیرک انسان ہیں مگر میں کامران کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ وہ ایک نمبر کا بونگا ہے۔''

عارف نے بے اختیار پوچھ لیا۔ ''بونگا مطلب؟''

''مطلب..... وہ تمہاری طرح ہینڈسم اور اسمارٹ نہیں ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

ناجیہ کی زبان سے اپنی تعریف سن کر عارف کو اچھا تو لگا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے بہ زبان خاموشی خودکلامی کی۔

''بیٹا! ذرا سنبھل کر۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو جانا۔ اپنی اوقات کو یاد رکھنے ہی میں عافیت ہے۔ اگر اونچا اڑنے کے بارے میں سوچو گے تو منہ کے بل زمین پر آگرو گے.....''

عارف، مصباح کے حوالے سے ایک چوٹ کھا چکا تھا اور یہ زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا۔ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے مصباح تو اس کی ہم پلہ تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور یہاں تو معاملہ برعکس تھا۔ ناجیہ اور عارف میں طبقاتی طور پر زمین و آسمان کا تفاوت موجود تھا۔ وہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''عارف! میں آج ہی ڈیڈی سے تمہارے بارے میں بات کروں گی۔'' ناجیہ کی سرسراتی ہوئی آواز نے عارف کی سماعت میں ہلچل مچا دی۔

وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''کوئی جدید آٹو گاڑی تو میں ڈیڈی کے شوروم سے اٹھا لوں گی۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''میں ڈرائیونگ جانتی ہوں اور آٹومیٹک کار تو ویسے بھی بہت آسان ہوتی ہے لیکن کراچی کے بے ہودہ اور بے ہنگم ٹریفک کو ٹیکل کرنا میرے

www.urdudayjeem.com

بس کی بات نہیں اور اس مقصد کے لیے مجھے ایک فل ٹائم ڈرائیور چاہیے ہوگا۔ کیا تم میرے ساتھ ڈیوٹی کرلو گے؟''

''جج..... جی..... بالکل، ضرور.....'' وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کوئی ایشو نہیں ہے۔''

''تم نے اس قدر گھبرا کر کیوں جواب دیا ہے۔'' وہ ٹٹولنے والے انداز میں مستفسر ہوئی۔ ''کیا تم یہ سوچ رہے تھے کہ میں ڈیڈی سے کوئی ایسی بات کرنے والی ہوں جس میں تمہارے لیے ایشو کا امکان موجود ہو؟''

''نن..... نہیں.....'' وہ بات بناتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ اور سمجھا تھا۔''

''کیا..... تم کیا سمجھے تھے؟'' ناجیہ نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں یہ سمجھا کہ.....'' بروقت اس کے ذہن میں ایک معقول بہانہ ابھر آیا تھا۔ ''کہ آپ حفیظ اللہ صاحب سے میری شکایت کردیں گی۔''

''کیسی شکایت؟'' وہ استعجابیہ انداز میں بولی۔ ''تم نے ایسا کیا کردیا ہے؟''

''میں نے بے دھیانی میں پلے کارڈ کو الٹا پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے آپ کو کوفت اٹھانا پڑی۔'' عارف نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''بس، یہی بات ہے.....''

یہ درست ہے کہ ناجیہ نے جب یہ کہا کہ وہ اپنے ڈیڈی سے عارف کے بارے میں بات کرے گی تو فوری طور پر اس کے ذہن میں کچھ اور ہی آیا تھا لیکن بہرحال اس نے ایک معقول بہانہ کرکے ناجیہ کی تشفی کردی تھی۔ وہ دریا دلی سے بولی۔

''نو ایشو، اٹس او کے۔''

ناجیہ اپنی دھن کی پکی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا۔ آئندہ روز سے حفیظ اللہ نے عارف کی ڈیوٹی ناجیہ کے ساتھ لگا دی۔ وہ شو روم کو خیرباد کہہ کر ناجیہ کی ڈرائیوری پر مامور ہوگیا۔

اس فرض کی ادائی کے دوران میں عارف کو، ناجیہ کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع بھی ملا۔ اس نے امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ڈیلس کی ایک معروف یونیورسٹی سے کامرس کی تعلیم مکمل کی تھی۔ وہ دل کی صاف، نیت کی شفاف اور ارادے کی پختہ تھی۔ اس نے عارف کے سامنے اس عزم کا اظہار کئی بار برملا کیا کہ وہ کسی بھی قیمت پر کامران علی سے شادی نہیں کرے گی۔

وہ کامران کو مسترد کرے یا کسی اور کو اپنا لے اور یا پھر وہ شادی کا خیال ہی اپنے ذہن سے نکال دے، اس معاملے سے عارف کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کی تشویش محض اس بات کے لیے تھی کہ وہ ناجیہ کو بڑی تیزی سے اپنے نزدیک آتا محسوس کررہا تھا۔ ناجیہ کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی تھی وہ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اسے ایسے کسی بکھیڑے میں نہیں پڑنا جس میں وہ کہیں کا نہ رہے۔

ناجیہ نے اپنا مطمح نظر اگرچہ عارف پر واضح نہیں کیا تھا لیکن اس کے دماغ میں جو کھچڑی پک رہی تھی اس کی خوشبو کو حفیظ اللہ نے سونگھ لیا تھا۔ اس صورت حال نے حفیظ اللہ کو گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ اس نے کامران علی سے ناجیہ کی شادی کی منصوبہ بندی کررکھی تھی۔ اگر اس کا پلان پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا تو اس حوالے سے اس نے جو جو بھی سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا سوچ رکھا تھا، وہ سب خاک میں مل کر رہ جاتا۔ اس نے موجودہ پوزیشن پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کیا اور اس مسئلے کا حل اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے ناجیہ سے بات کرنے کے بجائے عارف کو ٹارگٹ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک شام حفیظ اللہ نے کسی ضروری کام سے عارف کو اپنے آفس میں بلالیا۔ عارف نے اس روز ناجیہ کو سہ پہر میں، اس کی فرینڈز کے پاس چھوڑنا تھا اور پھر رات کو دس بجے پک کرنا تھا۔ وہ کم از کم پانچ گھنٹے کے لیے فری تھا لہٰذا وہ ناجیہ کو ڈراپ کرنے کے بعد حفیظ اللہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا باس آفس میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد حفیظ اللہ نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر عارف کی جانب بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اس لفافے کے اندر تمہاری تین ماہ کی تنخواہ کے برابر رقم موجود ہے تاکہ فوری طور پر نوکری چھوٹ جانے کی وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں سر.....'' وہ الجھن زدہ نظر سے حفیظ اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟''

''میں تمہیں ابھی اور اسی وقت نوکری سے نکال رہا ہوں۔'' حفیظ اللہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکی سے بولا۔ ''اس سلسلے میں، میں کسی وضاحت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بس، تم میری ایک بات اپنے ذہن میں نقش کرلو.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر

www.aliharyjeem.com

بڑی بے رحمی سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''فوری طور پر کراچی کو چھوڑ کر کہیں بھی چلے جاؤ اور اگر کراچی ہی میں رہنا ہے تو ناجیہ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ۔ اس لمحے کے بعد سے تم نے ناجیہ سے کبھی نہیں ملنا اور کسی بھی نوعیت کا تعلق واسطہ نہیں رکھنا حتیٰ کہ کبھی غلطی سے بھی اس کے سامنے نہیں آنا۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

عارف بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ حفیظ اللہ اس سے اس نوعیت کی بات کیوں کر رہا تھا۔ اس کے دل میں ناجیہ کے حوالے سے کوئی چور چھپا ہوا نہیں تھا لہٰذا اس معاملے میں اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی تاہم اس نے بات کو بڑھانا مناسب نہ جانا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جی..... بالکل سمجھ گیا ہوں۔''

حفیظ اللہ نے عارف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''عارف! یہ نصیحت میں تمہیں ایک باپ کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ مجھے سیاست داں بننے پر مجبور نہ کرنا.....!''

ان لمحات میں حفیظ اللہ کسی اور ہی دنیا کا باسی نظر آ رہا تھا۔ اس کے لب و لہجے سے درندگی اور الفاظ سے وحشت ٹپکتی تھی۔ عارف خاموشی سے اٹھا اور شوروم کے دفتری حصے سے باہر نکل آیا۔

شوروم سے اس کے گھر کی جانب ایک منی بس ڈائریکٹ جاتی تھی۔ وہ خالد بن ولید روڈ کے کنارے کھڑے ہو کر مذکورہ منی بس کا انتظار کرنے لگا۔ ان لمحات میں وہ ذہنی طور پر بے حد الجھا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اچانک اس کے ساتھ یہ کیا ہو گیا تھا! وہ حفیظ اللہ کی طرف سے ایسے کسی رویے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ حفیظ اللہ نے اس کی اور ناجیہ کی ذات کے حوالے سے جس نوعیت کی تشویش کا اظہار کیا تھا اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، کم از کم اس کی طرف سے ایسا کوئی معاملہ تو ہرگز نہیں تھا۔ بہرحال، اس نے اس موضوع پر حفیظ اللہ کے ساتھ کسی بحث و تکرار کو ضروری نہیں سمجھا تھا اور رقم والا لفافہ اٹھا کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ بہ وقتِ رخصت وہ ناجیہ والی گاڑی کی چابی حفیظ اللہ کے حوالے کر آیا تھا۔

دس پندرہ منٹ گزر جانے کے باوجود بھی جب اس کی مطلوبہ منی بس نہیں آئی تو وہ ایک دوسری بس پر سوار ہو گیا۔ یہ بس مین کورنگی روڈ سے گزرتے ہوئے کورنگی اور لانڈھی کی طرف جاتی تھی۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ اختر کالونی کے اسٹاپ پر منی بس سے اتر جائے گا اور پیدل مارچ کرتے ہوئے اپنے کوارٹر واقع اعظم بستی تک چلا جائے گا۔ یہ بہ مشکل دس منٹ کا واکنگ ڈسٹینس تھا لیکن وہ اپنی اس سوچ پر عمل نہ کر پایا۔ مذکورہ منی بس جب ڈیفنس مارکیٹ کے اسٹاپ پر رکی تو وہ ایک فوری خیال کے تحت بس سے اتر گیا۔

اس اچانک، ذہن میں ابھرنے والے خیال کا تعلق مسز حفیظ اللہ سے تھا۔ جس روز عارف، ناجیہ کو پک کرنے ائرپورٹ جا رہا تھا تو ندرت نے بڑے معنی خیز انداز میں اس سے کہا تھا۔ ''اگر تمہاری زندگی میں کوئی مشکل کھڑی ہو جائے تو تم سیدھا میرے پاس آ جانا۔ میں تمہارا مسئلہ حل کر دوں گی۔''

ان لمحات میں عارف کے سامنے واقعتاً ایک مشکل آن کھڑی ہوئی تھی۔ اسے نوکری جانے کا زیادہ غم نہیں تھا کیونکہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ:

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ۔ کراچی

اسے تین ماہ کی تنخواہ ایڈوانس میں مل گئی تھی۔ کوئی نیا روزگار تلاش کرنے کے لیے سو دن کی مہلت کافی تھی لیکن عارف کی الجھن کا سبب بلکہ اس کا اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ جس معاملے میں ملوث نہیں تھا اسی کی بنا پر حفیظ اللہ نے اسے فائر کر دیا تھا۔ انہی ذلت آمیز خیالات کے ساتھ کھیلتے ہوئے اس کے قدم حفیظ اللہ کے بنگلے واقع فیز ون کی سمت اٹھنے لگے۔

وہ پہلے بھی اس بنگلے پر کئی بار آ چکا تھا لہٰذا وہاں کا..... چوکیدار اسے اچھی طرح پہچانتا تھا اور خانساماں برکت علی اور ڈرائیور کرم داد سے بھی اس کی سلام دعا تھی جواب گاؤں سے واپس آ چکا تھا۔ چوکیدار اللہ بخش سے ''ہیلو ہائے'' کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''اللہ بخش! ناجیہ بی بی کو تو میں نے ان کی دوستوں کے پاس پہنچا دیا ہے۔ رات کو دس بجے میں انہیں واپس لے آؤں گا۔ اس وقت میں میڈم سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ اندر موجود ہیں؟''

''ہاں، میڈم بنگلے ہی میں ہیں۔'' اللہ بخش نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں انہیں تمہارے بارے میں بتاتا ہوں۔''

ایک منٹ کے بعد اللہ بخش نے واپس آ کر بتایا۔ ''تم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھو۔ میں نے میڈم کو اطلاع دے دی ہے۔ وہ پانچ منٹ کے بعد تم سے ملیں گی۔''

عارف، چوکیدار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔ بنگلے کا اندرونی حصہ اس کا دیکھا بھالا تھا لہٰذا وہ بہ سہولت ڈرائنگ روم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر ندرت کا انتظار کرنے لگا۔

ندرت کی آمد سے قبل باورچی ایک ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مذکورہ ٹرے میں پانی کا گلاس، چائے کا کپ اور بسکٹس والی پلیٹ موجود تھی۔ برکت علی نے ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تو رسمی علیک سلیک کے بعد عارف نے اس سے پوچھا۔

''آج تم سروس کر رہے ہو۔ صابرہ کہاں ہے؟''

صابرہ، حفیظ اللہ کی گھریلو ملازمہ تھی۔ وہ صبح سے رات تک اس بنگلے پر کام کرتی تھی۔ برکت علی نے عارف کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''صابرہ کے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آج جلدی چھٹی کر کے اپنے گھر چلی گئی ہے۔''

''اوہ.....'' عارف ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر پوچھا۔ ''ڈرائیور کرم داد بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ کیا وہ باہر نکلا ہوا ہے؟''

برکت علی نے جواب دیا۔ ''کرم داد کو صاحب نے بلایا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے شوروم کی طرف گیا ہے۔''

عارف کو یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ حفیظ اللہ صاحب نے کرم داد کو ڈرائیونگ کے حوالے سے نئی ہدایات دینے کے لیے بلایا ہوگا۔ وہ بے چینی سے ندرت کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

برکت علی کے جانے کے چند منٹ بعد ہی ندرت ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ اس دوران میں وہ چائے شروع کر چکا تھا۔ ندرت پر نگاہ پڑتے ہی وہ احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ.....'' وہ ہاتھ کے اشارے کے ساتھ بڑی نرمی سے بولی پھر اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہونے کے بعد اضافہ کیا۔ ''چائے پیو..... نوکری تو آنی جانی شے ہے!''

عارف نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لیے یہ بہت حیران کن تھا کہ وہ ندرت سے جو کچھ کہنے آیا تھا، ندرت پہلے سے وہ سب جانتی تھی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''آپ..... کو..... کس نے بتایا کہ..... حفیظ صاحب نے مجھے نوکری سے..... نکال دیا ہے.....؟''

''تمہارے صاحب حفیظ اللہ نے!'' وہ عارف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''انہوں نے تمہیں تین ماہ کی تنخواہ بھی پیشگی دے دی ہے تاکہ نئی نوکری تلاش کرنے تک تمہیں کسی مالی مشکل کا سامنا نہ ہو..... میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟''

عارف اپنی بپتا سنانے کے لیے ندرت کے پاس پہنچا تھا لیکن اسے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ندرت اس کی آمد سے پہلے ہی سب کچھ جان چکی تھی۔

''نہیں.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن مجھ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں ان سے مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔''

''یہ دنیا دکھوں کی نگری ہے عارف.....!'' وہ اس کے چہرے پر نگاہ جما کر فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''یہاں پر انسان کو سکھ آسانی سے نہیں ملتا۔ خوشی کے حصول کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ میں جانتی ہوں، اس سارے معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں مگر.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''حفیظ اللہ نے بھی اپنی جگہ بالکل ٹھیک کیا ہے۔ تم نہ سہی مگر ناجیہ بڑی تیزی سے تمہاری طرف مائل ہو رہی تھی۔ ایک تو یہ لڑکی پیدائشی ضدی و خودسر ہے، دوسرے امریکی

www.alibayeem.com

آزادانہ ماحول نے اس کے اندر بے پناہ خود اعتمادی بھی پیدا کر دی ہے۔ حفیظ اللہ کو ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کا بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے اسی لیے تمہیں ناجیہ سے دور کر دیا گیا ہے۔ حفیظ صاحب ہر قیمت پر ناجیہ کی شادی کامران علی سے کرنا چاہتے ہیں، چاہے ناجیہ اس کے لیے خوش ہو یا ناخوش کیونکہ حفیظ صاحب نے اس سیاسی شادی کے حوالے سے بڑی شاطرانہ منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔''

''یہ تو ناجیہ کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہو گی۔'' عارف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ کامران کو بالکل پسند نہیں کرتی۔''

''تمہیں ناجیہ کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں، اگر تم ناجیہ میں کوئی دلچسپی رکھتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری خاطر گیم کو گھما سکتی ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے ندرت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گیم گھمانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

''حفیظ صاحب نے تھوڑی دیر پہلے فون کر کے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے تمہیں نوکری سے نکال دیا ہے۔'' ندرت نے تلے انداز میں عارف کو بتانے لگی۔ ''اور ساتھ ہی اس امکان کا اظہار بھی کیا تھا کہ تم شوروم سے نکل کر سیدھے میرے پاس آؤ گے اور اپنی نوکری کی بحالی کے لیے مجھ سے درخواست کرو گے۔ انہوں نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں اس سلسلے میں تمہاری ایک نہ سنوں اور تمہیں سوکھا اور روکھا پھیکا جواب دے کر رخصت کر دوں۔ ان کے اندازے کے مطابق، تم میرے پاس آئے مگر تم نے اپنی نوکری کے حوالے سے مجھ سے کوئی درخواست نہیں کی۔ تم ایسا کر ہی نہیں سکتے کیونکہ میں جانتی ہوں، تم ایک غیرت مند اور خوددار انسان ہو۔ تم اپنی اور دوسروں کی نگاہ میں گرنا پسند نہیں کرو گے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ فخر سے سینہ تان کر بولا۔ ''لیکن میں نے جو پوچھا تھا آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔ وہ گیم گھمانے والی بات.....؟''

''اوہ ہاں.....'' وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جب تم ناجیہ میں دلچسپی رکھتے ہو مگر تم نے بتایا ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں لہٰذا ''گیم گھمانے'' والے معاملے کو ذہن سے نکال دو اور لائف کو انجوائے کرو۔ تین ماہ کی تنخواہ تمہاری جیب میں پہنچ چکی ہے..... فکر نہ فاقہ، عیش کر کاکا.....!''

عارف کو واضح طور پر محسوس ہوا کہ ندرت نے دانستہ اس موضوع کو گول کر دیا تھا اور آخری جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ ندرت کے اس مشکوک رویے نے اس کے اندر تجسس کو ابھارا اور وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اور..... اگر میں اس گیم میں ان ہونا چاہوں تو؟''

ندرت چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کی مدد سے اس کی سوچ کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی پھر پُرخیال انداز میں بولی۔

''عارف! اگر تم حقیقتاً ناجیہ میں دلچسپی لینے لگو یا اس کے طلب گار کا کردار ادا کرنے پر تیار ہو جاؤ تو اس سنسنی خیز کھیل میں تمہارے لیے گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے تین دن کا وقت دیتی ہوں۔ اچھی طرح غور و فکر کر کے کسی حتمی فیصلے تک پہنچ جاؤ۔ باقی باتیں اس کے بعد کریں گے۔''

ندرت نے عارف کے سامنے جو پچویشن رکھی تھی اس کے اندر عارف کو خطرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ حفیظ اللہ کی طاقت اور پہنچ سے اچھی طرح واقف تھا۔ ندرت نے جو پیشکش کی تھی وہ حفیظ اللہ کے منصوبے کے خلاف جاتی تھی اور وہ کسی بھی قیمت پر حفیظ اللہ جیسے بااثر شخص کی دشمنی مول لینے کو تیار نہیں تھا لیکن اس نے ندرت کی پیشکش کو کھلم کھلا ٹھکرایا بھی نہیں کیونکہ وہ ندرت کے اختیارات کا ادراک رکھتا تھا۔

''او کے میم!'' اس نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں سوچ کر آپ کو جواب دوں گا۔ یہ بتا دیں کہ آپ سے رابطہ کرنے کا ذریعہ کیا ہو گا۔ اس بنگلے پر تو اب میں آؤں گا نہیں۔ حفیظ صاحب نے مجھے اپنی شکل گم کرنے کے احکامات صادر کر دیے ہیں۔''

ندرت نے ایک کاغذ پر ایک فون نمبر لکھ کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم اس کھیل کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لو تو اس نمبر پر فون کر کے اپنی رضامندی کے بارے میں بتا دینا۔ باقی کے معاملات اس کے بعد طے کیے جائیں گے۔ اگر تین دن کے اندر تمہاری طرف سے اس نمبر پر رابطہ نہیں کیا گیا تو یہ آفر خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی بالکل سمجھ گیا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''حصہ نہ لینے کی صورت میں، یہ تمام باتیں میں اپنے ذہن سے اور یادداشتوں سے مٹا دوں گا جو ابھی ہمارے درمیان ہوئی ہیں۔''

''تمہارے حق میں یہی بہتر ہو گا.....'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

عارف بنگلے سے باہر نکل کر پیدل ہی اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ حفیظ اللہ نے آج اپنے دفتر میں بلا کر اس

www.allidyeem.com

کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس نے عارف کے ذہن میں ایک الاؤ سا روشن کر دیا تھا اور ندرت کی پراسرار پیشکش نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس وقت عارف کا دماغ نمونۂ جہنم بنا ہوا تھا۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ ندرت نے حفیظ اللہ کے خلاف کسی خوفناک کھیل کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ وہ دو ہاتھیوں کی لڑائی میں اپنا کچومر نکلوانے کے حق میں نہیں تھا لہٰذا..... تین دن تو دور کی بات، وہ تین سیکنڈ میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ کبھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھے گا۔

وہ لگ بھگ آٹھ بجے حفیظ اللہ کے بنگلے سے رخصت ہوا تھا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اس کا دوست عاصم وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا، لباس تبدیل کیا اور بستر پر دراز ہو کر اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ کم و بیش رات گیارہ بجے پولیس نے عارف کو ندرت کے قتل کے الزام میں اسی کوارٹر سے گرفتار کر لیا تھا۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ میں نے پچھلے چند روز میں اپنے موکل کی فراہم کردہ اطلاعات و معلومات اور اس کے دوست عاصم کے بھرپور تعاون کی بہ دولت اپنا ہوم ورک مکمل کر لیا تھا اور اس پیشی پر میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواستِ ضمانت بھی عدالت میں دائر کر دی تھی لیکن یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ باوجود کوشش کے بھی میں پہلی پیشی پر اپنے موکل کی ضمانت کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ ندرت کی موت سترہ اکتوبر کی شام آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کی لاش واش روم کے فرش پر پڑی ملی تھی۔ کسی آہنی شے کی مدد سے اس کی پیشانی کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ ضرب ایسی کاری ثابت ہوئی کہ اس نے مقتولہ کی کھوپڑی کا سامنے والا حصہ چٹخا کر رکھ دیا تھا اور وہ دھڑام سے واش روم کے فرش پر جا گری تھی۔ رپورٹ میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا کہ مقتول کی موت کا سبب یہی خطرناک چوٹ تھی۔ بعد ازاں پولیس نے بنگلے کے عقبی حصے سے ایک آہنی راڈ کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ مذکورہ راڈ کے لیبارٹری ٹیسٹ نے ثابت کر دیا کہ اس پر پایا جانے والا خون اور بال مقتولہ ندرت ہی کے تھے۔

پولیس کی جانب سے پیش کردہ چالان سراسر موکل کے خلاف جاتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے کس گیپ میں کون سا شارٹ کس وقت کھیلنا ہے لہٰذا میں اپنی ذات میں مطمئن اور پُرسکون تھا۔ پولیس کی رپورٹ یعنی استغاثہ کے ہر وار کا توڑ میرے ذہن میں موجود تھا۔

ابتدائی دو پیشیاں تو بعض تکنیکی امور کو نمٹانے میں گزر گئی تھیں۔ اس کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ اس پیشی پر جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے موکل نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں، میں اس سے تین ملاقاتیں کر چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری بات کو فوراً پک کر لیتا تھا اور پھر وہ نہ صرف اسے یاد رکھتا تھا بلکہ میری ہدایات کے عین مطابق وہ اس پر عمل بھی کرتا تھا۔

ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا پھر ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

''تم مقتولہ کے پاس کتنے عرصے سے کام کر رہے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

''میں مقتولہ کے پاس نہیں بلکہ ان کے شوہر کے شوروم میں ملازمت کرتا تھا جس میں ڈرائیونگ کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے کام کرنا ہوتے تھے۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''میری نوکری کا عرصہ لگ بھگ ایک سال ہے۔''

''کیا تم اس بات سے انکاری ہو کہ وقوعہ سے پہلے تمہاری ڈیوٹی مقتولہ کی بیٹی ناجیہ صاحبہ کے ساتھ تھی؟'' وکیل استغاثہ نے قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ''تم ناجیہ صاحبہ کے لیے فل ٹائم ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر رہے تھے؟''

''میں جزوی طور پر آپ کی بات سے انکار کرتا ہوں۔''

ملزم کے اعتماد کو دیکھ کر وکیل استغاثہ خاصا حیران ہوا۔ اس نے گھور کر ملزم کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ''اس جزوی انکار سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''دیکھیں جناب! میں ایک سیدھا سادہ سا دیہاتی انسان ہوں لہٰذا مجھے آپ کی طرح گھما پھرا کر بات کرنا نہیں آتی۔'' ملزم نے ٹھوس انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''میں کم و بیش نو ماہ تک حفیظ اللہ صاحب کے شوروم میں کام کرتا رہا پھر جب ناجیہ صاحبہ امریکا سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئیں تو حفیظ صاحب نے میری ڈیوٹی ناجیہ صاحبہ کے ساتھ لگا دی۔ میں لگ بھگ تین ماہ تک ان کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر چکا ہوں یعنی وقوعہ والے روز سترہ اکتوبر کی سہ پہر تک۔''

''تو میں نے کون سی الگ بات کی ہے.....؟'' وکیل استغاثہ نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

www.aiffayeem.com

''کوئی ایسی ویسی الگ'' ملزم نے سرکاری وکیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ نے فرمایا کہ واقعہ سے پہلے میری ڈیوٹی مقتولہ کی بیٹی ناجیہ کے ساتھ تھی۔ بے شک! میری ڈیوٹی ناجیہ صاحب کے ساتھ تھی مگر ناجیہ صاحب مقتولہ کی نہیں بلکہ حفیظ اللہ صاحب کی بیٹی ہیں..... حفیظ صاحب اور مرحومہ نگہت صاحب کی اکلوتی اولاد!''

''اوہ تو تمہارا اشارہ اس طرف تھا۔'' وکیل استغاثہ نے خجالت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں، یہ درست ہے کہ مقتولہ، ناجیہ کی سوتیلی ماں تھی۔ حفیظ اللہ صاحب نے کوئی دو سال پہلے مقتولہ سے دوسری شادی کی تھی۔''

''جب میں نے حفیظ اللہ صاحب کے پاس ملازمت اختیار کی تو مقتولہ سے ان کی شادی کو تقریباً ایک سال دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس حساب سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب مقتولہ جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں تو حفیظ اللہ صاحب سے ان کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے۔''

''تم یہ تو تسلیم کرتے ہو نا جب مقتولہ کی موت واقع ہوئی اس وقت تم ناجیہ کے ڈرائیور کی حیثیت سے کام کر رہے تھے؟'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... مجھے تسلیم ہے۔''

''جب تم ناجیہ کی ڈرائیوری میں تین ماہ گزار چکے تو ایک روز، سترہ اکتوبر کی سہ پہر حفیظ اللہ صاحب نے تمہیں اپنے آفس میں بلایا اور نوکری سے برخاست کر دیا۔'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس اچانک برخاستگی کا سبب کیا تھا؟''

''میں نہیں جانتا۔'' ملزم نے میری پڑھائی ہوئی پٹی کی روشنی میں جواب دیا۔ ''حفیظ اللہ صاحب میرے مالک تھے اور میں ان کا ملازم۔ میرے پاس صرف یہ اختیار تھا کہ نوکری چھوڑ کر چلا جاؤں اور حفیظ صاحب کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ کسی وقت بھی مجھے نوکری سے نکال دیں۔ میں نے خود یہ ملازمت نہیں چھوڑی بلکہ حفیظ صاحب نے مجھے جواب دیا تھا۔ یہ سوال آپ حفیظ صاب سے پوچھیں کہ انہوں نے مجھے نوکری سے کیوں نکالا تھا؟ میں تو ان کا احسان مند ہوں کہ بے روزگار کرتے وقت انہوں نے میرا خیال رکھا اور مجھے اتنی رقم دی کہ نئی ملازمت تلاش کرنے تک مجھے کسی قسم کی مالی پریشانی کا سامنا نہ ہو.....!''

''یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حفیظ اللہ نے تمہیں تمہاری کس خطا پر نوکری سے نکالا تھا۔'' وکیل استغاثہ ملزم کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''جب مقتولہ کا شوہر گواہی دینے کے لیے عدالت میں آئے گا تو تمہارے مکر کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی زبان ہی سے بتا دو۔''

''آپ کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ بھی، مجھے نوکری سے نکالے جانے کی وجہ سے واقف ہیں۔'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے یا تو آپ حفیظ اللہ صاحب کی گواہی تک انتظار کر لیں اور اگر آپ کے اندر صبر کا مادہ نہیں ہے تو اپنی زبان ہی سے معزز عدالت کے سامنے میری اصلیت کو ظاہر کر دیں.....''

''تمہاری اصلیت بڑی گھناؤنی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے نفرت بھری نظر سے ملزم کو گھورا۔ ''تم اپنی مالکن پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تمہاری انہی اوچھی حرکتوں کے باعث تمہیں نوکری سے نکالا گیا تھا۔''

ملزم عارف وکیل استغاثہ کی پھینکی ہوئی ہر بال کو میرٹ پر کھیل کر باؤنڈریز مار رہا تھا۔ بہت کم موکل ایسے ہوتے ہیں جو سب کچھ وکیل صفائی پر چھوڑ کر، اللہ بابا بن کر کٹہرے میں کھڑے نہیں رہتے بلکہ مناسب مواقع پر وہ اپنی توانائی کو صرف کرنے سے نہیں چوکتے۔ عارف بھی ایک ایسا ہی ذمے دار اور عقل مند موکل تھا۔ میں اس کی اطمینان بخش کارکردگی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کا اشارہ کس مالکن کی جانب ہے وکیل صاحب؟'' ملزم نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ ''مقتولہ ندرت صاحبہ یا بہ قیدِ حیات ناجیہ صاحبہ.....!''

''میں ناجیہ کی بات کر رہا ہوں۔'' وکیلِ استغاثہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جس کے ساتھ تم ڈیوٹی کر رہے تھے۔''

''کیا ناجیہ صاحبہ کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں موجود ہے؟'' جواب دینے کے بجائے ملزم نے الٹا سوال کر دیا۔

''ہاں ہے۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ نظر سے میرے موکل کو گھورا اور خاصے سخت لہجے میں کہا۔ ''پھر.....؟''

''میں تو اس کیس میں ملزم کی حیثیت رکھتا ہوں اور آپ مجھے مجرم ثابت کرنے کے لیے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو آزما رہے ہیں۔'' ملزم نے وکیل استغاثہ کے ''پھر'' کے جواب میں کہا۔ ''یہی نہیں بلکہ آپ مجھے جھوٹا، مکار اور فریبی بھی سمجھتے ہیں لہٰذا اگر میں یہ کہوں گا کہ میں اپنی مالکن ناجیہ صاحبہ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا تو آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا اس لیے.....'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

www.aiffoyeem.com

''ظاہر ہے..... اپنی باری پر ناجیہ صاحبہ بھی گواہی دینے کے لیے اس عدالت میں آئیں گی اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ آپ یہ سوال براہِ راست انہی سے کریں۔ ان کے جواب سے آپ کی تسلی ہو جائے گی کیونکہ وہ نہ تو جھوٹی ہیں نہ مکار اور نہ ہی فریبی۔ پھر وہ امریکا سے اپنی تعلیم مکمل کر کے وطن لوٹی ہیں۔ وہ جو بھی کہیں گی، سچ کہیں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہیں گی۔''

میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں اتنا پُراعتماد ملزم اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عارف کے انداز نے وکیل استغاثہ کے چودہ طبق بھی اجال ڈالے تھے۔ وہ جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔

''استغاثہ کی گواہ ناجیہ جب عدالت میں حاضر ہوگی تو اس سے بھی لازماً یہ سوال کیا جائے گا۔ فی الحال تم میری جرح کا سامنا کر رہے ہو اور میرے اس سوال کا جواب دینے کے پابند ہو۔''

بات کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے امداد طلب نظر سے جج کی طرف دیکھا تو جج نے اپنے مخصوص رعب دار انداز میں ملزم سے کہا۔

''وکیل استغاثہ نے تمہیں نوکری سے برخاست کیے جانے کی جو وجوہات بیان کی ہیں، تم ان سے اتفاق کرتے ہو یا اختلاف؟''

''صد فیصد اختلاف سر۔'' ملزم اپنا روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ''میری اصلیت گھناؤنی نہیں بلکہ کسی آئینے کے مانند شفاف ہے۔ میں نے اپنی مالکن ناجیہ صاحبہ پر کبھی ڈورے ڈالنے کی کوشش نہیں کی لہٰذا ایسی کسی اوچھی حرکت کو میری ذات سے منسوب کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس نوعیت کے ہتک آمیز اقدام سے پہلے استغاثہ کو ذہن نشین کرنا ہوگا کہ ناجیہ صاحبہ کوئی سیدھی سادی، بے وقوف سی دیہاتی لڑکی نہیں ہے جسے میں ڈورے ڈال کر اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناجیہ صاحبہ نے کئی سال امریکا جیسے خودمختار اور آزاد ملک کی فضاؤں میں سانس لیا ہے اور ڈیلس کی ایک یونیورسٹی سے کامرس کی ماسٹر ڈگری لے کر آئی ہیں۔ وہ تو اتنی تیز اور طرار ہیں کہ مجھے کھڑے کھڑے بیچ ڈالیں۔ میری کیا مجال کہ ان پر ڈورے ڈالوں گا۔ میں تو ان کے سامنے ایک ناچیز، الو کا پٹھا قسم کا انسان ہوں.....''

عارف کے پُرازمعنی اور وزنی دلائل نے جج کو کافی حد تک متاثر کیا تھا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

''مقتولہ کے شوہر نے تمہیں نوکری سے فارغ کرتے وقت لگ بھگ تین ماہ کی تنخواہ بس ایویں ہی تھما دی تھی مگر اس رقم سے تمہاری نیت نہیں بھری اور تم اپنی حرص و ہوس سے مجبور ہو کر مقتولہ کے پاس پہنچ گئے۔'' وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور مقتولہ کی نرم طبیعت کا فائدہ اٹھا کر تم نے تین لاکھ کا مطالبہ کر دیا۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''تم نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقتولہ کو دھمکی دی کہ یا تو تمہاری ملازمت بحال کی جائے اور یا پھر تمہیں تین لاکھ روپے ادا کیے جائیں۔'' وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''ورنہ تم یہ کر دو گے، وہ کر دو گے..... ہیں؟''

''جی نہیں..... بالکل نہیں۔'' ملزم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے عائد کردہ الزامات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

ملزم کی وضاحت کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے وکیل استغاثہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''جب مقتولہ نے تمہارا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تو تم غصے میں آ گئے اور پھر طیش کے عالم میں مقتولہ کے سر پر وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا۔''

''نہیں..... آپ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔'' ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''وقوعہ کے روز میڈم ندرت سے میری ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ ہے۔''

''تم قبولو گے..... اپنی زبان سے اقبال جرم کرو گے اور وہ بھی اسی کٹہرے میں کھڑے ہو کر۔'' وکیل استغاثہ نے خونخوار نظر سے ملزم کو گھورا۔ ''میرے پاس تمہارے جرم کے ایسے ٹھوس ثبوت ہیں کہ تم بچ نہیں سکو گے۔ تمہیں تمہارے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔''

ان دھمکی آمیز کلمات کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے ملزم پر اپنی جرح ختم کر دی۔ جج کی اجازت سے میں اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا پھر ملزم سے کچھ پوچھنے سے قبل منصف کی جانب دیکھتے ہوئے ملتمس ہوا۔

''جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اپنے مؤکل سے کوئی سوال کرنے سے پہلے وکیل سرکار سے چند نہایت ہی اہم نکات پر استفسار کرنا چاہتا ہوں۔''

''بیگ صاحب! یو آر پرمیٹڈ۔'' جج نے مجھ سے کہا۔

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معتدل انداز میں پوچھا۔ ''وقوعہ

www.alifayjeem.com

کی شام یعنی سترہ اکتوبر کی شام آپ سات بجے سے نو بجے تک کہاں تھے؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "اس وقت میں اپنے آفس میں تھا۔"

"کیا آپ نے روحانی طور پر اتنی ترقی فرمالی ہے کہ بہ یک وقت اپنے مادی وجود کے ساتھ دو مختلف مقامات پر موجود رہ سکتے ہوں؟" میں نے تیکھے انداز میں استفسار کیا۔

"یہ کس قسم کا سوال ہے؟" وہ ناگواری سے بولا۔

"سوال کی اقسام پر ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "میں نے جو پوچھا ہے، پہلے "ہاں یا نہ" میں اس کا جواب دیں۔"

"میں روحانی طور پر اس قابل نہیں ہوں کہ بہ یک وقت دو مختلف جگہوں پر اپنے مادی جسم کے ساتھ رہ سکوں۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقوعہ کی شام سات سے نو بجے تک آپ صرف اپنے آفس میں موجود تھے۔" میں نے چور کو اس کے گھر تک پہنچانے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ اور کہیں نہیں؟"

"یس..... دیٹ از۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

"میرے فاضل دوست!" میں نے میٹھی چھری سے اسے ذبح کرتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے مؤکل سے پے در پے چند سوالات پوچھے ہیں۔ جیسا کہ..... ملزم کا مقتولہ کے بنگلے پر پہنچ کر ملازمت بحال کرنے کا مطالبہ، بہ صورتِ دیگر تین لاکھ روپے کی ادائی کا مطالبہ، اس کے یہ مطالبات پورے نہ ہونے کی صورت میں ملزم کا مقتولہ کو خطرناک نتائج کی دھمکی دینا، مقتولہ کے صاف انکار پر ملزم کا اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتار دینا..... وغیرہ۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے ان پُروثوق استفسارات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس نازک موقع پر آپ بہ نفسِ نفیس جائے وقوعہ پر موجود تھے اور آپ نے یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے.....؟"

"جی نہیں۔" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں نے بتایا ہے نا، اس وقت میں اپنے آفس میں تھا۔"

"پھر آپ کا کوئی انفارمر مقتولہ کے بنگلے پر موجود تھا۔" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جس نے یہ آنکھوں دیکھا احوال آپ تک پہنچایا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔

"تو پھر آپ کی ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے استفسار کیا۔

"سب کچھ آپ کی نظروں کے سامنے آجائے گا۔" وہ کسی فلسفی کے انداز میں آنکھیں سکیڑ کر بولا۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے اسے عدالت میں سچ بھی ثابت کر کے دکھادوں گا لیکن اس کا وقت آنے پر۔"

وہ واضح طور پر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے ڈھیل دیتے ہوئے مصلحت بھرے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے میرے فاضل دوست! میں اس مناسب وقت کا انتظار کروں گا جب آپ میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیں گے۔" پھر میں اپنے مؤکل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"عارف!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ نوکری سے فارغ کرتے وقت مقتولہ کے شوہر نے تمہیں کیا تلقین کی تھی؟"

"حفیظ اللہ صاحب نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی بے رحمی سے کہا تھا....." ملزم نے میرے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "فوری طور پر کراچی کو چھوڑ کر کہیں بھی چلے جاؤ۔ اس لمحے کے بعد سے تم نے ناجیہ سے کبھی نہیں ملنا اور کسی نوعیت کا تعلق واسطہ نہیں رکھنا حتیٰ کہ کبھی غلطی سے بھی اس کے سامنے نہیں آنا....." لمحاتی توقف کر کے اس نے بڑی بھرپور نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "وکیل صاحب! میں نے حفیظ صاحب کے الفاظ کو من وعن معزز عدالت کے سامنے دہرادیا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کچھ؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"ہاں..... انہوں نے ایک بات اور بھی کہی تھی۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "اور حفیظ اللہ صاحب کی یہ بات سن کر میں واقعتاً گھبرا گیا تھا کیونکہ میں ان کے وسیع اختیارات اور اونچی پہنچ سے اچھی طرح واقف تھا۔"

میں نے ٹٹولنے والے لہجے میں پوچھا۔ "اور تمہیں گھبراہٹ میں مبتلا کر دینے والی حفیظ اللہ کی وہ خطرناک بات کون سی تھی؟"

"انہوں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔" ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "عارف! یہ نصیحت میں تمہیں ناجیہ کے باپ کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ مجھے سیاست داں بننے پر مجبور نہ کرنا۔"

www.urdtayeem.com

"واقعی، یہ تو خاصی ڈرانے والی بات تھی۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن تمہارا تو ناجیہ کے ساتھ کوئی معاملہ تھا ہی نہیں پھر حفیظ اللہ جیسے زیرک اور مردم شناس شخص کو ایسا شک کیوں ہوا؟"

"میں نے اس نکتے پر بہت غور کیا وکیل صاحب۔" وہ بے بسی سے کندھے جھٹکتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ اسی لیے میں نے شوروم سے نکالنے کے بعد اپنے گھر جانے کے بجائے حفیظ اللہ صاحب کے بنگلے کا رخ کیا تھا۔"

سانپ کو اس کے بل سے باہر نکالنے کے لیے میں نے اور عارف نے آپس میں کچھ باتیں طے کرلی تھیں۔ ہم نے سچ اور جھوٹ کو خلط ملط کر کے ایسا ڈرامائی انداز اختیار کرنا تھا جو بے ضرر بھی ہو اور اس سے میرا مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ بنیادی طور پر یہ کوئی غلط بیانی نہیں تھی بلکہ یہ سچ کے بدلے ہوئے چہرے کو ایک نئے طور پر سامنے لانے کا معاملہ تھا۔ اس وقت ہم دونوں مل کر یہی سب کر رہے تھے اور ہماری کسی ادا سے کوئی مصنوعی پن نہیں جھلکتا تھا۔

"کیا حفیظ اللہ صاحب کے بنگلے پر تمہاری الجھن کی سلجھن موجود تھی جو تم نے ادھر کا قصد کیا تھا؟" میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس وقت میرا خیال تھا کہ---- ہاں!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بعد ازاں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ ندرت صاحبہ کی دانش مندانہ وضاحت نے میری ساری الجھن دور کردی تھی۔"

"مقتولہ نے تم سے ایسا کیا کہہ دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میڈم ندرت نے مجھے بتایا کہ حفیظ اللہ صاحب اپنے بعض سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے ناجیہ صاحبہ کی شادی ایک سٹنگ منسٹر کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں۔ ناجیہ سے شادی کے امیدوار، اس منسٹر کے بیٹے نے ناجیہ کو میرے ساتھ دو تین بار مختلف ریسٹورنٹس اور آئس کریم پارلرز میں ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے دیکھ لیا تھا۔ اس لڑکے نے اس معاملے کو اپنے باپ تک پہنچایا اور مذکورہ سٹنگ منسٹر نے اس سنجیدہ معاملے پر حفیظ اللہ صاحب سے بات کی تھی چنانچہ ناجیہ کے مستقبل کی خاطر بہ الفاظِ دیگر اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کی غرض نے حفیظ اللہ صاحب کو یہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا تھا۔"

"مقتولہ کی اس وضاحت کے بعد تمہاری تشفی ہوگئی تھی؟" میں نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

"جی..... سولہ آنے۔" وہ کراری آواز میں بولا۔

"وقوعہ کی شام تم مقتولہ کے بنگلے سے کتنے بجے رخصت ہوئے تھے؟" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی آٹھ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری رخصت کے وقت مقتولہ اپنے بنگلے پر زندہ سلامت موجود تھیں؟"

"جی بالکل!" وہ چہکتے لہجے میں بولا۔ "اور انہوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے کہیں کوئی ملازمت نہ ملے اور میں کسی پراسرار کھیل کا حصہ بن کر پیسا کمانا چاہوں تو آئندہ تین روز میں ایک نمبر پر کال کر کے اپنی آمادگی کا اظہار کردوں۔ باقی کے معاملات میڈم خود سنبھال لیں گی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کاغذ پر، ایک نمبر لکھ کر مجھے دیا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس اچانک پیدا ہو جانے والی واہیات صورتِ حال نے مجھے بہت زیادہ خوف زدہ کردیا تھا۔ حفیظ اللہ صاحب اور ان کی مسز میڈم ندرت کا انداز بہت ہی مشکوک اور ڈرا دینے والا تھا۔ میں نے بنگلے سے نکلتے وقت ہی یہ ٹھان لی تھی کہ زندگی میں دوبارہ کبھی ان لوگوں سے ملنے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن میری بدقسمتی کہ حالات نے مجھے ایک ناکردہ جرم میں پھنسا دیا ہے۔ اللہ میرے حال پر رحم فرمائے۔"

"آمین----!" میں نے بہ آوازِ بلند کہا پھر روئے سخن جج کی جانب گھماتے ہوئے حتمی لہجے میں اضافہ کیا۔ "مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

میں ہر پیشی پر اپنے موکل کے والد علی نواز کو بھی بلا لیا کرتا تھا۔ وہ میرے بلاوے پر، پیشی سے ایک روز پہلے ہی حاصل پور سے کراچی پہنچ جاتا تھا۔ اب تک کی عدالتی کارروائی سے علی نواز پوری طرح مطمئن تھا۔ وہ عارف کی کارکردگی پر بہت زیادہ حیران بھی تھا۔ اس پیشی پر، عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا۔

"وکیل صاحب! عارف کو دیکھ کر مجھے بالکل یقین نہیں آرہا کہ یہ وہی حاصل پور والا میرا بیٹا ہے۔ گپ چپ اور اپنی ذات میں مگن رہنے والا انسان..... اس مقدمے میں پھنسنے کے بعد تو عارف کی جون ہی بدل گئی ہے۔ یہ حد سے زیادہ تیز اور بااعتماد ہوگیا ہے۔"

"علی نواز! مجھے ایک بات بتاؤ....." میں نے اس کی سادگی بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "جب سانپ

www.pdfbooksfree.pk

کے بل کے سامنے آگ جلائی جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟''

''سانپ گھبرا کر اپنے بل سے باہر نکل آتا ہے.....''

اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

''اور جب شہد کی مکھیوں کے چھتے کو دھواں دھار آگ دکھائی جاتی ہے تو اس کڑوے دھوئیں اور خوفناک تپش کی تاب نہ لاتے ہوئے مکھیاں کیا کرتی ہیں؟'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس مرتبہ بھی علی نواز نے ترت جواب دیا۔ ''مکھیاں، شہد کے چھتے کو چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔''

''انسان کی ذات بھی اپنی فطرت میں کسی بل میں سوئے ہوئے سانپ اور شہد کے چھتے سے چمٹی ہوئی مکھیوں کے مانند ہوتی ہے علی نواز۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب انسان کی ذات پر کہیں سے کوئی ضرب پڑتی ہے یعنی اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو پھر انسان کی ذات گپ چپ، منہ میں گھنگھنیاں ڈالے نہیں بیٹھی رہتی بلکہ وہ ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے پھر تپش آمدہ مصیبت کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہونے میں اسے ذرا دیر نہیں لگتی۔ ایسے ہی مواقع کے لیے کہا گیا ہے..... تنگ آمد، بہ جنگ آمد۔''

''میں یہ سمجھتا ہوں۔'' وہ معصومیت سے بولا۔ ''عارف کے اندر آنے والے اس بدلاؤ کا سبب صرف اور صرف آپ ہیں۔''

اسی وقت ہمارے کیس کی آواز پڑ گئی۔ میں یہ کہتے ہوئے کمرائے عدالت میں داخل ہو گیا۔

''علی نواز! بہت جلد جب یہ عدالت تمہارے بیٹے کو باعزت بری کرے گی تو اس خوشی کے موقع پر ان الفاظ کو تم سب سے پہلے اپنے خالق و مالک کا شکر ادا کرنے کے لیے استعمال کرنا۔ میری باری دوسرے نمبر پر لگا لو۔''

اس پیشی پر ہمارے کیس کا پہلا نمبر تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آج عدالتی کارروائی خاصی طویل چلے گی۔ اس سے پہلے کہ استغاثہ کے گواہوں کو کٹہرے میں کھڑے ہو کر بولنے کا موقع دیا جاتا، میں نے عدالت سے درخواست کی۔

''جناب عالی! میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں اگر معزز عدالت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو.....''

''نو آبجیکشن۔'' جج نے فراخ دلی سے کہا۔

کسی بھی کیس میں انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر وہ عدالت میں حاضر رہنے کا پابند بھی ہوتا ہے کیونکہ دونوں جانب سے کسی وقت کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

اس کیس کا آئی او ایک دراز قامت اور خوش شکل سب انسپکٹر فاروق احمد تھا۔ اس کے بدن پر پولیس کی وردی بہت جچ رہی تھی اور یونیفارم کی موجودگی نے اس کی شخصیت کے تاثر کو دوچند کر دیا تھا۔ جب وہ وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا تو میں نے اپنی توجہ کا انٹینا اس کی جانب موڑ دیا۔

''فاروق صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''آپ جیسے ہینڈسم آفیسر پولیس ڈپارٹمنٹ میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔''

میرے ان توصیفی کلمات پر وہ زیر لب مسکرایا اور حساب چکتا کرنے والے انداز میں بولا۔ ''تھینک یو ویری مچ۔ میرا کورٹ میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آپ جیسے اسمارٹ ایڈووکیٹ بھی یہاں پر بہت کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔''

''گویا اس وقت ہینڈسم نیس اور اسمارٹ نیس ایک دوسرے کے روبہ رو استادہ ہیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''کافی مزہ آنے والا ہے..... ہیں نا؟''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے سوالات کا سلسلہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سے اس قسم کے روایتی سوالات نہیں کروں گا کہ آپ کو اس واقعے کی اطلاع کس نے اور کتنے بجے دی؟ آپ جائے وقوعہ پر کب پہنچے؟ آپ نے کرائم سین پر کس نوعیت کی کارروائی کی اور اس کارروائی سے کیا نتائج اخذ کیے؟ مقتولہ ندرت کے قاتل کے حوالے سے نشاندہی کس نے کی؟ آپ نے ملزم کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا..... وغیرہ۔''

''آپ نے تمام روایتی سوالات تو کر ڈالے ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''بس، آپ نے مجھے ان کے جوابات دینے کا پابند نہیں کیا۔''

''مجھے عدالت کے قیمتی وقت کا بڑی شدت سے احساس ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ قاتل، مقتولہ کے بیڈروم میں کہیں چھپا ہوا تھا۔ جب مقتولہ واش روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں آنے لگی تو قاتل نے بڑی بے دردی سے مقتولہ کی پیشانی پر ایک خطرناک وار کیا جو انتہائی مہلک ثابت ہوا اور مقتولہ زندگی کی بازی ہار گئی؟''

''جی بالکل میری تفتیش بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے

www.urdupoint.com

چنانچہ میں آپ کی تھیوری سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مقتولہ کی لاش واش روم کے فرش پر اس طرح پڑی ملی تھی کہ اس کے پاؤں واش روم کے کھلے ہوئے دروازے کے انتہائی نزدیک تھے۔ مقتولہ واش روم کے فرش پر چت پڑی تھی جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مقتولہ نے جیسے ہی واش روم کا دروازہ کھولا اور باہر آنے کا ارادہ کیا، اس کی پیشانی پر آہنی راڈ سے ایک طوفانی ضرب لگائی گئی اور وہ پشت کے بل واش روم کے فرش پر جا پڑی۔ آہنی راڈ کا وار اتنا خطرناک اور جان لیوا تھا کہ مقتولہ فرش پر گرنے کے بعد اٹھ نہ پائی اور جاں بحق ہوگئی۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جس واش روم میں مقتولہ کی لاش پائی گئی تھی وہ بیڈ روم کا اٹیچڈ باتھ تھا لہٰذا کہا جاسکتا ہے، قاتل آہنی راڈ تھامے، گھات لگائے بیڈ روم کے اندر، واش روم کے بند دروازے کے انتہائی نزدیک کھڑا دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔''

''شکریہ فاروق صاحب.....'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اس چوبی میز کی جانب بڑھ گیا جہاں ایک سیلوفین بیگ کے اندر آلۂ قتل رکھا ہوا تھا۔

مذکورہ آہنی راڈ ڈیڑھ انچ موٹی اور بیس انچ لمبی تھی۔ اس کے ایک سرے پر مقتولہ کا خون لگا ہوا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ خشک ہو کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا۔ اسی جمے ہوئے خون کے اندر چند بال بھی چپکے ہوئے دیکھے جاسکتے تھے۔ میں نے اس سیلوفین بیگ کو انکوائری آفیسر کی آنکھوں کے سامنے جھلاتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''آئی او صاحب! یہ استغاثہ کا دریافت کردہ آلۂ قتل ہے جس کی مدد سے حفیظ اللہ صاحب کی اہلیہ ندرت کو فنا کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کیا آپ کو اس امر میں کوئی شک ہے؟''

''اگر اس حقیقت میں کسی شبے کی گنجائش ہوتی تو میں اس وقت ایک انکوائری آفیسر کی حیثیت سے عدالت میں موجود نہ ہوتا۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

''ویری گڈ!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''لیبارٹری ٹیسٹ کی رپورٹ کے مطابق، اسی آہنی راڈ کی مدد سے مقتولہ کو موت کی نیند سلایا گیا تھا۔ آپ کو یہ آلۂ قتل کہاں سے ملا تھا؟''

''بنگلے کے عقبی لان سے۔'' اس نے بتایا۔

''عقبی لان میں کس مقام پر؟'' میں نے پوچھا۔

''عقبی دیوار کے نزدیک.....''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل نے مقتولہ کو بیڈ روم کے واش روم میں ہلاک کیا اور پھر آلۂ قتل کو عقبی دیوار کے قریب پھینک کر وہ مذکورہ دیوار پھلانگ کر وہاں سے فرار ہوگیا۔''

''نہیں۔'' وہ ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ قاتل نے مقتولہ کو بیڈ روم کے واش روم میں ہلاک کیا اور پھر آلۂ قتل کو عقبی دیوار کے پاس پھینک کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ عقبی دیوار پھلانگ کر وہاں سے بھاگ گیا تھا جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم کی جانب اشارہ کرنے کے بعد بڑے وثوق کے ساتھ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس شخص نے آلۂ قتل کو بنگلے کی عقبی دیوار کے نزدیک پھینک کر پولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور خود بڑے آرام سے چلتے ہوئے بنگلے کے گیٹ سے رخصت ہوگیا۔''

''لیکن ملزم کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ یہ پولیس کو گمراہ نہیں کر سکا۔'' میں نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''ہوشیار پولیس نے یہ پتا چلا ہی لیا کہ قتل کی یہ واردات میرے مؤکل ہی نے کی ہے۔''

اگرچہ میں نے اپنی بات کا اختتام سوالیہ موڑ پر کیا تھا لیکن انکوائری آفیسر نے اس پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان لمحات میں میرے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ میں نے استفسار کیا۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ میرے مؤکل ہی نے آہنی راڈ کا وار کر کے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا؟''

''پکا یقین۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

''اس کیس کی فائل میں مجھے کہیں بھی ''ایف پی'' کی رپورٹ نظر نہیں آئی۔'' میں نے انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا آپ نے آلۂ قتل پر سے قاتل کے فنگر پرنٹس نہیں اٹھائے تھے اور ملزم کی انگلیوں کے نشانات سے اس کا موازنہ نہیں کیا تھا؟''

''ہم نے یہ کوشش کی تھی۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آلۂ قتل پر ہمیں ملزم کے فنگر پرنٹس نہیں ملے تھے۔''

''بیڈ روم کے اندر یا بنگلے کے کسی اور حصے میں، کسی مقام پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''لگتا ہے، قتل کی اس واردات کے وقت ملزم نے اپنے ہاتھوں پر مخصوص

www.aiwayjeem.com

قسم کے گلوز پہن رکھے تھے۔"

"کیا آپ نے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں موجود فرنیچر پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات ڈھونڈنے کی زحمت کی تھی؟" میں نے پوچھا۔ "یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وقوعہ کی شام میرے مؤکل کی مقتولہ کے ساتھ بنگلے کے ڈرائنگ روم ہی میں ملاقات ہوئی تھی اور اس ملاقات کا گواہ مقتولہ کا خانساماں برکت علی ہے۔ برکت نے اپنی مالکن کے حکم پر میرے مؤکل کو ڈرائنگ روم ہی میں چائے سرو کی تھی اور ان دونوں کے بیچ ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہوئی تھی۔"

"ہم نے ڈرائنگ روم کو چیک نہیں کیا تھا۔" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"تو یہ ہے آپ کی وہ کارکردگی جس پر آپ کو پکا یقین ہے کہ میرے مؤکل ہی نے حفیظ اللہ کی منکوحہ سزندرت کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" میں نے سلگانے والے طنزیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مقتولہ کی موت کا وقت آٹھ اور نو بجے کے درمیان بتایا گیا ہے لیکن میرا مؤکل تو اس روز آٹھ بجے سے چند منٹ پہلے ہی مقتولہ کے بنگلے سے روانہ ہو گیا تھا پھر وہ مقتولہ کی موت کا ذمے دار کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے؟"

"ملزم اپنی روانگی کے وقت کے حوالے سے غلط بیانی بھی تو کر سکتا ہے۔" آئی او نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بنگلے کا چوکیدار اس بات کا گواہ ہے کہ میرے مؤکل نے ڈرائنگ روم میں مقتولہ سے ملاقات کی تھی کیونکہ مقتولہ کے کہنے پر چوکیدار نے ملزم کو ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا تھا پھر اس ملاقات کے اختتام پر ملزم نے لگ بھگ آٹھ بجے یعنی آٹھ بجے سے چند منٹ پہلے ہی بنگلے کو چھوڑا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور خانساماں اس امر کی گواہی دے سکتا ہے کہ جب ملزم بنگلے سے نکلا تو اس وقت مقتولہ زندہ سلامت تھیں۔"

آئی او نے خشک لہجے میں کہا۔ "جب اللہ بخش اور برکت علی عدالت میں گواہی دینے آئیں گے تو اس بارے میں ان سے پوچھ لیا جائے گا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

"آل رائٹ۔" میں نے تعاون آمیز انداز میں کہا۔ "جب متعلقہ گواہان اپنی باری کے انتظار میں عدالت سے باہر موجود ہوں تو پھر انہیں بولنے کا موقع ضرور دینا چاہیے۔"

یہ بات میں نے اتنے وثوق کے ساتھ اس لیے کہی تھی کہ میری اطلاعات کے مطابق، آج حفیظ اللہ کے گھریلو ملازمین کرم داد، اللہ بخش اور برکت علی نے استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہونا تھا اور یہ تینوں افراد باہر عدالت کے برآمدے میں بلاوے کے منتظر تھے۔

سب سے پہلے چوکیدار اللہ بخش کو گواہوں والے کٹہرے میں لایا گیا۔ اللہ بخش کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وکیل استغاثہ نے اپنے حصے کا کام نمٹا دیا تو میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

"اللہ بخش!" میں نے نہایت ہی نرمی سے جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں وقوعہ کی شام تو اچھی طرح یاد ہو گی؟"

وکیل استغاثہ نے اپنے گواہ سے جتنے بھی سوالات کیے تھے ان کے صرف دو بنیادی مقاصد تھے۔ اول، ملزم کو غصہ ور اور جھگڑالو ثابت کرنا۔ دوم، ملزم اور ناجیہ کا بے تکلفانہ میل جول۔ دوسرے گواہوں پر جرح کرتے ہوئے بھی وکیل مخالف کا زاویہ نظر یہی رہا تھا لہٰذا میں ان تینوں گواہوں پر، وکیل سرکار کی جرح کو نظرانداز کر کے آپ کو صرف اپنی کارکردگی سے آگاہ کروں گا۔ اس کیس میں عارف کو اسی پوائنٹ پر پھنسایا گیا تھا کہ وہ حفیظ اللہ کی اکلوتی اولاد، امریکا پلٹ ناجیہ کو گھیرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا جس کے نتیجے کے طور پر اس کی نوکری چلی گئی تھی۔ بعدازاں جب مقتولہ اس کی بلیک میلنگ میں نہ آئی تو اس نے طیش کے عالم میں مقتولہ کا خون کر دیا تھا۔ یہ استغاثہ کا مؤقف تھا جبکہ میں نے کچھ اور ہی پلان کر رکھا تھا۔

"جی یاد ہے۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں بھلا اس شام کو کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"تمہیں بھولنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر تم بھول گئے تو پھر میرے سوالات کے جواب کون دے گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "ملزم اس شام کتنے بجے بنگلے پر پہنچا تھا؟"

"میں نے گھڑی میں وقت تو نہیں دیکھا لیکن وہ کرم داد کے جانے کے بعد آیا تھا۔"

"کتنا بعد؟"

"یہ کوئی پچیس یا تیس منٹ۔"

"کرم داد کتنے بجے گیا تھا اور کہاں گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کرم داد کو صاحب نے شوروم میں بلایا تھا۔" اس نے بتایا۔ "میں مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ کرم داد نے بتایا، وہ صاحب کے پاس جا رہا ہے۔"

"سترہ اکتوبر کو مغرب کی اذان چھ بج کر پانچ منٹ

www.aitmayeem.com

پر ہوئی تھی اور مغرب کی نماز اذان کے فوراً ہی بعد ادا کر لی جاتی ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ کرم داد لگ بھگ چھ بج کر بیس منٹ پر بنگلے سے روانہ ہوا ہوگا اور ملزم، کرم داد کے جانے کے آدھے گھنٹے کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ یعنی کم و بیش چھ بج کر پچاس منٹ پر..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا اللہ بخش؟''

''نہیں جناب..... آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تقریباً اسی ٹائم پر ملزم وہاں پہنچا تھا۔''

''اللہ بخش! ملزم کی آمد کی اطلاع تم ہی نے مقتولہ تک پہنچائی تھی اور مقتولہ نے ملزم کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے لیے کہا تھا۔'' میں نے اللہ بخش کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''تم سے میرا اگلا سوال یہ ہے کہ اس وقت بنگلے پر کتنے افراد موجود تھے؟''

''میڈم ندرت، ملزم، برکت علی اور میں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ناجیہ بی بی کسی سے ملنے گئی تھیں۔ انہیں ملزم ہی چھوڑ کر آیا تھا۔ گھریلو ملازمہ صابرہ کا بیٹا بیمار تھا اس لیے وہ دن ہی میں چھٹی کر گئی تھی اور کرم داد کو صاحب نے شوروم پر بلا لیا تھا۔''

''اللہ بخش! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''وقوعہ کی شام ملزم کتنے بجے بنگلے سے روانہ ہوا تھا؟''

''وقت کا مجھے اندازہ نہیں وکیل صاحب۔'' وہ بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں اتنا یاد ہے کہ جب ملزم واپس گیا تو چند منٹ کے بعد ہی عشاء کی اذان ہونے لگی تھی۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم پونے آٹھ سے آٹھ بجے کے درمیان کسی وقت بنگلے سے رخصت ہو گیا تھا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا ملزم کے جانے کے بعد تمہاری میڈم مقتولہ ندرت زندہ سلامت تھیں؟''

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میں نے اندر جا کر دیکھا نہیں تھا۔''

''تمہیں کب پتا چلا کہ تمہاری میڈم کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟'' میں نے جرح کو اختتام کی جانب لاتے ہوئے سوال کیا۔

''نو بج کر بیس منٹ پر۔'' گواہ نے بتایا۔ ''اور یہ اطلاع مجھے برکت علی نے دی تھی۔''

میں نے ایک کاغذ پر جلی اعداد میں لکھے گئے ایک فون نمبر کو گواہ کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''اللہ بخش! کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ یہ کس کا فون نمبر ہے؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

وہی کاغذ میں نے وکیل استغاثہ کی نگاہ کے سامنے لاتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ ''آپ اس فون نمبر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''نہیں!''

''جناب عالی!'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

اگلا گواہ مقتولہ کا خانساماں برکت علی تھا۔ وہ سانولی رنگت اور درمیانے قد کا مالک ایک دبلا پتلا شخص تھا لیکن اس نے سر کے بال کافی بڑھا رکھے تھے۔ برکت علی کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے بالوں سے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ بال گھنگرالے ہونے کے باعث ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے اپنے سر کے اوپر چڑیا کا گھونسلا اٹھا رکھا ہو۔ وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ اپنی شرٹ کو اس نے پینٹ سے باہر نکال رکھا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کے ابتدائی چند اوورز ملزم کی مخالفت میں کرائے اور اسے ایک چال باز، عیار قاتل ثابت کرنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ اس کے بعد وہ میرے مؤکل کی جانب سوالات کی ایسی بالز پھینکنے لگا جن پر بننے والے رنز میرے اسکور میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر رہے تھے۔ گویا میرے حصے کا زیادہ تر کام بھی اسی نے نمٹا دیا تھا جیسا کہ.....!

''برکت علی! مقتولہ کی لاش کو دریافت کرنے کا سہرا تمہارے سر بندھتا ہے۔'' وکیل استغاثہ نے گواہ سے پوچھا۔ ''تم مقتولہ کے بیڈروم میں کیا کرنے گئے تھے؟''

''اصل بات یہ ہے کہ اس روز مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی اور میڈم نے کہا تھا کہ چھٹی کے وقت وہ مجھے پیسے دے دیں گی۔'' گواہ نے بتایا۔ ''میں نو بجے رات چھٹی کر کے اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔ میں نے وقت پر اپنا کام ختم کر لیا تھا اور میڈم کی مہربانی کا انتظار کر رہا تھا لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا، وہ پیسوں والی بات کو بھول گئی ہیں۔ میں نے سوا نو بجے تک ان کا انتظار کیا۔ پھر میڈم کی یاد دہانی کی خاطر ان کے بیڈروم کے قریب پہنچ گیا۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور لائٹس بھی آن تھیں لیکن اندر مجھے میڈم کہیں دکھائی نہیں دیں۔ اس صورت حال نے مجھے پریشان کر دیا۔ مجھے پیسوں کی اشد

www.aitbayjeem.com

ضرورت تھی اور میں خالی ہاتھ گھر نہیں جانا چاہتا تھا لہٰذا میں نے دھیمی آواز میں میڈم کو پکارا مگر ان کا جواب مجھ تک نہ پہنچا۔ تب میں اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا۔"

"تم نے بیڈ روم کے اندر کیا دیکھا؟" وکیل استغاثہ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"بیڈ روم تو خالی تھا مگر واش روم کے اندر مجھے میڈم کی لاش پڑی نظر آئی۔" گواہ نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے بتایا۔ "ان کے سر کا سامنے والا حصہ پھٹا ہوا تھا جہاں سے نکلنے والا خون واش روم کے فرش پر پھیلا دکھائی دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ میڈم کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

"کس نے؟" وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

"مجھے کیا پتا جی۔۔۔" وہ سہمی ہوئی نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تو کچن میں اپنا کام کر رہا تھا۔"

"اور اللہ بخش اس وقت کہاں تھا؟"

"گیٹ سے متصل اپنے چھوٹے کمرے میں۔"

"گویا اللہ بخش کا بھی اس واردات میں ہاتھ نہیں ہے؟"

"جی۔۔۔ اللہ بخش برسوں کا آزمایا ہوا ایک وفادار چوکیدار ہے۔" گواہ نے جواب دیا۔ "ہم دونوں کو حفیظ صاحب کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔"

"کوئی تیسرا تو یہ گھٹیا حرکت کر سکتا ہے....." وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا پھر اپنے الفاظ گواہ کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اس شام ملزم بھی تو مقتولہ سے ملنے بنگلے پر آیا تھا اور تم نے ملزم کو چائے بھی سرو کی تھی؟"

"جی، جی....." وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "میں نے میڈم کے حکم پر ملزم کو چائے اور بسکٹ پیش کیے تھے۔"

"ملزم کتنے بجے بنگلے سے واپس گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" برکت علی نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں ملزم کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر کچن کی طرف چلا گیا تھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ پھر جب میں برتن اٹھانے ڈرائنگ روم میں آیا تو ملزم جا چکا تھا۔"

"تم نے ڈرائنگ روم سے چائے والے برتن کتنے بجے اٹھائے تھے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"تقریباً پونے نو بجے۔" گواہ نے بتایا۔ "میں نو بجے چھٹی کر کے اپنے گھر جانا چاہتا تھا اور جانے سے پہلے تمام برتنوں کو دھو کر رکھنا ضروری تھا اسی لیے میں نے ڈرائنگ روم میں سے چائے والے برتن اٹھا کر بھی دھو ڈالے تھے مگر میڈم سے میری ملاقات ہو سکی اور نہ ہی مجھے پیسے ملے۔"

برکت علی کی مایوسی میں ڈوبی ہوئی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے وکیل استغاثہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ملزم ساڑھے آٹھ بجے کے بعد پونے نو بجے سے پہلے بنگلے سے رخصت ہوا تھا!"

وکیل سرکار کے اس اظہار خیال پر گواہ نے تصدیقی ردعمل ظاہر کیا اور نہ ہی تردید کرنا ضروری جانا۔ وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

"مقتولہ کی لاش کو دیکھنے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟"

"وہ خونچکاں منظر دیکھ کر تو میرے ہوش گم ہو گئے تھے وکیل صاحب!" برکت علی نے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔ "چند منٹ تک تو میرے دماغ نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر جب میں حواس میں آیا تو میں نے جا کر اللہ بخش کو اس سانحے کے بارے میں بتایا۔ میری بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ ہم دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ صاحب کو فون کر کے اس دردناک واقعے کی اطلاع دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے کہ ہم شوروم فون کرتے، حفیظ اللہ صاحب بنگلے پر پہنچ گئے تھے۔"

وکیل استغاثہ نے اس کے ساتھ ہی گواہ پر اپنی جرح مکمل کر لی۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں نزدیک چلا گیا اور اس کیس کی سب سے مختصر یک استفساری جرح کا ریکارڈ قائم کر ڈالا۔ میں نے ٹیلی فون نمبر والے کاغذ کو برکت علی کے سامنے کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا تم اس نمبر کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

اس نے بڑے غور سے نمبر کو دیکھا پھر اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "نہیں۔"

میں نے نگاہ اٹھا کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور... بہ زبان خاموشی محض اپنی آنکھوں کی ورٹیکل موومنٹ کی مدد سے پوچھا۔ "اور آپ.....؟"

وکیل استغاثہ نے نہایت ہی صبر سے کام لیتے ہوئے، میری آنکھوں کی عمودی استفساریہ حرکت کے جواب میں اپنی گردن کو افقی جنبش دے کر اپنا انکار مجھ تک پہنچا دیا۔

برکت علی کے بعد ڈرائیور کرم داد کو گواہی کے لیے وٹنس باکس میں لایا گیا۔ وہ سچ بولنے کا حلف اٹھا چکا تو وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

www.aiftayjeem.com

"کرم داد! وقوعہ کی شام تم کہاں تھے؟"

"مجھے صاحب نے شوروم بلا لیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"پھر جب میری واپسی ہوئی تو مجھے اس افسوس ناک واقعے کے بارے میں پتا چلا۔"

"تم وقوعہ کے روز کتنے بجے واپس آئے تھے؟"

"ساڑھے دس بجے۔"

"حفیظ اللہ نے تمہیں اپنے آفس کس لیے بلایا تھا؟"

"انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ڈرائیور یعنی ملزم عارف کو نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔" کرم داد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لہٰذا ناجیہ کے ساتھ مجھے ڈیوٹی کرنا ہوگی۔"

"کیا حفیظ اللہ نے تمہیں بتایا کہ انہوں نے ملزم کی چھٹی کیوں کی تھی؟" وکیل استغاثہ نے دریافت کیا۔

"اس کی حرکتوں کی وجہ سے۔" وہ ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"کون سی حرکتیں؟" وکیل استغاثہ نے خاصی تیز آواز میں استفسار کیا۔

"یہ بندہ ہر وقت ناجیہ بی بی سے فری ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔" وہ ملزم کی جانب دیکھتے ہوئے ناگواری سے بولا۔ "میں نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر میری بات اس کے بھیجے میں نہیں اتری اور یہ اپنی روش پر قائم رہا۔ حفیظ اللہ صاحب آخر کب تک برداشت کرتے۔ جب یہ سدھرنے کو تیار نہیں ہوا تو انہوں نے اس کی چھٹی کر دی۔"

"کرم داد! تم نے بتایا ہے کہ ملزم حفیظ اللہ کی اکلوتی صاحب زادی ناجیہ کے ساتھ فری ہونے کے چکر میں رہتا تھا۔" وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "کیا تم ملزم کی کوئی ایک آدھ نازیبا حرکت کو معزز عدالت کے سامنے بیان کر سکتے ہو؟"

"جب حفیظ اللہ صاحب کو ملزم کے کرتوتوں کی خبر ہوئی تو انہوں نے مجھے اس پر نگاہ رکھنے کو کہا تھا۔" کرم داد نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "یہ جب بھی ناجیہ بی بی کو لے کر بنگلے سے نکلتا تو میں اکثر ان کے تعاقب میں روانہ ہو جاتا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ملزم نے کئی بار ناجیہ بی بی کے ساتھ کھانا کھایا، چائے کافی پی اور بعض اوقات یہ لوگ آئس کریم کھانے بھی گئے۔ میں نے جو دیکھا، اس کی رپورٹ حفیظ اللہ صاحب کو پیش کر دی تھی۔"

وکیل استغاثہ نے گواہ پر جرح موقوف کر دی اور روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بہ آوازِ بلند بولا۔ "یور آنر! کوئی بھی عزت دار شخص یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ گھریلو ملازمین اس نوعیت کی بے ہنگی کا مظاہرہ کریں۔ ملازم اور مالک کے درمیان ایک حد فاصل بہرحال ہونی ہے اور مالک کی بھی ملازم کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس حد کو پھلانگنے کی کوشش کرے اور۔۔۔ عمر کی نیچ کا معاملہ تو کچھ زیادہ ہی حساس اور سنگین ہوتا ہے۔ لہٰذا حفیظ اللہ صاحب نے جو بھی کیا، بہت اچھا کیا۔ یہ کام انہیں بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال۔۔۔" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھوڑی سی توقف کے بعد اپنی بات مکمل کر گئی۔

"دیا ایہ عدت آیا۔"

اپنی باری پر میں نے استغاثہ کے گواہ کرم داد کو آڑے ہاتھوں لیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سخت لہجے میں پوچھا۔ "کرم داد! تم امریکا میں کتنا عرصہ گزار چکے ہو؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ اچانک بول پڑا۔ "وکیل صفائی استغاثہ کے گواہ کو ہراساں کرنے کے لیے اس قسم کے غیر متعلق سوالات کر رہے ہیں۔ مجھے وکیل صاحب کی اس حرکت پر سخت اعتراض ہے۔"

"یہ میرا پہلا سوال تھا لہٰذا اس کے لیے سوالات کا ٹائٹل استعمال کرنا درست نہیں ہے جناب عالی!" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اور جہاں تک میرے سوال کے، اس کیس سے متعلق ہونے کا معاملہ ہے تو میں معزز عدالت کے سامنے اس کی وضاحت کرنے کا پابند ہوں۔ اگر میرے فاضل دوست نے اس کا موقع دیا تو۔۔۔"

میرے آخری جملے میں چھپے ہوئے زہریلے طنز کو وکیل استغاثہ نے بڑے واضح انداز میں محسوس کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میرا موڈ تبدیل ہو چکا ہے۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔"

میں نے استغاثہ کے گواہ کرم داد کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو اس نے جواب دیا۔

"میں تو آج تک پاکستان سے باہر کہیں نہیں گیا۔ امریکا جانا اور وہاں پر رہنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم امریکا کے ماحول، وہاں کے کلچر اور رنگ ڈھنگ سے بالکل واقف نہیں ہو؟"

"جی۔۔۔ میں نے بس، اس بارے میں تھوڑا بہت سنا ہی ہے۔"

"لیکن ناجیہ بی بی کا علم اور تجربہ سنی سنائی تک محدود نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کئی سال امریکا کی آزاد فضا

www.aitrayeem.com

میں گزار کر آئی ہیں۔ ناجیہ صاحبہ اگر ملزم کے ساتھ بے تکلفی سے بات کر لیتی تھیں اور وہ دونوں کبھی ایک ساتھ ڈنر کر لیتے تھے یا کہیں آئس کریم کھانے بیٹھ جاتے تھے تو اس میں ایسی بے شرمی اور بے حیائی والی کون سی بات تھی۔ تم نے خوامخواہ اپنے مالک کے کان بھر کر میرے مؤکل کی نوکری تیل کیوں کرائی؟''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب ملزم کے اپنے کرتوتوں کا پھل ہے۔'' وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس احمق کو ناجیہ بی بی کے ساتھ تعلقات کو اتنا زیادہ نہیں بڑھانا چاہیے تھا۔ یہ اپنے کام سے کام رکھتا۔ ناجیہ بی بی اس کے لیے نامحرم تھیں۔''

''محرم اور نامحرم کا ذکر کر دینا بہت آسان ہے کرم داد مگر اس کے اندر بڑی باریکیاں پائی جاتی ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لہٰذا بے شرمی اور بے حیائی کے فتوے صادر کرنے سے پہلے بہت زیادہ غور و فکر کر لینا چاہیے۔ اپنی نفرت، کدورت اور ناپسندیدگی کو ''نامحرم'' کے ٹائٹل کے پیچھے چھپانا ایک قابلِ مذمت فعل ہے اور تم نے ایسا ہی کیا ہے۔''

''م..... میں نے..... کیا..... کیا ہے.....؟'' وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کرخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ تم ملزم سے حسد کرتے تھے؟''

''میں بھلا..... ایسا کیوں کروں گا.....؟'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''اس لیے کرو گے کہ اس کی آمد کے بعد تمہاری مقبولیت میں کمی آ گئی تھی۔ خاص طور پر ناجیہ تو تم سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں ڈر محسوس ہوا کہ اگر اسی طرح چلتا رہا تو سب ملزم کے گرویدہ ہو جائیں گے اور تمہاری اہمیت زیرو ہو کر رہ جائے گی چنانچہ تم نے ایک خاص سازش کے تحت اپنے مالک کو ملزم کے خلاف بھڑکایا تاکہ اسے نوکری سے نکال دیا جائے۔ بالآخر تم اپنی اس ناپاک کوشش میں کامیاب ہو گئے..... ہیں نا؟''

''ملزم کی نوکری..... ختم ہونے میں..... میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''آپ خوامخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

''اِدھر میری طرف دیکھو.....!'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

وہ میری جانب تکنے لگا۔ میں نے ٹیلی فون نمبر والا پیپر اس کی آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یہ فون نمبر کس کا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے شرارت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کی سمت دیکھا اور بڑی معصومیت سے پوچھا۔ ''اور آپ.....؟''

''یہ کیسا مذاق ہے؟'' وہ چراغ پا ہوتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔

میں وکیلِ مخالف کو تپانے کے لیے ہی ایسی حرکت کر رہا تھا لہٰذا میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں سنجیدہ ہوں میرے فاضل دوست!''

''بھاڑ میں گئی ایسی سنجیدگی۔'' وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ نے اس فون نمبر کے حوالے سے عجیب ڈراما لگا رکھا ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے احتجاجی انداز میں بولا۔

''آئی آبجیکٹ یور آنر!''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''کیا اس فون نمبر کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟''

''بہت گہرا تعلق جنابِ عالی۔'' میں نے باادب جواب دیا۔

''مگر میرا اس فون نمبر سے کیا لینا دینا۔'' وکیل استغاثہ نے کھا جانے والی نظر سے دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ نے میرا ٹرائل کیوں شروع کر رکھا ہے۔ آپ ایک ہی سوال بار بار مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یہ فون نمبر زیرِ سماعت کیس میں صدر جہ اہمیت کا حامل ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور آپ بھی چونکہ اس کیس سے متعلق ہیں، یعنی اس کیس کا حصہ ہیں اس لیے دیگر کرداروں کی طرح میں نے آپ سے بھی یہ سوال کر دیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں۔'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''پھر کتنی سی بات ہے؟''

''میں نے جب ایک بار انکار میں جواب دے دیا تو پھر دوبارہ پوچھنے کی کیا تک بنتی ہے۔'' وہ ڈھیلے انداز میں بولا۔ ''آپ مجھے چڑانے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔''

''باخدا نہیں۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

''بیگ صاحب! اگر وکیل صاحب کے انکاری جواب سے آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو آئندہ آپ اس سوال کو ان سے دور

www.aidayeen.com

رکھیں۔" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور معزز عدالت اس فون نمبر کے اسرار تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہتی ہے..... دیٹس آل۔"

"دیٹس آل" کے الفاظ جج نے اس لیے استعمال کیے تھے کہ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا تھا۔

"جو حکم جناب عالی۔" میں نے سر کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"آئندہ پیشی پر معزز عدالت کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔"

جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از ایڈ جارنڈ.....!"

☆.....☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹنس باکس میں گھنگرالے بالوں والی ایک الٹرا ماڈرن دل کش ... حسینہ کھڑی تھی۔ وہ حفیظ اللہ کی اکلوتی صاحب زادی ناجیہ تھی۔ ناجیہ کی عمر تیس کے اریب قریب تھی۔ وہ بھرے بھرے بدن کی مالک ایک جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسا جادو تھا کہ وہ اگر لاکھوں کے مجمع میں بھی کھڑی ہو تو دیکھنے والی نگاہ اسی کے سراپا پر جا کر ٹھہرتی تھی۔ عدالتی کارروائی کے آغاز سے پہلے میں نے پیش کار سے مل کر یہ معلوم کر لیا تھا کہ آج استغاثہ کے آخری دو گواہ یعنی ناجیہ اور حفیظ اللہ گواہی کے لیے عدالت میں حاضر ہوئے تھے۔

ایک وقت میں وٹنس باکس میں ایک ہی گواہ کو لایا جاتا ہے تاکہ ایک گواہ کے بیان اور اس پر ہونے والی جرح سے دوسرے گواہ کی گواہی متاثر نہ ہو۔ حفیظ اللہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر کوریڈور میں اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

ناجیہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔ لگ بھگ دس منٹ تک گواہ اور وکیل کے مابین سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ میں خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا کیونکہ جرح کے اس حصے میں میری دلچسپی کا سامان موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں اسکول اور کالج کے لیول کا سیشن کر رہے تھے جب کہ میں نے پی ایچ ڈی کا پلان بنا رکھا تھا۔

وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں اپنے حصے کی جرح کے لیے گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔ پھر استغاثہ کی گواہ ناجیہ حفیظ کی طرف دیکھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"ہاؤ آر یو؟"

"آئم فٹ این فائن۔" اس نے جواب دیا۔

"ناجیہ صاحبہ! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ آپ کی والدہ کے قتل نے ہمیں اس عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر اور کوئی موقع ہوتا تو میں سب سے پہلے آپ کو تعلیم مکمل کرنے پر مبارک باد دیتا۔ اس کے بعد کوئی دوسری بات کرتا۔"

میں نے ناجیہ کے سامنے مقتولہ کے لیے والدہ کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہ ذکر حفیظ اللہ کے رشتے کی مناسبت سے تھا ورنہ میں اور دیگر افراد اچھی طرح جانتے تھے کہ مقتولہ ناجیہ کی سوتیلی ماں تھی۔ ناجیہ نے میری بات کا نہایت ہی مختصر جواب دیا۔

"تو ایشو..... اٹس او کے۔"

"ناجیہ صاحبہ! امریکا میں قیام کے دوران میں کامرس کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ہی آپ نے ٹائم کی اہمیت، افادیت اور استعمال کا بہ خوبی علم حاصل کر لیا ہو گا۔" میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا میں آپ کا وقت برباد نہیں کروں گا اور آپ کو صرف ایک سوال کے بعد فارغ کر دوں گا۔"

"تھینکس۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔

"میرے اس اکلوتے سوال کا جواب آپ نے بہت سوچ سمجھ کر ٹو دی پوائنٹ دینا ہے۔" میں نے اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے تصدیق طلب انداز میں گواہ کی طرف دیکھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "شیور!"

"ٹھیک ہو گیا۔" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ "ناجیہ صاحبہ! اس مقدمے کی عمارت کا سینٹر پلر آپ کی ذات ہے گویا، زیر سماعت کیس بہ یک وقت آپ کی ذات پر کھڑے ہو کر، آپ کی ذات ہی کے گرد گھومتا ہے۔ جیسا کہ حفیظ اللہ صاحب کو آپ کے ساتھ ملزم کی بے تکلفی پسند نہیں آئی۔ انہوں نے آپ کو محفوظ رکھنے کی غرض سے ملزم کو نوکری سے نکال دیا۔ ملزم اپنی ملازمت کی بحالی کے لیے آپ کی سوتیلی ماں یعنی مقتولہ ندرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر استغاثہ کے مطابق اس نے شنوائی نہ ہونے پر طیش میں آ کر آپ کی سوتیلی والدہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آپ سے میرا سیدھا اور سادہ سا سوال یہ ہے کہ....." میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری نظر سے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں جھانکا اور سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا واقعتاً آپ کے اور ملزم کے بیچ اس نوعیت کی کوئی

www.urdtaylam.com

انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوگئی تھی جو حفیظ اللہ کے شک کی تصدیق کرتی تھی؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں شاکر انکل کے بیٹے کامران کو پسند نہیں کرتی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں نکالنا چاہیے کہ میں ملزم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔"

"لیکن آپ کے والد صاحب اور آپ کی متوقع سسرال والوں نے یہی مطلب نکالا تھا۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور اسی وجہ سے یہ سارا بکھیڑا پھیلا ہے۔ ہیں نا؟"

"آئی ڈونٹ کیئر۔" وہ مخصوص امریکی انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "میں نے جو کیا وہ میرے نزدیک میرا نارمل بی ہیویئر تھا اور میں اس پر کوئی گلٹی فیل نہیں کرتی ہوں۔"

"آپ کو کامیابی کی فیل تو یقیناً آرہی ہوگی؟" میں نے معنی خیز انداز میں استفسار کیا۔

اس نے اس طرح چونک کر میری جانب دیکھا جیسے اچانک میرے سر پر دو سینگ نکل آئے ہوں۔ پھر وہ آنکھیں سکیڑ کر ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"سوری..... آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ۔"

"ناجیہ صاحبہ! میں نے آپ کی خدمتِ عالیہ میں یہ عرض کیا ہے کہ....." میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اپنے کیے پر کوئی پشیمانی اس لیے نہیں کہ اس سارے عمل کے درمیان آپ کی کامیابی چھپی ہوئی تھی۔ ملزم پر مائل... بہ کرم ہونے کا تاثر دے کر کامران کو مسترد کرنے کا اعلان اور..... اس مقصد میں آپ کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ ملزم کی نوکری گئی، آپ کی سوتیلی ماں کی جان گئی اور میرا موکل جیل کے ایک کیس میں پھنس گیا مگر آپ کی بلا سے۔ آپ کامران کو بونگا سمجھتی تھیں، کسی بھی قیمت پر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں اور میری تازہ ترین معلومات کے مطابق، شاکر علی نے حفیظ اللہ صاحب کو اس رشتے سے صاف انکار کردیا ہے۔ میری جانب سے آپ کو اس نقید المثال جیت پر دل کی گہرائی سے مبارک ہو۔"

وہ چند لمحات تک چپ چاپ کھڑی، شش و پنج کی حالت میں اپنے حسین ہونٹوں کا ستیاناس کرتی رہی پھر بڑی بے پروائی سے بولی۔

"وکیل صاحب! آپ اپنے انداز میں سوچنے اور اس سوچ سے اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرنے کے لیے آزاد و خود مختار ہیں۔ میں آپ کی تھیوری پر کسی قسم کے کمنٹس نہیں کروں گی۔"

"ایز یو وش!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔ پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے... بآواز بلند اضافہ کیا۔ "جناب عالی! مجھے استغاثہ کی گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"

جس لمحاتی وقفے میں ناجیہ وٹنس باکس سے نکل کر کمرائے عدالت سے باہر گئی اور حفیظ اللہ گواہی دینے کے لیے اندر داخل ہوا، وکیل استغاثہ نے حیرت بھرے انداز میں نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

"آج میرے فاضل دوست نے ٹیلی فون نمبر والا بینر نہیں اٹھا رکھا حالانکہ... گزشتہ پیشی پر انہوں نے معزز عدالت کو یقین دلایا تھا کہ آئندہ پیشی پر یہ صد اسرار میں چھپے ہوئے اس ٹیلی فونک معاملے کو بے نقاب کردیں گے۔"

"میں نے معزز عدالت کو جو یقین دہانی کرائی تھی اس پر قائم و دائم ہوں۔" میں نے وکیل استغاثہ کے طنزیہ وار کو معقولیت کی ڈھال پر روکنے کے بعد ایک کاری حملہ کردیا۔

"لیکن میرے فاضل دوست اس حوالے سے بڑے تاؤ لے ہو رہے ہیں اور اسی جلد بازی نما بے صبری میں انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ آج کی عدالتی کارروائی بھی جاری ہے۔"

میری اس کاری چوٹ پر وہ بہ زبانِ خاموشی بلبلا کر رہ گیا۔ میرے لیے اس کے دل میں جو مخاصمت اور کدورت بھری ہوئی تھی وہ اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھلکنے لگی پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرتا، حفیظ اللہ کمرائے عدالت میں داخل ہوا اور وٹنس باکس کی جانب بڑھنے لگا۔ وکیل استغاثہ معاندانہ انداز میں مجھے تکتے ہوئے اپنے وجود کے اندر کھول کر رہ گیا۔

حفیظ اللہ کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ اس نے خاصی گھنی اور صحت مند مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جو اس کی شخصیت کو رعب دار اور متاثر کن بنانے کا سبب تھیں۔ وہ ایک دبنگ شخص تھا۔ اس کی طاقت، اختیار اور پہنچ کے بارے میں پچھلے صفحات میں تفصیلاً بتایا جاچکا ہے۔ حفیظ اللہ حلف برداری سے فارغ ہوا تو وکیل استغاثہ نے اس سے سوال و جواب شروع کردیے۔

میں خاموشی سے یہ تماشا دیکھتا رہا کیونکہ میں نے آج کے لیے جو پلان کر رکھا تھا وہاں تک وکیل استغاثہ کی سوچ رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ میں اپنی منصوبہ بندی اور تیاری سے پوری طرح مطمئن تھا۔

وکیل استغاثہ نے دس منٹ کے اندر حفیظ اللہ کو فارغ کردیا۔ اس جرح کے دوران میں کمرائے عدالت کو دھوبی

www.alhrayeem.com

گھاٹ بنا کر وکیلِ موصوف نے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عارف کے تمام میلے۔ کپڑے دھو ڈالے تھے۔

میں اپنی باری پر جج سے اجازت لے کر وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا پھر حفیظ اللہ کے چہرے پر نگاہ جما کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''حفیظ صاحب! مجھے آپ کی اہلیہ کی موت کا سخت افسوس ہے۔''

''ایسا لگ تو نہیں رہا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں حفیظ صاحب؟'' میں نے الجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے جو کہا ہے اسے سمجھنے کے لیے راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں وکیل صاحب.....'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ کس قسم کی تعزیت ہے کہ آپ جس عورت کی موت پر مجھ سے اظہارِ افسوس کر رہے ہیں اسی کے قاتل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے آپ نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو داؤ پر لگا رکھا ہے۔ کہیں آپ میرے کسی دشمن کے کوئی ایجنٹ تو نہیں ہیں؟''

مقتولہ کے شوہر نے مجھے آڑے ہاتھوں لے کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ خاصے جارحانہ موڈ میں تھا۔ میں بھی وہاں ''چھپن چھپائی'' کھیلنے نہیں آیا تھا تاہم میں نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے اسے قانون کی مار مارنے کا سلسلہ آغاز کر دیا۔

''حفیظ صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تعزیت تو بے چاری تعزیت ہی ہوتی ہے۔ اس کی اقسام گنوانے کا میرے پاس وقت ہے اور نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ اگر آپ کو میرا اظہارِ افسوس پسند نہیں آیا تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ باقی جہاں تک ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کا معاملہ ہے تو آپ ذہن نشین کر لیں کہ میں اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو آزماتے ہوئے اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ میرا مؤکل بے قصور ہے۔ آپ کی اہلیہ کی موت میں اس کا ہاتھ نہیں ہے اور رہی بات میرے ایجنٹ ہونے کی تو.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے بڑی گہری نظر سے گواہ کو گھورا پھر واشگاف الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں عدل و انصاف کا ایجنٹ ہوں اور ان دو چیزوں کے حصول کی خاطر میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو داؤ پر لگانے میں کوئی ندامت محسوس نہیں کرتا بلکہ یہ میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ اگر آپ کے دشمنوں میں عدل یا انصاف نام کا کوئی شخص پایا جاتا ہے تو..... بس! میں آپ کے اسی دشمن کا ایجنٹ ہوں۔''

حفیظ اللہ کو امید نہیں تھی کہ میں اس کے عمل پر ایسا شدید ردِعمل ظاہر کروں گا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ میری اس تلخ وضاحت کے جواب میں وہ کیا کہے۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

''حفیظ صاحب! وقوعہ کے روز آپ کتنے بجے اپنے آفس پہنچے تھے؟''

''ساڑھے بارہ بجے دوپہر۔''

''اگر میں غلطی پر نہیں تو یہ آپ کا معمول ہے کہ آپ بارہ اور ایک بجے کے دوران میں اپنے شوروم والے آفس واقع خالد بن ولید روڈ پہنچ جاتے ہیں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا یہ بھی درست ہے کہ آپ رات دس سے ساڑھے دس بجے کے درمیان آفس سے واپس اپنی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں؟''

''بالکل درست۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ''لگتا ہے، آپ نے میرے معمولات پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی ہے۔''

''رکھنا پڑتی ہے حفیظ صاحب، کیونکہ میرا پیشہ اس کا متقاضی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ وقوعہ کی رات آپ ساڑھے نو بجے اپنے بنگلے پر پہنچ گئے تھے؟''

''یہ ایک حقیقت ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اس سے انکار ممکن نہیں۔''

''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ کی رات آپ معمول سے پہلے گھر کیوں آ گئے تھے جب کہ عموماً آپ ساڑھے دس کے بعد ہی گھر پہنچتے ہیں؟''

''اس کا بنیادی سبب میرے سر میں ہونے والا درد تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے اس روز میں جلدی آفس سے اٹھ گیا تھا۔''

''کسی بھی جسمانی تکلیف کی وجہ سے معمولاتِ زندگی میں ردوبدل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں اس پر پیچ کا اسپرے کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اپنے سر میں درد کا احساس آپ کو کتنے بجے ہوا تھا حفیظ صاحب۔''

www.aldhayeem.com

"لگ بھگ نو بجے اچانک مجھے سر میں درد محسوس ہوا۔" اس نے بتایا۔ "میں چند منٹ تک اس درد کو برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ تکلیف کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجبوراً نو بج کر دس منٹ پر میں نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا اور آفس سے نکل آیا۔"

"اس اچانک اٹھنے والے درد سر سے پہلے آپ اپنے آفس میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھے؟" میں نے استفسار کیا۔

میرے اور استغاثہ کے گواہ حفیظ اللہ کے مابین ہونے والے سوال و جواب کی نوعیت نے وکیل استغاثہ کو خاصا بے چین کر دیا تھا کیونکہ اس گفتگو کا زیر سماعت کیس سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ وکیل سرکار یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ میں اس کے گواہ کو غیر محسوس طور پر کس بندگلی کی جانب دھکیل رہا ہوں۔

"جی ـــ میں اس سے پہلے بالکل نارمل تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"حفیظ صاحب! اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔ "وقوعہ کی شام چھ بجے سے رات نو بجے تک آپ اپنے آفس میں موجود تھے؟"

"صد فی صد۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"اور ان تین گھنٹوں کے دوران میں آپ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آفس سے باہر نہیں گئے تھے؟"

"قطعی نہیں۔"

"آپ نے چھ بج کر دس منٹ پر اپنے گھر فون کر کے مقتولہ کو بتایا تھا کہ آپ نے ملزم کو نوکری سے فارغ کر دیا ہے اور اگر وہ اپنی ملازمت کی بحالی کے لیے منت خوشامد کے لیے مقتولہ کے پاس آئے تو وہ اس کی ایک نہ سنے۔" میں نے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی آپ نے مقتولہ سے یہ بھی کہا کہ وہ ڈرائیور کرم داد کو شوروم بھیج دے؟"

"جی بالکل!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سب کچھ ایسے ہی ہوا تھا۔"

میں نے اپنی فائل میں سے ایک فل اسکیپ کاغذ برآمد کیا جس پر بولڈ مارکر کی مدد سے ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ میں نے جلی اعداد والے اس کاغذ کو گواہ کی نظر کے سامنے لاتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"آپ اس فون نمبر کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

مذکورہ ٹیلی فون نمبر پر نگاہ پڑتے ہی حفیظ اللہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ میرے سوال کے جواب میں کچھ کہتا، وکیل استغاثہ نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"آبجیکشن یور آنر ـــ!"

جج نے حیرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟"

"میرے فاضل دوست چیٹنگ کر رہے ہیں یور آنر ـــ" اس نے احتجاجی انداز میں جواب دیا۔

"کیسی چیٹنگ؟" جج کی حیرت دوچند ہو گئی۔

"انہوں نے ٹیلی فون نمبر بدل دیا ہے۔" وکیل استغاثہ نے بتایا۔ "یہ وہ نمبر نہیں ہے جو اس سے پہلے وکیل صاحب مجھ سمیت استغاثہ کے گواہوں، یہ شمول انکوائری آفیسر کو دکھا کر سوال کرتے رہے ہیں۔"

اب کی بار جج نے بھی اس نمبر پر غور کیا پھر اضطراری لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ "بیگ صاحب! یہ نمبر تو واقعی پہلے والے نمبر سے مختلف ہے۔ یہ کیا مسٹری ہے؟"

"اس مسٹری کی ایک ہسٹری ہے جناب عالی!" میں نے کھنکھار کا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس سے پہلے جو فون نمبر ڈسپلے کر کے مختلف افراد سے استفسار کیا وہ ایک ڈمی نمبر تھا جب کہ یہ نمبر خالص گھی کے مانند اصلی ہے۔ میں نے یہ سارا کھیل اس لیے کھیلا کہ وقت سے پہلے اس فون نمبر کا راز افشا نہ ہو جائے۔ اس راز کی وضاحت میں استغاثہ کے گواہ کے جواب کے بعد کروں گا۔"

"تو گویا ـــ اب تک آپ نے ـــ ہم سب کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا رکھا تھا؟" وکیل استغاثہ نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ جانا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "اس فون نمبر کو دیکھ کر آپ کے ذہن میں کیا آ رہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں ـــ" وہ برہمی سے بولا۔ "میں اس فون نمبر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

میرے اور وکیل استغاثہ کے مابین ہونے والی تکرار کی مہلت کا فائدہ اٹھا کر حفیظ اللہ نے خود کو سنبھال لیا تھا ورنہ جب میں نے پہلی مرتبہ اس سے یہ سوال کیا تھا تو اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا۔ اس کے پایۂ استقلال میں ڈائنامائٹ لگانے کی غرض سے میں نے اپنی فائل میں سے مزید دو کاغذات نکال لیے پھر مذکورہ ایک کاغذ اور فون نمبر والے کاغذ کو جج کے سامنے رکھنے کے بعد بہ آواز بلند کہنا شروع کیا۔

www.alhayeem.com

''یور آنر! یہ وقوعہ کی شام مقتولہ کے بنگلے کے ٹیلی فون کے استعمال کی تفصیل ہے جو کہ میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے متعلقہ محکمے سے نکلوائی ہے۔ عدالت اگر ضرورت محسوس کرے تو اس رپورٹ کی تصدیق بھی کرا سکتی ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے معزز عدالت کی خدمت میں جو تفصیل پیش کی ہے وہ سہ پہر چار بجے سے رات دس بجے تک کی رپورٹ ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ان چھ گھنٹوں میں تین کالز کی گئیں اور صرف ایک کال ریسیو کی گئی۔ آؤٹ گوئنگ کالز زیادہ رہا جب کہ ان کمنگ کے ذیل میں صرف ایک کال نظر آتی ہے جو کہ شام چھ بج کر دس منٹ پر حفیظ اللہ نے اپنے شوروم کے آفس سے کی تھی جس کا تھوڑی دیر پہلے وہ اقرار کر چکے ہیں۔ اب ہم نمبروار آؤٹ گوئنگ کالز کا جائزہ لیتے ہیں۔'' میں نے چند سا وقفہ لے کر حاضرین عدالت پر ایک نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''ان تین کالز میں سے پہلا فون سہ پہر چار بج کر پندرہ منٹ پر کلفٹن کے ایک نمبر پر کیا گیا اور کم و بیش دس منٹ تک بات ہوتی رہی۔ میری معلومات کے مطابق یہ کال ناجیہ صاحبہ نے اپنی ایک دوست کو کی تھی۔ مذکورہ تین کالز میں آخری اور تیسرا فون رات نو بج کر پینتالیس منٹ پر متعلقہ تھانے کیا گیا تھا تاکہ بنگلے پر ہونے والی قتل کی واردات کی اطلاع پولیس کو دی جا سکے۔ یہ فون حفیظ اللہ صاحب نے کیا تھا۔ اس کال کا دورانیہ تقریباً آٹھ منٹ ہے۔ اب بات ہو جائے تیسری یعنی درمیانی آؤٹ گوئنگ کال کی۔''

''اس کال کو آپ نے ہائی لائٹ کیوں کیا ہوا ہے بیگ صاحب؟'' جج نے چونکے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''معزز عدالت کی توجہ مبذول کرانے کے لیے جناب عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بنگلے والے فون سے وقوعہ کی رات آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر محض تین سیکنڈ کی ایک مختصر سی کال کی گئی تھی جس کے اوپر میں نے ہائی لائٹر پھیر کر اس کی تفصیل کو اجاگر کر دیا ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ قلیل مدتی یہ کال اسی نمبر پر کی گئی تھی جو میں نے استغاثہ کے سب سے معتبر گواہ حفیظ اللہ کو دکھا کر اس کے بارے میں استفسار کیا تھا اور اب یہی نمبر جناب کی میز پر رکھا ہے۔''

جج نے دونوں کاغذات کو میچ کرنے کے بعد معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ پراسرار نمبر کس کا ہے؟''

میں جج کے سوال کا دانستہ جواب نہ دیتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''جناب عالی! میرا مؤکل کم و بیش آٹھ بجے جائے وقوعہ سے نکل آیا تھا لہٰذا یہ کال اس نے نہیں کی ہوگی۔ باقی رہ گئی مقتولہ عندرت..... تو اگر اس مشکوک نمبر پر عندرت نے کال کی تھی تو اس کی تصدیق یا تردید کے لیے وہ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ تو پھر کیوں نہ میں اس نمبر کے بارے میں گواہ ہی سے استفسار کروں۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ جلدی سے بیچ میں کود پڑا۔ ''استغاثہ کا گواہ بڑے واضح الفاظ میں اس سوال کا ''انکار'' میں جواب دے چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرے فاضل دوست عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں نے وکیل استغاثہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دوسرا پیپر جج کے حوالے کر دیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''جناب عالی! یہ حفیظ اللہ کے بنتری فون کا وقوعہ کی شام چھ بجے سے رات نو بجے تک کا تین گھنٹے کا کال ریکارڈ ہے۔ اس کال ہسٹری کے مطابق حفیظ نے کل سات مرتبہ فون کا ریسیور اٹھایا، یعنی چار بار کال اٹینڈ کرنے کے لیے اور تین بار کال کرنے کی غرض سے۔ ان سات کالز میں سے میں نے صرف ایک کال کو ہائی لائٹ کیا ہے جو حفیظ اللہ کے آفس سے چھ بج کر بیس منٹ پر کی گئی۔ اس کال کا دورانیہ لگ بھگ ایک منٹ ہے اور جس نمبر پر حفیظ اللہ نے فون کیا وہ وہی نمبر ہے جس پر مقتولہ کے بنگلے سے کسی نے آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر کال کی تھی۔ کل ملا کر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس پراسرار نمبر کے بارے میں صرف اور صرف حفیظ اللہ ہی معزز عدالت کو بتا سکتے ہیں۔ دیٹس آل یور آنر۔''

''میں نے اس گدھے کو منع بھی کیا تھا۔'' بے ساختہ حفیظ اللہ کے منہ سے نکلا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنی زبان کو لگام دے لی اور امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب تکنے لگا۔

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے فریادی لہجے میں کہا۔ ''ڈیفنس استغاثہ کے گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''میں آپ کے معزز گواہ کے ساتھ جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اس کے لیے ''ہراساں'' کا لفظ بے وقعت ہے۔'' پھر میں نے

www.urdtaylyjeem.com

روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ استغاثہ کا گواہ حفیظ اللہ اس ٹیلی فون نمبر کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ معزز عدالت سے میری مؤدبانہ استدعا ہے کہ استغاثہ کے گواہ کو شاملِ تفتیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔''

جج نے میرے خاموش ہونے پر حفیظ اللہ سے دریافت کیا۔ ''مسٹر حفیظ اللہ! یہ فون نمبر کس کا ہے؟ آپ نے وقوعہ کی شام چھ بج کر بیس منٹ پر ایک منٹ کی کال کس کو کی تھی؟''

جج کے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ ڈنس باکس کی چوبی ریلنگ کو پکڑ کر اس طرح ہانپنے لگا جیسے اس کے تعاقب میں شکاری کتے لگے ہوں اور وہ میلوں دوڑتے ہوئے یہاں پہنچا ہو۔

بعض اوقات حقائق اتنے تلخ اور سفاک ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے خونخوار شکاری کتوں کی وحشت اور دہشت بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ ان لمحات میں حفیظ اللہ اسی نوعیت کی صورت حال سے دوچار تھا۔ جب مذکورہ ٹیلی فون کے بارے میں اس نے لب کشائی نہیں کی تو میری درخواست کی روشنی میں جج نے اسے شاملِ تفتیش کرنے کے احکامات جاری کردیے۔

☆☆☆

پولیس کی تحویل میں حفیظ اللہ کو زبان کھولنا ہی پڑی۔ وہ ٹیلی فون نمبر اس کے ایک سیاسی حلیف کا تھا جس کے توسط سے اس نے اپنی اہلیہ ندرت کو اس طرح ٹھکانے لگوانے کی درخواست کی تھی کہ اس قتل کا الزام میرے موکل پر آئے۔ اس کے سیاسی حلیف نے یہ کام ایک کنٹریکٹ کلر سے کرایا تھا۔ اسی اجرتی قاتل نے ندرت کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد مقتولہ کے بنگلے سے آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر محض تین سیکنڈ کی کال کر کے اپنے باس کو کام کی تکمیل کی یک لفظی اطلاع دی تھی۔ قاتل نے صرف ایک لفظ ادا کیا تھا..... ڈن!

آیندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کردیا اور انکوائری آفیسر کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد اس مقدمے کا نیا چالان عدالت میں دائر کردے۔

اس موقع پر میں حفیظ اللہ سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''تمہیں تکلیف تو عارف اور ناجیہ کے بے تکلف تعلقات سے تھی۔ پھر تم نے اپنی خوب رو اہلیہ کو قتل کیوں کرایا؟''

''میں نے ندرت سے شادی کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔'' وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ بات مجھے بہت بعد میں پتا چلی کہ وہ میرے ایک طاقت ور سیاسی حریف کے ہاتھوں کا کھلونا تھی اور اس نے ایک گہری سازش کے تحت مجھ سے شادی کی تھی۔ ندرت کے ذریعے میرا دشمن مجھے تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ بنائے بیٹھا تھا۔ میں ندرت سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی موثر ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ ناجیہ اور عارف والا معاملہ سامنے آگیا۔ یہ سچ ہے کہ ان دونوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے معاملات کے سلسلے میں مجھ پر شاکر علی کی طرف سے بھی خاصا دباؤ تھا۔ میں نے سوچا، ایک تیر سے دو شکار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ندرت کو اس کی بے وفائی اور عارف کو اس کی نمک حرامی کی سزا تو ملنا چاہیے ہی نا۔''

''ایک تیر سے دو شکار کرنا تمہارا فلسفہ ہے حفیظ اللہ۔'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میری نگاہ میں یہ عذرِ لنگ ہے۔''

وہ برا سا منہ بنا کر مجھے تکنے لگا۔

''حفیظ اللہ! تم ایک طویل عرصے کے لیے جیل جانے والے ہو۔'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''اس موقع پر میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور وہ بھی فیس کے بغیر۔''

''ہاں، بولو.....'' وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں گویا ہوا۔

''ہماری اولاد ہم سے زیادہ ذہین اور عقل مند ہے لہٰذا پرانی نسل کو نئی نسل کے راستے کی دیوار بننے سے پرہیز کرنا چاہیے۔''

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''یہ کس قسم کا مشورہ ہے؟''

''جیل کی کوٹھری میں بیٹھ کر ٹھنڈے دماغ کے ساتھ تم میری بات پر غور کرنا تو سب سمجھ میں آجائے گا حفیظ اللہ۔ فی الحال میں تمہیں ایک اشارہ ہی دے سکتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ایک چال تم نے چلی اور ایک چال تمہاری بیٹی ناجیہ نے۔ تم ندرت اور عارف کا پتا صاف کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور ناجیہ محض کامران سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ ناجیہ جیت گئی اور آزاد فضا میں سانس لے رہی ہے جب کہ تم ہار گئے اور..... جیل کی زندگی اب تمہارا مقدر ہے۔''

اپنی بات مکمل کرتے ہی میں آگے بڑھ گیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ حفیظ اللہ میرے اس نصیحت بردار مشورے کو جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے اپنی ہی روش پر چلتا رہے گا۔

عذرِ لنگ کی پالیسی پر اپنی شان و شوکت کا پلازا کھڑا کرنے والے خود پسند اور انا پرست لوگوں کو سمجھانا ناممکن کی حد تک مشکل ہوتا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

www.alfrayeem.com

تدبیر

عبدالرب بھٹی

خوب صورتی ہمیشہ دلوں میں جگہ کرلیتی ہے مگر اس وقت بہت مشکل پیش آتی ہے جب یہ جگہ درست نہ ملی ہو۔۔۔وہ بھی اسی بے کلی کا شکار تھی، بالآخر اسے ایک ایسی تدبیر سوجھ گئی جب ایک چاہنے والا اسے اپنے دل میں جگہ دینے پر مجبور ہو گیا۔

www.alifbari.com

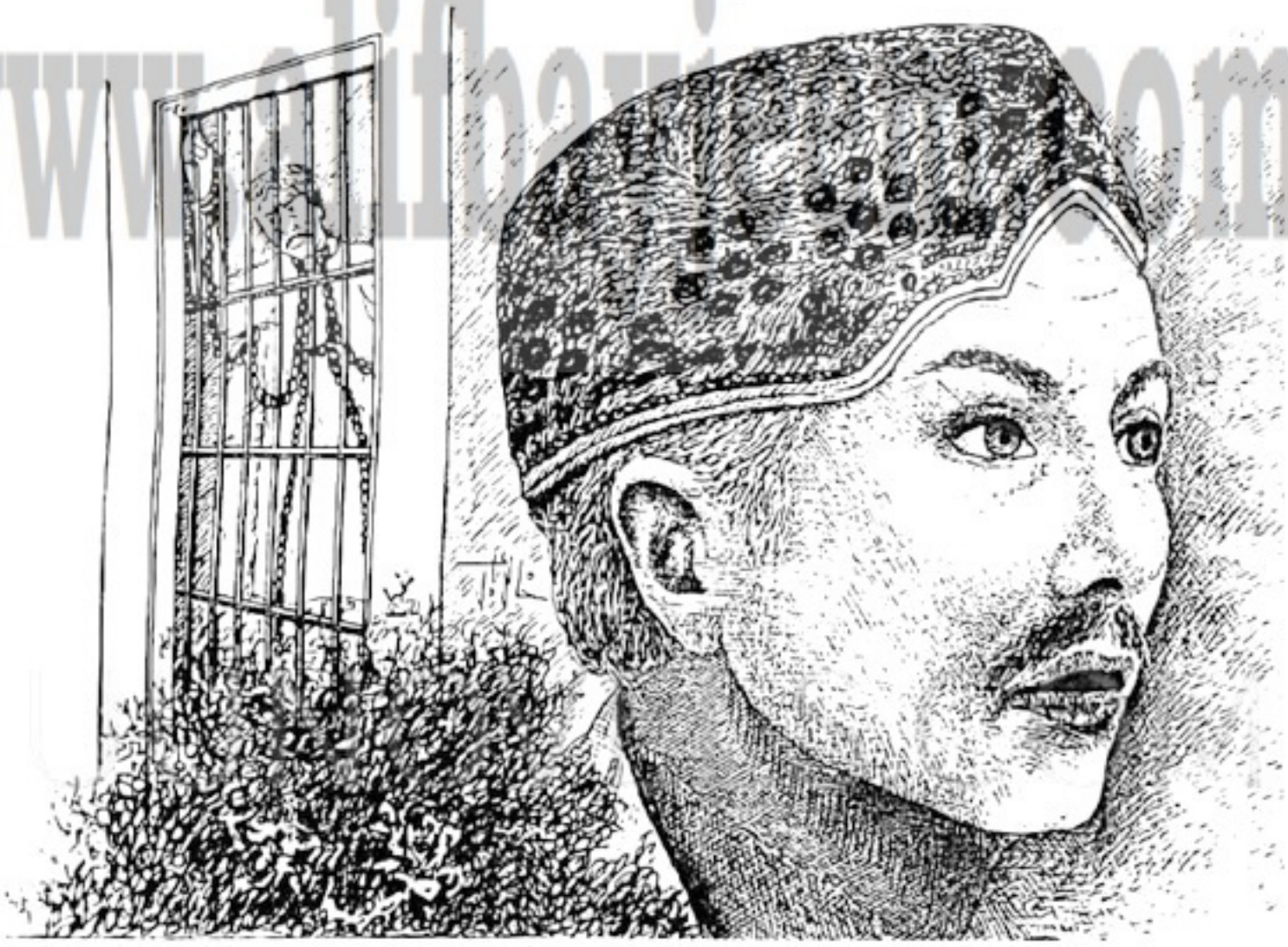

محبت کے لیے محبت کی قربانی دینے والے ایک عاشق کی نامرادیاں

اوائل سرمائی کی چمکیلی اور خوشگوار دھوپ میں زاہد ہاتھ میں بڑا سا رجسٹر پکڑے کھلے سے میدان میں کھڑا تھا۔ وہ سامنے پڑے نئی فصل کی کٹائی کے ڈھیروں (غلّے) کو ایک نظر دیکھتا، پھر انگلیوں میں پھنسے قلم کے اشارے سے انہیں گنتا اور کچھ حساب کتاب لگاتا.....اس کے بعد وہ رجسٹر میں درج کرنے لگتا۔

اس کے اردگرد سرسبز لہلہاتے کھیت بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ ہاری کام اور بٹائی میں مصروف تھے، بائیں جانب

کے کھیت میں ایک ٹریکٹر چل رہا تھا، جس میں لگے ریکارڈ سے سندھ کے مشہور لوک گیتوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ اس کے عقب میں ذرا دور گوٹھ کے کچے پکے گھروں اور سرکنڈوں کے بنے جھونپڑوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ کھیتوں کے درمیان سے ایک بل کھاتا راستہ اس آبادی تک اور دوسری جانب وہ مین روڈ پر جاتا نظر آ رہا تھا۔

زاہد کی عمر پچیس سال تھی۔ وہ خوب گٹھے ہوئے جسم کا اور درمیانے قد کا قبول صورت نوجوان تھا۔ رنگت سانولی تھی۔ سر پر شیشوں کے کام والی سرخ سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ جسم پر بے داغ شلوار قمیص تھی۔ اس کے ذرا عقب میں ایک گھنے پیڑ تلے ایک رلی بچھی چارپائی اور پاس ہی اس کی نئی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

اس کے ہمراہ ایک مجہول سا عمر رسیدہ ہاری خیر بخش کھڑا تھا، جس سے زاہد کبھی کبھار کچھ پوچھ لیتا تھا۔

''چاچا خیر بخش! کیا بات ہے، اس بار ہری فصل کم اتری ہے؟'' زاہد نے ذرا اکڑ کر بوڑھے ہاری سے پوچھا جو اپنے پورے خاندان سمیت یہاں کھیت مزدوری کرتا تھا۔

''سائیں! پانی کا مسئلہ تھا، اس بار وارے کا پانی ہمیں کم ملا ہے۔'' اس نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

''پانی؟ مگر چاکر خان تو کہہ رہا تھا کہ پانی پورا چھوڑا گیا ہے؟'' زاہد بولا۔ ہاری خیر بخش نے کچھ کہنا چاہا مگر زاہد فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ارے چاچا! پالک تو پچل فصل ہے، گھوڑی کے دم کے بال کی طرح اگتی ہے۔ ادھر کاٹتے جاؤ اور ادھر دوبارہ اگتی جاتی ہے۔ لگتا ہے کچھ ہیرا پھیری ہو رہی ہے۔''

''بالکل نہیں منشی سائیں!'' خیر بخش ایک دم ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''سارا حساب آپ کے سامنے تو ہے۔ باقی ایک ایک پائی کا حساب آپ مجھ سے لے سکتے ہو۔''

''اچھا..... اچھا! اب زیادہ باتیں نہ کر..... سائیں مختار کی چند ایکڑ زمین تجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔''

''ایسا تو نہ بولو منشی صیب! میرا پورا خاندان، کیا مرد کیا چھوٹے بڑے اور بوڑھے، عورتیں بھی تو جتے رہتے ہیں۔''

زاہد نے کوئی جواب نہیں دیا اور قلم جیب میں اڑسا، رجسٹر بند کیا پھر چارپائی پر آ کر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔

''چائے پانی حاضر کروں منشی صیب؟'' خیر بخش نے قریب آ کر پوچھا۔

''نہیں، میں اب چلوں گا۔'' زاہد نے جواب دیا اور تھوڑی دیر بعد اپنی نئی بائک کی طرف بڑھا۔ رجسٹر اس میں لٹکایا اور سوار ہو کے کک ماری۔ بائک اسٹارٹ ہو گئی اور وہ آبادی کی طرف جانے والے راستے کی طرف ہو لیا۔

زاہد کا رخ سائیں مختار کے گھر کی طرف تھا۔ اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے اس کے اندر ہمیشہ ہی لڈو پھوٹتے تھے، دل عجیب طرح دھڑکتا تھا، اس کی آنکھوں میں ایک پیاس اور شوقِ دید جیسی چمک ہلکورے لینے لگتی تھی۔ وہ تو گویا سائیں مختار کے گھر بار بار جانے کے بہانے ڈھونڈا کرتا تھا اور وہاں جب بھی جاتا پورا اہتمام کیا کرتا تھا۔ مثلاً غسل، نئے کپڑے اور نئی ٹوپی کے علاوہ، وہ اپنی مونچھوں اور سر کے بالوں میں بھی خوب تیل چپڑا کرتا تھا۔

وہ جب تک سائیں مختار کے گھر کی راہ میں ہوتا، اس کی چشمِ تصور میں سونہڑیں کا... گلنار چہرہ گردش کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ جب تک وہ مختار کے گھر پہنچ نہیں جاتا اور سونہڑیں کا دیدار نہیں کر لیتا۔

اس کے لیے بھی وہ بڑی ہوشیاری اور محتاط روی کا پورا دھیان رکھتا تھا کہ کہیں مختار کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو جائے۔

وہ حساب کتاب دینے کی غرض سے اس کے گھر جا پہنچا۔ سرخ اینٹوں سے بنا اس کا گھر خاصا کشادہ تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ بائک وہ اسٹینڈ پر کھڑی کر چکا تھا اور اب رجسٹر اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

''کون ہے؟'' اندر سے اسے حسبِ توقع مختار کی آواز سنائی دی۔

''سائیں وڈا! میں ہوں، زاہد۔'' اس نے جواب میں کہا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھلا۔ سامنے ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔ اس کے ڈاڑھی مونچھوں کے بال دسمہ کیے ہوئے تھے۔ قد مناسب تھا۔ صحت ٹھیک ہی تھی۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ وہ ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ چند ایکڑ زمین تھی، اسی پر اس کی گزران تھی۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا، جوان..... جسے زمینداری سے زیادہ پڑھائی کا اور کسی بڑے شہر میں جا بسنے کا شوق تھا۔ سو وہ اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے اور حیدرآباد میں بس کر پورا کر لیا تھا۔ وہیں اس نے اپنی پسند کی شادی بھی کر لی تھی۔ باپ بیٹے کا تعلق اب بس اسی قدر تھا کہ فون پر بات ہو جاتی۔ زاہد اس کا منشی تھا۔

''آ جا اندر.....'' مختار نے اس سے کہا اور واپس پلٹ گیا۔ زاہد دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ سامنے کشادہ صحن تھا۔ سامنے کے رخ پر دو بڑے کمرے تھے اور دائیں جانب اوطاق تھی۔ وہاں مختار کبھی کبھار اپنے چند ہاریوں

www.allrayjeet.com

یا دوستوں کے ساتھ نشست جما لیا کرتا تھا مگر زاہد کو وہ گھر میں ہی بلا لیتا تھا۔ اس کی زمینوں کا سارا کام اور دردسری بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ زاہد کو اس بات پر فخر بھی ہوتا کہ صرف وہی واحد ایک ایسا فرد تھا جسے مختار نے اپنے گھر کے اندر آنے کا اختیار دے رکھا تھا۔ یہ سوچ کر کبھی کبھی اس کا ضمیر ملامت بھی کرتا تھا کہ وہ اس طرح اپنے ہی مالک کے گھر پر "سیندھ" لگانے کی سوچ رہے ہوئے تھا۔ پھر جانے کون سی تاویل و توجیہہ سے خود کو تسلی بھی دیتا کہ وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کر رہا ہے۔

صحن میں بالا کے نقشین پایوں والی قیمتی بان کی بڑی سی چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس پر رلی تھی۔ وہ متلاشی اور بے چین سی نظریں چاروں طرف گھماتا ہوا، چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چارپائی کے سامنے سرکنڈوں کا ایک اونچی پشت گاہ والا موڑھا (مونڈھا) دھرا تھا۔ مختار اس پر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی زاہد! کیا کھائے گا؟" اس نے اپنے نوجوان منشی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں سائیں! بس ذرا بتائی تھی، اسی لیے کچھ حساب کتاب دینے آیا تھا۔" زاہد نے سعادت مندی سے کہا اور ایک بار پھر اس نے سامنے کے دونوں کمروں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔

اسے مایوسی ہوئی۔ سونہڑیں اسے دکھائی نہیں دی۔ پھر وہ مختار کے سامنے رجسٹر کھول کے بیٹھ گیا اور بہانے سے اسے مختلف مسائل میں الجھا کر اس "بیٹھک" کو طول دینے لگا کہ کہیں مختار اسے جلد ہی نہ گھر سے رخصت کر دے۔

"اڑی او..... سونہڑیں! ذرا دو کپ دودھ پتی چائے بنا دے۔" دفعتاً مختار نے کمروں کے برآمدے کی جانب منہ کر کے آواز لگائی اور زاہد کا دل یکبارگی مسرت کے بے پایاں احساس تلے زور سے دھڑکا۔

آج اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ سونہڑیں کو نظروں ہی نظروں میں اپنے دل کا..... اپنی "پسندیدگی" کا پیام ضرور دے گا۔ اسے ڈر بھی لگتا کہیں وہ اس کی شکایت اپنے خاوند سے نہ کر دے، مگر اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ عشق تھا تو پھر ڈرنا کیسا۔ وہ خود کو تسلی دیتا۔

"آتی ہوں۔" اندر سے سونہڑیں کی مترنم آواز نے زاہد کے من مندر میں اجالا سا بکھیر دیا۔

اس نے اپنے اور مختار کے سامنے کھلے پڑے رجسٹر پر قلم رکھا اور اسے بہ ظاہر کچھ بتانے لگا لیکن ساتھ ہی وہ ترچھی نظروں سے سونہڑیں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا جو اب ایک کمرے سے نکل کر بائیں جانب بنی رسوئی کی طرف بڑھ

آپ پریشان!
آخر کب تک؟

ہماری معلومات کے مطابق ہر چوتھا انسان اپنی اعصابی کمزوری کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا ہربل اعصابی کورس تیار کیا ہے۔ اگر آپ اپنی گھریلو لائف پُرسکون بنانا چاہتے ہیں تو آپ ہمیں اپنی اعصابی کمزوری سے متعلقہ تمام علامات کے بارے میں فون کریں۔ اور آج ہی بذریعہ ڈاک وی پی VP ہربل اعصابی کورس منگوالیں۔ ان شاء اللہ ہمارا اعصابی کورس آپ کو بے حد طاقت دے گا۔ ہمارا اعصابی کورس سستا آسان اور مختصر ہے

دارلشفاء المدنی

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0301-8149979
0309-1604171
0346-0319995

اوقات رابطہ
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے

رہی تھی۔

وہ حسب سابق سرخ جھلملاتے لباس میں تھی جو اس کے سرو قد و سیم تن پر بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عمر اپنے ادھیڑ عمر کے شوہر مختار سے آدھی سے بھی کم تھی۔ وہ بہ مشکل بیس، اکیس کی ہوگی۔ خوبرو اور پُرکشش، حسین و جمیل، نازک اندام۔

زاہد کے نزدیک بس یہ پیسے کا کھیل تھا کہ سونہڑیں ایک غریب ہاری ماں باپ کی اکلوتی جوان بیٹی تھی اور مختار نے اس کے ماں باپ کو بڑا بھاری "عوضانہ" دے کر اس سے نکاح کرلیا تھا۔ غربت کی پوٹ سے ہمیشہ مجبوری ہی جنم لیتی ہے اور مجبوری انسان کو کسی نہ کسی کنویں میں ضرور دھکیلتی ہے۔ سونہڑیں بھی بھری جوانی میں ایک بڈھے کی بے کیف اور بے رونق زندگی میں دھکیل دی گئی تھی۔ سونہڑیں کے غریب ماں باپ بھی مجبور تھے۔ وہ مختار کے مقروض بھی تھے، شادی کے بعد وہ قرض بھی معاف کردیا گیا تھا۔

"سونہڑیں بالکل بھی اس بڈھے گدھ کے لائق نہیں ہے۔ اس نے اسے قیدی بنا رکھا ہے۔ میں سونہڑیں کو ایک دن اس بڈھے گدھ کی گرسنہ چونچ سے ضرور نجات دلاؤں گا۔ کبھی نہ کبھی وہ میری جانب مائل ضرور ہوگی۔" زاہد ہر روز ایک نئے عزم کے ساتھ یہ سوچا کرتا تھا۔

سونہڑیں ذرا دیر بعد چائے کے برتن لیے رسوئی سے آنے لگی تو اس دوران مختار کو غسل خانے میں جانے کی سوجھی اور وہ اٹھ کر ذرا دیر کے لیے چلا گیا۔

اب سونہڑیں اور زاہد آمنے سامنے تھے۔ وہ یک ٹک محویت اور مخموری نظروں سے سونہڑیں کو تکنے لگا۔ سونہڑیں نے چائے کی ٹرے قریب دھری میز پر جھک کے رکھی اور اسے اپنی جانب تکتے پاکر پہلی بار تھوڑا سا مسکرائی تو زاہد کو حوصلہ افزائی کے لیے تو یا "گرین سگنل" مل گیا۔ اس نے سونہڑیں کی نرم و نازک کلائی تھام لی۔ اس وقت وہ ٹرے رکھ کے سیدھی ہونے لگی تھی۔ کلائی زاہد کی گرفت میں آتے ہی وہ اسی طرح جھکی جھکی زاہد کی طرف تکتی رہ گئی۔ گویا یہاں بھی برا نہیں منایا گیا تو زاہد کا دل اور بڑا ہوگیا۔ مخفی مگر خوابیدہ آتش فشاں کی مثل کے..... اس کے اندر کے جذبات تھے کہ لاوے کی طرح ابل پڑے۔

"سونہڑیں! میں تجھ سے پیار کرنے لگا ہوں۔ تیری ہی خاطر یہاں آتا ہوں اور میری پیاسی نظریں تجھے ہی تلاش کرتی رہتی ہیں۔"

"میں شادی شدہ ہوں۔" سونہڑیں نے بہت دھیرے سے..... بہت احتیاط سے..... اشارے میں مختصر مگر مفصل جواب دیا۔

"یہ شادی نہیں دھوکا ہے۔" اس نے ہولے سے کہا۔ ساتھ ہی اس کی نظریں پاس کے غسل خانے کی جانب بھی اٹھ جاتی تھیں۔

"دھوکا کیسا؟ میری مرضی شامل تھی۔" سونہڑیں نے بھی جواب میں ہولے سے کہا، اس کی بھی سرگیں نگاہیں بار بار غسل خانے کی طرف اٹھنے لگیں۔

"تمہاری نہیں، تمہارے مجبور والدین کی۔" زاہد نے کہا۔ "اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے اپنی مرضی کا بتاؤ۔"

سونہڑیں کچھ نہ بولی۔

"سونہڑیں! میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تمہارے عشق میں گرفتار ہوگیا ہوں۔ تمہارا اس..... بڈھے سے کوئی جوڑ نہیں، اس نے تمہاری مجبوری سے کھیلا ہے، مجھے تم پر ترس بھی آتا ہے۔ کیا تمہیں نہیں آتا اپنے آپ پر ترس؟ دیکھو..... زندگی کا سفر بہت طویل ہوتا ہے اور تمہاری زندگی تو پہاڑ سی پڑی ہے مگر اس میں کیا ہے، سوائے بنجر اور خشک سالی کے۔ میں..... میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں، میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

زاہد جیسے آپے میں نہ رہا۔ سونہڑیں اس کی باتوں پر سرخ ہوئی، مگر یہ سرخی نہیں لالی تھی۔ اس میں طیش کے بجائے لاج کی جھلک تھی مگر آنکھوں سے خوف بھی نمودار ہوا اور کچھ گہری سوچ کے آثار بھی ابھرے تھے، جیسے اس نے زاہد کی ترغیب پر لمحہ بھر کو غور کیا ہو۔ وہ بولی۔

"میرا شوہر زندہ ہے۔" سونہڑیں نے بالآخر کہا۔ اس ایک لفظ نے زاہد کو بہت کچھ سمجھا دیا۔

اسی وقت سونہڑیں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کیونکہ غسل خانے سے کھنکھارنے اور دروازہ کھولنے کی آواز ابھری تھی۔ زاہد نے بھی جلدی سے رجسٹر اپنی گود میں کھولے اس پر اپنا سر جھکا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے گھر سے رخصت ہوکر اپنی بائک پر بیٹھ رہا تھا۔

اپنے گھر کے راستے پر بائک دوڑاتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں سونہڑیں کا فقط یہی ایک جملہ گردش کررہا تھا۔

"میرا شوہر زندہ ہے..... میرا شوہر زندہ ہے۔"

وہ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

مطلب سمجھ آنے کے بعد زاہد حیران و ششدر رہ

www.urdtayeem.com

گیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ سونہڑیں اتنی سیدھی سادی نہیں ہے جتنی کہ نظر آتی ہے۔ اس نے جس ذو معنی انداز میں اسے جو بات سمجھائی تھی، وہ واضح لفظوں سے بھی زیادہ نمایاں تھی۔

''میرا شوہر زندہ ہے۔'' اس کا صاف مطلب تھا کہ اسے ہلاک کر ڈالو تو میں تمہاری ہو جاؤں گی اور وہ ساری زمینیں بھی اس کے بوڑھے شوہر مختار کی ملکیت تھی۔

''ہوں..... ٹھیک ہے پھر اگر ایسا ہے تو یہی بات میں بھی سونہڑیں کو آسان پیرائے میں سمجھاؤں گا۔'' اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور..... اگلی ملاقات میں اس نے..... مختار کے گھر کا رخ کیا مگر جب وہ وہاں پہنچا تو اچانک ٹھٹک گیا۔ اس نے بائک اس کے گھر کے دروازے سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر روک دی۔

اسے زمیندار مختار کے گھر کے دروازے پر ایک پولیس جیپ کھڑی نظر آئی۔ لمحہ بھر کو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہیں سونہڑیں نے اس کا آسرا پا کر اپنے شوہر کا قتل ہی تو نہیں کر ڈالا؟

وہ الجھ سا گیا اور چند ثانیے اسی کشمکش میں رہا کہ آگے بڑھے یا ادھر سے ہی واپس پلٹ جائے۔

''نہیں، مجھے دیکھنا تو چاہیے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ ڈر کس بات کا..... میں کوئی مجرم تھوڑی ہوں۔'' اس نے یہ سوچ کر ہمت باندھی اور آگے بڑھا۔

جیپ خالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس والے اندر موجود تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے ابھی دروازے پر دستک دینی ہی چاہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور اندر سے ایک پچیس تیس سالہ جوان پولیس انسپکٹر... وردی میں باہر نکلا، اس کے ہمراہ مختار بھی تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

گوٹھ کے تھانے دار نیاز شاہ کو بھلا کون نہیں جانتا تھا۔ پورے گوٹھ میں وہ کرخت مزاج اور سخت گیر مشہور تھا۔ ایک ذرا جرم کی بھنک پڑتے ہی وہ اپنی پولیس پارٹی سمیت آن دھمکتا تھا۔ زاہد کے تجسس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کی زمیندار مختار خاں کے ہاں آمد خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ زاہد ایک بار اپنے باپ مٹھل کے ساتھ متعلقہ تھانے نامعلوم چوروں کے خلاف رپورٹ درج کروانے گیا تھا، ان کی کسی نے بھینس چوری کر لی تھی۔ اس تھانے کی حدود میں اس گوٹھ سمیت دو اور بھی گاؤں آتے تھے۔

''سلام سائیں۔'' اسے دیکھتے ہی زاہد نے سلام جھاڑ دیا۔ انسپکٹر نیاز اس کی طرف متوجہ ہوا۔ حسب عادت اس نے کرخت نظروں سے زاہد کو گھورا تھا، زاہد کو پورا یقین تھا کہ وہ عادت کے مطابق اس سے درشت انداز میں کچھ نہ کچھ ضرور کہے گا، کیونکہ جب تھوڑے دنوں پہلے وہ اپنی بھینس کی چوری کے سلسلے میں اس سے ملا تھا تو اس نے ان سے بھی بڑے کرخت انداز اور درشت لہجے میں الٹے سیدھے سوالات پوچھے تھے، جیسے بھینس خود ان دونوں باپ بیٹے نے چوری کی ہو۔ وہی ہوا۔

''اڑے تو..... چاچا مٹھل کا چھوکرا تو نہیں ہے؟'' انسپکٹر نیاز نے اسے گھورتی نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک پہچانا سرکار! میں اسی کا بیٹا، زاہد دسایا ہوں۔'' زاہد نے اسے مہربان سا ہوتے دیکھ کر یک دم باچھیں پھیلا کر کہا۔

''زیادہ منہ پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انسپکٹر نیاز نے اسے گھورا تو زاہد نے جلدی سے اپنا شمالاً جنوباً پھیلا ہوا منہ بند کر لیا۔

''تو وہی ہے نا، جو کچھ دن پہلے تھا نے اپنے باپ مٹھل کے ساتھ آیا تھا، بھینس چوری ہونے کی رپورٹ لکھوانے؟'' نیاز شاہ نے اچانک بھویں سکیڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی جی سرکار سائیں! میں ہی تھا وہ، کیا چور پکڑے گئے؟'' زاہد نے بھی گویا لگے ہاتھوں پوچھ ہی لیا۔

''اڑے مجھے تو یہ تم دونوں باپ بیٹے کا ڈراما ہی لگتا تھا۔'' وہ بولا پھر قریب کھڑے حیران پریشان مختار سے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ تیرا منشی ہے؟''

''جی سائیں۔'' زمیندار مختار... نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''ہوں.....! اس پر بھی نظر داری ضروری ہے۔''

''نہیں سائیں! یہ تو میرا سب سے زیادہ وفادار ملازم ہے۔'' مختار نے کہا۔ زاہد خائف سا نظر آنے لگا۔ سمجھ تو گیا تھا کہ رات رات میں کوئی واردات ہوئی ہے۔

انسپکٹر نیاز، مختار سے رخصت ہو کر اپنی جیپ میں جا بیٹھا اور پھر اسے اسٹارٹ کر کے تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

''تو بتا! کیسے آنا ہوا؟'' مختار نے اچانک اس سے پوچھا۔

''ادھر سے گزر رہا تھا کہ تمہارے گھر کے سامنے پولیس کی گاڑی دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ یہی پوچھنے ادھر کا رخ کیا۔'' زاہد نے بہانہ بنایا۔

www.aitbayteem.com

''خیریت تو ہے نا..... کیا کوئی واردات ہوئی ہے؟''
اس نے بھی پوچھ لیا۔ اس دوران اس کی متلاشی نظروں نے دروازے کے پیچھے چوکھٹ پر جھولتے پردے کی آڑ میں کھڑی سونہڑیں کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ یقیناً اس کی جھلک دیکھ کر رک گئی تھی۔

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' مختار گومگو سے لہجے میں بولا۔ زاہد کا خیال تھا کہ وہ اسے اندر لے جا کر بات کرے گا، مگر اس نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے اسے بتا دیا کہ کل رات کوئی چوری کی نیت سے گھر میں گھس آیا تھا۔ اس کی بیوی سونہڑیں کو آدھی رات میں پیاس لگی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اسی وقت اسے باہر صحن میں کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ باہر آئی تو ایک انسانی سائے کو دیوار پھلانگتے دیکھ کر چیخ ماری اور وہ بھاگ گیا تھا، وغیرہ۔

زاہد الجھ سا گیا۔ پھر وہ ایک نگاہ اسی پردے کی جانب اٹھا کے واپس پلٹ گیا۔ سونہڑیں اب وہاں نہیں تھی۔

☆☆☆

سونہڑیں سے اس کی دوسری ملاقات خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ زمیندار مختار نے کچھ کھاد کی بوریاں اپنے گھر کے صحن میں رکھوا دی تھیں۔ خود اسے کسی ضروری کام سے شہر جانا پڑ گیا تھا، اس نے زاہد کو وہ بوریاں فارم پر پہنچانے کا کہہ دیا تھا۔

جب وہ اس کے گھر پہنچا تو ظاہر ہے سونہڑیں اکیلی تھی۔ اس سے خوب جی بھر کر اسے باتیں کرنے کا موقع ملا۔

''سونہڑیں! مجھے بتانا، پھر تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' وہ پھر فدا ہونے لگا۔

''میں نے کہا نا کہ جب تک مختار زندہ ہے، ہم ایک نہیں ہو سکتے۔'' سونہڑیں نے بھی اس بار جیسے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے تو میرے ساتھ ہے۔'' زاہد خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا۔ اس پر سونہڑیں کے چہرے کی رنگت شرم سے سرخ ہو گئی تو زاہد جھلا کر بولا۔

''یہ وقت شرمانے کا نہیں ہے، کچھ کرنے کا ہے۔''

''میں کیا کروں؟ جو کچھ کرنا ہے تمہیں ہی کرنا ہے۔ میں خود اس بڈھے گیدڑ سے چھٹکارا چاہتی ہوں جس نے پیسوں کے زور پر میرا جسم تو خرید لیا مگر روح کو قید کر دیا۔ میرا خود اپنا دل بھی تجھ پر آ گیا ہے۔ اب تو ہی مجھے اس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے، زاہد!''

سونہڑیں کو اس طرح بولتے پا کر زاہد حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ اسے تسلی ہو گئی کہ سونہڑیں بھی اسے چاہتی تھی۔ (جس کا اسے یقین تھا، کیونکہ وہ بالآخر مختار جیسے بڈھے کے مقابلے میں ایک گبرو جوان تھا اور سونہڑیں اس سے صرف چند ایک سال ہی تو چھوٹی تھی)

''دیکھ! تجھے بھی تھوڑی ہمت کرنا پڑے گی۔ ہم دونوں مل کر اس بڈھے کو راستے سے ہٹا دیں گے۔'' اس نے کہا۔

''سچ؟'' سونہڑیں کی آنکھوں میں غیر یقینی سی خوشی ہلکورے لے رہی تھی۔

''تجھے میں ایک زہر لا دوں گا، وہ تو اس کے دودھ کے گلاس میں ملا دینا۔''

''وہ دودھ نہیں پیتا۔'' سونہڑیں نے انکشاف کیا۔

''کھانے میں ملا دینا۔'' زاہد بولا۔

''مم..... مگر پولیس تفتیش سے تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ اسے زہر دیا گیا ہے، سب سے پہلا شک پولیس کا مجھ پر ہی ہو گا۔''

''ہاں! یہ تو تو نے ٹھیک کہا۔ ویسے بھی یہاں کا تھانے دار نیاز شاہ بڑا ہٹیلا ہے۔'' زاہد بولا پھر جیسے اسے یاد آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

''کچھ روز پہلے تھانے دار یہاں آیا تھا، سنا تھا میں نے کہ تو نے کسی چور کو اپنے گھر کی دیوار ناپتے دیکھا تھا؟''

''ہاں!''

''تو پھر سن، ایک ترکیب میرے ذہن میں آ رہی ہے۔'' زاہد کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''کیسی ترکیب؟'' سونہڑیں نے جیسے کان لگا کر پوچھا۔

''مختار اپنے ساتھ ایک پستول رکھتا ہے۔ تو آج رات اسے گولی مار دے اور یہی بتانا کہ چور آیا تھا اور یہ اسی کا کام ہے۔''

''مگر پستول پر میری انگلیوں کے نشانات.....'' سونہڑیں نے یاد دلایا۔

''یہ بھی تو نے ٹھیک ہی کہی..... مگر اتنی ساری عقل تجھ میں آئی کہاں سے؟'' زاہد نے حیرت سے پوچھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

''آٹھ جماعتیں پاس ہوں میں اور اس بڈھے نے مجھے بڑا سا موبائل بھی لا کر دیا ہے، نیٹ پر میں سب کچھ دیکھتی ہوں۔ شادی کے بعد نہیں، پہلے بھی، اپنی ایک سہیلی کے ساتھ.....'' اس کی آنکھوں میں ہی نہیں چہرے پر بھی معنی خیزی تھی۔

''اوہ.....'' زاہد نے بھویں اچکائیں۔ بولا۔ ''خیر تو اس کی فکر نہ کر، ہمت کر اور رات کی تاریکی میں جب وہ بے خبر

www.aiilbayjeem.com

سو رہا ہو اس کے سینے میں ایک عدد گولی اتار دے۔ پستول پر سے اپنے نشان کسی بھی کپڑے سے صاف کر سکتی ہے۔ کہہ دینا وہی چور پکڑے جانے کے خوف سے گولی مار کے چلا گیا۔ تھانے دار کو تو پتا ہی ہے کہ کسی چور نے یہ گھر ڈائن کی طرح دیکھ رکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تیری خاطر یہ بھی کر دوں گی مگر میں چاہتی ہوں تو بھی ساتھ ہو، میرا حوصلہ بڑھے گا۔ ڈرتی ہوں کہیں عین وقت پر..... میرا ارادہ ہی نہ بدل جائے۔'' سونہڑیں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

زاہد سوچنے لگا، پھر بولا۔ ''اچھا ٹھیک ہے، میں آجاؤں گا آج رات ٹھیک ایک بجے۔''

اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

زاہد اس رات بستر پر لیٹا دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور تصور میں ہی سونہڑیں جیسی حسین و جمیل لڑکی کو اپنی بیوی کے روپ میں دیکھ رہا تھا اور خود کو ایک زمیندار کے روپ میں.....

جب ایک بجنے میں بیس منٹ رہ گئے تو وہ آہستگی سے اٹھا اور اپنے مکان سے نکل کھڑا ہوا۔

سردیوں کی راتیں تھیں، آوارہ کتے بھی کہیں مارے سردی کے دبکے ہوئے تھے۔ ہر طرف رات کا ٹھٹھرتا ہوا سناٹا طاری تھا۔ ہلکی سرد ہوا چل رہی تھی۔

اس نے گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ زمیندار مختار کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر رکا تو اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کے اور سونہڑیں کے بیچ پہلے سے طے تھا کہ وہ یہاں پہنچنے کے بعد دروازے پر کھڑے ہو کر کسی جانور کی آواز نکالے گا اور سونہڑیں جو منصوبے کے مطابق اس کے انتظار میں جاگ رہی ہوگی، جھٹ سے دروازہ کھول دے گی۔

لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ دو ایک بار جانور کی آواز نکالنے کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے اس کے گھبرائی اور پریشان سی سونہڑیں کھڑی تھی۔ زاہد یہی سمجھا اس ''معاملے'' کی وجہ سے ایسا ہے۔

''اندر آجاؤ جلدی.....'' اس نے کہا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔

''خیریت تو ہے..... تم.....'' زاہد کہتے کہتے رہ گیا اور وہ جیسے درمیان میں ہی یوں ہانپتے ہوئے بولی، جیسے میلوں دور سے دوڑتی آرہی ہو۔

''اندر چلو..... مم..... میں نے اسے گولی مار دی ہے۔''

اگرچہ یہ سننا زاہد کے لیے غیر متوقع نہیں ہونا چاہیے تھا مگر پھر بھی وہ یہ سن کر اندر سے تھوڑا لرز سا گیا کیونکہ اس کے حساب سے قتل وقت سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اسی سبب جب وہ بولا تو اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''کک..... کہاں ہے اس کی لاش.....؟''

''اندر چلو تو.....'' سونہڑیں نے کہا۔ وہ اسے ایک ایسے کمرے میں لے آئی جہاں دونوں میاں بیوی یعنی مختار اور سونہڑیں سویا کرتے تھے۔

اندر بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں زاہد نے ایک خوفناک سا منظر دیکھا۔ مختار چارپائی سے نیچے کمرے کی کھڑکی والی دیوار کے قریب زمین پر بے سدھ گرا پڑا تھا اور اس کے سینے میں ایک سرخ رنگ کا سوراخ تھا جس سے بھل بھل گاڑھا خون بہہ کر نیچے تالاب سا بنائے ہوئے تھا۔

''اب کیا کریں؟'' سونہڑیں نے پوچھا۔ زاہد کے پہلے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ سونہڑیں نے ایک عورت ہو کر اتنا بڑا کام کیا تھا اور وہ مرد ہو کے ڈر رہا تھا، پھر یہ تو ان کا مشترکہ منصوبہ تھا لہٰذا وہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے ہی لگا تھا کہ سونہڑیں نے اسے کھدیڑا۔

''مگر تم کیوں اس قدر خوف زدہ نظر آرہے ہو؟ یہ تو سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہی ہوا ہے نا؟''

''وہ..... وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے تھوڑا جلد بازی سے کام لیا اور میرے آنے سے پہلے ہی اسے گولی مار ڈالی۔ حالانکہ ہم نے سوچا تھا کہ.....''

''اب یہ باتیں چھوڑو''۔ سونہڑیں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''پہلے یا بعد میں بات ایک ہی ہے۔ مجھے جیسے ہی موقع ملا میں نے اس پر گولی چلا دی۔ یہ جاگ گیا تھا۔''

''مم..... میرا مطلب ہے کہ اب میرا یہاں موجود ہونا مناسب نہ ہوگا۔'' بالآخر زاہد نے اصل بات بتا دی جس سبب وہ پریشان تھا۔

''تو؟''

''تو یہ کہ میں واپس جا رہا ہوں اور تم پولیس کو فون کر کے مطلع کر دو اور خود ہی اس معاملے سے نمٹنے کی کوشش کرو مگر بڑی ہوشیاری کے ساتھ..... وہی چور والی ترکیب اور موقف اختیار کرنا ہے تمہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ پولیس میرے اس چور والے بیان سے مطمئن ہو جائے گی؟''

''اب تو یہ باتیں سوچنے کا وقت نہیں رہا۔ قتل ہو چکا۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔''

www.aiffaiyeen.com

''تم کوئی اور موقف نہیں بتا سکتے مجھے جس میں پولیس کو کم سے کم شک ہو مجھ پر؟'' سونہڑیں نے کسی خیال کے تحت کہا۔ انسان ایسا کوئی کام کرنے سے پہلے ایک رخ پر سوچتا ہے اور سب اسے بے داغ نظر آتا ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ جب کر چکتا ہے تو اسے بعد میں سو سقم نظر آنے لگتے ہیں، یہی سونہڑیں کا اصل مسئلہ تھا۔

''مثلاً؟'' زاہد نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''خودکشی کا موقف کیسا رہے گا؟''

''نہیں۔'' کہتے ہوئے زاہد نے مختار کی لاش کو زمین پر غور سے پڑے دیکھا۔ ''لاش جس زاویے پر ہے اور گولی کا نشان اس سے یہ کسی طرح بھی خودکشی کا کیس نہیں لگتا۔ ہاں! اگر تم نے اس کی کنپٹی پر گولی ماری ہوتی تو اور بات تھی، مگر اب نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے ہمیں وہی پہلے والا موقف ہی اختیار کرنا پڑے گا۔'' بالآخر سونہڑیں نے کہا۔

''ہاں! اور یہی زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ چوری کی پہلے والی ناکام واردات کے بارے میں مختار پولیس میں نہ صرف رپورٹ درج کروا چکا ہے بلکہ..... اس روز تھانے دار نیاز شاہ بھی بہ نفسِ نفیس یہاں وقوعے والی جگہ پر آ کر تفتیش کر کے جا چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں یہی کہوں گی کہ چور آیا، میرے خاوند کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنا پستول نکالا۔ چور نے اس پر چھلانگ لگائی۔ میں خوف سے ایک کونے میں جا دبکی۔ چور نے میرے شوہر کا پستول چھین کر اس کے سینے پر گولی داغ دی، پستول پھینکا اور کھڑکی کے راستے سے فرار ہو گیا۔'' اس نے کہتے ہوئے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس کے پٹ بند تھے اور وہ آدم گزار تھی۔ اس پر گرل بھی نہیں تھی۔

''بالکل ٹھیک..... اب یہ پستول مجھے دو تاکہ میں اس پر سے تمہاری انگلیوں کے نشان صاف کر دوں۔'' زاہد نے یہ کہتے ہوئے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ سونہڑیں نے پستول اس کے حوالے کر دیا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ زاہد کا چہرہ ست کر رہ گیا۔ سونہڑیں بھی پریشان سی نظر آنے لگی۔

''ی ی..... یہ کون آ گیا اس وقت.....؟''

''تم ادھر ہی ٹھہرو، میں جا کر دیکھتی ہوں، شاید ہوا سے بجا ہو۔''

''لیکن اگر کوئی اور ہوا تو؟''

''میں عورت ہوں، کوئی بہانہ کر کے چلتا کر دوں گی۔'' اس نے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور زاہد اسے روکتا ہی رہ گیا۔

زاہد کمرے میں لاش کے پاس اکیلا کھڑا ڈر رہا تھا، اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا جس میں سے ایک گولی چل چکی تھی کہ اسی وقت سونہڑیں اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ تھانے دار نیاز شاہ اور دو ساتھی پولیس والے تھے۔

''ی ی..... یہی ہے چور.....! اسی نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔'' سونہڑیں نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں ہکا بکا کھڑے زاہد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور رو دی۔

زاہد کے ہاتھ میں پستول ابھی تک چمک رہا تھا اور اسے یہ یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے.....؟

☆☆☆

چند روز بعد..... سونہڑیں گھر میں کام کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے تھانے دار نیاز شاہ کھڑا تھا۔ اس کے گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ سونہڑیں بھی اسے دیکھ کر مکارانہ انداز میں مسکرائی۔

وہ اندر آیا تو سونہڑیں نے بڑے دلبرانہ انداز میں پوچھا۔

''چارے کا کیا کیا؟''

''وہ نکل لیا گیا۔ اسے پھانسی نہیں تو عمر قید تو ضرور ہو ہی جائے گی۔'' نیاز شاہ نے اسے زاہد کے بارے میں بتایا۔

''ہونہہ..... اوقات دیکھی تھی اس نے اپنی۔ ایک معمولی منشی اور چلا تھا مجھ سے شادی کر کے وڈا زمیندار بننے.....'' سونہڑیں نے حقارت سے کہا۔ اس وقت وہ زخم کھائی ہوئی ناگن نظر آ رہی تھی۔ ''پہلے بڈھے کے عذاب میں پھنسی اور اب وہ کتا میرے گلے پڑنے والا تھا۔''

''اور میں.....'' نیاز شاہ یہ کہتا ہوا اس کی جانب بڑھا تو سونہڑیں محبت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ کے بولی۔

''تم.....!'' وہ اس کی جانب نشیلی نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری کیا بات ہے۔ ویسے تم نے سانپ کے مرنے اور لاٹھی کے بچنے کی اچھی تدبیر کی.....''

نیاز نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

⌘⌘⌘

www.alitbayiee.com

www.alifbayjeem.com

نوکریوں کی برسات ہونے لگتی ہے۔ آج بھی اماں نے سوتے میں جھنجوڑ کر جگایا، تو میں پھٹ پڑا۔

''کیا ہے اماں! کیوں ہر وقت میری دشمن بنی رہتی ہیں..... سکون سے سونے بھی نہیں دیتیں۔'' میں نے کمبل کھینچ کر منہ پر تان لیا۔

''ایک ماہ ہو گیا ہے تمہیں چارپائیاں توڑتے ہوئے۔ اٹھو اور جا کر نوکری تلاش کرو۔'' وہ دہاڑیں۔

''نوکری باہر درختوں پر نہیں لگی ہوئی کہ جا کے توڑ لاؤں گا۔ پورے شہر کی سڑکوں کی خاک چھان چکا ہوں۔''

''اگر درختوں پر نہیں لگی ہوتی تو بستر پر اینٹھتے ہوئے بھی نہیں ملنے والی۔ اس کے لیے تگ و دو کرنا پڑتی ہے۔ کتنے چاؤ سے تمہارا نام پارس رکھا تھا مگر تم تو پتھر سے بھی بدتر نکلے۔'' اماں پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئیں اور میرے لیے دوبارہ سکون کی نیند سونا ناممکن ہو گیا۔

میں نے بے دلی سے کمبل پرے پھینکا اور بستر چھوڑ دیا۔

''تو اچھا ہے یار..... تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اپنے ابا کا جنرل اسٹور سنبھال لیا جبکہ میرے ماں باپ نے تو میری زندگی ہی تنگ کر کے رکھ دی ہے۔'' میں نے چائے کے گھونٹ بھرے اور کپ ٹیبل پر رکھا۔

میں اس وقت اپنے قریبی دوست عزیر کے ساتھ ایک چائے خانے میں بیٹھا دل کا بوجھ ہلکا کر رہا تھا۔

عزیر اور میں نے تعلیمی مدارج اکٹھے ایک ساتھ طے کیے تھے۔ وہ نہ صرف میرا بہت اچھا دوست تھا، بلکہ ایک بہترین انسان بھی تھا۔

''یار اگر غور کرو تو وہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔ ماں باپ اولاد کو پروان چڑھاتے ہوئے ایک ایک دن گنتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خواہشات کو بھی پروان چڑھا رہے ہوتے ہیں۔ اور جب خواہشات کے یہ ننھے پودے تناور درخت بن جاتے ہیں تو وہ ان کا پھل کھانے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔''

''مگر یار! جاب ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کئی دفاتر اور کمپنیوں کے دھکے کھا چکا ہوں۔ ٹرخا کر باہر نکال دیتے ہیں۔ نوکری حاصل کرنے کے لیے سفارش اور رشوت دو اہم چیزیں ہیں اور میں بدقسمتی سے ان دونوں سے محروم ہوں۔'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''تو کیا کرو گے..... ساری عمر یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے؟''

''تمہارے جنرل اسٹور میں سیلز مین کی جاب کر لیتا ہوں۔ آٹھ دس ہزار تنخواہ تو دے ہی دو گے۔'' میں تمسخر سے ہنسا۔

''میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''جب تک جاب نہیں ملتی، کوئی بھی چھوٹا موٹا کام کر لو۔''

''سوری یار..... میں نہ تو دہی بڑے یا آلو چاٹ کی ریڑھی لگا سکتا ہوں اور نہ ہی کسی دفتر میں چپڑاسی کی نوکری کر سکتا ہوں۔'' میں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''چلو پھر کھاتے رہو باپ کے ڈنڈے اور ماں کے کوسنے۔ برائے مہربانی میرے آگے یہ موضوع مت چھیڑا کرو۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ارے یار..... تُو تو گرمی کھا گیا۔ دیکھنا اپنی قسمت بھی ایک دن ضرور بدلے گی۔ بس جیک لگنے کی دیر ہے۔ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں ہوں، جس پر چل کر سالوں کی مسافت مہینوں میں طے کر لوں۔ پھر دیکھنا کیسے میرے حالات بدلتے ہیں۔'' میں نے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے چٹکی بجائی۔

''جس شارٹ کٹ پر تم چلنے کی بات کرتے ہو، اس پر چلنے کے لیے اپنی غیرت اور خودداری کو گروی رکھنا پڑتا ہے۔ رکھ لو گے؟''

''غیرت، خودداری، انا، عزتِ نفس، یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت میں سب سے بڑی چیز پیسا ہے۔ جس کے پاس پیسا ہے، اس کی سب عزت کرتے ہیں۔''

''ہوں..... میں تمہاری باتوں سے متفق تو نہیں ہوں مگر پھر بھی بیسٹ آف لک..... تمہارے لیے نیک خواہشات ضرور... رکھتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

اس کا خوشگوار موڈ دیکھتے ہوئے میں نے بھی اپنا سوال داغ دیا۔

''یار! مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو، جیسے ہی کوئی لمبا ہاتھ مارا، سب سے پہلے تمہارا سارا قرضہ چکتا کروں گا۔'' میں کھسیاہٹ آمیز انداز میں مسکرایا۔

''جی جی، مجھے پورا یقین ہے اس بات کا۔ اور ویسے بھی قرض مانگنے کے لیے بھی عزت نفس، انا، خودداری وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ آپ کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ صرف کتابی الفاظ ہیں۔'' اس کے چہرے پر شرارت آمیز تاثرات دیکھ کر میں کھلکھلا کر ہنس دیا۔

میری ہنسی میں اس کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

☆☆☆

میں گھر آیا، تو اپنے زیرِ تکمیل منصوبوں پر پھر سے پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار کرنے لگا۔

www.alibayjeem.com

میں نے فیس بک پر متعدد لڑکیوں کے ساتھ دوستی کر رکھی تھی۔ ان میں سے تین لڑکیوں کو، ان کی مالی حیثیت دیکھتے ہوئے میں خاص اہمیت دیتا تھا۔ وہ تینوں بھی میرے ساتھ کافی سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔

عزیر میرے کرتوتوں سے مکمل آگاہ تھا۔ میں ان تینوں کا ذکر گاہے بگاہے اس کے سامنے کرتا رہتا تھا۔

وہ بخوبی جانتا تھا کہ میں کسی امیر کبیر لڑکی کو اپنے پیار کے جال میں پھنسا کر اس کے ساتھ شادی کر کے اپنی لائف کو سیٹل کرنے کے چکر میں تھا۔

اپنے اس طریقۂ واردات کو میں اس کے سامنے ''شارٹ کٹ'' کے نام سے یاد کیا کرتا تھا اور وہ اس شارٹ کٹ کے استعمال کو بے غیرتی پر محمول کرتا تھا۔

میں ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً کال پر بات بھی کر چکا تھا، صرف اپنی تسلی کے لیے کہ یہ تینوں لڑکیاں ہی ہیں، لڑکیوں کے بھیس میں لڑکے تو نہیں۔

تینوں لڑکیاں ایلیٹ کلاس گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں ان کی سالگرہ پر قیمتی تحائف بھیج کر ان کی محبتیں اور چاہتیں سمیٹ چکا تھا۔ اب مجھے ان تینوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

گو کہ ان کے سامنے میں نے آج تک کبھی شادی کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ان تینوں میں سے کم از کم ایک تو مجھ سے سنجیدہ ہوگی اور شادی کی ہامی بھر لے گی۔

اب میں اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے، ان کی طرف مزید پیش قدمی کرنے کا سوچ رہا تھا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے فیس بک آن کیا... ...اور سب سے پہلے ماہا سے بات کرنے کی ٹھانی۔

''ہائے ماہا! کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں ہینڈسم۔'' اس نے ریپلائی کیا۔

''شادی کے بارے میں تمہاری کیا پلاننگ ہے؟''

میں سیدھا اپنے مدعے پر آ گیا۔

''یہ آج تمہارے ذہن میں اچانک شادی کا خیال کیسے آ گیا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''بس آ گیا نا..... تم میری بات کا جواب دو۔''

''سچ بتاؤں یار! میں شادی کو گلے کا پھندا سمجھتی ہوں۔ شادی کے بعد زندگی کو ٹھیک طرح سے انجوائے نہیں کیا جا سکتا اور میرا ابھی اس پھندے میں گردن دینے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''اچھا۔'' میرے سینے میں جیسے چھن سے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔

''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو یار؟''

''کیونکہ میری ماما مجھے شادی کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہیں۔'' میرے دل میں موہوم سی امید جاگی۔

اماں کو ماما کہتے ہوئے میں ہمیشہ خفت محسوس کیا کرتا تھا۔

''تو کر لو..... اس میں اتنا سوچنے والی کیا بات ہے؟''

''مگر ابھی ابھی تو تم نے کہا کہ شادی ایک پھندا ہے، اور شادی کے بعد زندگی کو انجوائے نہیں کیا جا سکتا۔'' میرا لہجہ طنز آمیز ہو گیا۔

''تم شادی کرو یا نہ کرو، تمہارے پاس زندگی کو انجوائے کرنے کے لیے ویسے بھی کچھ زیادہ لوازمات نہیں ہیں اور تم تو ابھی تک بے روزگار ہو نا..... شادی کر کے بیوی کو کہاں سے کھلاؤ گے، میری مانو تو پہلے روزگار ڈھونڈو پھر بیوی ڈھونڈنا۔''

''مشورے کے لیے شکریہ..... مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہا ہوں۔''

میں لاگ آف ہو گیا اور غصے سے موبائل پرے پھینکا۔

''کمینی کہیں کی..... چیٹ کرتے ہوئے ساری حدیں پھلانگ جاتی ہے۔ شادی کا نام لیا تو بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔''

میں بڑبڑاتا ہوا سونے کے لیے لیٹ گیا۔ دنیا اور دنیا کے لوگوں سے دل بری طرح اچاٹ ہو چکا تھا۔ ماہا اور اس کی دوستی پر مٹی ڈالی اور اس کو بھیجے ہوئے تحائف پر فاتحہ پڑھ کر آنکھیں موند لیں۔

اگلی رات آن لائن ہوا، تو پروجیکٹ نمبر دو پر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ یعنی نیلم کے ان باکس میں جا پہنچا۔

''ہیلو نیلم! ہاؤ آر یو؟''

''میں ٹھیک ہوں.....''

''کیا ہو رہا ہے آج کل؟'' یہاں پر میں نے سیدھا اپنے مطلب کی بات پر آنے سے احتراز کیا۔

''پاپا اسٹڈی کے لیے باہر بھیجنا چاہتے ہیں مگر میرا جانے کو دل نہیں چاہتا۔ میں اپنے بوائے فرینڈ عاطف کے ساتھ جانا چاہتی ہوں مگر اس کا ابھی تک ویزا اپلائی نہیں ہو رہا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیا.....؟'' میرے سر پر تو جیسے ساتوں آسمان گر پڑے۔ ''تمہارا میرے علاوہ بھی کوئی بوائے فرینڈ ہے؟''

''ٹیپکل مردوں جیسی باتیں مت کرو۔ میرے فیس

www.aiibayiee.com

بک پر اور ریئل لائف میں بہت سے فرینڈز ہیں، جن میں لڑکے بھی شامل ہیں۔''

''شادی کب کرو گی؟''

''میں نے اپنی پوری لائف کی پلاننگ کر رکھی ہے اور میری پلاننگ میں شادی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں۔''

''ہوں..... صحیح۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔

''میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ تم شاید مجھ میں انٹرسٹڈ ہو اور مجھے اپنا لائف پارٹنر بنانا پسند کرو گی۔''

''اگر تم ایسا سمجھتے رہے ہو تو تم سے بڑا پاگل اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ یہاں سوشل میڈیا پر سب وقت گزرای کے لیے آتے ہیں نہ کہ رشتے داریاں جوڑنے کے لیے۔''

''تو کیا تم اب تک میرے ساتھ صرف ٹائم پاس کر رہی تھیں؟'' میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

''آف کورس..... ٹائم پاس کر رہی تھی۔ میں نے تو کبھی تم سے کوئی عہد و پیمان نہیں باندھا۔ اگر تم خود سے ہی بے کار کی امیدیں لگائے بیٹھے ہو تو اس میں غلطی سراسر تمہاری ہے۔''

''سوری..... اینڈ بائے۔'' میں نے گفتگو کو سمیٹا اور پروجیکٹ نمبر تین کا رخ کیا۔

یہ ٹینا تھی۔ پورا نام تو شاید تہمینہ تھا، مگر ٹینا کے نام سے ہی پکاری اور جانی جاتی تھی۔ لاہور میں رہتی تھی۔ اس کے باپ کی لوہے کے سریے اور گارڈر بنانے والی فیکٹری تھی۔

مجھے یہاں بھی کامیابی کی کوئی امید دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جب ان دونوں نے بری طرح دھتکار دیا تھا تو یہ تو ان سے بھی اونچی چیز تھی۔

بے دلی سے ہیلو ہائے کا تبادلہ کیا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی اس وقت آن لائن تھی۔

اتنے بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود ٹینا نے کبھی بدمزاجی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ خوش مزاجی سے پیش آیا کرتی تھی۔

''کیسے ہو جانِ من؟'' اس کا میسج آیا۔

''اچھا ہوں۔'' میں نے مختصر جواب لکھا۔

''کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے ہو؟''

''دکھائی دے رہا ہوں؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

''مطلب پریشان سے محسوس ہو رہے ہو۔'' اس نے جلدی سے بات بدلی۔

''ہاں پریشان تو ہوں۔''

''کیا پریشانی ہے؟''

''تمہیں بتانے کا فائدہ کوئی نہیں..... کیونکہ تمہارے پاس میری پریشانی کا کوئی حل نہیں ہے۔''

''بتا کے دیکھو شاید کوئی حل نکال سکوں۔''

اس کا حوصلہ افزا رویہ دیکھ کر میں نے دل کی بات کرنے کی ٹھان لی۔

''ٹینا! ماما میری شادی کرنا چاہتی ہیں جبکہ میری بچپن میں ہی اپنی کزن سے منگنی ہو چکی ہے۔''

''تو اس میں رکاوٹ کیا ہے..... کر لو شادی۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہی حل پیش کیا۔ کم بخت نے دل توڑنے میں ایک ثانیہ بھی نہ لگایا تھا۔

''مگر میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔''

''تم کس سے محبت کرتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر دل کی بات کہہ دی۔

کچھ دیر کے لیے اس کی طرف سے میسجز آنے کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ میں ڈر گیا۔

''ہیلو ٹینا! کیا سوچ رہی ہو..... تمہیں برا لگا نا؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کا جواب آیا۔

''تو پھر..... کہیں اور انوالو ہو؟'' دھڑکن کی اسپیڈ پہلے سے بھی تیز ہو گئی۔

''نہیں۔'' اس کے مختصر ترین جواب نے دل میں خوش فہمیوں کے پھول کھلا دیے۔

''سمجھ گیا..... ہم دونوں کے درمیان اسٹیٹس کی اونچی دیوار حائل ہے جسے شاید تم پھلانگنا نہیں چاہتیں۔'' میں شکوہ کناں ہوا۔

''ایسی بات نہیں ہے پارس..... لڑکیوں کے ساتھ سو طرح کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔''

''کیسی مجبوریاں ڈیئر؟ تم جس کلاس سے تعلق رکھتی ہو، وہاں کی لڑکیوں کے منہ سے ایسی مشکل باتیں سننا بہت غیر حقیقی سا لگتا ہے۔''

''تم مجھ سے ملنے کے لیے آ سکتے ہو؟'' کچھ دیر توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

''آف کورس آ سکتا ہوں۔ بتاؤ کہاں ملنے آؤں؟'' میرے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

اس نے ملنے کے لیے ایڈریس سینڈ کیا، جو میں نے

www.urdupoint.com

نوٹ کرلیا۔ ایڈریس نوٹ کرتے ہوئے دل ایک انوکھی تان پر رقص کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک سہ منزلہ عمارت تھی جو شہر کے کمرشل ایریا میں بڑے کروفر سے کھڑی تھی۔

میں اپنی زندگی میں دوسری بار لاہور شہر آیا تھا اور اب اس بلڈنگ کے پاس کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس تین منزلہ عمارت میں گراؤنڈ فلور پر دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ دوسری منزل پر اسنوکر کلب تھا اور تیسری منزل پر جم..... بنا ہوا تھا۔

ثمینا نے مجھے اسی اسنوکر کلب کا ایڈریس دیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کہ ایک لڑکی کا اسنوکر کلب میں بھلا کیا کام پھر سوچا کہ ایلیٹ کلاس کی لڑکیاں بھی شاید پروفیشنل اسنوکر کلبز میں جا کر کھیلتی ہوں گی۔

میں اکیلا یہاں تک چلا تو آیا تھا، مگر اب بری طرح نروس ہو رہا تھا..... عزیر کو ہی ساتھ لے آتا۔ اب یہاں کھڑا خود کو بری طرح ملامت کر رہا تھا۔ گراؤنڈ فلور پر بنی ہوئی ایک فارمیسی کی طرف بڑھا اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص سے پوچھا۔

''بھائی فائیو سٹار اسنوکر کلب یہی ہے نا؟''

''جی جی، یہی ہے۔ وہ سیڑھیاں دکھائی دے رہی ہیں؟ اوپر چلے جائیں۔''

میں لرزتی ٹانگوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر سے لڑکوں کے شور وغل اور ہنسی مذاق کے ساتھ میوزک کی تیز آواز بھی نیچے تک آ رہی تھی۔

اسنوکر کلب میں داخل ہوا تو وہاں چار بڑی ٹیبلز دکھائی دیں جن کے گرد اٹھارہ بیس جوان لڑکے کھڑے کھیل رہے تھے۔ وہ سبھی بگڑے ہوئے شوقین مزاج دکھائی دے رہے تھے۔

میں ایک طرف کھڑا ہونق چہرہ لیے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان اٹھارہ بیس لڑکوں میں سے کوئی بھی لڑکی نہیں تھی۔ سب لڑکے تھے۔

وہ اپنے حال میں مست تھے اور ہنسی مذاق میں بھی ایک دوسرے سے گالی گلوچ کر رہے تھے۔ کسی نے بھی مجھے توجہ کے قابل نہ سمجھا۔

یہ ثمینا نے مجھے کہاں پھنسا دیا، میں سمجھ گیا کہ اس نے میرے ساتھ بہت ہی بے ہودہ مذاق کیا ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر نہیں ملنا تھا تو بلایا کیوں تھا۔

میں غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا پھر ذہن میں ایک خیال آتے ہی اپنا موبائل فون جیب سے نکالا اور اسے کال ملائی۔ کال ملا کر فون کان سے لگایا۔ اور خود سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

اچانک ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کے فون کی رنگ ٹون سنائی دی تو میں رک گیا۔ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ لڑکا جیب سے فون نکال رہا تھا پھر اس نے فون اسکرین پر نظر ڈالی۔ میری طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کر کے تصدیق کی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کال کاٹ کر فون جیب میں ڈالا... اور میری طرف آنے لگا۔

قریب آ کر اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کیا۔

''جی فرمائیے..... آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' اس کے چہرے پر شرارت رقص کر رہی تھی۔ اس کے کچھ دوست بھی اس کے آس پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

میں جو اس کے فون پر ثمینا کے نمبر کی کال جاتے دیکھ کر پہلے ہی بہت الجھا ہوا تھا، اس کا رویہ مزید الجھن میں مبتلا کرنے لگا۔

''مجھے ثمینا سے ملنا ہے۔'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

سب لڑکے میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے اور سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ میری حالت سے جیسے محظوظ ہو رہے تھے۔

''جی جی، میں ہی ثمینا ہوں..... کریں نا بات مجھ سے۔'' مصافحہ کرنے والا لڑکا زنانہ آواز نکال کر بولا۔ اس کا جواب سن کر سب لڑکے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

میری سٹی گم ہو گئی۔ میں پاگلوں کی طرح ایک ایک کا چہرہ دیکھنے لگا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

''دیکھیے..... میں اتنی دور سے..... ثمینا سے ملنے آیا ہوں۔ آپ پلیز..... ثمینا سے ملوا دیں۔'' میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ سمجھنا نہیں چاہ رہا تھا۔

میری بات سن کر لڑکوں کی ہنسی میں شدت پیدا ہو گئی۔

یہ ہنگامہ دیکھتے ہوئے دوسرے لڑکے بھی وہاں جمع ہو رہے تھے۔

''جی دیکھیے۔ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں ہی آپ کی ثمینا ہوں۔ میں ہی آپ سے کال اور میسجز پہ بات کیا

www.afbayteen.com

کرتی تھی...اور میں نے ہی آپ کو لاہور ملاقات کے لیے بلایا تھا اور اس اسٹوکر کلب کا ایڈریس دیا تھا۔ وہ کیا ہے کہ ہم لوگ کافی دنوں سے دل کھول کر ہنسے نہیں تھے۔ میرے دوست بھی یہ تماشا لائیو دیکھنا چاہتے تھے۔ یو نو..... کسی کو ہنسانا کتنی بڑی نیکی ہے۔ تھینکس فار دس انجوائمنٹ۔'' اس نے لہرا لہرا کر زنانہ آواز میں اپنی بات مکمل کی۔

اب وہ سب دیوانوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

زندگی میں ایسی ذلت اور تجربے سے پہلی بار پالا پڑا تھا۔ جیب سے رومال نکالا اور پیشانی پر آیا ہوا پسینا صاف کرنے لگا۔

پھر رومال اور موبائل جیب میں ڈالے اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

آنکھوں سے آنسو چھلکنے کو بے تاب تھے۔ مگر کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے انہیں حلق میں اتار لیا۔ ٹانگیں یکدم بے جان ہو گئی تھیں۔ بدقت تمام سیڑھیوں سے اترا۔ اتنا بڑا دھوکا..... یہ لڑکا ایک سال تک ٹینا بن کر مجھ سے بات کرتا رہا۔ مجھ سے تحفے اور ایزی لوڈ بٹورتا رہا اور مجھے ہلکا سا شک بھی نہیں ہوا کہ یہ لڑکی نہیں لڑکا تھا۔

سیڑھیاں اترتے ہی میرا دل چاہا کہ اونچی آواز میں رونا شروع کر دوں، مگر رونے کے لیے نہ تو وقت مناسب تھا اور نہ جگہ۔ دو قدم چلا تھا کہ پیچھے سے وہ لڑکا پکارتا ہوا آیا۔

وہ یقیناً تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''سوری یار..... جانتا ہوں کہ میں نے بہت گھٹیا مذاق کیا ہے۔ تمہارے جذبات اور احساسات کے ساتھ کھیلتا رہا ہوں۔ ہو سکے تو معاف کر دینا۔'' اب اس کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ نفرت سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکا اور ایک طرف کو چل دیا۔ وہ وہیں کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس واقعے کے بعد فیس بک کی دنیا سے جیسے دل ہی اٹھ گیا۔ کچھ دن میں دل گرفتہ سا رہا۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا بلکہ ہر کسی کو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

عزیر نے بھی لاہور والی ملاقات کا احوال جاننے کے لیے ہمارے گھر کا رخ کیا مگر میں نے اس سے بھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ ملاقات کی صرف اتنی تفصیل بتائی کہ وہ لڑکی اپنے بتائے ہوئے ایڈریس پر ملی نہیں۔ یعنی دھوکے باز نکلی۔ عزیر تھوڑی دیر بیٹھا اور پھر اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے سکون بھری سانس لی۔

میں نے پھر سے کمر ہمت باندھی اور ...سوشل میڈیا پر ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ کسی ایسی لڑکی کی تلاش شروع کر دی جو فنا نشلی ..... مجھے مستحکم کر سکے۔ اب کی بار پاکستانی لڑکیوں پر لعنت بھیجتے ہوئے، یورپ کا رخ کیا۔

کیونکہ پاکستانی لڑکیاں وہ بھی اگر فیک نہ ہوں تو گھر والوں سے چوری چھپے صرف چیٹنگ تک محدود رہنا چاہتی ہیں۔ جب کبھی کوئی حتمی قدم اٹھانے کی بات کی جائے تو کچھوے کی طرح اپنے خول میں سمٹ جاتی ہیں۔

اب میرا ٹارگٹ غیر ملکی لڑکیاں تھیں۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ یورپین لڑکیاں دھوکا نہیں دیتیں اور نہ ہی جھوٹ کا سہارا لیتی ہیں۔ جو ہو جیسا ہو، بنا کسی لگی لپٹی کے بیان کر دیتی ہیں۔ میں نے کچھ یورپین لڑکیوں کو فرینڈ ریکوئسٹ بھیج کر ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہا۔ چند دنوں میں ہی کافی غیر ملکی لڑکیاں میری فرینڈ لسٹ میں ایڈ ہو چکی تھیں۔

ان کے ساتھ بات کرتے ہوئے سب سے زیادہ زبان کا مسئلہ درپیش آتا تھا۔ جو گوگل ٹرانسلیٹر نے چٹکی بجاتے ہی حل کر دیا۔

انہی لڑکیوں میں لندن کی ایک لڑکی انجلینا جسے عورت کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اس کے ساتھ دوستی تھوڑی آگے بڑھتی دکھائی دی۔ جبکہ دوسری لڑکیوں کے پاس میرے ساتھ بات کرنے کا بھی ٹائم نہیں ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ رشتہ صرف ہیلو ہائے تک محدود رہا۔

انجلینا عمر میں مجھ سے دس بارہ سال بڑی ہو گی۔ میں نے عمروں کے اس فرق کو پس پشت ڈالا اور اس کی طرف پیش رفت جاری رکھی۔

شروع شروع میں اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی سمجھنے میں دشواری پیش آتی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ مجھے انگریزی کی تھوڑی بہت سمجھ آنا شروع ہو گئی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بنا ٹرانسلیٹر کے ہی سمجھ لیتا تھا۔ نمبر 4 شارٹ کٹ اب میں اس کے ساتھ شادی کر کے برطانیہ کی شہریت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔

انجلینا نے بتایا کہ اس کی یکے بعد دیگرے تین شادیاں ناکام ہو چکی ہیں اور اب اس کا شادی سے دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ باقی زندگی ایسے ہی گزارنے کا ارادہ ہے۔

تین شادیوں کا سن کر میرا دل بہت برا ہوا پھر دل کو

www.urdumajlis.com

یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ یورپ میں زیادہ شادیاں کرنے کو معیوب بات نہیں سمجھا جاتا۔

آخر ایک دن ہمت کر کے اسے پرپوز کر دیا۔ میری بات سن کر وہ ہنس دی اور جواب دیا کہ میں جلد ہی پاکستان آ رہی ہوں۔ وہاں آ کر تمہیں اپنے جواب سے آگاہ کروں گی۔

اس کا رویہ کافی حوصلہ افزا تھا۔ میں خوش گمانیوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

جاب کرنے کا تو اب خیال بھی دل سے نکال دیا تھا۔ اب بھلا مجھے دو ٹکے کی ملازمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انجلینا سے شادی کر کے انگلینڈ کی نیشنلٹی مل جاتی۔ اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی تھی میرے لیے۔

ایک دن میں نے انجلینا سے پوچھا کے کب آ رہی ہو پاکستان..... تو اس نے بتایا کہ شاید اگلے ماہ۔

مجھے اس کے پاکستان آنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ یقیناً پاکستان وہ صرف مجھ سے اور میری فیملی سے ملنے کے لیے آ رہی تھی... اور اسے بھلا اس پس ماندہ اور ترقی پذیر ملک سے کیا لینا دینا تھا۔ اب میں ہر روز اپنے گھر کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیتا۔

انجلینا کہاں رہے گی؟ اس کے رہنے کے لیے تو گھر میں کوئی مناسب کمرا بھی نہیں تھا اور اس کے آنے کا ذکر اماں ابا سے کیسے کروں؟

بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تنگ آ کر عزیر سے بات کرنے کی ٹھانی۔ اس کے گھر گیا۔

''انجلینا پاکستان آ رہی ہے۔'' میں نے اسے یوں اطلاع دی جیسے وہ بھی میری طرح بے صبری سے اس کے آنے کا منتظر ہو۔ اس وقت میں اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

''انجلینا..... کون انجلینا..... اچھا وہ انجلینا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''میں انجلینا جولی سمجھا تھا۔''

''دیکھ ذرا کیسی قسمت پائی ہے میں نے۔ اسی لیے پاکستانی لڑکیوں میں سے کسی سے سیٹنگ نہیں ہو رہی تھی کہ میری ایک برطانوی لڑکی سے شادی ہونا طے تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔'' میں خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔

''ویسے یار تمہاری یہ انجلینا تمہاری اماں سے کتنی چھوٹی ہوگی؟'' اس نے چیونگم چباتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اماں سے چھوٹی ہے یا بڑی، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمہیں بھی زیادہ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس بات پر میں فکر مند ہوں اس کا کوئی حل تلاش کرو۔''

''کیوں کیا پریشانی ہے اب؟''

''یار وہ اگلے ماہ پاکستان آ رہی ہے اور ہمارے چار مرلے کے گھر میں کوئی بھی کمرا ایسا نہیں ہے، جہاں اس کو ٹھہرا سکوں۔'' میں نے اپنی پریشانی اس کے سامنے رکھی۔

''اس میں سوچنے والی کیا بات ہے..... جب وہ آئے گی تو تمہارے کمرے میں ہی رکے گی نا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے یار..... اماں اور ابا مجھے جان سے مار دیں گے اور ویسے بھی میرے ساتھ تو میرا چھوٹا بھائی فارس ہوتا ہے۔''

''تو پھر ایسا کر..... اسے اپنی بہن گڑیا کے کمرے میں ٹھہرا دینا۔''

''اماں نہیں مانیں گی اور مجھے خود بھی انجلینا کو گڑیا کے ساتھ ٹھہرانا کچھ مناسب دکھائی نہیں دے رہا۔''

''تو پھر اب میں کیا کر سکتا ہوں..... اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں اسے اپنے گھر میں ٹھہراؤں گا، تو یہ ممکن نہیں۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''مانا تم میرے دوست ہو اور میں تم پر بہت اعتماد بھی کرتا ہوں مگر اتنا اندھا اعتماد بھی نہیں کرتا کہ انجلینا کو تمہارے حوالے کر دوں۔'' میں نے اسے تپانے کی کوشش کی۔

''یہ ماں کی عمر کی گرل فرینڈ صرف تمہیں ہی مبارک ہو۔ مجھے ایسی بوڑھی گھوڑیوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری منگیتر لاکھوں میں ایک ہے اور تین ماہ بعد ہماری شادی ہونا بھی طے پا چکی ہے۔'' وہ عورتوں کی طرح طعنہ زنی پر اتر آیا۔

''اچھا اچھا جا رہا ہوں..... میں خود ہی مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لوں گا۔'' میں اس کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گھر آیا تو اماں شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف..... سبزی کاٹ رہی تھیں۔ انہیں تنہا دیکھ کر میں نے بات کرنے کی ٹھانی۔

''اماں آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔''

''کیسی بات.....؟'' اماں نے ابرو اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''انگلینڈ سے میری ایک دوست آ رہی ہے۔ چند دن ہمارے ہاں قیام کرے گی۔''

''آ رہی ہے..... کیا مطلب..... کیا وہ لڑکی ہے؟'' اماں نے تیکھے چتونوں سے پوچھا۔

''ہاں اماں۔'' میں نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہی

www.urdupoint.com

مجرم کی طرح اقبالِ جرم کیا۔

''ہائے میں مرگئی۔ ایک یہی دن دیکھنا باقی تھا۔ اب تُو لڑکیوں سے دوستیاں کرے گا اور انہیں اپنے گھر بلائے گا۔ کوئی شرم حیا ہے تم میں..... کہ سب ختم ہوگئی۔'' اماں کا واویلا سن کر گڑیا بھی باہر آ گئی۔

''گڑیا سمجھاؤ اماں کو..... خوامخواہ بات کو غلط رنگ دے رہی ہیں۔ میری دوست آ رہی ہے انگلینڈ سے، چند دن ہمارے ہاں قیام کرے گی اور شاید تمہارے کمرے میں تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔''

گڑیا میری بات فوراً سمجھ گئی۔ اس نے تابعداری سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اماں! سوچو ذرا..... اگر وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہوگئی، تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں اس کے ساتھ انگلینڈ چلا جاؤں گا اور کچھ عرصے بعد آپ سب لوگوں کو بھی بلا لوں گا۔ سب کی زندگی سیٹ ہو جائے گی۔'' میں نے اماں کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا۔

میری اس بات نے اماں پر خاطر خواہ اثر کیا۔

''سچ کہہ رہے ہو.....؟'' اماں کا لہجہ اور چہرے کے تاثرات سب ایک دم بدل گئے۔

''اگر وہ مان گئی تو ایسا ہی ہوگا۔'' میں مسکرایا۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ تم سے شادی کرنے کے لیے مان جائے گی؟''

''ہنڈریڈ پرسنٹ یقین ہے اماں۔ تمہارا بیٹا اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہے۔'' میں نے دو انگلیوں سے اپنی شرٹ کے کالر کو پکڑ کر سیدھا کیا۔

''چل ٹھیک ہے..... تُو اس انگریزن کو جلدی سے بلا لے۔ میں گڑیا کے کمرے میں کچھ چیزوں کا اضافہ کر کے، اس کے رہنے کے قابل بنا دوں گی۔''

اماں کی بات سن کر میں سرشار ہو گیا۔ ذہن سے جیسے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب تو بس مجھے انجلینا کے آنے کا انتظار تھا۔ اور پھر ایک دن یہ جاں گسل انتظار ختم ہوا۔ انجلینا آ گئی۔

اس دن دروازے پر کسی نے مہذب انداز میں دستک دی، تو میں نے ہی دوڑ کر دروازہ کھولا تھا کیونکہ اس وقت میں گھر میں بالکل اکیلا تھا اور ویسے بھی میری نظر آج کل ہر وقت دروازے پر لگی رہتی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا، تو وہ سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے چست بلاؤز کے ساتھ میلی کچیلی سی جینز پہن رکھی تھی... جو گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی تھی اور اس پھٹی پینٹ سے اس کے گورے چٹے صحت مند گھٹنے جھلک رہے تھے۔

''اوہ پیرس.....'' اس نے کہا اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ مجھے پارس کے بجائے پیرس کہتی تھی۔

میں اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔ بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ کیا۔

''کیسی ہو انجلینا..... سفر کیسا رہا؟'' میں نے اس کے ہاتھ سے بیگ لیا۔

''فرسٹ کلاس۔'' اس نے یورپین لہجے میں جواب دیا۔

''اندر آ جاؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اندر لے آیا۔

''تمہارا پرنٹس کدھر ہے؟ تم گھر میں اکیلا کیوں ہے؟'' اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرنے کی کوشش کی۔

''مائے ماما گونگ ٹو دی نیبرز۔ اینڈ سسٹر ان دی اسکول۔''

میں نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر گلاس میں انڈیلی اور گلاس ٹرے میں رکھ کے اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے بنا کسی جھجک کے گلاس اٹھا لیا اور غٹاغٹ چڑھا گئی۔

میں نے خالی گلاس ٹرے میں رکھا۔ ٹرے کچن میں رکھی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ حقیقت میں بھی بہت پیاری تھی۔ عمر کچھ زیادہ تھی مگر پھر بھی پُرکشش دکھائی دیتی تھی۔

''سفر کیسا گزرا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھا..... مگر تھک گئی ہوں۔ آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا۔'' میں نے گڑیا کے کمرے میں جانے تک اس کی راہنمائی کی۔

اس نے جوتے اتارے اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرے پاس بیٹھو نا۔'' اس نے فرمائش کی اور ایک باز دعوت دینے والے انداز میں وا کیا۔

میں ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اٹھا اور اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گیا۔

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

''کیسے ہو؟'' اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں..... بس ہر وقت تمہارا انتظار رہتا تھا مگر تم نے اپنے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔ بس اچانک چھاپا مار دیا۔'' میرے لہجے میں ہلکا سا شکوہ در آیا۔

''بس سرپرائز دینا چاہتی تھی تمہیں۔'' وہ مسکرائی۔

www.allmayjeem.com

اس کا ایک ہاتھ میری ران پر رینگنے لگا۔
''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں بوکھلا گیا۔
''پیار.....'' اس نے مخمور لہجے میں جواب دیا۔ اتنے میں بیرونی دروازہ بجنے لگا۔
میں دل کی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے باہر کی طرف لپکا۔
دروازہ کھولا تو سامنے اماں کھڑی تھیں۔
''کیا ہوا تمہارا سانس کیوں دھونکنی کی طرح چل رہا ہے؟'' اماں نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔
''اماں، وہ آ گئی۔'' میں نے اپنی سانس کو اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔
''کون آ گئی؟'' اماں نے گھر میں قدم رکھتے ہوئے کھوجتی نگاہ سے اطراف کا جائزہ لیا۔
''انجلینا آ گئی۔'' میری آواز سرگوشی میں بدل گئی۔
''کہاں ہے؟'' اماں کا لہجہ بھی یکدم دھیما پڑ گیا۔
''گڑیا کے کمرے میں..... آرام کر رہی ہے۔''
''دیکھتی ہوں۔'' اماں گڑیا کے کمرے کی طرف بڑھی، تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔
اماں کے اس مختصر فقرے ''دیکھتی ہوں'' نے مجھے ڈرا دیا تھا۔
مگر اندر جا کر اماں نے وہ اداکاری کی کہ میں اماں کی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا اور دل ہی دل میں ملکۂ جذبات کا لقب دے ڈالا۔
میں اماں کی ایکٹنگ بلکہ اوور ایکٹنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔
انجلینا جو اماں کو میرے ساتھ دیکھ کر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی، اماں نے اسے ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہیں دیا اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔
اماں دیوانہ وار اس کا منہ چومنے لگی۔ ''پلیز پلیز لیو می۔'' وہ احتجاج کرتی رہی مگر اماں نے اس کی ایک نہ سنی۔
''میری بیٹی..... میری چندا..... میری جان..... کب آئی ہو تم؟'' اماں نے یہ جانے بنا کہ وہ اس کی بات سمجھ بھی رہی ہے یا نہیں، اپنی طرف سے تابڑ توڑ جملوں کا استعمال جاری رکھا۔
میں نے اماں کو کھینچ کر اس سے الگ کیا۔
انجلینا اپنے ہاتھوں سے سر کے بالوں کو سنوارنے لگی جو اماں کے جبر سے بری طرح بکھر چکے تھے۔

☆☆☆

شام کو گھر کے سبھی افرادِ خانہ اکٹھے ہو کر بیٹھے، تو انجلینا جیسے ان سب کے درمیان کوئی عجوبہ تھی۔ وہ ان سب کی پتھر پھاڑ نگاہوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اپنے موبائل پر کسی کے ساتھ ٹیکسٹ میسجز کرنے میں مصروف تھی۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا منہ بھی مصروف تھا۔ وہ چیونگم چبا رہی تھی۔
ابا جان اس کی پھٹی ہوئی پینٹ سے جھانکتی اس کی عریاں ٹانگوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں لاحول..... پڑھ رہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد اس نے فون پر جھکا اپنا خوشنما چہرہ اٹھایا اور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔
میں اس کی نگاہوں کا مطلب بخوبی سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا بیٹھا رہا۔ بالآخر اسے اپنی زبان کو زحمت دینا پڑی۔
''چلو نا پیرس! چل کر اپنے کمرے میں سوتے ہیں۔''
وہ مجھے پیار سے اتنے دلنشین لہجے میں جب پیرس کہہ کر مخاطب کرتی، تو میں سچ میں خود کو پیرس کی خوشبودار ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا۔
اس کی بات سن کر ابا جی نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ابا جی کی نگاہوں سے جھلکتے جاہ و جلال کو دیکھ کر مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔
''انجلینا! تم میرے کمرے میں نہیں سو سکتیں۔ تم گڑیا کے ساتھ اس کے کمرے میں سو جاؤ۔''
''واٹ ربش..... میں اتنی دور سے گڑیا کے ساتھ سونے کے لیے نہیں آئی۔'' انجلینا نے بے شرمی کا عظیم ترین مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بے شرم سا احتجاج کیا۔
مجھے اس سے اسی قسم کے جملے کی امید تھی۔
''انجلینا! سمجھنے کی کوشش کرو..... ہم پاکستانی لوگ شادی سے پہلے ایک ساتھ ایک کمرے میں نہیں سو سکتے۔''
''کیوں نہیں سو سکتے؟ میں تمہارے کمرے میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔''
اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابا جی مارے غصے کے تھر تھر کانپنے لگے۔
''لخ دی لعنت تیرے جمن تے۔'' انہوں نے غیظ و غضب سے پھنکارتے ہوئے یہ جملہ میری طرف اچھالا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔
''مگر میں نے کیا کیا ہے؟'' میں منمنایا۔
میں اور اماں نے بالآخر اسے بہلا پھسلا کر گڑیا کے ساتھ سونے کے لیے راضی کر لیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں معمول سے کچھ پہلے جاگ گیا۔ دل میں ساری رات یہ خیال کروٹیں لیتا رہا کہ انجلینا ہمارے گھر کی چھت کے نیچے مجھ سے کچھ فاصلے پر محوِ خواب ہے اور یہ خیال بڑا ہی سنسنی خیز اور لذت آفریں تھا۔

www.alfidayjeem.com

بڑی مشکل سے رات کٹی تھی۔ علی الصباح اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔

قارس اور گڑیا کالج جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اماں کچن میں مصروف تھیں۔

صحن میں بنے مشترکہ واش روم سے ابا کے کھانسنے کی آواز سنائی دی تو میں پھر سے اپنے کمرے میں واپس آ گیا، اور بستر میں دبک گیا۔ میں ابا جی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قارس اور گڑیا چلے گئے اور ابا جی دکان پر چلے گئے تو میں باہر نکلا۔ گڑیا کے کمرے میں جھانکا دیکھا کہ انجلینا ابھی تک سو رہی ہے مگر اس کا لباس دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔

وہ ایک سلیپنگ گاؤن میں ملبوس سو رہی تھی۔ گاؤن ٹانگوں سے اوپر ہی ختم ہو جاتا تھا۔

عریاں ٹانگیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ میں نے کمبل اٹھا کر اس کی ٹانگوں پر ڈالا اور باہر آ گیا۔ اماں کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔

میں نے اماں کے پاس بیٹھ کر ناشتا کیا اور چھت پر آ گیا۔

نومبر کی میٹھی میٹھی دھوپ جسم کو بھلی لگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر چھت پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ انجلینا کو کیسے جگاؤں۔ پھر اس کے از خود جاگنے کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور نیچے آ گیا۔

''اماں! میں انجلینا کے لیے ناشتے کا سامان لینے جا رہا ہوں۔ وہ پراٹھے تو کھائے گی نہیں۔ بیکری سے بریڈ اور انڈے وغیرہ لاتا ہوں۔''

میں گھر سے باہر آ گیا۔ بیکری دو گلیاں چھوڑ کر مین روڈ پر واقع تھی۔ دس منٹ کا پیدل سفر تھا۔ میں بیکری پر پہنچا۔ اپنی مطلوبہ چیزیں خریدیں۔ وہاں مجھے عزیر مل گیا۔ وہ مجھے کھینچ کر ہماری فیورٹ چائے کی دکان پر لے گیا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے چائے کا ایک ایک کپ پیا۔

وہ مجھ سے انجلینا کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ شام کو آنا اور مل لینا اس سے۔

اس نے آنے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ اپنے جنرل اسٹور کی طرف چلا گیا اور میں واپس گھر آ گیا۔ گھر میں داخل ہوا، تو ایک نیا ہنگامہ منتظر تھا۔

اماں مضطرب حالت میں صحن میں چکر لگا رہی تھیں اور دونوں ہاتھ سینے پر مار رہی تھیں۔

''اماں! کیا ہوا؟''

اماں کسی چیل کی طرح مجھ پر جھپٹیں۔

''مت پوچھو..... کیا ہو گیا۔ سمجھو وہ ہو گیا جو میں نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔'' ہیجان کے مارے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

اماں کی باتیں سن کر میں پریشان ہو گیا۔

''آخر بتائیں تو سہی..... ہوا کیا ہے؟ انجلینا کہاں ہے؟'' اماں میں رونما ہونے والی تبدیلی کو میں نے از خود انجلینا کی ذات سے جوڑ لیا تھا۔

''انجلینا کی وجہ سے ہی تو عزت کی دھجیاں اڑ گئیں۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم لوگ۔''

میں نے ہاتھ میں پکڑا سامان اماں کو پکڑایا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے گڑیا کے کمرے میں پہنچا۔ وہاں بستر خالی دیکھ کر باہر آیا۔

''وہ گئی کہاں؟''

اماں نے خاموشی سے چھت کی جانب انگلی کھڑی کی۔

میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر جا پہنچا۔ چھت پر جا کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

انجلینا چھت پر چارپائی پر لیٹی دھوپ سینک رہی تھی۔ اس نے ٹوپیس بکنی پہنی ہوئی تھی اور آنکھیں موند رکھی تھیں۔

میں نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا تو آس پاس کی منڈیروں پر جھانکتے مختلف سائز اور رنگوں کے سر رکھے دکھائی دیے اور ان کے ..... چہروں پر وہی کمینی اور خبیثانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی جو مفت کی انجوائے منٹ ملنے پر عموماً حاصل ہوا کرتی ہے۔

میں نے انجلینا کو پکارا۔ وہ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنے لگی اور مسکرانے لگی۔

''تمہارے شہر کی دھوپ بہت پیاری ہے پیرس۔ وہاں لندن میں اس دھوپ کے لیے ترستی تھی۔ تھینک یو سو مچ پیرس۔'' وہ مسحور کن لہجے میں بولی اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

''انجلینا پلیز..... نیچے چلو۔ یہاں سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

''تو کیا ہوا..... دیکھنے دو۔ اس میں کیا بری بات ہے۔ ویسے بائی دا وے یہ سب لوگ مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''تم برہنہ ہو— اس لیے دیکھ رہے ہیں۔'' میں جھلا کر بولا۔ ''جلدی چلو..... اماں تمہیں بلا رہی ہیں۔ ناشتا کر لو۔''

''دل تو نہیں چاہ رہا..... اتنا اچھا دھوپ چھوڑ کے جانے کو۔ مگر ماما بلا رہا ہے تو پھر جانا تو پڑے گا نا۔'' وہ کھڑی ہوئی اور ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔

www.aliraiyeem.com

میں نے بوکھلا کر منڈیروں کی طرف دیکھا جہاں موجود چھوٹے بڑے چہرے اب کھل کر ہنسنے لگے تھے۔

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ تار پر لٹکی بیڈ شیٹ کھینچی اور اس کا جسم ڈھانپ دیا۔

''ہمارے ملک میں ان چیزوں کو بہت برا سمجھا جاتا ہے..... میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو پلیز۔'' میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشیوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اوکے۔'' اس نے شان بے نیازی سے کندھے اچکائے اور سیڑھیوں سے اترنے لگی۔ چادر جسم سے پھسل کر نیچے گر گئی۔ میں نے پھر سے چادر اٹھا کر اس کے کندھوں پر ڈالی اور اس کے نیچے جانے تک اس کے ساتھ چادر کو سنبھالے رکھا۔

وہ کمرے میں گئی اور پھر سے جینز اور شرٹ پہن کر باہر آ گئی۔

اماں نے ناشتا تیار کیا اور چبھنے والے انداز میں اس کے آگے رکھا۔ وہ اماں کا بدلہ ہوا رویہ محسوس کیے بنا ناشتا کرنے لگی اور ناشتا کرتے ہوئے میرے ساتھ خوش گپیاں کرتی رہی، میں زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائے صرف ''ہوں ہاں'' میں جواب دیتا رہا اور دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا رہا کہ یہ ہوشربا نظارہ اباجی نے نہیں دیکھا۔ ورنہ ان کے ہاتھوں میرا قتل واجب ہو جاتا۔

شام کو عزیر ملنے آ گیا۔ اس نے انجلینا سے مصافحہ کیا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔ میں پاس بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا۔

عزیر نے اپنے موبائل فون سے ہماری کچھ تصویریں کھینچیں اور چلا گیا۔

گھر جاتے ہی اس نے ہماری تصویریں فیس بک پر اپ لوڈ کر دیں اور ساتھ ہی یہ چٹ پٹی مسالے دار خبر لگا دی کہ سیالکوٹ کے لڑکے کی محبت میں مجبور ہو کر ایک ولایتی میم اس کے پیچھے پاکستان آ گئی۔

یہ خبر سوشل میڈیا پر وائرل کیا ہوئی، میں معمولی سے ایکدم غیر معمولی بن گیا۔

الیکٹرانک میڈیا والے اپنے کیمرے اور مائک سنبھالے ہمارے گھر آن وارد ہوئے۔ ہمارے انٹرویوز ٹی وی اور اخبارات پر آنے لگے۔

میں ایکدم سے خود کو بہت اہم اور معتبر سا محسوس کرنے لگا۔

یہ خبر وائرل ہونے کی دیر تھی کہ ہمارے شہر کی سب سے بڑی فیکٹری جن کی پروڈکٹس پوری دنیا میں بھیجی جاتی تھیں۔ اس انٹرنیشنل کمپنی کے مالک نے اپنے منیجر کو ہمارے پاس بھیجا۔

منیجر بھی اپنے پورے لاؤ لشکر اور ضروری لوازمات میڈیا کے اہم نمائندے اور کیمرے وغیرہ کے ساتھ ہم سے ملنے آیا۔

اس نے مجھے اور انجلینا کو پرکشش سیلری کے ساتھ شاندار جابز کی آفرکیں۔

میں حالات کے اچانک پلٹا کھانے پر انگشت بدنداں تھا۔ میں جو کچھ عرصہ پہلے بے روزگاری اور مفلسی کی چکی میں پستے ہوئے ایک ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور تھا اب ایک دم سے معزز اور مشہور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ایک ہفتہ انہی ہنگامہ خیزیوں کی نذر ہو گیا۔

''انجلینا! اب ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ آخر کب تک تم گڑیا کے کمرے میں سوتی رہو گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے کمرے میں میرے پاس سویا کرو اور یہ شادی کے بنا ممکن نہیں۔''

''کر لیں گے شادی..... اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' وہ انداز دلربائی سے مسکرائی۔

''کیا مطلب..... جلدی کیا ہے؟ شادی کے بعد ہم دونوں نے واپس بھی تو جانا ہے نا۔ اب ہم اس غریب اور پسماندہ ملک میں تو اپنی زندگی گزار نہیں سکتے اور نہ ہی اپنی اولاد کی زندگی تباہ و برباد ہوتے دیکھ سکیں گے۔''

''مگر واپس کہاں جانا ہے۔ میں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا ارادہ لے کر آئی تھی۔''

''نہیں انجلینا! ہم اپنی فیملی انگلینڈ میں ہی بنائیں گے۔ یہاں کا ماحول اور حالات بہت خراب ہیں۔'' میں نے اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

''یعنی تم مجھ سے شادی کر کے انگلینڈ جانے کے خواب دیکھ رہے ہو.....؟'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''ظاہر ہے..... تم برطانوی شہریت رکھتی ہو تو مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی جانا ہو گا۔''

''اتنی جلدی نہیں جا سکو گے۔ مجھے وہاں جا کر تمہارے پیپرز بنوانے پڑیں گے۔''

''کتنا ٹائم لگے گا پیپرز بنوانے میں؟''

''یہی کوئی چھ سات ماہ۔'' اس نے جواب دیا۔

www.urdubayeem.com

''کوئی بات نہیں..... میں تمہارے بنا یہ چھ، سات ماہ اوکھا سوکھا ہو کے گزار لوں گا۔'' میں نے لہجے میں حتی المقدور رقت بھرنے کی کوشش کی۔

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میں اس سے شادی ہی انگلینڈ جانے کے لیے کرنا چاہتا تھا اور انگلینڈ جا کے سیٹلڈ ہونے کا خواب صرف میرا اکیلے کا نہیں، بلکہ میری پوری فیملی کا تھا۔

اماں اس چھت والے واقعے کے بعد سے انجلینا سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھیں۔

اگر میں یہ کہتا کہ صرف میرے فیوچر کی وجہ سے اماں اور ابا اس کا وجود اس گھر میں برداشت کر رہے تھے، تو غلط نہ ہوتا۔

ورنہ ان کا بس چلتا تو انجلینا کو کان سے پکڑ کر کب کا باہر نکال دیتے۔

اور اگر بات صرف خالی میرے مستقبل کی ہوتی تو شاید وہ برداشت کی اس انتہا کو بھی نہ پہنچتے۔ درحقیقت انہیں میرے فیوچر کے ساتھ ساتھ فارس اور گڑیا کا فیوچر بھی برائٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

ایک رات میں حسبِ عادت و حسبِ معمول انجلینا سے شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

خواب میں وہ لال جوڑا پہنے میری دلہن بنی حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی اور میں کالی شیروانی پہنے اس کے سامنے، اس کا ہاتھ تھامے بیٹھا، اس کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ جب اچانک اماں نے میرے سینے پر دو، تین مار کے میرے ارمانوں پر شب خون مارا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''اماں کیا کرتی ہو؟ جگانے کا یہ کون سا طریقہ ہے بھلا۔ اس طرح بندے کو ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہارٹ اٹیک تو تجھے ویسے بھی ہو جانا ہے نامعقول یہ خبر سن کر۔''

''کون سی خبر.....؟'' میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔

''تمہاری انجلینا بھاگ گئی۔'' اماں نے گویا بم پھوڑ دیا۔

''بھاگ گئی؟'' میں بھونچکا رہ گیا۔

''اچھی طرح دیکھو اماں، چھت پر ہو گی۔ دھوپ سینک رہی ہو گی۔''

''وہ اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔ چھت پر دھوپ سینکنے جاتی تو اپنا سامان ساتھ لے کر نہ جاتی۔ یقین نہیں آتا تو جا کر خود دیکھ لے۔''

میں لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور گرتا پڑتا گڑیا کے کمرے میں جا پہنچا۔ گڑیا بھی پریشان نظروں سے کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''گڑیا..... انجلینا کہاں گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا بھائی..... جب میں جاگی تو وہ غائب تھی۔''

''کہاں جا سکتی ہے؟'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ اس کا سامان بھی غائب تھا۔

''دل کو سمجھا لے۔ وہ صرف وقت گزارنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ تمہیں الو بناتی رہی، اور ہم سب کو گدھا۔ پورا مہینا ہم سب سے مفت کی خدمتیں کرواتی رہی مہارانی۔ اور جب اس کا دل بھر گیا تو یہاں سے چلتی بنی۔'' اماں کی زہر افشانی ساتھ ساتھ جاری تھی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے اماں۔ اس نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔'' میں روہانسا ہو رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی سائڈ والا تکیہ اٹھایا تو نیچے سے ایک کاغذ کا پرزہ برآمد ہوا۔

میں کھول کر پڑھنے لگا۔ انجلینا نے انگریزی میں میرے نام ایک پیغام لکھا تھا۔

''ہائے ویرس!

آج تمہیں ایک سچائی سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں پاکستان تم سے شادی کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ بلکہ کسی اور مقصد کے لیے آئی تھی۔ چھ ماہ پہلے لاہور کے ایک پروڈیوسر سے انگلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں، اپنے یونٹ کے ہمراہ انگلینڈ آیا تھا۔ اس نے ملاقات کے دوران مجھے اپنی اگلی فلم میں بطور ہیروئن لینے کا وعدہ کیا۔ ایک ہفتہ ہم نے وہاں بہت اچھا وقت گزارا۔

ایک ہفتے بعد وہ واپس آ گیا۔ اور اپنا وعدہ بھول گیا شاید مگر میں اس سے مسلسل رابطے میں تھی۔ جب وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لیتا رہا، تو میں اس کے پیچھے پاکستان آ گئی۔ لاہور اس کی رہائش گاہ پر گئی، تو پتا چلا کہ وہ ایک ماہ کے لیے سنگاپور گیا ہوا ہے۔ کسی نئی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں۔ میرے پاس کسی اچھے ہوٹل میں رہنے اور کھانے پینے کے لیے مناسب بندوبست نہیں تھا۔ یعنی اتنی رقم نہ تھی کہ ایک ماہ کے لیے کسی ہوٹل کا انتظام کر سکتی۔ پھر اچانک میرے ذہن میں تمہارا خیال آیا اور میں تمہارے دیے ہوئے اس ایڈریس پر یہاں آ گئی۔ تم اور تمہاری فیملی نے بہت اچھا سلوک کیا میرے ساتھ۔ میں ہمیشہ تم لوگوں کو یاد رکھوں گی۔ بس ایک بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ، تمہارے گھر میں رہنے اور تمہاری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے مجھے تم سے شادی کا جھوٹا وعدہ کرنا پڑا جس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا ... انجلینا!''

www.aitmayjeem.com

وہ خط پڑھ کر گویا ساتوں آسمان مجھ پر گر پڑے۔ میں کتنی دیر تک کچھ بولنے اور سمجھنے کے قابل نہ رہا اور جب ہوش و حواس میں واپس آیا، تو اماں کو انجلینا کے خط کا اردو میں ترجمہ کر کے سنایا۔

اماں سن کر اپنا سینہ پیٹنے لگی۔ اپنے بچوں کا روشن مستقبل اچانک تاریکیوں میں ڈوبتا دیکھ کر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

میں نے کاغذ کے اس پرزے کے ٹکڑے کر کے ڈسٹ بن کے حوالے کیے۔ اور اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا۔

''کمینی..... حرافہ۔ یہ انگریز عورتیں ہوتی ہی دو نمبر ہیں۔ بدچلن اور آوارہ..... کسی ایک مرد کے ساتھ رہ ہی نہیں سکتیں۔ میری تو قسمت ہی خراب ہے۔'' میں کافی دیر تک زیر لب بڑبڑاتا رہا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا۔

ایک ہفتہ اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتا رہا پھر ایک دن اچانک فیکٹری کے منیجر رمیز صاحب کی پرکشش آفر یاد آئی تو پھر سے کمر ہمت باندھی۔

اپنی ڈگریاں نکالیں۔ انہیں جھاڑ پونچھ کر فائل میں لگایا اور رمیز صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

''انجلینا صاحبہ کہاں ہیں؟'' انہوں نے کاغذات کے پلندے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''وہ تو واپس چلی گئیں۔'' میں نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''سوری! یہ جاب کی آفر ان کے لیے تھی اور ان کے حوالے سے ہی آپ کو ملنی تھی۔ اگر وہ نہیں رہیں تو آپ کو بھی ہم نہیں رکھ سکتے۔'' اس نے فائل میرے آگے پٹخی۔

میں نے وہ فائل اٹھائی۔ منیجر پر ایک ہزار لعنت بھیجی اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا دفتر سے باہر آ گیا۔

دماغ جیسے ساتویں آسمان پر پہنچا تھا، اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے زمین پر واپس آیا تھا۔

اب میں تھا اور میری بے روزگاری تھی۔ مایوسی تھی اور شدت کی لاچاری۔ بالآخر حالات سے مجبور ہو کر جھوٹی شان اور انا کو ایک سائیڈ پر رکھا اور فاسٹ فوڈ کارنر کھول لیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کام چل نکلا۔ گھر میں خوشحالی آ گئی۔ میں نے دوسروں کے سہارے تلاش کرنے چھوڑ دیے تھے اور حقیقت کی دنیا میں جینا سیکھ لیا تھا۔

جیسے ہی اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہوئے زندگی گزارنے کی ابتدا کی، زندگی آسان سے آسان تر ہوتی چلی گئی۔

اماں ابا میری بدلی ہوئی روش کو دیکھ کر بہت خوش تھے۔ بزنس سیٹ ہوا تو اماں کو میری شادی کی فکر لاحق ہونے لگی۔

انہوں نے اپنی بھانجی کا ہاتھ میرے لیے مانگ لیا۔ یوں سادگی سے منگنی طے پا گئی اور زویا میرے نام سے منسوب ہو گئی۔

ایک دن دکان سے لنچ کرنے کے لیے گھر آیا، تو صحن میں انجلینا بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور پہلے والا رنگ و روپ اور شادابی ناپید تھی۔

اسے دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''کیوں آئی ہو یہاں؟'' میں چلایا۔

''پیرس..... میری بات سنو پلیز۔'' وہ گڑگڑائی۔

''نکل جاؤ یہاں سے..... اور دوبارہ کبھی اپنی شکل مت دکھانا۔''

''پہلے میری پوری بات تو سن لو۔ اگر میری آفر پسند نہ آئے تو چلی جاؤں گی۔ میں تم سے شادی کرنے کے لیے آئی ہوں۔ شادی کے بعد ہم دونوں انگلینڈ چلے جائیں گے۔ وہاں اپنی فیملی بنائیں گے۔''

''مجھے تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنی اور نہ ہی انگلینڈ جانا ہے۔ میں یہاں پر بہت خوش ہوں۔ میرا ملک غریب اور پسماندہ سہی مگر یہاں بھی محنت کرنے والے خوشحال... زندگی گزار سکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر میں گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ کب تک رکی، اور کب واپس گئی، مجھے علم نہیں۔ رات کو جب واپس آیا، تو وہ جا چکی تھی۔

مگر جاتے جاتے اماں کے ہاتھ میں ایک خط دے گئی تھی۔

خط پڑھ کر پتا چلا کہ لاہور کے اس فلم پروڈیوسر نے اسے ایک سال اپنے پاس رکھیل بنا کر رکھا تھا اور پھر جب اس کا دل بھر گیا تو اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔

وہاں سے دھتکارے جانے کے بعد اس نے پھر سے میرے گھر کا رخ کیا تھا۔ جہاں اس کے خیال میں ایک لالچی اور دوسروں کے آسروں پر زندہ رہنے والا پتھر نما پارس رہتا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ پارس اب حقیقت میں پارس بن چکا تھا۔

⌘⌘⌘

www.aiffayjeem.com

محفلِ شعر و سخن

❁ حاجی زاہد اقبال..... حافظ آباد

کبھی تو لوٹ آئے گا جو دور سمندر پار گیا
ہر روز نئے اک جذبے سے ہم خود کو سنوارا کرتے ہیں

❁ محمد رشید سیال..... روہڑی ضلع سکھر

کتنے دور نکل گئے رشتے نبھاتے نبھاتے
خود کو کھو دیا ہم نے اپنوں کو پاتے پاتے
لوگ کہتے ہیں ہم مسکراتے بہت ہیں
اور ہم تھک گئے درد چھپاتے چھپاتے

❁ محمد شہباز اکرم لوئی..... پاک پتن شریف

گفتگو ہم سے اور خیالوں میں کوئی اور
حال آپ کا بھی میری نمازوں جیسا ہے

❁ دل افگار..... حیدر آباد

آج پھر یاد بہت آیا وہ
آج پھر اس کو دعا دی ہم نے
کوئی بات تو ہے اس میں فیض
ہر خوشی جس پہ لٹا دی ہم نے

❁ ایس سجاد..... اوکاڑہ

مدت کے بعد کی جو اس نے لطف کی نگاہ
جی خوش تو ہو گیا مگر آنسو نکل پڑے

❁ حرا خان..... حیدر آباد

کیا کہوں اس سے جو بات سمجھتا ہی نہیں
وہ تو ملنے کو ملاقات سمجھتا ہی نہیں

❁ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی

دیکھ مت چھیڑ چھلک جائے نہ پیمانۂ صبر
ہم زمانے کے رویوں سے بھرے بیٹھے ہیں

❁ امیر علی..... سرگودھا

اک نور تیرا صبحِ ازل دیکھ لیا تھا
اب تک ہے جگر چاک گریبان دو عالم
تو شاہد و مشہود ہے تو طالب و مطلوب
قائم تیرے جلوے پہ ہے ایوانِ دو عالم

❁ وزیر محمد خان..... بٹل ہزارہ

یاد ہیں سارے چراغ ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

❁ ریاض بٹ..... حسن ابدال

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا نام محبت ہو جائے

❁ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی

حوصلہ تجھ میں نہ تھا مجھ سے بچھڑنے کا
ورنہ تیری آنکھوں میں یہ کاجل پھیلا نہ ہوتا

❁ نجمی رحمان..... امریکا

نکل کر باغ جنت سے چلا آیا تھا دنیا میں
سنا ہے بعد محشر پھر اسی جنت کی دعوت ہے
چلا تو جاؤں جنت میں مگر اس سوچ میں گم ہوں
میں ابنِ آدم ہوں مجھ کو بہک جانے کی عادت ہے

www.aldjeem.com

❁ زرین خان ..... حیدرآباد

مری خوش نصیبیاں تھیں اگر آتا وہ ستم گر
کبھی جان صدقے کرتا، کبھی میں نثار ہوتا

❁ محمد شہریار..... سکھر

تیرے کرم کے معاملے کو تیرے کرم پر ہی چھوڑتا ہوں
میری خطا میں شمار کرلے میری وفا کا حساب کردے

❁ اسما محبوب..... فیصل آباد

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توہین ہوتی ہے
میں مسجودِ ملائیک ہوں مجھے انسان رہنے دو

❁ نوید ممتاز..... کراچی

سمجھ میں نہ آسکا یہ طلسم لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے اور شام آئے
نہ جانے کون سا آدم ہے آپ کا معیار
کہ ہم تو عرش پہ جاکر بھی ناتمام آئے

❁ عمران شیروانی..... حیدرآباد

مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کون سا گناہ کروں
کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو
کسے گلے سے لگاؤں، کسے تباہ کروں

❁ ریشا علی..... گھوٹکی

بلا رہے ہیں افق پر وہ زرد رو ٹیلے
کہو تو ہم بھی فسانوں کے راز ہو جائیں

❁ صبا سحر..... کراچی

میں جسے شرطِ ادب کہتا ہوں تو فرطِ حیا
عشق اور حسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی
ابھی انساں کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر و مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی

❁ آصف علی..... میرپورخاص

اجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے، اتار ہو کہ چڑھاؤ
خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمہاری بات چلی ہے مری حسین خطاؤ!

❁ محمد واجد..... ٹنڈوالہیار

رسائی اصل میں ہے انتہائے سرشاری
مسافرانِ محبت تھکن سے چُور نہ تھے

❁ جہانزیب علی..... ملتان

یہیں ملیں گے تمہیں پھول بھی ستارے بھی
بتا رہی ہے دل آویزیِ لباس ہمیں

❁ شاہینہ مہتاب..... چنیوٹ

ہرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

❁ فیاض احمد..... اوکاڑہ

کائنات ایک دشتِ بے انجام
اب کہاں ڈھونڈیے کسی کی گلی

❁ ناصر خان..... کوئٹہ

مچل مچل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لو
میں سوچتا ہوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں
سب درست، شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
حمر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

❁ ناہید یوسف..... اسلام آباد

کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے
ان کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

❁ یسریٰ خان..... پنڈی

ہم سے گئی رتوں نے عجب خوں بہا لیا
آنکھوں سے جھانکتا رہا چہرہ سوالیہ
کچھ ایسے دھوپ چھاؤں کے پہرے لگے رہے
نکلے حصارِ شب سے تو سورج نے آلیا

❁ مہوش..... خانیوال

چھت پر اترا ایک کبوتر لوٹ گیا
آنکھوں میں آیا ہوا منظر لوٹ گیا
سحر ہوئی اور جھلمل کرتے تاروں کا
اِک اِک کرکے سارا لشکر لوٹ گیا

❁ محمد آریز ملک..... کراچی

فیصلے کررہے ہیں عرش نشیں
آفتیں آدمی پہ آتی ہیں

❁ فواد علی..... گجرانوالہ

یہ تیری چاپ ہے یا میرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آئی ہے دور کی آواز

www.adbayjeen.com

مہتاب احمد..... حیدرآباد

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضور للسلۂ خیر و شر کا ذکر کریں

مجاہد علی..... سکھر

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سن رہا ہوں میں

ثنا احمد..... دوہڑی

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

فرح معراج..... اسلام آباد

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخیِ گفتارِ دوست

محمد انور ندیم..... اوکاڑہ

کوئی نہیں ہے یہاں اعتبار کے قابل
کسی کو راز بتاؤ گے، مارے جاؤ گے

ناظر علی..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

نغمہ ہائے دل کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

قاسم علی..... نواب شاہ

جب ہم اداس ہوتے ہیں
بس اپنے پاس ہوتے ہیں

جواد علی..... ملتان

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

غزالہ حیدر..... بہاولنگر

آتشِ جاں سے گزر جانے کا
زندگی نام ہے مر جانے کا

سحرش خان..... قصور

تھکے مسافروں کو نیند آگئی
ہوا کا شور بادبان میں رہا

قیوم علی..... مری

تری طلب ترے گمان میں رہا
میں ایک عمر امتحان میں رہا

یوسف خان..... سیالکوٹ

بعد اس کے یہ بھید مجھ پہ کھلا
جی رہا ہوں میں زندگی اس کی

پرویز احمد..... خانپور

مری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں

امتیاز احمد..... منڈی بہاالدین

جب تک پاؤں کے نیچے تھی زمیں
آسماں سر پہ اٹھاتا ہی رہا

اسلم احمد..... چنیوٹ

تو نے کہا تھا عشق میں تنہا کون جیا کرتا ہے
تجھ کو بھول گئے اور تیری بات ہمیشہ یاد رکھی

نوید رشید..... خیرپور

منڈیر پر چراغ رکھ دیتے ہیں خود جلائے گا
وہ آنے والا شخص جانے کس طرف سے آئے گا

رومانہ پرویز..... کراچی

مرا خوں بہا مرے لوگ مجھ کو ادا کریں
مرا مسئلہ کسی تاج کا تھا نہ تخت کا

عظیم احمد..... جھنگ سٹی

یہ کس ترتیب سے اعضا معطل ہو رہے ہیں
کبھی آنکھیں نہیں ہیں اور کبھی چہرہ نہیں ہے

عاصم خان..... پشاور

یہ نگارِ جہاں ہے سلیم اس میں سب بولتے ہیں مگر
اپنی آواز سب سے الگ رکھ سکو تو زباں کھولنا

نعیم خان..... بی

سفر کی ابتدا ہوئی کہ تیرا دھیان آگیا
مری زمیں کے سامنے اک آسمان آگیا

www.alifhayjeem.com

انجام

شاکر لطیف

کہتے ہیں ہر انجام کی عمارت اعمال کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ وہ جو خوش گمانیوں میں مبتلا تھا، خود کو عقلِ کل اور سب سے زیادہ طاقتور سمجھتا تھا، وقت کے بھنور میں محض تنکے کے مانند چکراتا رہا اور بالآخر ان گہرے پانیوں میں کہیں گم ہو گیا... اسی کو وقت کہتے ہیں۔ بڑے بڑے تیس مار خان وقت کی دھول چاٹنے پر مجبور ہو گئے... پھر کیسے وہ بچ جاتا۔

[illegible] کے موڑ کے سراب ایک شیری بڑوں کا المناک واقعہ

''میری بات سچی اور سو فیصد حقائق پر مبنی ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم آج رات تک ساری رقم جوناتھن کے گھر میں موجود ہے۔ اس نے آج شام کیسینو سے تین لاکھ ڈالرز کی خطیر رقم جوئے میں جیتی ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی ہمت سے کام لیں تو یہ رقم حاصل کر سکتے ہیں۔'' ریگن نے اپنے سامنے بیٹھے جونی اور مارٹن کو مخاطب کیا۔

''یہ تھوڑی سی ہمت کا کام نہیں ہے۔'' جونی سگریٹ کا مرغولہ فضا میں بکھیرتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''جوناتھن جیسے آدمی کو لوٹ لینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم چھوٹے موٹے چور اور ڈکیت ہیں، یہ درست ہے کہ تم ہم سے زیادہ ذہین آدمی ہو اور ہم کسی بھی واردات کا ارتکاب کرتے وقت تمہارے پلان کے مطابق ہی آگے بڑھتے ہیں مگر اس بار تم جو منصوبہ لے کر آئے ہو، وہ ہماری اوقات سے بڑا ہے۔''

''انسان اپنی اوقات خود بناتا ہے۔'' ریگن نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ تمہاری سوچ ہی چھوٹی ہے۔ ذرا سوچو، آخر ہم کب تک اس طرح چھوٹی موٹی وارداتوں پر گزارہ کرتے رہیں گے۔ ہم پہلے دو دفعہ جیل کی ہوا کھا چکے ہیں اور تیسری دفعہ بھی اس کے امکانات روشن ہیں کبھی نہ کبھی ہم دوبارہ پکڑے جائیں گے اس لیے چھوٹے موٹے ہاتھ مارنے کے بجائے کوئی بڑا ہاتھ مارنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ قسمت نے ہمیں چانس دیا ہے۔ بس تھوڑی سی بہادری دکھانی ہوگی۔ کم ہمت انسان زندگی میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

''مگر یہ تو سوچو اس دفعہ تم، جوناتھن جیسے آدمی کو لوٹنے کا پلان بنا رہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک گینگسٹر ہے۔ وہ ہمیں اتنی آسانی سے مال لے کر جانے نہیں دے گا اور پھر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس نے رقم اپنے گھر میں رکھی ہوئی ہے؟'' اس بار مارٹن نے سوال کیا۔

''وہ رقم لے کر سیدھا اپنے گھر ہی گیا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب کر کے پوری تسلی کر لی ہے۔'' ریگن نے جواب دیا۔ ''شام کے وقت بینک تو بند ہو جاتے ہیں اس لیے وہ رقم لے کر اپنے گھر کے سوا کہاں جاتا؟ ویسے میری معلومات کے مطابق وہ بینک ڈیفالٹر ہے اور شاید اس سلسلے میں جلد ہی گرفتار بھی ہونے والا ہے۔ بینک ڈیفالٹر ہونے کی وجہ سے اکاؤنٹ میں رقم رکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تاہم اس کے بینک ڈیفالٹر ہونے کے بارے میں میری معلومات سو فیصد مصدقہ نہیں ہیں ممکن ہے وہ بینک ڈیفالٹر نہ ہو اور کل بینک کھلتے ہی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دے اس لیے ہمارے پاس بس آج رات کا ہی وقت ہے میری بات مان لو، میں نے کل اسے کیسینو میں یہ رقم جیتتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ رقم کے ساتھ وہ کلب سے شراب کی بوتل بھی لے کر گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ شراب کے نشے میں دھت ہوگا۔ اگر کوئی جواری بہت بڑی رقم جیت جائے تو پھر اس کا جشن بھی مناتا ہے۔ نشے کی حالت میں اسے آسانی سے قابو کیا جا سکتا ہے۔ بڑا سوچو گے تو بڑا بنو گے۔ جوناتھن کو ہی لے لو، صرف چند برس پہلے ہی کی بات ہے۔ جب یہی جوناتھن پٹرول میں ملاوٹ کر کے اسے فروخت کیا کرتا تھا۔ یہ صرف تین چار برس پرانی ہی تو بات ہے۔''

''ہاں، اس کے بارے میں کچھ ایسا میں نے بھی سنا تھا۔'' مارٹن نے کہا۔ ''یہ چند برس پرانی بات ہے۔ اس زمانے میں پٹرول میں ملاوٹ کا دھندا عروج پر تھا تاہم بعد میں حکومت کی سخت پالیسیوں کی وجہ سے ماند پڑ گیا۔ میں نے سنا تھا جوناتھن نے اپنے گھر کے تہ خانے میں ہی یہ کام شروع کر رکھا تھا۔ بہرحال اس قصے کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ بالفرض تمہارا پلان کامیاب ہو بھی جاتا ہے اور ہم جوناتھن کو لوٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ..... تو کیا بعد میں وہ ہمیں زندہ چھوڑے گا؟''

''وہ ہمیں تبھی زندہ چھوڑے گا جب ہم اسے زندہ چھوڑ کر آئیں گے۔'' ریگن نے سفاکانہ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' اس بار جونی حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ ریگن کا جواب سن کر مارٹن کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''مطلب سیدھا اور صاف ہے۔'' ریگن نے بدستور سفاکانہ لہجے میں کہا۔ ''رقم حاصل کرنے کے بعد ہم جوناتھن کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' مارٹن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم جانتے ہو ہم چور اور ڈاکو ضرور ہیں مگر قاتل نہیں ہیں۔ ہم نے آج تک کسی انسان کی جان نہیں لی۔ ہم اسے مارے بغیر بھی یہ واردات سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہم بہ وقتِ واردات چہرے پر ماسک پہن لیں گے؟''

''اگرچہ تمہاری بات میں وزن ہے مگر میرے خیال میں اسے زندہ چھوڑنا بہت بڑا رسک ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جوناتھن ہمارے چہرے پر ماسک ہونے کے باوجود ہمارے قدوقامت اور چال سے ہی ہمیں پہچان لے گا۔ وہ بہت کائیاں اور شاطر آدمی ہے اور پھر اس نے جوئے کے کلب میں مجھے بھی دیکھا ہے۔ اگر اس کے ساتھ اس طرح کی واردات کا ارتکاب ہوتا ہے تو اس کا شک مجھ پر بھی جا سکتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہم تینوں کے لب و لہجے سے واقف ہے۔ اس نے رقم اپنے گھر میں کسی خفیہ جگہ چھپا رکھی ہوگی اور اس سے اس خفیہ جگہ کے بارے میں اگلوانے کے لیے ہمیں اس پر تشدد کرنا پڑے گا۔ بات چیت کے دوران اگرچہ ہمارے چہروں پر ماسک ہوں گے مگر اگر اس نے ہمارے لب و لہجے سے ہمیں پہچان لیا تو اسے زندہ چھوڑنا بہت بڑا رسک بن جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے آج تک کسی انسان کی جان نہیں لی مگر اس بار ہمیں ایسا کرنا پڑے گا۔ آج تک ہم چھوٹی موٹی وارداتیں سرانجام دیتے رہے ہیں اس بار ہم بڑا رسک لینے جا رہے ہیں۔ کامیابی کے بعد ہمارے حصے میں ایک ایک لاکھ ڈالرز کی رقم آئے گی۔ ایک

www.aiffayeem.com

لاکھ ڈالرز اتنی بڑی رقم ہے کہ ہمیں دوبارہ کوئی واردات کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس رقم سے ہم برسوں تک عیش کر سکتے ہیں۔"

"مگر تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس نے پورے تین لاکھ ڈالرز ہی جیتے ہیں۔ تم نے کیا وہ رقم گن کر دیکھی ہے؟" جونی نے پوچھا۔

"تم بھی نرے گاؤدی ہو۔" ریگن نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ "اتنا بھی نہیں جانتے کہ کیسینو میں جوا کیش رقم کے بجائے کیسینو کے مہر یافتہ ٹوکنز سے کھیلا جاتا ہے اور رقم ٹوکن واپس دے کر کاؤنٹر سے حاصل کی جاتی ہے۔ میں نے جوناتھن کو رقم کاؤنٹر سے حاصل کرتے دیکھا تھا۔ اسے پورے تین لاکھ ڈالرز گن کرا دیے گئے تھے۔"

مارٹن اور جونی نے اس بار ریگن کی بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا تاہم ان کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ ریگن کے دلائل نے اب ان پر اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ آخر وہ کب تک اس طرح چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے رہیں گے؟ وہ یہ بات بھی جانتے تھے کہ پچھلی دو وارداتوں میں پکڑے جانے کے بعد عدالت نے انہیں زیادہ لمبی سزا نہیں سنائی تھی مگر ممکن تھا کہ اس بار پکڑے جانے کی صورت میں انہیں لمبی سزا ہوتی کیونکہ اب ان کا نام عادی مجرموں کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ اب انہیں عدالت سے کوئی رعایت نہیں ملنے والی تھی۔ جب پکڑے جانے کی صورت میں لمبی جیل یاترا کرنی ہی تھی تو پھر ہاتھ بھی لمبا ہی مارنا چاہیے اور پھر یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ وہ ناکام ہی ہوتے۔

"جوناتھن کوئی عام آدمی نہیں ہے۔" قدرے توقف کے بعد جونی پُرخیال لہجے میں بولا۔ "اس کا شمار اس شہر کے مانے ہوئے غنڈوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک سابق باکسر بھی ہے اور گینڈے جیسی جسامت کا مالک ہے۔ اگر اسے موقع مل گیا تو وہ مار مار کر ہم تینوں کا بھرکس نکال دے گا۔"

"ہم اسے موقع دیں گے تبھی وہ مار مار کر ہمارا بھرکس نکالے گا۔" ریگن نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ "ہم مسلح ہو کر وہاں جائیں گے اور اسے گن پوائنٹ پر یرغمال بنا کر اس کے متعلق معلوم کریں گے۔"

"ایک بار پھر سوچ لو ریگن۔" مارٹن نے کہا۔ "اگرچہ میں جونی کو عقل سے پیدل سمجھتا ہوں مگر اس کی بات سے متفق ہوں کہ اس بار ہم اپنی اوقات سے بڑا کام کرنے جا رہے ہیں۔ ناکامی کی صورت میں ہمیں دوسرا چانس نہیں ملے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اپنی زندگیوں سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ جوناتھن بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"وہ کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو، ہے تو ایک انسان ہی۔ کیا گولی لگنے سے اس کے جسم سے خون نہیں بہے گا یا اس کی موت واقع نہیں ہوگی؟ حقیقت یہی ہے کہ وہ بھی ایک گولی لگنے سے اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ اپنی بزدلانہ سوچ ایک طرف رکھ کر سوچو گے تو تمہیں میری بات سمجھ آ جائے گی۔" ریگن نے پُرزور لہجے میں کہا۔

"ہمیں بزدلی کا طعنہ مت دو۔" مارٹن ہلکے سے غصے سے بولا۔ "ہم عرصہ دراز سے تمہارے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔ ہر واردات کے وقت جتنا رسک تم اٹھاتے ہو اتنا ہم بھی اٹھاتے ہیں۔"

"شاید تم میری بات کا برا منا گئے ہو۔" مارٹن کو غصے میں آتے دیکھ کر ریگن مفاہمت آمیز لہجے میں بولا۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تم دونوں کو خود سے کمتر سمجھتا ہوں۔ میں تو بس تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اگر قسمت نے ہمیں ایک موقع دیا ہے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ یقین کرو اگر آج تم دونوں نے میری بات نہ مانی تو زندگی بھر پچھتاوے کا شکار رہو گے اور جونی! تم تو خود مجھ سے ایک دو بار کہہ چکے ہو کہ چھوٹی موٹی وارداتوں کے بجائے ہمیں کوئی بڑا ہاتھ مارنا چاہیے۔ اب جب میں ایک منصوبہ لے کر آیا ہوں تو پھر یہ تذبذب کیسا؟"

جونی نے ریگن کی بات کا جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا مگر اس سے پہلے وہ مارٹن کا زناٹے دار تھپڑ کھا کر صوفے سے نیچے جا گرا۔ جونی نحیف سی جسامت کا مالک تھا جبکہ اس کے برعکس مارٹن خاصا گرانڈیل اور طاقتور تھا اس لیے اس کے ایک ہی تھپڑ نے اسے صوفے سے گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"احمق آدمی! تم نے پھر وہی حرکت کی۔" مارٹن اپنا ہاتھ مسلتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تکلیف کے تاثرات بھی موجود تھے۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" زمین پر گرا جونی تیزی سے اٹھ کر بولا۔ اس کے لہجے میں بھی غصے کی رمق واضح تھی۔

"تم نے بے خیالی میں اس کے ہاتھوں پر جلتا سگریٹ لگا دیا ہے۔" مارٹن کے بجائے ریگن نے جواب دیا۔ "تمہاری غائب دماغی کی یہ عادت یا مرض اب ہمارے لیے مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔"

"تم جانتے ہو اس میں میرا کوئی قصور نہیں، پھر تھپڑ مارنے کی کیا ضرورت تھی۔" جونی اس بار ٹھنڈے لہجے میں

www.pklibrary.com

بولا۔ ''مارٹن کو تو مجھے تھپڑ مارنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ اپنی طاقتور جسامت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جونی دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا تاہم وہ ایک ہاتھ سے ابھی تک اپنا گال سہلا رہا تھا۔ اس نے زمین پر گرا اپنا سگریٹ بھی نہیں اٹھایا تھا۔

''میں تمہیں متعدد بار مشورہ دے چکا ہوں کہ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ میرا خیال ہے تمہارے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔'' ریگن نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی متعدد بار تمہارے مشورے پر تمہیں بتائے بغیر عمل کر چکا ہوں مگر کوئی افاقہ نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میرا مرض سو فیصد نفسیاتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس کے لیے مجھے کسی دوا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے مضبوط قوتِ ارادی کی بدولت اس مرض پر قابو پانا ہوگا۔''

''اسی وجہ سے کسی واردات کا ارتکاب کرتے وقت ہم تمہیں پسٹل نہیں دیتے، مبادا تم اس کا ہم پر ہی استعمال نہ کر دو۔ غائب دماغی کی حالت میں تمہارا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اگرچہ تم صرف چند لمحے کے لیے ہی ذہنی طور پر غیر حاضر ہوتے ہو مگر کسی پر گولی چلانے کے لیے چند سیکنڈ بھی بہت ہوتے ہیں۔ تم مجھے کہیں کسی بڑے نقصان سے نہ دوچار کر دو۔'' مارٹن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''میرا مرض اتنا بھی خطرناک نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔'' جونی منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اصولی طور پر تو تمہیں مجھے ایک نفسیاتی مریض کے طور پر ٹریٹ کرنا چاہیے مگر تمہارا رویہ ہمیشہ میرے ساتھ غیر انسانی ہوتا ہے۔''

''میرے خیال میں تم دونوں غیر ضروری بحث میں الجھ گئے ہو ہمیں اصل موضوع کی طرف آنا چاہیے۔'' ریگن نے سنجیدہ لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔ ''تو بتاؤ کیا تم میرے پلان میں میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو؟''

''میرے خیال میں تمہارے پلان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔'' مارٹن تحمل کے لہجے میں بولا۔ ''اگرچہ جوناتھن جیسے آدمی کو لوٹنا ایک پُرخطر کام ہے مگر میں تمہاری اس بات سے سو فیصد متفق ہوں کہ ہم کب تک چھوٹے موٹے ہاتھ مار کر گزارہ کرتے رہیں گے۔ کیوں نہ ایک ہی بار کوئی بڑا ہاتھ مارا جائے۔ شاید تمہاری یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ جوناتھن کی صورت میں قسمت نے ہمیں ایک اچھا موقع دیا ہے۔ ہمیں اس چانس کو مس نہیں کرنا چاہیے۔''

''جونی! تم کیا کہتے ہو؟'' مارٹن کو رضامند ہوتے دیکھ کر ریگن، جونی کو استفسار طلب نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا۔

''شاید میرے پاس بھی انکار کی گنجائش نہیں ہوگی۔'' جونی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے میں بھی ہامی بھروں گا۔ اگرچہ جوناتھن کو لوٹنے کے معاملے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں مگر انسان کو زندگی میں کبھی کبھی بڑا رسک بھی لینا پڑ جاتا ہے۔''

''تو پھر فیصلہ ہو گیا۔'' ریگن مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم آج رات گیارہ بجے کے قریب جوناتھن کی رہائش گاہ کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔ ہمارے پاس دو پسٹل موجود ہیں۔ ایک مارٹن کے پاس رہے گا جبکہ دوسرا میرے پاس۔ سائلنسر کا بندوبست بھی میں کر کے آیا ہوں۔ اس واردات میں بے آواز پسٹل کی موجودگی بڑی ضروری ہے۔''

''کیا مطلب..... کیا تم نے سائلنسر کا بندوبست پہلے ہی کر لیا ہے؟ کیا تم جانتے تھے کہ ہم تمہارا ساتھ دینے پر رضامند ہو جائیں گے؟'' مارٹن نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، مجھے یقین تھا کہ تم رضامند ہو جاؤ گے۔'' ریگن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں تمہیں عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔''

جونی، مارٹن اور ریگن کا ساتھ تقریباً کافی پرانا تھا۔ وہ عرصہ دس برس سے ایک ساتھ مل کر وارداتیں کر رہے تھے اور اس سلسلے میں دو دفعہ پولیس کے ہتھے بھی چڑھ چکے تھے جس کے بعد کچھ عرصہ جیل میں گزارنا پڑا تھا تاہم یہ واقعہ تقریباً تین سال پرانا تھا۔ اب وہ بہت سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کوئی واردات کرتے تھے اور اسی وجہ سے پچھلے تین سال سے گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ جب سے انہوں نے کسی بھی واردات کی پلاننگ کی تمام ذمے داری ریگن کے سپرد کی تھی، اس وقت سے وہ آج تک ایک بار بھی گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ریگن ان سے زیادہ ذہین اور شاطر آدمی ہے اور ریگن نے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ ثابت بھی کیا تھا۔

جونی اور مارٹن میکسیکو نژاد ہونے کے ساتھ ساتھ ہم عمر اور بچپن کے دوست بھی تھے۔ انہوں نے چھوٹی موٹی چوریوں کا آغاز بچپن سے ہی کر دیا تھا۔ جب ان کے ماں باپ کی وفات ہوئی تو ان کے عزیزوں اور بہن بھائیوں نے بھی ان کی حرکتوں کی وجہ سے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا اس لیے وہ دونوں اکٹھے رہنے لگے۔ رہائش کے لیے انہوں نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر حاصل کر رکھا تھا اور پھر تقریباً دس سال پہلے

www.darbaryeem.com

ریگن بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اب وہ تینوں مل کر جرم کی دنیا میں اپنا راستہ بنا رہے تھے۔

جونی کے ساتھ ایک ذہنی مسئلہ تھا۔ وہ بچپن ہی سے غائب دماغی کے مرض میں مبتلا تھا اور دن میں کئی بار اس پر غائب دماغی کا دورہ پڑتا تھا جس کی وجہ سے وہ چند سیکنڈ کے لیے ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتا تھا اور اس دوران نادانستگی میں کوئی ایسی حرکت بھی کر گزرتا تھا جو کسی دوسرے کو ناگوار گزرتی تھی۔ اکثر اوقات اس کی ذہنی غیر حاضری کا یہ مختصر دورانیہ بخیر و عافیت گزر جاتا تھا مگر کبھی کبھی وہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے والی حرکت کر دیتا تھا جیسے کسی دوسرے پر گرم گرم کافی انڈیل دینا یا اس کے ہاتھ پر جلتا ہوا سگریٹ لگا دینا۔ آج اس نے مارٹن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا۔ مارٹن اس کے بچپن کا دوست تھا۔ وہ شروع شروع میں جونی کی ایسی حرکتوں کو نفسیاتی مرض کا شاخسانہ سمجھ کر درگزر کر دیا کرتا تھا مگر اب اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

مارٹن اور وہ بچپن ہی سے جرائم کی دنیا میں داخل ہو گئے تھے۔ اس لیے وہ دوسرا کوئی کام بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پیسا کمانے کے لیے سب سے آسان راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے اور ان دونوں کا خیال تھا کہ مہینا بھر کسی جگہ کام کرنے کے بجائے صرف ایک دن تھوڑی سی ہمت کر کے کسی راہ گیر کو لوٹ کر اس کے مہینے بھر کی کمائی اپنے قبضے میں کر لینا زیادہ آسان ہے۔ وہ آج تک چھوٹی موٹی وارداتیں سرانجام دے کر اپنی گزر بسر کر رہے تھے مگر آج ریگن نے کچھ نیا کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس کا یہ منصوبہ پرکشش ہونے کے ساتھ ساتھ پُرخطر بھی تھا۔ ریگن نے شہر کے ایک نامی گرامی غنڈے کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جونی اور مارٹن جوناتھن کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اگرچہ مارٹن ایک طاقت ور اور مضبوط جسامت کا شخص تھا اور اس کے قبیل کے افراد اس وجہ سے اس سے دبتے بھی تھے مگر اس کے باوجود جوناتھن سے اس کا کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جوناتھن کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے جسم میں گینڈے جیسی طاقت ہے۔ مارٹن اور جونی نے کئی نامور غنڈوں کو اس کے ہاتھوں پٹتے دیکھا تھا۔ وہ ایک گینگسٹر تھا اور جونی اور مارٹن جیسے چھوٹے موٹے وارداتیوں کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ آج شام ریگن نے اسے کیسینو میں ایک بڑی رقم جیتتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ تین لاکھ ڈالرز کی رقم جوناتھن نے وصول کر لی تھی اور پھر وہ کیسینو سے شراب کی بوتل خرید کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ریگن نے اس کا تعاقب کر کے یہ تسلی بھی کر لی تھی کہ وہ رقم لے کر اپنے گھر ہی گیا ہے۔ اس کے بعد وہ سیدھا مارٹن اور جونی کے پاس آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جوناتھن کو اس کے گھر میں گن پوائنٹ پر آسانی سے یرغمال بنا کر لوٹا جا سکتا ہے۔ جونی اگرچہ ریگن کے منصوبے سے پوری طرح متفق نہیں تھا مگر ایک تو معاملہ بڑی رقم کا تھا اور دوسرا اس کے ہامی بھرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ مارٹن کے رضامند ہونے کے بعد اس کے پاس پیچھے ہٹنے کا کوئی جواز باقی نہیں بچا تھا۔

جونی کافی بنا کر ڈرائنگ روم میں لے آیا اور وہ سب کافی کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ اپنے پلان کی مزید جزئیات طے کرنے لگے۔ ریگن نے صرف ایک ہی سائلنسر کا بندوبست کیا تھا اور اس نے مارٹن کو بھی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ انتہائی ناگزیر صورتِ حال کے علاوہ گولی نہیں چلائے گا۔ جوناتھن کو ختم کرنے کے لیے ریگن نے اپنا بے آواز پسٹل استعمال کرنا تھا۔ مارٹن کا ریوالور صرف اپنی حفاظت کے لیے تھا۔ جونی کے ذہنی مرض کی وجہ سے حفظِ ماتقدم کے طور پر اسے ریوالور نہیں دیا جاتا تھا۔ مبادا وہ غائب دماغی کی حالت میں ان پر ہی گولی چلا دے۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت کی اس ذہنی غیر حاضری میں اس سے انجانے میں کوئی بھی خطرناک حرکت سرزد ہو سکتی تھی۔ وہ جب بھی کسی شکار کو لوٹتے تھے تو جونی کی اصل ذمے داری شکار کی تلاشی لینا ہوتی تھی۔ مارٹن اور ریگن اس دوران شکار کو گن پوائنٹ پر نشانہ بنا کر رکھتے تھے۔ ویسے انہوں نے کبھی کسی پر گولی نہیں چلائی تھی۔

ریگن جوناتھن کو باندھنے کے لیے نائلون کی مضبوط رسی کا بھی بندوبست کر کے آیا تھا۔ اس حقیقت سے وہ بھی آگاہ تھے کہ اگر جوناتھن نے رقم اپنے گھر کی کسی خفیہ جگہ پر چھپائی ہے تو پھر وہ آسانی سے رقم کے بارے میں نہیں بتائے گا۔ ممکن تھا کہ اس پر خاصا تشدد کرنا پڑے اور اس گینڈے کو تشدد سے پہلے رسیوں کی مدد سے بے بس کرنا ضروری تھا۔

جونی اور مارٹن سب سے زیادہ اس بات پر معترض ہوئے جب ریگن نے جوناتھن کے گھر تک کا سفر پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی اس بات پر ان دونوں نے بیک وقت اعتراض کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تینوں ریگن کی بائیک پر بھی جا سکتے ہیں یا پھر کوئی ٹیکسی وغیرہ استعمال کی جا سکتی ہے تاہم ریگن نے ان کا مشورہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ وہ مسلح ہوں گے اور رات کے وقت اگر پولیس کی کسی پٹرولنگ گاڑی کا ان سے سامنا ہو گیا اور انہوں نے شک کی بنا پر ان کی ٹیکسی یا بائیک کو روک کر ان کی تلاشی لے لی تو مسئلہ ہو جائے گا۔ راستے میں پولیس کی کسی گشتی گاڑی کا سامنا ہونے

www.allmayeem.com

کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے سخت سردی اور دھند کی وجہ سے سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں ایسے وقت میں ان کی گاڑی یا بائیک پولیس کی خاص توجہ کا مرکز بن سکتی تھی اور پھر وہ تینوں پولیس کے ریکارڈ یافتہ تھے۔ روکے جانے کی صورت میں پولیس والے انہیں ریکارڈ یافتہ مجرموں کے طور پر پہچان لیتے تو پھر ان کی جان تلاشی اور پوچھ گچھ کے بغیر نہیں چھوٹنے والی تھی۔ کچھ دیر کے مزید بحث و مباحثے کے بعد جونی اور مارٹن ریگن کی تجویز پر من وعن عمل کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس وقت نو بجے کا وقت ہو رہا تھا اور انہوں نے گیارہ بجے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس طرح جب وہ جوناتھن کے گھر پہنچتے تو تقریباً بارہ بجے کا وقت ہو جاتا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا ایسے وقت علاقے کے تمام باسی اپنے گھروں میں دبکے رہتے تھے۔ رات کے بارہ بجے خون منجمد کر دینے والی سردی میں کوئی بھی باہر نہیں نکلتا تھا اور ان تینوں کو یہ صورت حال سوٹ کرتی تھی۔ ان کا منصوبہ تبھی کامیابی سے ہمکنار ہوتا جب وہ کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے۔ واردات کے لیے استعمال ہونے والا دیگر ضروری سامان ان کے پاس پہلے سے ہی موجود تھا۔ ویسے تو وہ کسی بھی راہ گیر کو لوٹتے وقت چہرے پر ربڑ کے ماسک کا استعمال کرتے تھے تاکہ ان کی شکل کسی کی نگاہوں میں نہ آئے مگر اس بار کیونکہ انہوں نے واپس آتے وقت جوناتھن کو ختم کر دینا تھا اس لیے صرف ربڑ کے دستانے استعمال کرنے کا ہی فیصلہ کیا تھا تاکہ پولیس کو ان کے فنگر پرنٹس دستیاب نہ ہو سکیں۔ ابھی گیارہ بجنے میں دو گھنٹے باقی تھے اور انہوں نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لیے جانے سے پہلے کچھ پیٹ پوجا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عام طور پر مارٹن کھانا تیار کرتا تھا مگر آج کافی کی طرح جونی نے کھانا بنانے کی ذمے داری بھی اٹھائی اور اٹھ کر کچن کی جانب بڑھ گیا۔ مارٹن اور ریگن صوفوں پر ہی جمے رہے اور جونی کے کھانا بنانے کے دوران جوناتھن کے بارے میں بات کرتے رہے مگر تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی کچن میں جونی کی چیخ سنائی دی تو دونوں بے اختیار اچھل پڑے۔

''لگتا ہے اس نے پھر کوئی حرکت کی ہے۔ اس حرامزادے کی یہ بیماری اب میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔'' مارٹن نے غصیلے لہجے میں کہا اور تیزی سے کچن کی جانب بڑھ گیا۔ ریگن نے بھی اس کی تقلید کی۔

''کیا ہوا ہے؟'' کچن میں داخل ہوتے ہی مارٹن نے تیز لہجے میں پوچھا تاہم کچن میں داخل ہو کر اسے صورتِ حال کا کافی حد تک خود بھی ادراک ہو گیا۔

جونی کچن کے پانی والے نل سے اپنے ہاتھ پر پانی ڈال رہا تھا۔ چولہے پر آگ تو جل رہی تھی تاہم کھانے کا برتن زمین پر گرا ہوا تھا۔ برتن اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا اس لیے ریگن اور مارٹن کو اندازہ ہو گیا کہ فی الحال انہیں کھانا نہیں مل سکے گا۔

''شاید میں نے بے خیالی میں اپنا ہاتھ آگ پر رکھے کھانے کے برتن پر دے مارا تھا جس کی وجہ سے کھانے کا برتن زمین پر جا گرا۔'' جونی نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''بے خیالی میں نہیں، تم نے پاگل پن میں ایسا کیا ہے۔'' مارٹن جھنجلا کر بولا۔ ''میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تمہارے معاملے میں میری برداشت اب جواب دیتی جا رہی ہے!''

''اس پر پھر غائب دماغی کا دورہ پڑا ہے۔ مارٹن ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہاری ذہنی غیر حاضری کے دوروں میں لگاتار اضافہ ہونے لگا ہے۔ بہتر تھا کہ مارٹن خود کھانا بنا لیتا، ہمیشہ کھانا مارٹن ہی بناتا ہے۔'' ریگن نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''مجھے خیال ہی نہ رہا ورنہ اس پاگل کو کھانا بنانے کی اجازت نہ دیتا۔'' مارٹن نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''اس نے خود ہی کہا میں کھانا بناتا ہوں اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ ویسے کافی بھی اسی نے بنائی تھی۔ اس کا یہ غائب دماغی کا مرض ہمارے لیے کوئی بڑا مسئلہ .... کھڑا کر دے گا۔''

''اگر تمہیں میری بیماری سے اتنی چڑ ہے تو اپنے راستے جدا کر لو۔ مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ ایک تو گرم برتن کو ہاتھ مارنے کی وجہ سے میرا ہاتھ جل گیا ہے دوسرا تم نے بکواس شروع کر دی ہے۔'' جونی نے بھی اس بار غصیلے لہجے میں کہا۔

''بھاڑ میں جاؤ۔'' مارٹن نے جارحانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''تم جہاں جانا چاہتے ہو جا سکتے ہو، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس فلیٹ میں تم رہ رہے ہو اس کا کرایہ میں بھی شیئر کرتا ہوں۔ تم مجھے یوں جانے کا نہیں کہہ سکتے۔'' جونی نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ویسے تو وہ مارٹن سے دبتا تھا مگر نہ جانے کیوں آج غصے میں آ گیا تھا۔ شاید ہاتھ پر ہونے والی جلن کے احساس نے اسے وقتی طور پر مارٹن کے خوف سے بے نیاز کر دیا تھا ورنہ یہ حقیقت بھی کہ جتنا غصے میں وہ اس وقت نظر آ رہا تھا اتنا غصے میں تو وہ مارٹن کے تھپڑ کھانے کے بعد بھی نہیں آتا تھا۔

''تم دونوں نے خوامخواہ جھگڑا شروع کر دیا ہے۔'' ریگن نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اگر تم واقعی ایک

www.urdupoint.com

دوسرے سے الگ ہونا چاہتے ہو تو اپنا یہ ارادہ آج کی واردات کے بعد تک ملتوی کردو۔ اس کے بعد مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آج کی واردات کی کامیابی کے بعد ہمارے پاس اتنی دولت آجائے گی کہ ہمیں مزید کہیں واردات کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس کے بعد اپنا اپنا حصہ لے کر اگر تم دونوں علیحدہ ہونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں اس واردات کی کامیابی کے بعد جرائم کی دنیا کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اگر تم بھی یہ فیصلہ کرلو تو بہتر ہے۔ ایک لاکھ ڈالرز بہت ہوتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے آج کی واردات کے بعد میں سنجیدگی سے جونی سے الگ ہونے کے بارے میں سوچوں گا۔'' مارٹن نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر واپس مڑ گیا۔ ریگن نے پہلے کی طرح اس بار بھی اس کی تقلید کی تاہم جاتے جاتے اس نے جونی کو کہہ دیا کہ وہ زمین پر پڑے برتن سمیٹ لے۔ اب وہ کھانا کھائے بغیر ہی جائیں گے انہیں تین میل کا سفر پیدل طے کرنا تھا اس لیے خالی پیٹ جانا ہی بہتر تھا۔ بھرے پیٹ کی بہ نسبت خالی پیٹ پیدل سفر زیادہ آسان ثابت ہوتا۔

ریگن اور مارٹن واپس آکر صوفے پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد جونی بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گیا تاہم اس کا چہرہ اب بھی ستا ہوا تھا اس نے اپنے لیے سگریٹ بھی سلگا لیا تھا تاہم اس بار وہ مارٹن کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے دوسرے صوفے پر بیٹھا تھا۔

''اگر تمہارا ہاتھ زیادہ جل گیا ہے تو کوئی مرہم وغیرہ لگا لو۔'' ریگن نے ہمدردانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جلن کا احساس وقتی تھا۔ پانی ڈالنے سے مجھے آرام محسوس ہو رہا ہے۔'' جونی نے جواب دیا۔

اس کا جواب سن کر ریگن نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا اور پھر ان سے دوبارہ اپنے پلان کے بارے میں ڈسکس کرنے لگا۔ ریگن اپنے پلان سے سو فیصد مطمئن تھا تاہم جونی اور مارٹن اگرچہ رضامند ہو چکے تھے مگر وہ اعصابی دباؤ کا بھی شکار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر جوناتھن کو موقع مل گیا تو وہ انہیں جان سے مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ اس سے بچنے اور پلان کی کامیابی کا دارومدار اسی نکتے پر تھا کہ وہ اسے اس کے حرکت میں آنے سے پہلے قابو کر لیتے اور پھر اس سے پیسے نکلوانے کے بعد اسے ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیتے۔ جوناتھن کے گھر میں داخل ہونے کی ذمے داری ریگن کی تھی مگر مسئلہ صرف گھر کے اندر داخل ہونا نہیں تھا بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ انہیں گھر کے اندر اس طرح داخل ہونا تھا کہ جوناتھن کو ان کی آمد کی خبر نہ ہو سکے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا اور ان کے اعصابی دباؤ میں بھی اضافہ ہو رہا تھا تاہم یہ کیفیت جونی اور مارٹن کی تھی۔ ریگن کافی حد تک مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

گیارہ بجے وہ مکمل تیاری کے ساتھ گھر سے نکل پڑے۔ ان تینوں نے رین کوٹ پہن رکھے تھے۔ کوٹ کی جیبوں میں ریوالور کے ساتھ اس واردات میں استعمال ہونے والا تمام ضروری سامان بھی منتقل کر لیا گیا تھا۔ باہر نکلتے ہی سردی اور دھند نے ان کا استقبال کیا۔ یہ صورتِ حال ان کے حق میں جاتی تھی۔ دھند کی وجہ سے ان کا دور سے دکھائی دینا بالکل ناممکن تھا۔

پولیس کی نظروں میں آنے سے بچنے کے لیے وہ اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے تھے۔ یہ فلیٹ بھی انہوں نے حال ہی میں لیا تھا اس لیے جونی اور مارٹن اس علاقے کی تنگ و تاریک گلیوں سے ناواقف تھے۔ یہ پُرپیچ گلیاں کسی بھول بھلیوں سے کم نہ تھیں۔ انجان آدمی ان گلیوں کے راستے کسی کی مدد کے بغیر شاید اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا مگر یہ علاقہ ریگن کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ ان گلیوں کے ہر رمز سے بخوبی آگاہ تھا کیونکہ اس علاقے میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ یہ فلیٹ بھی اسی کے توسط سے حاصل کیا گیا تھا۔ راستے سے آگاہ ہونے کی وجہ سے وہ آگے چل رہا تھا جبکہ مارٹن اور جونی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اگرچہ رات کے گیارہ بجے اور شدید دھند کی وجہ سے خاصی سردی تھی مگر تیز چلنے کی وجہ سے ان کے جسم گرم ہو گئے تھے جس سے سردی کا احساس قابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک ان گلیوں میں آگے بڑھتے رہے، اس دوران ان کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ سردی کی وجہ سے ہر طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ پُرپیچ گلیوں میں ریگن نے چلتے وقت کافی مرتبہ ٹرن لیا۔ جونی اور مارٹن خاموشی سے اس کی تقلید کرتے رہے ویسے انہیں اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہو گیا تھا کہ اگر ریگن ان راستوں سے واقف نہ ہوتا تو آگے بڑھنا خاصا مشکل ہوتا۔ ایک گھنٹے بعد ان کا سفر اختتام پذیر ہو گیا۔ ریگن ایک گھر کے پاس جا کر ٹھہر گیا تھا۔

''ہماری منزل آگئی ہے۔'' ریگن نے ہلکی آواز میں کہا۔

جونی اور مارٹن جوناتھن سے تو اچھی طرح واقف تھے مگر اس کے گھر کی جانب پہلی بار آئے تھے۔ انہیں یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ یہ جوناتھن کے گھر کا عقبی حصہ ہے۔

''اس کے تعمیراتی ڈھانچے تک پہنچنے کے لیے پہلے

www.alifbayjeem.com

ایک چھوٹا لان کراس کرنا ہے۔'' قدرے توقف کے بعد ریگن دوبارہ بولا۔

''اگرچہ عقبی دیواریں زیادہ اونچی ہیں تاہم میرے لیے مارٹن کی مدد سے ان پر چڑھنا کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوگا، تاہم مارٹن اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ اتنی بلند و بالا دیوار پار کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ جونی کو بھی دیوار پھاندنے کی ضرورت نہیں ہے، میں اندر جاکر مین گیٹ کا دروازہ کھولتا ہوں۔ تم دونوں دروازے سے اندر داخل ہونا۔'' بات کرنے کے دوران ریگن آس پاس کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ویسے تو دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک دیکھنا ناممکن تھا تاہم جہاں تک بھی ان کی نگاہ جاتی تھی، کسی ذی روح کا نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

''جوناتھن نے اپنے گھر میں سیکیورٹی گارڈز وغیرہ نہیں رکھے ہوئے؟'' مارٹن نے سوال کیا۔

''اس نے کوئی سیکیورٹی گارڈ نہیں رکھا ہوا اس بارے میں، میں پہلے ہی تسلی کر چکا ہوں ورنہ ہمیں گارڈز پر بھی قابو پانا پڑتا۔ جوناتھن نے دیواروں پر کوئی آہنی باڑ بھی نہیں لگوائی ورنہ مشکل ہوجاتی۔ لگتا ہے اسے خود پر بہت اعتماد ہے۔'' ریگن نے جواب دیا۔

''گھر کے اندر کسی واچ ڈاگ کی موجودگی کے امکان کو بھی مسترد نہیں کیا جاسکتا۔'' جونی تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ ''ایسا نہ ہو کہ اندر داخل ہوتے ہی تمہارا سامنا کسی خونخوار کتے سے ہوجائے؟''

''جوناتھن کے بارے میں جتنا میں جانتا ہوں اتنا تم نہیں جانتے۔ وہ کتوں سے نفرت کرتا ہے اس لیے کسی کتے کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' ریگن نے تیز لہجے میں کہا اور پھر مارٹن کی جانب متوجہ ہوکر بولا۔

''مارٹن! دیوار پر چڑھنے میں میری مدد کرو۔ اب ہمارے پلان کے اہم اور مشکل مرحلے کا آغاز ہورہا ہے جیسے ہی میں اندر کودوں گا تم دونوں بھی مین گیٹ پر آجانا تاہم آس پاس بھی نگاہ رکھنا، مبادا اندر داخل ہوتے وقت کسی کی نگاہوں میں آجاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے ریگن نے اپنے کوٹ کی جیب سے ربڑ کے دستانے نکال کر پہن لیے۔ اسے ایسا کرتے دیکھ کر جونی اور مارٹن نے بھی اپنے کوٹ کی جیبوں سے دستانے نکال کر پہن لیے۔ فنگر پرنٹس کے مسئلے سے بچنے کے لیے یہ بہت ضروری بھی تھا۔

''آجاؤ مارٹن.....'' ریگن نے آخری بار آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تو مارٹن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے قریب آگیا اور پھر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو مضبوطی سے آپس میں جوڑ کر ریگن کے سامنے پھیلا دیں۔ ریگن نے اس کی دونوں ہتھیلیوں پر اپنے پاؤں رکھے تو مارٹن نے ایک جھٹکے سے اسے اوپر کی جانب اچھال دیا۔ ریگن نے خود بھی اوپر کی جانب جمپ لگائی تھی اس لیے دیوار کے سرے تک اس کے ہاتھ پہنچ گئے۔ وہ دیوار پر مضبوطی سے ہاتھ جما کر لمحہ بھر کے لیے اس حالت میں لٹکا رہا اور پھر اس نے اپنے جسم کو زوردار انداز میں جھٹکا دے کر اوپر اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دیوار کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ دوسری طرف اترنے کے لیے اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایک دفعہ پھر دیوار پر مضبوطی سے جمائے اور دوسری طرف لٹک کر نیچے چھلانگ لگادی۔ اگرچہ اس کے گرنے سے زیادہ آواز پیدا نہیں ہوئی تھی مگر مارٹن اور جونی کو یہ آواز بھی بہت زیادہ لگی۔ شاید یہ اس اعصابی دباؤ کا نتیجہ تھا جو ان کے ذہنوں پر سوار تھا۔

ریگن اندر داخل ہوچکا تھا اس لیے وہ بھی گھر کے فرنٹ ایریا کی جانب چل پڑے۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹتے ہی وہ مین گیٹ کے سامنے آگئے اسی لمحے مین گیٹ کا چھوٹا دروازہ ہلکے سے کھٹکے سے کھلا اور ریگن نمودار ہوگیا۔

''آجاؤ.....'' انہیں دیکھتے ہی اس نے سرگوشی کی تو وہ دونوں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی ریگن نے دروازہ بند کر دیا۔ جوناتھن کے گھر کے اندر داخل ہونے کا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے ہوگیا تھا تاہم ابھی وہ صرف چار دیواری کے اندر داخل ہوئے تھے۔ ابھی گھر کے اندرونی تعمیراتی حصے میں داخل ہونے کا مرحلہ باقی تھا۔ ''میرے پیچھے ہی رہنا۔'' ریگن نے اپنا ریوالور نکالتے ہوئے کہا اور پھر ایک جانب بڑھ گیا۔ مارٹن نے بھی اسے دیکھ کر اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا جبکہ جونی خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑا۔ ویسے بھی اس کے پاس ریوالور تھا ہی نہیں۔ اس کے غائب دماغی کے مرض یا عادت کی وجہ سے ریگن اور مارٹن اسے ریوالور رکھنے ہی نہیں دیتے تھے۔

اب وہ گھر کا چھوٹا سا لان کراس کر کے اندرونی دروازے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس بند دروازے کو کھولنا اب ریگن کا کام تھا مگر شاید قسمت کی دیوی ان پر پوری طرح مہربان تھی۔ ریگن نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ چونک پڑا کیونکہ اس کے ہینڈل موڑتے ہی دروازہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ''اندرونی دروازہ تو لاک نہیں ہے۔ شاید جوناتھن مین گیٹ بند کر کے مطمئن ہوگیا ہے۔ اسے خود

www.allhayeem.com

پر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد ہے اور آج وہ اپنے اسی زعم میں مارا جائے گا۔'' ریگن نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ جونی اور مارٹن نے بھی اس کی تقلید کی۔ انہیں اندرونی دروازہ کھلا ملنے پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ جرائم کی دنیا سے وابستہ تھے اور جوناتھن جیسے غنڈوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جوناتھن جیسے گینگسٹر اس نفسیاتی زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ کوئی ان سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کر سکتا اور بسا اوقات اسی سوچ کے زیر اثر وہ ہر قسم کی احتیاط بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ آج جوناتھن نے اپنے گھر کے اندرونی دروازے کو لاک نہ کر کے اس کا عملی ثبوت بھی دے دیا تھا مگر اس کی اس بے احتیاطی کا خمیازہ کس قدر بھیانک ہو سکتا تھا، اس کا اندازہ شاید اسے ابھی نہیں تھا۔

وہ تینوں اب گھر کی راہداری میں موجود تھے۔ راہداری کی لائٹ روشن تھی۔ وہ تینوں آگے بڑھنے لگے۔ انہوں نے یہاں آنے کے لیے خصوصی تیاری کی تھی۔ ربڑ کے مخصوص جوتے پہن رکھے تھے جس کی وجہ سے ان کے چلنے سے آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ راہداری میں چار کمرے تھے۔ ریگن نے احتیاط کے ساتھ تین کمروں کو چیک کر لیا۔ کسی کمرے کا بھی دروازہ مقفل نہیں تھا مگر وہ کمرے روشن ہونے کے باوجود خالی تھے۔ کمروں کی جلتی روشنیاں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ یا تو جوناتھن اپنے گھر کے معاملے میں خاصا بے پروا تھا یا پھر وہ ریگن کے اندازے کے عین مطابق نشے میں دھت ہونے کی وجہ سے گھر کی فالتو لائٹس بند کرنا بھول گیا تھا۔ راہداری کے آخری کمرے کے سامنے جا کر رکتے ہی ریگن کے حلق سے ایک طویل سانس برآمد ہوئی۔ اس کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا اور ادھ کھلے دروازے سے جوناتھن سامنے بیڈ پر سویا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اس کمرے کی لائٹ بھی سونے سے پہلے بند نہیں کی تھی۔ بہرحال یہ صورتِ حال ان کے لیے تسلی بخش تھی کہ وہ بالآخر جوناتھن کو خبردار کیے بغیر اس کے سر پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب مزید وقت برباد کرنا مناسب نہ تھا۔ جوناتھن پر فوری قابو پانا ضروری تھا تاکہ اس سے رقم کے بارے میں اگلوایا جا سکے۔ ریگن نے مارٹن اور جونی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ پورا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں الکوحل کی تیز بو نے ان کا استقبال کیا۔ ایک سائڈ پر چھوٹی سی ٹیبل پر شراب کی خالی بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ جوناتھن ان کی آمد سے بے خبر گہری نیند میں تھا۔ ریگن کا اس کے بارے میں اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں پوری طرح دھت ہو کر سو رہا تھا۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر جونی اور مارٹن کے چہرے پر بھی اطمینان کے تاثرات عود آئے تھے۔

''ہوشیار ہو جاؤ، میں اسے بیدار کر رہا ہوں۔ ممکن ہے یہ ریوالور دیکھنے کے باوجود بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کرے۔'' ریگن نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو مارٹن اور جونی بھی پوری طرح الرٹ ہو گئے۔ ریگن کی یہ بات ٹھیک تھی کہ جوناتھن سے ریوالور دیکھنے کے باوجود بھی مزاحمت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ وہ اپنی طاقت اور برتری کے زعم میں مبتلا ایک سر پھرا شخص تھا اور وہ تینوں اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

''ہوشیار.....'' ریگن نے دوبارہ کہا اور پھر سوئے ہوئے جوناتھن کو زور زور سے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

''کون ہے..... کون ہے؟'' اگرچہ جوناتھن نشے میں دھت تھا تاہم اس طرح زوردار انداز میں جھنجوڑنے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے لاشعوری حالت سے شعوری حالت میں آنے میں کچھ وقت لگا تاہم ہوش میں آتے ہی اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تینوں کو دیکھنا شروع کر دیا اور پھر اس کی سرخ آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات ابھر آئے۔

''تم تینوں اور میرے گھر میں؟'' اس نے ریگن اور مارٹن کے ہاتھوں میں موجود ریوالور کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں بھی خوف کے بجائے حیرت اور برہمی کا عنصر نمایاں تھا۔

''ہاں ہم تینوں تمہارے گھر میں.....'' ریگن نے اس کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا۔ ''اب بتاؤ رقم کہاں ہے؟ اگر کوئی حرکت کی تو ہمارے ہاتھوں میں ریوالور تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔''

''کون سی رقم؟'' جوناتھن نے پوچھا۔ نشے میں ہونے کے باوجود اس کا لہجہ متوازن تھا۔ وہ عادی شراب نوش تھا اس لیے نشے کی حالت میں بھی اس کا لہجہ نارمل تھا۔

''انجان بننے یا ایکٹنگ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں اس رقم کی بات کر رہا ہوں جو آج تم نے کیسینو سے جیتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں بھی وہاں موجود تھا۔'' ریگن نے سخت لہجے میں کہا۔

''اچھا تو تم اس رقم کی بات کر رہے ہو۔ وہ رقم تو میں نے آج بینک میں جمع کروا دی ہے۔'' جوناتھن حلق سے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''بکواس بند کرو۔'' ریگن غراتے ہوئے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں رقم تمہارے گھر میں ہی ہے۔ میں نے

www.paktaleemi.com

کیسینو سے نکلتے وقت تمہارا تعاقب کیا تھا۔ تم راستے میں کہیں نہیں گئے، سیدھے گھر آئے تھے اور شام کے وقت ویسے بھی بینک بند ہو جاتے ہیں۔ ہم تمہیں جان سے مار کر بھی رقم تلاش کر لیں گے اس لیے بہتر ہے کہ تم خود ہی بتا دو کہ رقم کہاں چھپائی ہوئی ہے ورنہ خوامخواہ ہمارا وقت برباد ہوگا۔ اگر تم پیسے ہمیں دے دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔''

''تم لوگ تھرڈ کلاس غنڈے ہو، تم لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی کہ میرے ہی گھر میں آ کر مجھ ہی کو دھمکیاں دینا شروع کر دو۔'' جوناتھن بپھرے ہوئے لہجے میں بولا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر ریگن پہلے سے ہی تیار تھا۔ اس لیے جیسے ہی وہ اٹھا، اس نے اپنے ریوالور کے دستے کی ایک بھرپور ضرب اس کے سر پر لگائی۔ ضرب اتنی زوردار اور شدید تھی کہ جوناتھن تیورا کر بیڈ سے نیچے جا گرا اور پھر اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔ ریگن نے جھک کر اس کی نبض چیک کی اور پھر مطمئن ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ ایسے نہیں بتائے گا۔'' وہ جوناتھن کے بے ہوش وجود کو تکتے ہوئے پرخیال لہجے میں بولا۔ ''اسے باندھ کر اس پر تشدد کرنا پڑے گا تبھی یہ کچھ اگلے گا۔''

''مگر یہ گنجان آبادی والی جگہ ہے۔ اگر ہم نے اس پر تشدد کیا تو اس کی چیخوں کی آواز دور تک سنائی دے گی اور چیخوں کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی پولیس کو فون کر ہی دے گا۔'' مارٹن نے کہا۔

''اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر بھی اس پر تشدد کیا جا سکتا ہے۔'' جونی نے گفتگو میں مداخلت کی۔

''پھر بھی خطرہ برقرار رہے گا۔'' مارٹن نے جواب دیا۔

''اس سے کچھ پوچھنے کے لیے جیسے ہی اس کے منہ سے کپڑا نکالا جائے گا یہ اس وقت بھی شور مچا سکتا ہے۔ رات کی خاموشی اور سکوت میں آواز کافی دور تک سنی جا سکتی ہے۔ شکر کرو کہ جب ہم نے اسے جگایا تو اس نے اس وقت شور مچانے کی کوشش نہیں کی ورنہ مسئلہ بن سکتا تھا۔'' مارٹن نے کہا۔

''پہلے کمرے کی تلاشی لے کر تو دیکھو، شاید رقم مل جائے۔ ممکن ہے اس نے رقم اس کمرے میں ہی رکھی ہو۔ اسے کون سا ہماری آمد کا علم تھا جو رقم کو کسی خفیہ جگہ پر رکھتا۔'' ریگن نے کہا۔

''کمرے کی تلاشی لینے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن میرا خیال ہے پیسے اس سامنے نصب سیف میں موجود ہو سکتے ہیں۔'' مارٹن نے ریگن کی عقبی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو ریگن نے بے اختیار چونک کر اپنے عقب کی جانب دیکھا۔ دیوار پر نصب اس آہنی سیف پر اس کی نظر پہلے نہیں پڑی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سیف کے پاس چلا گیا اور کچھ دیر تک سیف کے لیور وغیرہ کو گھما کر دیکھتا رہا اور پھر واپس آ گیا۔

''یہ نمبر والا مخصوص سیف ہے اور لاک بھی ہے جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رقم اسی سیف کے اندر ہے تاہم یہ بہت مضبوط سیف ہے۔ اس طرح کے سیف کو توڑنے کے لیے سات سے دس گھنٹے کا وقت درکار ہوتا ہے۔ اگر جدید گیس کٹر ہو تو بھی تین گھنٹے لگ جائیں گے اور اس وقت گیس کٹر کا بندوبست نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس سیف کو تبھی کھول سکتے ہیں جب جوناتھن اس کا کوڈ اگلے گا تاہم پھر بھی کمرے کو چیک کر لو۔ ممکن ہے اس نے رقم سیف میں منتقل نہ کی ہو۔''

مارٹن اور جونی نے اس بار کچھ کہنے کے بجائے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی تاہم کچھ دیر تک کمرے کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد انہوں نے ناکامی کا اعلان کر دیا۔

''عجیب الجھن میں پھنس گئے ہیں۔'' ریگن ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ ''اگر اس جگہ تشدد کیا تو اس کی آواز ہمارے لیے پرابلم کھڑی کر دے گی اور تشدد کے بغیر یہ کچھ بتانے والا نہیں ہے۔ محض ریوالور دکھا کر اسے خوف زدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اندازہ تو ہمیں ہو ہی چکا ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ یہ کسی زمانے میں پٹرول میں ملاوٹ کرنے کا کام کرتا تھا۔'' جونی نے کہا تو ریگن نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''ہاں مگر اس قصے کا اب ذکر کیوں کیا؟'' ریگن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے اپنے گھر میں ہی کوئی خفیہ تہ خانہ بنا رکھا تھا جہاں وہ یہ کام کیا کرتا تھا۔ اگر واقعی یہ سچ ہے تو ہمیں اس تہ خانے تک رسائی حاصل کرنی ہوگی۔ میری معلومات کے مطابق اس طرح کے تہ خانے عام طور پر ساؤنڈ پروف ہوتے ہیں اور وہاں جوناتھن کی چیخیں ہمارے سوا کسی کو سنائی نہیں دیں گی۔''

جونی کا جواب سن کر ریگن کے چہرے پر مسکراہٹ عود آئی۔

''تم اتنے بھی غائب دماغ نہیں ہو جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ تم نے بہت اہم بات بتائی ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، تہ خانے کا دروازہ تلاش کرو۔ میں نے اس بارے میں بس سنا تھا، اگر واقعی اس گھر میں کوئی

www.allpdfbooks.com

ایسا تہ خانہ موجود ہے تو اسے وہیں لے کر جایا جائے گا تم دونوں تہ خانے کا راستہ تلاش کرو میں اس دوران اسے باندھ دیتا ہوں تاکہ یہ ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ شرارت نہ کر سکے۔" ریگن نے ریوالور اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور پھر کوٹ کی دوسری جیب سے رسیوں کا گچھا نکال کر بے ہوش جوناتھن پر جھک گیا۔

"اس کا خیال رکھنا، ایسا نہ ہو کہ یہ پھر ہوش میں آجائے اور تمہیں اکیلا دیکھ کر تم پر حملہ کر دے۔" مارٹن نے کہا۔

"بے فکر رہو، میں نے اس کی نبض چیک کر لی ہے۔ یہ اتنی جلدی ہوش میں نہیں آئے گا۔۔۔ تم دونوں جاؤ۔" ریگن نے جواب دیا تو مارٹن اور جونی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی۔ انہوں نے آتے ہی کامیابی کا اعلان کیا۔ جونی نے ریگن کو یہ بھی بتایا کہ تہ خانہ سادہ پروف ہے۔

"مگر اتنی جلدی تم نے خفیہ تہ خانے کا راستہ کیسے ڈھونڈ لیا؟" ریگن نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہم جرائم پیشہ لوگ ہیں، عام لوگوں کی بہ نسبت ہمارا ذہن زیادہ کام کرتا ہے۔ بسا اوقات ہم ایسے کام کر لیتے ہیں جو پولیس بھی نہیں کر سکتی۔ گھر کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے بس شک گزرا کہ اس جگہ تہ خانہ ہو سکتا ہے اور چیک کرنے پر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ تہ خانے کا راستہ ایک بڑی الماری کے پیچھے سے نکلتا ہے۔" جونی نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"دیکھا مارٹن! جونی کتنا ذہین ہے۔" ریگن نے کہا۔

"تم خوامخواہ اس سے راستے الگ کرنے کی بات کر رہے تھے۔ تمہیں تو اس کی ذہانت کی قدر کرنی چاہیے۔"

"میں اس کی ذہانت کی قدر کرتا ہوں۔" مارٹن نے جواب دیا۔ "اور ساتھ ہی ساتھ اس کی غائب دماغی کی قدر بھی کرتا ہوں۔" مارٹن کا جملہ اس قدر اچانک اور بے ساختہ تھا کہ اس بار ریگن کے ساتھ ساتھ جونی بھی بے اختیار ہنس پڑا۔

"او کے میں نے اسے باندھ دیا ہے۔ ٹانگیں اور ہاتھ مضبوطی سے بندھ جانے کے بعد اب یہ کوئی حرکت نہیں کر سکے گا۔ اسے اٹھا کر تہ خانے میں لے چلو۔" ریگن نے کہا تو مارٹن نے آگے بڑھ کر جوناتھن کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اگرچہ جوناتھن خاصا بھاری بھرکم وجود رکھتا تھا مگر پھر بھی مارٹن کو اسے اٹھانے میں زیادہ مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ خود بھی خاصا طاقتور اور کڑیل جسامت کا مالک تھا۔ جوناتھن کو کندھوں پر اٹھا کے مارٹن کمرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ریگن اور جونی اس کے پیچھے چل پڑے۔ تہ خانے کی لائٹ جونی پہلے ہی آن کر چکا تھا تاہم اس کی سیڑھیاں اترتے وقت ہی ریگن کو اندازہ ہو گیا کہ تہ خانے کو کافی عرصے سے صاف نہیں کیا گیا تھا۔ غنیمت تھا کہ تہ خانے کی لائٹ کام کر رہی تھی نیچے پہنچ کر مارٹن نے جوناتھن کے بے ہوش وجود کو فرش پر لٹا دیا۔ ریگن نے تہ خانے کا جائزہ لیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کسی زمانے میں جوناتھن پٹرول میں ملاوٹ کر کے فروخت کیا کرتا تھا۔ آج اسے اس بات پر یقین بھی آ گیا۔ تہ خانے کے ایک طرف پٹرول کے چند ڈرم اب بھی موجود تھے۔

"اس کی ناک اور منہ پر ہاتھ رکھو۔ دم گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے یہ ہوش میں آجائے گا۔" ریگن نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے کہا تو مارٹن نے ایک ہاتھ جوناتھن کے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ناک بند کر دی۔ چند ہی لمحوں بعد جوناتھن کے جسم میں حرکت ہوئی تو مارٹن پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جونی بھی خاموشی سے ایک جانب کھڑا تھا۔ جوناتھن ہوش میں آ رہا تھا۔ اسے ہوش میں آنے میں چند لمحے لگے حواس بیدار ہوتے ہی اس نے آس پاس کا جائزہ لیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی مگر رسیوں میں جکڑا ہونے

معاف اور درگزر کرنا

معاف اور درگزر کرنا نہ تو کمزوری کی علامت ہے، نہ بے عزتی کی بات ہے۔ نہ شکست ماننے کے مترادف ہے بلکہ یہ محبت اور رحمت کی علامت ہے۔ بغض اور کینہ سے سلامتی کی دلیل ہے اور پاکیزہ قلب اور روح کی پہچان ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

معصومیت

ایک اسکول ٹیچر نے کلاس میں بچوں کو بتایا۔ "آج کل بچے اپنی ماں کو مام، ڈیڈی کو ڈیڈ اور آنٹی کو آنٹ کہتے ہیں۔"

ایک بچے نے ٹیچر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا میڈم! ہم آپ کو "میڈ" کہہ سکتے ہیں؟"

مرسلہ۔ عبدالجبار روی انصاری، بورے والا

www.alltayleem.com

کی وجہ سے بے بسی سے تڑپ کر رہ گیا سر پر لگنے والی ضرب کی وجہ سے وہ ہلکے ہلکے کراہ بھی رہا تھا تاہم اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا اور سر پر لگنے والی ضرب نے اس کا سارا نشہ بھی ہرن کر دیا تھا اس لیے ہوش میں آتے ہی اسے صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا تھا۔

''تم لوگوں نے تہ خانے کا راستہ کیسے تلاش کر لیا؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''جس طرح ہم نے تہ خانے کا راستہ تلاش کیا ہے اسی طرح ہم رقم بھی تلاش کر لیں گے۔ اس لیے تو ہم تمہیں کہہ رہے ہیں کہ تم ہمیں آزمائش میں ڈالنے کے بجائے خود ہی بتا دو کہ رقم کہاں ہے اس طرح ہم تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے۔'' ریگن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''میں تم لوگوں سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس رقم نہیں ہے۔ میں رقم بینک میں جمع کروا چکا ہوں۔'' جوناتھن نے جواب دیا۔

''بکواس بند کرو۔'' مارٹن نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ ''ہم جانتے ہیں کہ پیسے تمہارے پاس ہیں۔ چلو اگر تم سچے ہو تو اپنے کمرے میں موجود سیف کا کوڈ بتاؤ ہم اسے کھول کر چیک کر لیں گے۔''

''سیف کافی عرصے سے خراب ہے۔ ویسے بھی مجھے اس کا کوڈ یاد ہی نہیں ہے۔'' جوناتھن نے جواب دیا۔

''جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔'' ریگن نے کہا۔ ''ہم تمہیں تہ خانے میں اسی لیے لائے ہیں کہ تمہارا منہ کھلوا سکیں۔ ہمیں تشدد پر مجبور نہ کرو۔ ہم اب بغیر پیسوں کے واپس جانے والے نہیں ہیں، میں اب بھی تمہیں زندگی بچانے کا موقع دے رہا ہوں۔''

''مجھے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔'' جوناتھن طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ پیسے حاصل کرنے کے بعد تم لوگ مجھے زندہ چھوڑنے کی بے وقوفی ہرگز نہیں کرنے والے۔ موت تو بالآخر آنی ہی ہے، افسوس تو بس اتنا ہے کہ موت تم جیسے تھرڈ کلاس غنڈوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ میری موت میرے لیول کے مطابق ہوتی تو میں سکون کی موت مرتا۔''

جوناتھن کا جواب اور رویہ ان تینوں کو حیران کر رہا تھا۔ وہ ان کی توقع سے بھی زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس طرح بندھے ہونے کے باوجود بڑے بااعتماد لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

''حرامزادے! پٹرول میں ملاوٹ کر کے بیچنے والے..... تمہاری اوقات بھی ہم جانتے ہیں۔'' جونی نے بھی آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں پر ایک زوردار لات رسید کی، شاید اپنے لیے تھرڈ کلاس غنڈے کا خطاب اس سے برداشت نہیں ہوا تھا تاہم وہ نحیف اور کمزور سی جسامت کا مالک تھا اس لیے اس کی ٹھوکر سے جوناتھن کو کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

''اگر میں زندہ بچ گیا تو تم تینوں کو عبرتناک موت ماروں گا۔'' جوناتھن غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اس سیف کو تمہارا باپ بھی نہیں کھول سکے گا۔ میں نے وہ سیف خصوصی طور پر تیار کرایا تھا۔ اس کا کوڈ میرے سینے میں مدفون ہے۔ تم جتنی چاہے کوششیں کر لو اسے نہیں کھول پاؤ گے اور مجھ سے کچھ اگلوا بھی نہیں سکو گے۔''

جوناتھن کی بات کے جواب میں اس بار مارٹن اور جونی نے اسے بیک وقت اپنی ٹھوکروں کی زد میں لے لیا۔ لاتیں رسید کرنے کا یہ سلسلہ کچھ دیر تک تواتر کے ساتھ جاری رہا۔ اس دوران ریگن خاموشی سے کھڑا جوناتھن کی چیخیں سنتا رہا۔ جوناتھن کی باتوں سے اسے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ کیسینو سے حاصل ہونے والی رقم اس نے اپنے کمرے کے سیف میں ہی رکھی ہوئی ہے تاہم اب اس سے سیف کو کھولنے والا کوڈ اگلوانا بھی ضروری تھا اس لیے اس نے مارٹن اور جونی کو نہیں روکا۔ مارٹن کی ٹھوکروں کی طاقتور ضربات سے جوناتھن کا منہ پھٹ گیا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے زمین پر لوٹ پوٹ ہوتا بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا ورنہ حقیقت تھی کہ ریگن، جونی اور مارٹن جیسے غنڈے عام حالات میں اسے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے تھے۔

''میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔'' مارٹن نے جوناتھن کو ایک آخری زوردار ٹھوکر رسید کر کے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر جونی بھی پیچھے ہٹ گیا۔

''کون سی تجویز ...؟'' ریگن نے چونک کر پوچھا۔

''اس کی باتوں سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہے کہ رقم اس کی تجوری میں ہی موجود ہے۔ اسے ختم کر دیتے ہیں اور پھر صبح جا کر گیس کٹر لے آئیں گے۔ گیس کٹر سے اس تجوری کو دو تین گھنٹوں میں کاٹنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ کل تک ہم اسی گھر میں قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ یہ اکیلا رہتا ہے اور اس جیسے غنڈے سے ملنے بھی کوئی نہیں آتا ہوگا۔'' مارٹن نے جواب دیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی بے ترتیب سانسوں کو بھی اعتدال پر لا رہا تھا۔ جوناتھن کو پیٹنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول گئی تھی۔

''یہ بہت خطرناک ہوگا۔ اس وقت رات کی تاریکی اور دھند میں ہم کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر رقم لے کر نکل سکتے

www.paksociety.com

ہیں۔ صبح یہاں سے کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر نکلنا مشکل ہوگا۔ ہم نے جاتے وقت اس کو موت کی نیند سلا دینا ہے۔ یعنی پولیس مرڈر کیس کی تفتیش کرے گی اور اگر ہم جوناتھن کے مرڈر کے سلسلے میں پکڑے گئے تو تمام عمر جیل میں گزارنی پڑ سکتی ہے۔ صبح تک اس جگہ ٹھہرنے کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔'' ریگن نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر اس حرامزادے کا کچھ کرو۔ مجھے نہیں لگتا یہ جلدی بولے گا۔'' مارٹن نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''جب مجھے مرنا ہی ہے تو میں تمہیں بھی تمہارے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔'' جوناتھن نے کراہتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں اب ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ کیسے نہیں بولتا۔'' ریگن اپنا ریوالور لہراتا ہوا جوناتھن کے قریب چلا گیا۔

''جوناتھن! تمہارا یہ تہ خانہ ساؤنڈ پروف ہے اس لیے تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی اور میرے ریوالور پر بھی سائلنسر لگا ہوا ہے تم نے ابھی مارٹن اور جونی سے صرف مار کھائی ہے، تشدد تو اب میں تم پر کروں گا۔ میں تمہارے ایک پیر پر گولی ماروں گا پھر دوسرے پیر پر اور اس طرح تمہارے جسم کے ہر اس حصے پر گولی ماروں گا جہاں گولی مارنے سے تمہاری فوری موت واقع نہ ہو سکے۔ تم تڑپ تڑپ کر مرو گے۔ تجوری ہم خود ہی کھول لیں گے۔'' بات کرتے ہوئے ریگن کے لہجے میں بے پناہ سفاکی عود کر آئی اور اس نے ریوالور جوناتھن کے پیر پر لگا دیا۔

''تم چاہے جو کر لو مگر میں تمہیں سیف کا کوڈ نہیں بتاؤں گا۔'' جوناتھن نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے بے اختیار چیخ پڑا۔ ریگن نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ سائلنسر لگے ریوالور کی گولی نے اس کے پاؤں میں سوراخ کر دیا تھا اس کے پاؤں سے خون تیزی سے بہنے لگا۔

''تم بہت سفاک اور ظالم انسان ہو۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''میرے سامنے سفاکی اور ظلم کی باتیں مت کرو۔'' ریگن نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں کو گولی مار کر اپاہج بنایا ہے اور کئی افراد کی جان لی ہے۔ آج جب خود پر بات آئی تو سفاکی اور ظلم یاد آ گیا ہے۔ اب میں تمہارے دوسرے پیر پر گولی مارنے والا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ریگن نے جوناتھن کے دوسرے پاؤں پر ریوالور رکھ دیا۔ جونی اور مارٹن خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے انہوں نے ریگن اور جوناتھن کی گفتگو میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جوناتھن ابھی تک مضبوطی سے اپنی بات پر اڑا ہوا تھا مگر ریگن نے جیسے ہی اس کے دوسرے پاؤں پر ریوالور رکھا اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف امڈ آیا۔ اسے اب اچھی طرح ادراک ہو گیا تھا کہ ریگن اس بار بھی اپنے کہے پر عمل کر گزرے گا۔

''دیکھو، مجھ سے ڈیل کر لو۔ آدھی رقم لے لو اور مجھے زندہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس واقعے کو ہمیشہ کے لیے بھلا دوں گا۔'' جوناتھن کمزور سے لہجے میں بولا۔

''تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ ہم سے ڈیل کر سکو۔ بہتر ہے کہ مجھے سیف کا کوڈ بتا دو ورنہ میں دوسری گولی بھی چلانے والا ہوں۔'' ریگن کا لہجہ فیصلہ کن تھا اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ جونی آگے بڑھا اور پھر جوناتھن کے پاس بیٹھ کر اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کی اس عجیب و غریب حرکت پر جوناتھن لمحہ بھر کے لیے اپنی تکلیف بھول کر حیرت بھرے انداز میں جونی کا منہ تکنے لگا۔

ریگن کے چہرے پر بھی چند ثانیوں کے لیے حیرت کے تاثرات ابھرے مگر مارٹن کے حلق سے نمودار ہونے والا بے ساختہ قہقہہ سن کر اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اسے اب جونی کی اس حرکت کی وجہ سمجھ آئی تھی۔ جونی غائب دماغی کے نفسیاتی مرض میں مبتلا تھا اور دن میں کئی بار اس پر اس طرح کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ ایسی حالت میں وہ غیر ارادی طور پر کوئی بھی عجیب حرکت کر گزرتا تھا۔ مارٹن اور ریگن جونی کی ان حرکتوں سے آگاہ تھے اس لیے اس کی اس حرکت کی وجہ بھی سمجھ گئے مگر ظاہر ہے جوناتھن جونی کے نفسیاتی مرض سے ناواقف تھا اس لیے اس کی حیرت بجا تھی۔

''جوناتھن! لگتا ہے تمہیں تکلیف برداشت کرنا پسند ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ریگن نے ایک بار پھر ٹریگر دبا دیا۔ شائیں کی آواز کے ساتھ جوناتھن کے دوسرے پیر میں بھی سوراخ ہو گیا۔ اس کے حلق سے ایک اضطراری چیخ بلند ہوئی اور اس نے ایک دفعہ پھر زمین پر لوٹنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ سے اس کے بال سہلاتے جونی کو یک بہ یک ہوش آ گیا اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ میں کیا کر رہا تھا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم اسے کہہ رہے تھے کہ پیارے پاپا آپ کو زیادہ تکلیف تو نہیں ہوئی۔'' مارٹن نے جواب دیا۔ اس کے لہجے

www.urdutayeem.com

میں اتنی سنجیدگی تھی کہ جونی بھی لمحہ بھر کے لیے ششدر نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگا مگر اسی لمحے ریگن کا قہقہہ سنائی دیا تو اسے ہوش آ گیا اور وہ منہ بناتے ہوئے اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ریگن کے قہقہے سے اسے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اس نے ذہنی غیر حاضری کی کیفیت میں کوئی ایسی حرکت کی تھی جس کی وجہ سے مارٹن نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی خجالت کے تاثرات بھی ابھر آئے تھے۔

''اب میں تمہارے گھٹنے پر گولی ماروں گا۔'' ریگن نے ریوالور کی نال جوناتھن کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ جوناتھن کے اعصاب کو درجہ بہ درجہ چٹخا رہا تھا اور اسے اپنے مقصد میں کامیابی بھی ہو رہی تھی۔ جوناتھن کے چہرے پر اب تکلیف، تذبذب اور خوف کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے تھے۔ شاید اسے بھی اس حقیقت کا ادراک تھا کہ ریگن اس بار بھی اپنے کہے پر عمل کر گزرے گا۔

''ریگن! اس طرح تو یہ کچھ بتائے بغیر ہی مر جائے گا۔'' مارٹن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ اس طرح یہ مر جائے گا مگر ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس پر بے رحمانہ تشدد کیا جائے تبھی یہ کچھ اگلے گا۔ یہ بہت غیر معمولی قوتِ برداشت کا مالک ہے۔'' ریگن نے جواب دیا۔

''مگر اگر یہ زیادہ خون بہنے کی وجہ سے ہلاک ہو گیا تو ہمارا منصوبہ ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔'' مارٹن نے کہا۔

اس کی بات سن کر ریگن اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات عود آئے تھے۔ مارٹن کی یہ بات درست تھی کہ اس طرح زیادہ خون بہنے سے جوناتھن ہلاک ہو سکتا تھا اگرچہ انہوں نے بالآخر اسے مارنا ہی تھا مگر رقم کے بارے میں معلوم کرنے تک فی الحال اسے زندہ رکھنا ضروری تھا۔ ریگن کو یقین تھا کہ جوناتھن اعصابی طور پر بالآخر ٹوٹ جائے گا۔

''تم جو مرضی کر لو، میں مر جاؤں گا مگر تمہیں سیف کا کوڈ نہیں بتاؤں گا۔ یہ اسپیشل سیف ہے۔ تم گیس کٹر کی مدد سے بھی اسے نہیں کاٹ پاؤ گے۔ بہتر ہے کہ مجھ سے ڈیل کر لو۔ آدھی رقم لے لو اور مجھے زندہ چھوڑ دو۔'' جوناتھن کے دونوں پیروں میں گولیوں سے سوراخ ہو چکے تھے۔ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا مگر وہ اس حالت میں بھی زندگی کی امید لگائے بیٹھا تھا مگر ریگن کسی صورت بھی اس کو زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اس لیے وہ جوناتھن کی باتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کا منہ کھلوانے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا سے منسلک تھا اس لیے جانتا تھا کہ کسی بھی شخص کے اعصاب کو توڑنے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ اسے ذہنی طور پر خوفزدہ کیا جائے۔ جوناتھن کے پیروں پر گولیاں مار کر اسے کافی حد تک کامیابی ہو گئی تھی تاہم گرم لوہے پر آخری چوٹ مارنا ضروری تھی۔

''ذرا دیکھو پٹرول کے ان ڈرموں میں پٹرول موجود ہے یا نہیں۔'' ریگن نے کہا۔

''تم پٹرول کا کیا کرو گے؟'' مارٹن حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''تم دیکھو تو سہی۔'' ریگن پرزور لہجے میں بولا۔

اگرچہ مارٹن ریگن کی بات کا مقصد نہیں سمجھ پایا تھا تاہم اس بار وہ کوئی اعتراض کیے بغیر خاموشی سے ڈرموں کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے باری باری ڈرموں کے ڈھکن ہٹا کر چیک کیے۔ ''ڈرموں میں پٹرول موجود ہے۔ یہ ناقص اور غیر معیاری پٹرول ہے۔ شاید اسی لیے جوناتھن نے اسے استعمال نہیں کیا مگر پٹرول سے بھرے اتنے بھاری بھرکم ڈرمز سیڑھیوں کے راستے تو یہاں نہیں لائے جا سکتے پھر یہ ڈرمز اس جگہ کیسے پہنچے؟'' مارٹن کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ارے ..... اس میں حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھی سی بات ہے، پہلے پٹرول کے خالی ڈرم یہاں پہنچائے گئے اور پھر چھوٹے گیلن وغیرہ کے ذریعے ان میں پٹرول منتقل کیا گیا۔ یہ بڑے ڈرمز پٹرول کی ترسیل کے لیے نہیں بلکہ پٹرول کی اسٹوریج کے لیے ہیں۔ بہرحال ان ڈرمز کو دھکیل کر جوناتھن کے پاس لاؤ اور پھر اس کا پٹرول زمین پر بہا دو۔ ناقص پٹرول ہے مگر آگ تو پکڑے گا۔'' یہ بات کرتے ہوئے ریگن کے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی۔

''کیا مطلب؟ کیا تم مجھے زندہ جلانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' جوناتھن نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''تم نے سیف کا کوڈ نہ بتا کر اپنی موت کو دعوت دے دی ہے۔ اگر تم اپنی ضد کے پکے ہو تو ہم بھی اپنی ضد کے پکے ہیں۔ رقم ہمیں بھلے نہ ملے لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری ضد کی تمہیں سزا ضرور دوں گا۔ میں تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ ہم پٹرول کو زمین پر بہا دیں گے اور پھر میں اپنے ساتھیوں سمیت تہ خانے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنے لائٹر سے کسی شے کو آگ لگا کر اسے نیچے پھینک دوں گا۔ زمین پر بہا ہوا پٹرول آگ پکڑ لے گا اور کچھ دیر میں آگ سارے ڈرموں تک پہنچ جائے گی۔ اس دوران ہم دوڑتے ہوئے تمہارے گھر سے نکل جائیں گے۔ آگ کے پھیلنے تک ہمیں نکلنے کا موقع تو مل

www.aitbayteen.com

ہی جائے گا۔ اس کے بعد تمہارا انجام کیا ہوگا تم خود سوچ لو۔ تمہاری عبرت ناک موت ضروری ہے کیونکہ تمہاری وجہ سے ہمیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔'' ریگن بہت سوچ سمجھ کر الفاظ ادا کر رہا تھا۔ جوناتھن کو اعصابی طور پر توڑنے کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔

''جونی! تم مارٹن کی مدد کرو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جونی اور مارٹن کو آنکھ سے مخصوص اشارہ بھی کر دیا۔

مارٹن اور جونی ریگن کا پلان سمجھ چکے تھے انہوں نے پٹرول کے ڈرموں کو دھکیل کر جوناتھن کے پاس لانا شروع کر دیا۔ کچھ ڈرموں کا پٹرول زمین پر بہا دیا اور کچھ کے ڈھکن کھول کر جوناتھن کے پاس رکھ دیے۔ گویا اب جوناتھن کے آس پاس بارود کا ڈھیر موجود تھا۔ زمین پر بہنے والا پٹرول بھی چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ اپنا کام پورا کرنے کے بعد جونی اور مارٹن ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ پٹرول کی بُو نے جوناتھن پر خاصا اثر کیا تھا۔

''بس کرو.....'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''چلو آدھی کے بجائے ساری رقم لے لو اور مجھے زندہ چھوڑ دو بس میری زندگی بخش دو۔''

جوناتھن کی وہ فریاد عبرت کا شاہکار تھی۔ وہ اس شہر کے مانے ہوئے غنڈوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ رحم نام کے جذبات سے سرے سے ناآشنا ہے مگر آج اپنی جان پر بنتے ہی اس نے رحم کی بھیک مانگنا شروع کر دی تھی۔ اس کی رحم کی بھیک کی فریاد ان تینوں کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ شہر کا مشہور غنڈا ان سے زندگی بچانے کی فریاد کر رہا تھا۔ یہ برتری کا احساس انہیں سرشار کر رہا تھا۔ آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ تھوڑی سی ہمت سے کام لیں تو ان کا شمار بھی اس شہر کے مانے ہوئے غنڈوں میں ہو سکتا ہے۔

''پٹرول کی بُو سے میرا سر چکرا رہا ہے۔ اب چلتے ہیں۔ مارٹن! تمہارے پاس لائٹر تو ہوگا۔'' ریگن نے مارٹن کو مخاطب کیا۔

''ہاں ہے۔ تم جانتے ہو میں اور جونی عادی اسموکر ہیں اس لیے لائٹر ہر وقت پاس رکھتے ہیں۔''

''تو پھر چلو.....'' ریگن نے مڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں رک جاؤ... فار گاڈ سیک!'' جوناتھن نے چلاتے ہوئے کہا۔ پیروں میں لگنے والی گولیوں کی وجہ سے اس کا کافی خون بہہ چکا تھا اس لیے اس کی آواز نقاہت زدہ تھی۔ ''میں کوڈ بتا دیتا ہوں مگر ان ڈرمز کو مجھ سے دور کر دو۔''

جوناتھن کا جواب سن کر ریگن نے فاتحانہ نگاہوں سے مارٹن کی جانب دیکھا۔ اس نے جوناتھن کو زندہ جلانے کے خوف میں مبتلا کر کے بالآخر اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے خوبصورت نفسیاتی چال چلی تھی اور اس کھیل میں جیت اسی کی ہوئی تھی۔

''کوڈ بتاؤ۔'' ریگن نے جوناتھن سے کہا تو اس نے سیف کو کھولنے کا کوڈ بتا دیا۔

''اب مجھے گولی مار دو۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے زندہ چھوڑ کر نہیں جانے والے۔'' جوناتھن نے کراہتے ہوئے کہا۔

''تم درست کہہ رہے ہو۔'' ریگن نے جواب دیا۔ ''مگر پہلے میرا ایک ساتھی تمہارے کمرے میں جا کر چیک کرے گا کہ تم نے درست کوڈ بتایا ہے یا نہیں۔ اگر سیف کھل گیا تو میرا وعدہ ہے کہ تمہاری موت جلنے سے نہیں ہوگی۔''

''میں نے درست نمبر بتایا ہے۔'' جوناتھن نے کربناک لہجے میں کہا۔ پیروں میں لگنے والی گولیوں کے زخم اب ٹھنڈے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے اس کے درد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''جونی! اس کے بتائے ہوئے کوڈ کو جا کر چیک کرو۔'' ریگن نے پلٹ کر جونی کو مخاطب کیا اور پھر اس کے حلق سے خوف اور دہشت سے بھرپور چیخ برآمد ہوئی۔

''جونی! رک جاؤ۔'' ریگن کی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔

جوناتھن سے بات کرتے ہوئے ریگن اور مارٹن کی پوری توجہ جوناتھن پر مرکوز تھی۔

جونی ان سے قدرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ ریگن نے پٹرول کو زمین پر بہانے کا ڈراما محض جوناتھن کو خوفزدہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کا یہ کھیل کامیاب بھی رہا تھا مگر وہ اس بات سے انجان تھا کہ قسمت بھی اپنا کھیل خاموشی سے کھیل رہی ہے۔

جونی غائب دماغی کے نفسیاتی مرض میں مبتلا تھا۔ اس پر دن میں کئی بار ذہنی غیر حاضری کا اٹیک ہوتا تھا اور ذہنی غیر حاضری کے دورانیے میں وہ ایسی غیر ارادی حرکت کر گزرتا تھا جس کا اسے خود بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اس وقت بھی اس پر ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر جلتے سگریٹ کو پٹرول کے ڈرم پر اچھال دیا تھا۔ ریگن نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ سگریٹ نے پٹرول کو شعلہ دکھا دیا تھا اور پھر تہ خانے میں بس لرزہ خیز انسانی چیخیں اور آگ ہی رہ گئی تھی۔

⌘⌘⌘

www.aitbayeem.com

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر
عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا
بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی
تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا
سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے
اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب
دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے
خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت
کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ
چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں
زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی
رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل
نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور
آنکھوں میں سنہرے خواب تھے، جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل
مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

www.aitbayeem.com

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

ساشا

عمر عبداللہ

دوسرا حصہ

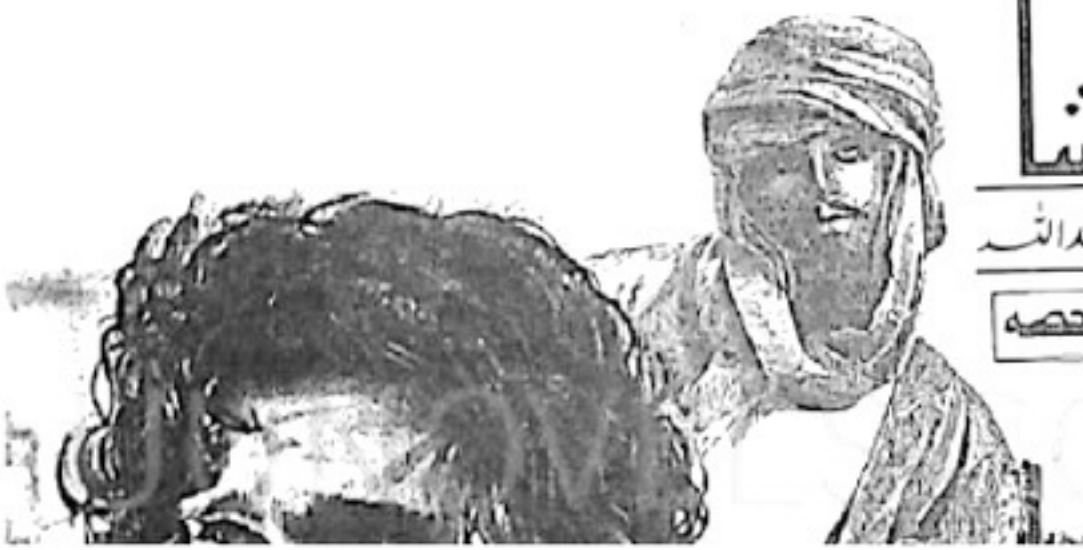

وہ کل کی طرح آج بھی قید خانے کے فرش پر بچھی بدبودار گودڑی پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی پشت اور پہلوؤں کے زخم کافی حد تک بہتر ہو گئے تھے اور پہلے جیسی تکلیف نہیں تھی پھر بھی اس نے اوندھا لیٹنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس طرح وہ ایک طرف تو احتیاط برت کر اپنے زخموں کو ضرر پہنچنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف قید خانے کے نگرانوں کو طبیب کے اس بیان کی یقین دہانی کروانی مقصود تھی کہ اس کے کچھ زخم بُری طرح بگڑ چکے ہیں۔ خاموشی سے اوندھے پڑے ہونے کے باوجود اس کی تمام حسیات اس وقت پوری طرح بیدار تھیں اور بند آنکھوں کے پیچھے نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ اس نے لوئیس اور حبشی نگران کی گفتگو کی روشنی میں طبیب اور اس کے نائب سلیمان کو بتایا تھا کہ لوئیس کا قید خانے سے فرار ایک دو راتوں کے درمیان کسی وقت بھی عمل میں آسکتا ہے لیکن اب اسے یقین تھا کہ لوئیس کو آج رات ہی قید خانے سے فرار کروایا جائے گا۔

کل اس سے دوستانہ لہجے میں بہت سی گفتگو کرنے والے لوئیس نے آج پورے دن اس کی طرف رخ نہیں موڑا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس سے جان بوجھ کر بے اعتنائی برت رہا تھا... بلکہ ایسا لگتا تھا کہ آج اسے خود پر قابو نہیں ہے۔ وہ سخت مضطرب اور بے چین دکھائی دیتا تھا۔ اس اضطراب کے باعث کبھی وہ مختصر قید خانے میں چہل قدمی کرنے لگتا تھا، کبھی گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ جاتا تھا، کبھی خلاؤں میں تکنے لگتا اور کبھی بڑبڑاتا ہوا کسی ایسی ہستی سے گفتگو کرنے لگتا جو اس قید خانے میں تو کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن اس کے پردۂ خیال پر یقیناً پوری آب و تاب سے موجود تھی۔ اس نے اپنے لیے آنے والا کھانا بھی نہایت بے دلی سے وصول کیا تھا اور چند لقموں سے زیادہ حلق سے نیچے نہیں اتار سکا تھا۔ دن کے آخری کھانے کے بعد جب اس تاریک قید خانے کے اندھیرے مزید دبیز ہو گئے تھے، لوئیس نے باقی قیدیوں کی طرح لیٹ کر سونے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اپنی جگہ پر لیٹا ساشا جو کن انکھیوں سے اس کی نگرانی کر رہا تھا، اس کے ہیولے کو ایک دیوار کے ساتھ پشت لگائے بیٹھا دیکھ سکتا تھا۔

اندھیرا اور خاموشی دونوں ہی بہت گہرے تھے اسی لیے ساشا کے کانوں نے قید خانے میں ابھرنے والی اس معمولی آہٹ کو سن لیا۔ لوئیس نے بھی یقیناً آہٹ سنی تھی اس لیے بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ساشا نے البتہ ذرا بھی حرکت نہیں کی اور پہلے ہی کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اس کے کان بہت احتیاط سے اٹھنے والے قدموں کی معمولی آہٹیں سن رہے تھے۔ آہٹوں سے واضح تھا کہ آنے والا فرد واحد ہے۔ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا وہ لوئیس کی سلاخ دار کوٹھری کے سامنے آرکا اور بہ آہستگی قفل میں کنجی گھمائی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا اور لوئیس خاموشی سے آنے والے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ساشا کی تیز سماعتوں نے آخری حد تک ان کے جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں پھر قید خانے میں مہیب سناٹا چھا گیا۔

یہ سناٹا صرف تہ خانے میں قائم اس قید خانے تک ہی محدود تھا اور یہاں سے باہر جانے والے لوئیس کو خبر نہیں تھی کہ خاموشی کے جلو میں کیسے کیسے ہنگامے اسے چھاپ لینے کو تیار ہیں۔

''اب تم آزاد ہو اور اس خفیہ تہ خانے تک میری راہنمائی کر سکتے ہو جہاں ابوبکیٰ کو مطلوب وہ عجوبہ اور نادر نقشہ محفوظ ہے۔'' قید خانے سے باہر آزاد فضا میں سانس لیتے ہی لوئیس کے ہم قدم قید خانے کے حبشی نگراں نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''مجھے تمہاری راہنمائی نہیں بلکہ نقشے کی دستیابی کا فریضہ سونپا گیا ہے اور اس فریضے کو مجھے تن تنہا ہی انجام دینا ہے۔ تم اور تمہارے ساتھی قصر کے باہر میرا انتظار کرو۔ جب میں امیر زادی کے ساتھ زادِ راہ سے لدے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوں گا تو نقشہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔'' لوئیس نے خشک لہجے میں حبشی نگراں کو جواب دیا۔ اس جواب کو سن کر وہ اپنے دانت کچکچا کر رہ گیا لیکن پھر دانستہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''بہتر ہوگا کہ تم اپنی مدد کے لیے ایک ساتھی کو ساتھ رکھو جو کسی مشکل کی صورت میں تمہارا ساتھ دے سکے۔''

''اگر وہاں کوئی مشکل میری منتظر ہوئی تو وہ یقیناً ایسی ہوگی کہ کسی ایک آدھ فرد کا ساتھ اسے بھی میرے ساتھ موت کی آغوش میں لے جانے کے سوا کچھ نہ کر سکے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اس معاملے میں میرے ساتھ بحث نہ کرو اور اس سے قبل کہ میں کسی کی نظروں میں آؤں، مجھے میرے کام کے لیے جانے دو۔ تم زیادہ سے زیادہ میری اتنی مدد کر سکتے ہو کہ اپنی یہ تلوار میرے حوالے کر دو۔'' لوئیس نے اچانک ہی بے حد پھرتی سے کام لیتے ہوئے حبشی کی تلوار اس کی کمر سے بندھی نیام میں سے کھینچ لی اور اچھل کر اس سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

www.alibayeen.com

''یہ کیا حرکت ہے؟'' حبشی نگراں تلملایا۔

''تم نے مجھے ایک ساتھی کی پیشکش کی تھی اور ایک مرد کے لیے تلوار سے بہتر خطرات کا کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا۔'' لوئیس نے اسے جواب دیا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

''اب تم جاؤ۔ گھنٹا بھر بعد امیر زادی کی خواب گاہ کے باہر ہماری ملاقات ہو گی۔ خواب گاہ سے قصر کے دروازے تک ہمیں بحفاظت پہنچانا تمہاری ذمے داری ہے۔'' اپنی بات کہنے کے بعد وہ مزید وہاں رکا نہیں اور قصر کی نیم تاریک راہداریوں میں ایک چھلاوے کی طرح دوڑتا ہوا غائب ہو گیا۔ وہ چند افراد جو خاموشی سے اس کا پیچھا کرنے کی نیت سے کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے، منہ تکتے رہ گئے۔ لوئیس کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ اب کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھ رہی ہے تو قصر کے اس مخصوص گوشے کا رخ کیا جہاں سے اس خفیہ کمرے تک جانے والا راستہ نکلتا تھا جہاں وہ نقشہ رکھا تھا جس کی حفاظت کئی نسلوں سے کی جا رہی تھی اور پیشگوئی کے مطابق اب وہ وقت آ چکا تھا جب اس نقشے کی حفاظت کرنے والے اس سے استفادہ کر سکتے تھے۔

عیسائی گھرانے سے تعلق رکھنے والے لوئیس کی قسمت تھی کہ اس کا دادا وہ ماہر مہندس (انجینئر) تھا جس نے اس قصر میں خفیہ کمرا اور خفیہ راستے تعمیر کرنے کے سلسلے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ قصر کی تعمیر کے فوراً بعد اس کے دادا کی موت واقع ہو گئی تھی اور موت کی وجہ ہیضہ قرار پائی تھی لیکن کچھ کہنے والے دبی زبان میں کہتے تھے کہ موت کی وجہ زہر خورانی تھی اور یہ زہر اسے اس خدمت کے جواب میں دیا گیا تھا جو اس نے قصر کی تعمیر کے سلسلے میں کی تھی۔ دبی زبان میں یہ بات کہنے والے لوئیس کے اپنے ہی خاندان کے لوگ تھے لیکن ان میں سے کسی نے کبھی کھل کر یہ بات کہنے کی جرأت اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ لوئیس کے مہندس دادا کو اس کی خدمت کے نتیجے میں ملنے والے بیش قیمت انعام و اکرام پر خوب عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ عیش و عشرت کی لت عموماً انسان کو حق بیانی سے روک دیتی ہے چنانچہ لوئیس کے باپ سمیت اس کے چچاؤں نے بھی کبھی اپنے باپ کی موت کے سلسلے میں کسی تحقیق کا مطالبہ نہیں کیا اور مرے ہوئے باپ کے مال پر عیش کرتے رہے۔ عیش و عشرت کے یہ دن لوئیس کے بچپن تک ہی قائم رہ سکے اور عیاشی اور تن آسانی نے جلد اس کے باپ اور چچاؤں کو قلاش کر ڈالا۔ اب لوئیس کے خاندان پر غربت کے سائے راج کرتے تھے اور وہ ان معززین میں سے نہیں رہے تھے جنہیں امراء اپنے ساتھ عزت سے بٹھاتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ اب تو ان سے سلام دعا کا تعلق بھی بس ان ہی معززین نے رکھا ہوا تھا جن میں اب بھی پرانی وضع داری باقی تھی۔

اپنے خاندان پر یہ بُرے دن آنے سے قبل جبکہ لوئیس کا شمار معززین کے بچوں میں ہوتا تھا، لوئیس ایک ایسی درسگاہ میں زیر تعلیم رہا تھا جہاں بہت سے امراء کے ساتھ ساتھ امیر ارغل کی خوب صورت اور نازک اندام بیٹی حورم بھی زیر تعلیم تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ان کا شعور پختہ نہ تھا اور وہ صنف مخالف کی کشش یا محبت کا ڈھنگ سے ادراک بھی نہیں رکھتے تھے لیکن ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے وہ عجیب سا انس پیدا ہو چکا تھا جس نے جدا ہونے کے بعد بھی انہیں ایک دوسرے کو بھولنے نہیں دیا۔ حورم کو ذرا سا قد نکالتے ہی مدرسے سے نکلوا کر پردے میں بٹھا لیا گیا اور لوئیس اپنے خاندان کی مالی ابتری کے باعث اس مدرسے میں حصولِ علم کا اہل نہیں رہا۔ دوری شاید دونوں کو ایک دوسرے کو فراموش کرنے کے اسباب پیدا کر ہی دیتی لیکن لوئیس کی چھوٹی بہن انطونیہ کی قصر میں ملازمت نے دو بچھڑ جانے والوں کے درمیان پل کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

انطونیہ اسے بتاتی کہ اب حورم کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ عمر کا ہر برس حورم کے شباب کو کیسے چار چاند لگا رہا ہے۔ اس کی ہنسی کلیسا کی گھنٹیوں سے زیادہ مترنم ہے، اس کی چال کے آگے ہرنی کی چال مات ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے بچپن کے ہم مکتب لوئیس کو آج تک فراموش نہیں کیا ہے..... تو لوئیس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں اور وہ حورم کی ایک جھلک کے لیے تڑپ تڑپ جاتا۔ ادھر انطونیہ، حورم سے بھی لوئیس کے قصے بیان کرنے میں بخل سے کام نہ لیتی تھی۔ لوئیس کی وجاہت، شعر و شاعری میں دلچسپی اور کھیل کے میدان میں برتری کے اَن گنت ایسے واقعات تھے جنہیں سن کر حورم کے دل میں بھی لوئیس کو دیکھنے کا اشتیاق جاگ اٹھتا۔ اس اشتیاق کو انطونیہ کے ذریعے حورم تک پہنچنے والے لوئیس کے اشعار نے مزید بھڑکایا۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ لوئیس کے اشعار میں جس پیکر جمال کا ہجر تڑپاتا، کرلاتا ہے، وہ اس کی ذات کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ دونوں طرف بھڑکتی اس آتش نے ملاقات کی راہ نکال لی۔ ذریعہ انطونیہ ہی بنی۔ وہ حورم کو باغ کی سیر کے

www.urdubeyond.com

بہانے قصر سے باہر لے جانے میں کامیاب رہی اور ساتھ گئے پہرے داروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر باغ کے ایک گوشے میں دید کو ترستی آنکھوں کی سیرابی کا انتظام کر دیا۔ اس نادان لڑکی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ دید آتشِ عشق کو اس حد تک بھڑکا دے گی کہ دونوں کے لیے ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور محال ہو جائے گا اور راستے کی تمام کلفتوں کو خاطر میں لائے بغیر ایک ایسی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے جو اصل میں ان کے لیے تھی ہی نہیں۔

لوئیس اور حورم کی راہ میں کوئی ایک پتھر تو نہ تھا۔ سب سے بڑا فرق مذاہب کا تھا۔ سماجی رتبے میں بھی دونوں خاندان ہم سفر نہیں تھے اور معاشی حالت کے اعتبار سے تو لوئیس بے حد پست حیثیت کا مالک تھا لیکن ایک تو ان کی دلی کیفیات، دوسرے عمر کا وہ نازک دور جو انسان کو زمانے کے کسی اصول کو خاطر میں نہیں لانے دیتا اور انسان زمانے کو اپنے اصولوں کے مطابق ہانکنے کی سوچتا ہے..... وہ دونوں بھی چاہت کے سفر پر اتنے آگے نکل گئے کہ ایک دوسرے کو پانے کے سوا کوئی خیال دل میں نہیں رہا اور وہ کسی دور دیس میں اپنی الگ دنیا بسانے کے خواب دیکھنے لگے۔

اتفاقاً ان دنوں ایک چھوٹا سا حادثہ ایسا ہوا کہ ان دونوں کے درمیان پیغام رسانی کا فریضہ انجام دینے اور کبھی کبھار ملاقات کا انتظام کروا دینے والی انطونیہ کو قصر کی ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔

انطونیہ کا قصور یہ تھا کہ وہ امیر ارغل کی چہیتی بیوی اور حورم کی سوتیلی ماں ارسلہ کا قیمتی جواہرات جڑا ایک نازک جام توڑ بیٹھی اور اس جرم کی پاداش میں پشت پر کوڑے کھانے کے ساتھ ساتھ اس پر ہمیشہ کے لیے قصر کے دروازے بند ہو گئے۔ ارسلہ کا امیر ارغل پر اتنا اثر تھا کہ حورم کی خواہش بھی انطونیہ پر بند دروازے نہ کھلوا سکی اور حورم اور لوئیس کے درمیان قائم رابطے کا پل ٹوٹ گیا۔

کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ..... لوئیس کو بھی حورم تک پہنچنے کی ایک راہ مل گئی۔ ایک روز وہ گھر میں پڑی پرانی کتابیں ٹٹول رہا تھا کہ اسے دادا کی یادداشتوں پر مشتمل ایک ہاتھ سے لکھی کتاب مل گئی۔ کتاب کے بیشتر اوراق کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ جگہ جگہ روشنائی بھی اس قدر مدھم ہو گئی تھی کہ تحریر پڑھنا مشکل تھا لیکن لوئیس چند ایسے اوراق پڑھنے میں کامیاب رہا جن سے اس پر انکشاف ہوا کہ امراء کے خاندان کے پاس ایک نادر نقشہ ہے اور یہ نقشہ قصر کے ایک ایسے خفیہ کمرے میں محفوظ کیا گیا ہے جس کی تعمیر میں اس کے دادا کا کلیدی کردار تھا۔ اس خفیہ کمرے اور اس تک پہنچنے والے خفیہ راستے کے بارے میں دادا کی یادداشتی کتاب میں اسے تفصیلات مل گئیں اور ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پانے لگا۔ علاقے کے بیشتر لوگوں کی طرح اسے بھی علم تھا کہ امیر ارغل اور اس کے چھوٹے بھائی امیر سالک میں اپنے باپ کی وفات کے بعد سے کوئی ایسا تنازعہ جاری ہے جس کی بنیاد پر دونوں بھائی ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہیں اور امیر ارغل نے اپنے اثر رسوخ سے کام لے کر امیر سالک پر قصر کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ دادا کی یادداشتوں نے اس پر وجہ تنازعہ واضح کر دی اور اسے لگا کہ وہ اس تنازعے کا فائدہ اٹھا کر حورم کے حصول کی راہ نکال سکتا ہے۔ اس نے بے حد احتیاط سے چند ایسے لوگوں کے سامنے خفیہ کمرے اور خفیہ راستے سے اپنی آگاہی کا ذکر چھیڑا جن کے بارے میں اسے گمان تھا کہ وہ امیر سالک کے ہمدرد ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ لوگ امیر سالک تک یہ بات ضرور پہنچا دیں گے اور وہ اس اہم نقشے کے حصول کے بدلے امیر کو اپنی بھتیجی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دینے پر راضی کر سکے گا۔

اس کی امیدوں کے برخلاف امیر سالک نے تو براہِ راست اس سے رابطہ نہیں کیا لیکن وہ ایک دن اچانک ابوبکیٰ کے روبرو پہنچا دیا گیا۔ اس ملاقات میں ابوبکیٰ نے اس پر انکشاف کیا کہ بظاہر وہ امیر ارغل کا ساتھی اور ہمدرد ہے لیکن اصل میں امیر سالک کے مفادات کی حفاظت کے لیے امیر ارغل کا قرب حاصل کیے ہوئے ہے اور اس وقت امیر سالک کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آباء کی وراثت وہ نادر نقشہ اس کے قبضے میں آ جائے۔ اس موقع پر لوئیس نے جرأت سے کام لیتے ہوئے ابوبکیٰ سے پوچھا تھا۔

''امیر سالک اس نقشے کے حصول کی کیا قیمت ادا کر سکتا ہے؟''

''کوئی بھی منہ مانگی قیمت۔'' ابوبکیٰ نے بلاتوقف جواب دیا تھا۔

''اور اگر میں بدلے میں اس کی بھتیجی حورم کو مانگوں تو.....؟'' لوئیس کے اس سوال نے پل بھر کے لیے ابوبکیٰ کو دم بخود کر دیا تھا لیکن پھر وہ خود کو سنبھال کر مسکرایا تھا اور اس نے لوئیس سے کہا تھا۔

''تمہیں یہ قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے لیکن شرط یہ ہو گی کہ تم ہمارے طے کردہ طریقۂ کار کے مطابق چلو۔''

اس کے بعد ابوبکیٰ نے اسے سارا کھیل سمجھایا تھا۔ اس نے لوئیس کو احساس دلایا تھا کہ اگر امیر سالک اپنے

www.aiffayeem.com

بڑے بھائی امیر ارغل پر غلبہ حاصل کر لے، تب بھی اس کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ کھلے بندوں اپنی بھتیجی کا ہاتھ ایک ادنیٰ درجے کے عیسائی لڑکے کے ہاتھ میں دے سکے۔ ہاں خفیہ طور پر اس کی یہ خواہش اس طرح پوری کی جا سکتی ہے کہ امیر سالک پر کوئی الزام نہ آ سکے۔ پھر ابوکیلی نے اسے پورا منصوبہ سمجھایا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق پہلے اسے امیر سالک کے جاسوس کی حیثیت سے گرفتار کر کے قصر کے تہ خانے میں واقع قید خانے تک پہنچایا جانا تھا پھر باقی مراحل طے ہونے تھے۔ لوئیس نے اس منصوبے پر رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ خفیہ راستے اور کمرے کے بارے میں کسی کو نہیں بتائے گا اور خود وہ نقشہ حاصل کر کے اس کا امیر زادی سے تبادلہ کرے گا۔ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود اسے اتنا شعور تو بہر حال تھا کہ وہ لوگ اسے دھوکا دے سکتے ہیں اس لیے ممکنہ احتیاط برتنے کی کوشش کی تھی۔ قید خانے میں قدم رکھتے ہی اسے اپنی اس احتیاط کے درست ہونے پر یقین ہو گیا تھا۔

حبشی نگراں جو ابوکیلی کا خاص آدمی تھا، اس پر ایک قہر بن کر ٹوٹا تھا اور مسلسل کئی دن تک دردناک تشدد کا نشانہ بنا کر اس سے خفیہ راستے اور کمرے تک رسائی کے لیے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ لوئیس کے لیے اس تشدد کے آگے زبان بند رکھنا آسان نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی خاموشی ہی حورم کے حصول کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کی ضمانت ہے چنانچہ نہایت استقلال سے زباں بندی پر قائم رہا۔ اس کے حق میں صرف ایک بات اچھی تھی اور وہ یہ کہ اس پر ظلم کے پہاڑ توڑنے والوں کے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی اور وہ ایک بار پھر تشدد کی راہ چھوڑ کر اس کے ساتھ سودے بازی پر مجبور ہو گئے تھے۔ لوئیس ان سے اپنے مطالبات منوانے کے بعد اس وقت قید خانے سے باہر ایک ایسی سرنگ سے گزر رہا تھا جسے یقیناً بہت کم انسانی قدموں کا لمس نصیب ہوا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر یہ سرنگ بالکل صاف ستھری تھی اور اس میں کہیں بھی مکڑیوں کے جالے یا گرد و غبار نظر نہیں آتا تھا۔

سرنگ کی اونچائی کم ہونے کے باعث لوئیس کو اپنا سر قدرے جھکا کر گزرنا پڑ رہا تھا لیکن یہ بہت تکلیف دہ نہیں تھا۔ سرنگ میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے بھی یقیناً کوئی انتظام تھا اس لیے وہ ہلکا سا حبس تو ضرور محسوس کر رہا تھا لیکن ایسی گھٹن نہیں تھی کہ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوتا۔ قریباً چھ سات منٹ چلنے کے بعد وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سرنگ تین شاخوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو یقیناً تذبذب میں پڑ جاتا کہ ان تینوں میں سے کس شاخ کا انتخاب کرے لیکن اس کے سامنے ایسی کوئی الجھن نہیں تھی۔ دادا کا تیار کردہ وہ نقشہ اس کے دماغ میں پوری طرح نقش تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اسے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ وہ پورے اعتماد سے آگے بڑھا اور درمیانی شاخ میں قدم رکھا لیکن پہلے قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھانے کی زحمت نہیں کی اور پنجوں کے بل نیچے بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ میں موجود مشعل نیچی کر کے غور سے سرنگ کے فرش کا جائزہ لینے لگا۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہاتھ کا استعمال بھی کر رہا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں مسلسل زمین کو ٹٹول رہی تھیں۔ آخر اس نے وہ درز ڈھونڈ نکالی جو فرش پر کسی جوڑ کی نشاندہی کر رہی تھی۔ درز اتنی معمولی تھی کہ وہ اسے انگلیوں سے محسوس تو کر سکتا تھا لیکن اس کی کوئی انگلی اس درز میں داخل ہو کر اس سل کو نہیں کھسکا سکتی تھی جس کے نیچے وہ خفیہ کمرا موجود تھا جس کی تلاش میں جانے کون کون سرگرداں تھا۔

لوئیس نے جلتی مشعل سرنگ کی ایک دیوار کے ساتھ ٹکائی اور نیام سے تلوار نکال کر درز میں داخل کر دی۔ اب وہ تلوار کے زور سے خفیہ راستے پر موجود اس سل کو بائیں طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنی توقع سے بہت کم قوت خرچ کرنی پڑی اور سل کھسک کر کسی نامعلوم کھانچے میں سما گئی۔ اب اس کے سامنے ایک چوکور خلا تھا اور اس خلا سے نیچے کی سمت جاتی پتھر کی سیڑھیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں کو اپنے پاس موجود مشعل کی روشنی کے بغیر بھی دیکھ سکتا تھا اور اس کی وجہ وہ روشنی تھی جس کا منبع اس خفیہ کمرے یا تہ خانے میں کہیں موجود تھا۔ لوئیس نے اپنی تلوار کو مضبوطی سے تھاما اور خلا میں سے گزر کر سیڑھی کے قدمچے پر پیر دھرا۔ قدم قدم نیچے اترتے ہوئے وہ اپنی سماعت پر بھی پورا زور دے رہا تھا لیکن ابھی تک اسے کوئی ایسی آواز سنائی نہیں دی تھی جس کے باعث وہ وہاں کسی ذی نفس کی موجودگی کا گمان کرتا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس کی آنکھیں دنگ رہ گئیں۔ اس کے سامنے موجود وہ کمرا بہت وسیع نہیں تھا لیکن اس کی بناوٹ اور سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ دیدہ زیب پتھروں سے تراش کر بنائے گئے اس کمرے کی دیواروں پر ہاتھ سے بنی چند قدیم تصاویر آویزاں تھیں۔ چھت سے ایک بڑا سا خوب صورت فانوس جھول رہا تھا۔ شیشے کے ایک بہت بڑے مرتبان میں رنگ

www.dilkayeem.com

برگی مچھلیاں تیرتی پھر رہی تھیں اور ایک طرف بنے سونے کے چھوٹے سے آتش دان میں آگ روشن تھی۔ اس آگ کو دیکھ کر لوئیس کے ذہن میں لوگوں کی زبانی سنی چند داستانیں یاد آنے لگیں۔

کہنے والے کہتے تھے کہ امیر ارغل اور امیر سالک کے آباء واجداد مجوسی تھے اور ان آتش پرستوں کی اولادوں میں اب بھی کہیں نہ کہیں آگ کے لیے عقیدت اور محبت موجود تھی۔ اس خفیہ کمرے میں جہاں اس خاندان کا ایک نہایت خاص اور نادر راز ایک تمثیل کی صورت میں موجود تھا، سونے کے آتش دان میں آگ کا جلنا اس امر کی تصدیق تھی کہ واقعی اس خاندان کے لیے آج بھی آگ ایک بے حد قابل عزت شے ہے لیکن کیا آگ صرف ایک شے تھی؟ لوئیس ٹھٹکا۔

آگ تو زندگی کی علامت تھی جسے روشن رکھنے کے لیے انسانی ہاتھوں کی حاجت ہوتی ہے۔ وہ انسانی ہاتھ کہاں تھے؟ یہ دیکھنے کے لیے وہ اپنی پشت کی طرف مڑتا اس سے قبل اس کے گلے میں ایک پھندا ڈال کر کھینچا جا چکا تھا اور ساتھ ہی تلوار کی نوک بھی اس کی گردن پر رکھ دی گئی تھی۔ پھندا اس کے گلے میں اس حد تک تنگ تھا کہ وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کر رہا تھا اور اس کی آنکھیں حلقوم سے باہر نکل آئی تھیں۔ ان پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اب وہ اپنے سامنے روشن آگ کے ساتھ ساتھ شیشے کے مرتبان میں تیرتی رنگ برنگی مچھلیوں کو بھی دیکھتا اپنی عقل پر ماتم کر رہا تھا۔ کمرے کی غیر متوقع آرائش نے اسے اس حد تک مبہوت کر دیا تھا کہ اسے فوری طور پر خود کو درپیش خطرے کا ادراک نہیں ہو سکا تھا اور اب وہ خطرہ اس کی پشت پر کھڑا اسے حکم دے رہا تھا۔

''تلوار پھینک دو ورنہ تمہیں مزید سانسیں لینے کی مہلت نہیں مل سکے گی۔'' حکم دینے والے کے لہجے میں کسی درندے کی سی غراہٹ تھی۔ لوئیس نے ایک جھرجھری سی لی اور بغیر کسی پس وپیش کے تلوار پھینک دی۔ تلوار پھینکتے ہی اس کی گردن پر رکھی تلوار کی نوک ہٹا لی گئی لیکن گلے میں پڑے پھندے کا تناؤ برقرار تھا۔ لوئیس نے فطری طور پر پھندے کو ڈھیلا کرنے کی خواہش میں اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھانا چاہا لیکن اسے مہلت نہ مل سکی۔ پیچھے سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے گئے اور پلک جھپکتے میں اسی رسی میں جکڑ دیے گئے جس کے ایک سرے پر بندھا پھندا اس کی گردن کو جکڑے ہوئے تھا۔ ہاتھوں کو جکڑنے کے لیے اس بے رحمی سے کام لیا گیا تھا کہ رسی کے تناؤ سے لوئیس کی گردن پیچھے کی جانب قدرے جھک گئی تھی۔ ایک تو سانس کی نالی پر پڑتا دباؤ دوسرے گردن کا غیر فطری طور پر پیچھے کی طرف جھکاؤ..... لوئیس دہری اذیت میں گرفتار ہو گیا۔ پیچھے کی طرف جھکی گردن کے تناؤ سے نجات کے لیے گردن کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتا تو گلے میں پڑا پھندا مزید تنگ ہو کر اس کے لیے سانس لینے کے عمل کو اور بھی زیادہ دشوار بنا دیتا۔ ابھی وہ نازل ہونے والی اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں سوچ سکا تھا کہ اس کے دونوں پیر بھی رسی میں جکڑے گئے۔ اب جبکہ وہ پوری طرح بے بس ہو چکا تھا اس کی پشت پر موجود شخص اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس شخص کو دیکھ کر لوئیس کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں مزید ابل آئیں۔

لمبے، الجھے ہوئے اور بے حد گندے بالوں والے اس شخص کے جسم پر زنانہ لباس تھا۔ اس بوسیدہ سے زنانہ لباس پر بھی میل کی اتنی ہی تہیں چڑھی ہوئی تھیں جتنی اس کے جسم پر۔ گدلی آنکھوں، بے حد گندے پیلے دانتوں اور میل سے بھرے ناتراشیدہ ناخنوں والے اس شخص کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ زندگی بھر اسے صابن اور پانی سمیت ایسی کوئی شے میسر نہیں آئی تھی جس کی مدد سے وہ اپنے لیے صفائی کا اہتمام کر پاتا۔ وہ ہلکی ہلکی خوشبو میں بسے اس خوب صورت اور صاف ستھرے کمرے کا متضاد تھا لیکن ''تھا'' کہنا بھی شاید مناسب نہیں تھا۔ اپنی تکلیف دہ حالت کے باوجود لوئیس کی آنکھوں نے ڈاڑھی مونچھوں کے بجائے ہلکے روئیں اور جسم کی بناوٹ کو دیکھ کر اس کے بارے میں یہ اندازہ قائم کر لیا تھا کہ دراصل وہ ایک مخنث تھا۔ عجیب ستم تھا کہ وہ جس نے حورم کو پانے کی چاہ میں بڑی جواں مردی سے مشکلات کا مقابلہ کیا تھا، اپنی منزل سے اتنا قریب آنے کے بعد ایک مخنث کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تھا۔

مخنث زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر کچھ دیر اسے اپنی سرخ آنکھوں سے گھورتا رہا پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بھی وحشت ناک تھی اور بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی درندہ دانت نکوس رہا ہو۔ لوئیس نے اس سے مخاطب ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے محض ایک خرخراہٹ نکل کر رہ گئی۔ اسے لگا کہ اس کی اس بے بسی نے مخنث کو لطف دیا ہو۔ اس کی گدلی، سرخ آنکھوں میں ایک کینہ توز سی چمک دکھائی دی تھی۔ تاہم اس بار بھی اس نے زبان سے کچھ نہ کہا اور یکدم ہی آگے بڑھ کر لوئیس کو اپنے شانے پر لاد لیا۔ اس کے جسم سے اٹھتی بو لوئیس کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ ابھی تک وہ اس بو کو کمرے میں رچی

www.allpaypk.com

مہک کی وجہ سے محسوس نہیں کر سکا تھا لیکن اس کے شانے پر لدے ہونے کے باعث اس بدبو سے مفر ممکن نہیں تھا۔ مضبوط کاٹھی کے میلے کچیلے مخنث نے پلک جھپکتے میں اس سمیت سیڑھیاں طے کیں اور چوکور خلا سے باہر اسے سرنگ کے فرش پر پٹخ کر سابقہ غراہٹ آمیز لہجے میں دو لفظی حکم دیا۔

''واپس جا۔'' اس حکم کو صادر کرنے کے بعد وہ خود واپس خلا میں غائب ہو گیا اور اس کے غائب ہوتے ہی خلا بھی غائب ہو گیا۔

اب لوئیس بے بسی کے عالم میں سرنگ کے فرش پر پڑا تھا اور اس کے قریب ہی وہ مشعل جل رہی تھی جسے وہ نیچے اترنے سے قبل ایک دیوار سے ٹکا کر رکھ گیا تھا۔

''اب میں کیا کروں؟'' ویران سرنگ میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے لوئیس نے خود سے سوال کیا تو وہ بے حد مایوس اور احساسِ شکست سے نڈھال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ناکامی کے بعد اس کی زندگی میں کچھ باقی نہیں بچا ہے اور اب وہ حورم کو پانا تو درکنار، اپنی زندگی بچانے کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔

''تو پھر کیا مجھے یہیں پڑے پڑے اس موت کا انتظار کرنا چاہیے جو میرا مقدر ہو چکی ہے؟'' مایوسی کے عالم میں خود سے کیے جانے والے اس سوال پر وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جگہ پڑے پڑے موت کا انتظار کرنا کتنا دردناک ہوگا۔ فاقہ کشی سے واقع ہونے والی موت جتنی سست رفتار ہوتی ہے، اتنی ہی اندوہناک بھی۔ اس موت میں جسم کا ایک ایک خلیہ اپنے اندر سے زندگی کو نکلتا محسوس کرتا ہے اور ظالم زندگی اتنی مشکل سے جسم کا ساتھ چھوڑتی ہے کہ موت اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہربان محسوس ہوتی ہے۔

''موت میرا مقدر ہی سہی، میں اس سے ایک آخری جنگ ضرور لڑوں گا۔'' اپنی دردناک موت کے تصور نے اس کے مایوس دل و دماغ میں عزم جگایا تو ایک حل بھی سجھائی دے گیا۔

اس نے فرش پر پڑے پڑے اپنے بندھے ہوئے پیروں کو بلند کیا اور سرنگ کی دیوار پر اس جگہ رکھا جس کے عین نیچے اس کی رکھی مشعل موجود تھی۔ جلتی مشعل کے شعلے کی تپش نے فوراً ہی اس کے پیروں کو جھلسانا شروع کر دیا لیکن وہ دانت پر دانت جمائے اس بے انتہا اذیت کو برداشت کرتا رہا۔ آخر کار اس کا مقصد پورا ہوا اور آگ نے اس کے پیروں کو جکڑنے والی رسی کو جلانا شروع کر دیا۔ جلنے سے رسی کمزور پڑی تو اس نے اسے جھٹکا دے کر توڑ ڈالا۔ پیر آزاد ہونے سے اسے خود کو حرکت دینے میں تھوڑی سے آسانی محسوس ہوئی اور پیچھے کو جھکی ہوئی گردن کے تناؤ کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح مشعل کی طرف پیٹھ پھیر کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا اور سب سے پہلے رسی کے اس حصے کو جلانے کی کوشش کرنے لگا جو اس کی گردن سے اس کے ہاتھوں تک جا رہا تھا۔ رسی کے اس حصے نے آگ پکڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی لیکن فوراً ہی اس پر ایک دوسری اذیت نازل ہو گئی۔ رسی کے ساتھ ساتھ پشت پر سے اس کے لباس نے بھی آگ پکڑ لی تھی اور یہ تکلیف ایسی تھی کہ وہ اپنے پیروں کے جھلسنے کی تکلیف فراموش کر بیٹھا۔ اذیت سے نڈھال اس کے گلے سے چند گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں اور اس نے آگ بجھانے کی خواہش میں دیوانہ وار اپنی پشت کو دیوار سے رگڑ ڈالا۔ اس کوشش میں اس کے گلے پر بے تحاشا دباؤ پڑا۔ قریب تھا کہ اس کی سانس

ناہید اختر نے مشفق خواجہ سے ذکر کیا کہ احمد فراز اور پروین شاکر کی شاعری کے مطالعے سے ان کے اندر بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا ہے۔

خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے کہ احمد فراز اور پروین شاکر کی شاعری کا کوئی مثبت نتیجہ نکلا۔ ورنہ اکثر لوگ ان دونوں کے کلام سے متاثر ہو کر شاعری ترک کر دیتے ہیں۔''

☆☆☆

دہلی میں پیروڈی شاعری کا مشاعرہ تھا۔

جب گلزار زتشی کا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا تو وہ انکساری سے بولے۔ ''حضور! میں صدارت کا اہل کہاں ہوں؟''

اس پر کنور سنگھ بیدی نے کہا۔ ''مطمئن رہیں، آپ بھی صدر کی پیروڈی ہی ہیں۔''

☆☆☆

ایک دفعہ جون ایلیا نے اپنے بارے میں لکھا کہ میں ناکام شاعر ہوں۔ اس پر مشفق خواجہ نے انہیں مشورہ دیا۔ ''جون صاحب! اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ یہاں اہلِ نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرنے کے باوجود ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں۔''

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

www.alibaya.com

رک جاتی کہ ایک معجزہ سا ہوا اور ہاتھ اور گردن کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے والی رسی ٹوٹ گئی۔ گردن کے تناؤ سے نجات حاصل ہونے پر اس نے پشت اور پنڈلیوں کی جھلسن کے باوجود سکون سا محسوس کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ پشت پر اس کی جھلس جانے والی کھال دیوار کی رگڑ کے باعث ادھڑ چکی ہے لیکن اس کے پاس اس اذیت کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یوں بھی اب اذیت پر وہ جوش حاوی ہونے لگا تھا جو اپنے جسم کو بندشوں سے آزاد ہوتا دیکھ کر اس کے اندر بیدار ہو گیا تھا۔

خود کو ایک بار پھر اذیت سے گزارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر کے اس بار اس نے اپنے ہاتھوں کو بندشوں سے آزاد کرنے کے لیے مشعل کے آگے کر دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ آگ سے اس کی جلد کو کم سے کم نقصان پہنچے اور رسی جل جائے لیکن احتیاط کے باوجود اسے اتنی شدید تکلیف سے گزرنا پڑا کہ اس کے ہونٹوں سے کراہیں نکلتی چلی گئیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں پر پھیلتے رہے۔ بہرحال اس کی قربانی رنگ لائی اور وہ ہاتھوں کی بندشوں سے بھی آزاد ہو گیا۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے گلے میں موجود پھندا نکال کر پھینکا اور پھر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ کلائیوں پر سے جلد بری طرح جل چکی تھی اور ہاتھوں کی پشت پر آبلے نظر آ رہے تھے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آزادی کی اتنی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد آگے اس کے لیے کوئی راحت موجود ہے یا نہیں..... بس اتنا اطمینان تھا کہ کسی دشمن سے سامنا ہوا تو بالکل بے بسی کی حالت میں نہیں مارا جائے گا۔ مشعل کو ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل آگے کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ دوبارہ خفیہ راستہ کھول کر اس کمرے میں جا کر وہ نقشہ حاصل کرنے کی کوشش کرے جس کے بدلے اسے حورم سمیت قصر سے فرار کروانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اندر نقشے کی حفاظت کے لیے بیٹھا شخص اس سے بہتر مقام پر تھا اور اس بار بھی اسے آسانی سے زیر کر سکتا تھا۔ ہاں ایک بار اس کے دل میں یہ خواہش ضرور ابھری کہ خفیہ راستہ کھولے اور جلتی مشعل اندر پھینک کر اس کمرے میں آگ لگا دے تاکہ اس کے لیے اتنی شدید تکلیف کا سبب بننے والا شخص جل کر بھسم ہو جائے لیکن پھر اس نے اس خواہش سے دستبردار ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ مشعل پھینکنے سے پورے کمرے میں ایسی آگ بھڑک اٹھے کہ وہاں موجود شخص بے بس ہو جائے۔ ہاں اس کی اس حرکت سے وہ شخص مشتعل ضرور ہو جاتا اور اشتعال کے عالم میں وہ اس بار اس سے اپنی جان بخشی کی امید نہیں رکھ سکتا تھا چنانچہ لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اب اس کے ذہن میں صرف اتنا تھا کہ کسی طرح حورم کے کمرے تک پہنچ جائے اور وہاں منتظر ابوبکیٰ کے آدمیوں کو نقشے کے حصول کے بارے میں یقین دہانی کروا کر انہیں خود کو اور حورم کو قصر کے دروازے سے باہر تک پہنچانے پر راضی کر لے۔

تکلیف کے باعث سرنگ سے واپسی کے سفر میں اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ وقت لگا۔ سرنگ میں آمد و رفت کا خفیہ راستہ کھولنے سے قبل اس نے اپنے ہاتھ میں موجود مشعل بجھا دی لیکن اسے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اب یہی واحد شے اس کے پاس رہ گئی تھی جسے وہ کسی حد تک اپنے دفاع کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ ہر قدم پر جسم کے جھلسے ہوئے حصوں کی تکلیف کے باعث ہونٹوں سے نکلتی سسکیوں کو دباتا بالآخر وہ اس کمرے میں پہنچ گیا جس میں کچھ خاندانی یادگاریں کباڑ کی طرح جمع تھیں۔ بزرگوں کی نشانی کے طور پر رکھی گئی ان معمولی اشیا سے کسی کو دلچسپی نہیں تھی اور بس کبھی کبھی ایک ملازم کمرے میں آ کر ان کی جھاڑ پونچھ کر دیتا تھا یا کبھی امیر خود کو بزرگوں کا قدردان ظاہر کرنے کے لیے اس کمرے کا چکر کاٹ جاتا تھا۔ یہ تو کسی کو گمان ہی نہیں تھا کہ اس کمرے میں کوئی ایسا خفیہ راستہ موجود ہے جو کسی سرنگ کے ذریعے اس کمرے تک جاتا ہے جہاں اس خاندان کا سب سے بڑا راز محفوظ ہے۔ لوئیس اپنے دادا کی تحریری یادداشتیں کھنگالنے پر اس راز سے واقف ہوا تھا لیکن اسے افسوس تھا کہ دادا کی یادداشتوں سے اسے قصر کا مکمل نقشہ میسر نہ آ سکا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ابوبکیٰ اور اس کے آدمیوں سے مدد لینے پر مجبور نہیں ہوتا اور حورم کو کسی خفیہ راستے سے قصر سے نکال لے جاتا۔ اسے یقین تھا کہ قصر سے باہر جانے کے ایک سے زیادہ خفیہ راستے ہوں گے لیکن اس کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ وہ ایسے کسی راستے کو تلاش کر سکتا۔ اسے ابوبکیٰ کے آدمیوں پر ہی انحصار کرنا تھا اور ان لوگوں سے وہ کسی زہریلے سانپ سے بھی زیادہ محتاط تھا۔

یادگاروں والے کمرے سے باہر آنے کے بعد وہ

www.aliyaviewin.com

سانس بھی بے پناہ احتیاط سے لے رہا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ ابوبکیٰ کے آدمی اس کی تاک میں قصر کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہوں گے اور ان کی پوری کوشش ہوگی کہ اس کے امیرزادی کی خواب گاہ تک پہنچنے سے قبل اسے چھاپ کر اس سے وہ نقشہ بازیاب کروالیں۔ ممکنہ طور پر اپنی تاک میں موجود ان افراد سے بچنے کے لیے وہ قصر کی نیم تاریک راہداریوں سے بلی کی چال چلتا دیواروں کے ساتھ لگ کر گزر رہا تھا۔ ایک دو جگہ اسے رات کے پہرے دار دکھائی دیے تو وہ ان سے کنی کترا کر گزرتا چلا گیا۔ ان سنگین لمحات میں اس کا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ابوبکیٰ کے آدمیوں اور قصر کے پہرے داروں دونوں سے اسے یکساں خطرہ درپیش ہے۔ دونوں ہی کے ہاتھوں پکڑے جانے کی صورت میں موت اس کی منتظر ہوگی۔ یہ موت اس پر سے اسی صورت ٹل سکتی تھی کہ وہ بحفاظت امیرزادی کے کمرے تک پہنچ جاتا اور وہ اس کی ڈھال بن جاتی۔ جوں جوں امیرزادی کی خواب گاہ تک کا فاصلہ کم ہو رہا تھا اس کا حوصلہ بڑھتا جا رہا تھا لیکن کسی کسی لمحے اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ کچھ ان دیکھے سائے اس کے تعاقب میں ہیں۔ ایک آدھ جگہ وہ کسی کی موجودگی کے خیال سے بھڑکا بھی لیکن جب کچھ نہ ہوا تو اپنے احساس کو واہمہ قرار دے کر جھٹک ڈالا۔

نیم تاریک راہداریوں اور بند دروازوں والے کمروں کے سامنے سے گزرتا ہوا بالآخر وہ اس راہداری میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کا تیسرا دروازہ حورم کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ اسے کبھی حورم کی خواب گاہ تک آنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن انطونیہ اور خود حورم کی زبانی وہ خواب گاہ تک کے راستے اور دیگر تفصیلات سے اس قدر واقف تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ کچھ معلومات اسے ابوبکیٰ کے ساتھیوں نے فراہم کی تھیں اور ساتھ ہی اس کے اور حورم کے درمیان پیغام رسانی کا ذریعہ بھی بنے تھے۔ اس لیے اسے یقین تھا کہ بظاہر بند نظر آنے والا حورم کی خواب گاہ کا دروازہ اس وقت اندر سے بند نہ ہوگا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے اس پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا تو اس کے فوراً ہی کھل جانے سے ایسی راحت محسوس ہوئی کہ لگا جسم کے جلتے ہوئے زخموں پر کسی نے ٹھنڈا مرہم رکھ دیا ہو۔ ایک بے تابی کے سے عالم میں اس نے دروازے کو پوری طرح دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ رات کے اس پہر قصر کے باقی حصوں کی طرح حورم کی خواب گاہ میں بھی بہت ہلکی روشنی تھی۔ اس ہلکی روشنی میں اس نے خالی پڑی وسیع و عریض مسہری کو دیکھا تو حورم کی تلاش میں گردن گھما کر بائیں جنبش دینے کی کوشش کی لیکن اسے اس کوشش میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ لوگ یقیناً اس کی پشت پر موجود دروازے کے دائیں بائیں چھپے ہوئے تھے جن کے ہاتھوں میں موجود تلواروں اور بھالوں نے اس طرح اسے اپنے حصار میں لیا تھا کہ وہ معمولی سی حرکت بھی کرتا تو حورم کی خواب گاہ کا فرش اس کے خون سے رنگین ہو جاتا۔ احساس شکست سے نڈھال اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بجھی ہوئی مشعل پر سے اپنی گرفت ختم کر دی۔

"خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو، نہیں تو امیرزادی حورم کی خواب گاہ میں تمہاری موجودگی ہی اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر یہیں تمہاری گردن اڑا دی جائے تو کوئی اعتراض کرنے والا نہیں ہوگا۔" اسے گھیرنے والوں میں سے ایک نے اسے حکم دیا تو اس کے پاس اس حکم کی تعمیل سے انکار کی جرأت نہیں تھی۔ ہاں، نظروں نے ضرور ایک بار حورم کی وسیع اور شاندار خواب گاہ کے ہر گوشے کا جائزہ لیا۔ کمرے کے قیمتی ساز و سامان نے اسے گواہی دی کہ وہ حورم دختر ارغل کی ہی خواب گاہ ہے لیکن خود اس کا وجود اس خواب گاہ سے غائب تھا۔ مایوسی اور شکستگی کے بوجھ سے لدا وہ ہتھیار بدست آدمیوں کے نرغے میں جس جگہ پہنچایا گیا، وہ یقینی طور پر ایک قید خانہ تھا لیکن اس قید خانے سے بالکل الگ تھلگ جس میں اب تک اس کا قیام رہا تھا۔ اس قید خانے میں قدم رکھتے ہی اسے کسی کے ایسے چیخنے کی آوازیں آئیں جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔ جلد ہی اسے ایک سلاخ دار کوٹھری کی چھت سے الٹا لٹکا لہولہان آدمی دکھائی دے گیا۔ آدمی کا چہرہ اپنے ہی خون میں لت پت تھا اس لیے وہ فوری طور پر اسے شناخت نہیں کر سکا لیکن پھر اس کے ڈیل ڈول اور رنگت نے اسے بتا دیا کہ وہ قید خانے کا حبشی نگراں اور ابوبکیٰ کا خاص آدمی ہے۔ حبشی نگراں کو اس حال میں دیکھ کر اسے کوئی شک نہ رہا کہ اس وقت وہ براہِ راست امیر ارغل کا قیدی ہے۔ اس انکشاف کے بعد اس کے دل میں امید کی اگر کوئی ہلکی سی کرن باقی بھی تھی تو وہ معدوم ہو گئی اور وہ سپاہیوں کے حکم پر اسے اپنے لیے کھولی جانے والی سلاخ دار کوٹھری میں داخل ہوا جیسے سیدھے تختۂ دار پر چڑھایا جا رہا ہو۔

☆☆☆

"آج کے جشن میں تیرے سردار کے قتل کی سازش تیار

www.urdtayeem.com

کی گئی ہے۔ سردار کو کسی مشروب میں دوست الاثر زہر پلایا جائے گا جسے پینے سے سردار کی حالت میں واقع ہونے والی تبدیلی کو وہ خود اور اس کے ہمدرد محض شراب کی مدہوشی سے تعبیر کریں گے۔ یہ مدہوشی ایسی ہوگی کہ رفتہ رفتہ سردار کی اپنے اعضا اور ذہن پر سے گرفت ختم ہو جائے گی اور سردار اپنی زبان سے اپنا ہر راز آشکار کرنے کے بعد دھیرے دھیرے موت کی آغوش میں جا سوئے گا۔'' کنیز کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور آواز پست تھی لیکن ساشا کو یوں لگ رہا تھا کہ اس کے اردگرد زوردار دھماکے ہو رہے ہیں۔

''تم اگر جھوٹ بول رہی ہو تو خود اپنی جان کے ساتھ ظلم کر رہی ہو۔'' آخر اس نے بے پناہ اشتعال کی کیفیت میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کنیز کی گردن دبوچ لی اور غراتے ہوئے بولا۔

''کنیز کو اپنی جان سے ایسی کوئی دشمنی نہیں کہ اسے خطرے میں ڈال کر ایک جھوٹی اطلاع سردار کے کانوں تک پہنچائے۔'' وہ روہانسی ہوگئی اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''کون..... کون ہے وہ جو میرے خلاف یہ خطرناک سازش کر رہا ہے؟'' اس کے چہرے کی سرخی آگ کے شعلوں سے زیادہ تیز تھی۔

''وہی جس نے سابق سردار کے عام سے زخم پر ایسا زہر آزمایا کہ وہ بجائے تندرست ہونے کے قبر کی گود میں جا لیٹا۔'' کنیز کا یہ جملہ ایک اور انکشاف تھا۔ ساشا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''حکیم حاذق.....'' اس نے دانتوں کو اس طرح کچکچاتے ہوئے حکیم حاذق کا نام لیا جیسے ان دانتوں کے بیچ اس کا وجود کچل رہا ہو۔ کنیز نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات تائیدی تھے۔

''لیکن کیوں.....؟ آخر کیوں؟ حکیم حاذق کو ہم سے کیا دشمنی ہے؟'' اس کا حیران ہونا جائز تھا کہ حکیم حاذق ان لوگوں میں سے تھا جن کی اس کے باپ سردار امان سے سب سے زیادہ قربت تھی۔

''اولاد کی محبت میں انسان دوستوں کا بھی دشمن بن جاتا ہے۔ میرے آقا کو بھی سرداری کے لیے اپنے بیٹے سے زیادہ کوئی موزوں نہیں لگتا۔''

''اور مطربہ.....؟'' ساشا کی زبان اپنا سوال مکمل نہیں کر سکی۔

''ایک بہن اپنے بھائی کی کامیابی کے لیے ہر حد سے گزر سکتی ہے۔'' کنیز کے جواب نے ساشا کے سینے میں بھالا سا گھونپ دیا۔ وہ جس کی محبت میں دن رات سرشار رہتا تھا، اس کی محبت ایک دھوکے کے سوا کچھ نہیں تھی۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ اس کے سردار بنتے ہی مطربہ اچانک اس کی طرف کیوں مائل ہوگئی تھی۔

''حاذق اور اس کے خاندان کو ابھی اور اسی وقت اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔'' جوش اور طیش کی شدت سے اس کی آواز کانپ گئی اور اس نے نیام سے تلوار کھینچنی چاہی۔

''نہیں سردار! آپ اکیلے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔ ان کی اتنی بڑی تعداد کے سامنے آپ کے گنتی کے چند وفادار آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ اگر انہیں آپ سے سردار امان کے رازوں اور دفینے کا پتا معلوم نہ کرنا ہوتا تو اتنے تکلف اور منصوبہ بندی سے کام نہ لیتے۔'' کنیز نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اس کا تلوار کے دستے پر جما ہاتھ تھام لیا۔

''تمہاری مجھ سے اتنی ہمدردی کی وجہ.....؟'' ساشا نے اسے گھورا۔

''زندگی میں شاید کبھی آپ وہ وجہ بھی جان لیں لیکن فی الحال میری درخواست ہے کہ مزید تاخیر مت کیجیے اور فوری طور پر یہاں سے فرار ہو جائیے۔ مزید تاخیر میرا جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں آنا رائگاں کر دے گی۔'' کنیز نے عاجزی سے اسے جواب دیا اور پھر تقریباً دھکیلتے ہوئے بولی۔

''خدارا! اب یہاں سے روانہ ہو جائیے۔ مجھے آپ کی منزل کا اندازہ نہیں لیکن زادِ راہ کے طور پر آپ کے گھوڑے کی خرجین میں کچھ کھانے کا سامان اور پانی کی چھاگل رکھ دی ہے۔''

''تمہاری وفاداری کی لاج رکھنے کے لیے میں فی الحال جا رہا ہوں لیکن میرے دشمنوں کو بتا دینا کہ میں اپنے باپ کے خون کا حساب لینے لوٹ کر ضرور آؤں گا۔'' اس نے کنیز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور آمد و رفت کے راستے کا رخ کرنے کے بجائے تلوار کی مدد سے خیمے کے پچھلے حصے کو چاک کر کے باہر نکل گیا۔ فضا میں گانے بجانے اور لوگوں کے بولنے کا شور رچا ہوا تھا لیکن آندھیوں کی زد میں آئے اس کے دل و دماغ کے لیے یہ سب بے معنی ہو گیا تھا۔ وہ خود تک اطلاع پہنچانے والی کنیز پر سو فیصد اعتبار نہ کرنے کے باوجود اس وقت وہاں سے چلے جانے میں ہی اپنی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر سچ اور جھوٹ کی جانچ بھی کر لی جاتی لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ وہ جو راستوں کا شناور تھا، سب سے پہلو بچا کر اپنے علاقے

www.aiidayiem.com

سے تو نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن کسی محفوظ مقام تک پہنچنے سے قبل ہی موت کے ہرکارے اس کے قدموں کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گئے۔ اس کے باپ نے زندگی بھر اسے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سکھایا تھا۔ چنانچہ موت کے ان ہرکاروں سے لڑتا بھڑتا اپنی جان بچانے کی خاطر اس صحرا میں جا نکلا جہاں سے ابوکیٹی کے آدمیوں نے اسے گرفتار کر کے اس قید خانے تک پہنچا دیا جہاں ظلم و جبر کی داستانیں رقم کرنے کے ساتھ ساتھ سازشوں کے تانے بانے بھی بُنے جا رہے تھے۔

☆☆☆

لوئیس کے حبشی نگراں کے ساتھ جانے کے بعد وہ کچھ دیر اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے لوئیس پر غصہ تھا کیونکہ اس نے خود کو اسی کی طرح مظلوم اور بے قصور ظاہر کر کے ابوکیٹی کے لیے جاسوسی کی کوشش کی تھی۔ وہ جس دنیا کا باسی تھا، وہاں اس طرح کی چالیں چلنے اور ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی روش نہیں تھی۔ کم از کم سردار امان کی زندگی تک تو اس نے اپنے اردگرد ایسا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ہاں اختلافات بہت کم ہوتے تھے اور عموماً سردار کے فیصلے سے دور ہو جاتے تھے۔ کبھی صورتِ حال بگڑتی تھی تو فریقین اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بجائے سینہ تان کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاتے تھے۔ کھل کر ایک دوسرے کے خلاف بولتے تھے اور پھر سردار کے منصفانہ فیصلے پر راضی ہو جاتے تھے۔ بچپن سے اس نے سب کچھ راست طریقے سے ہوتا دیکھا تھا اور سازش جیسے مہلک ہتھیار سے اپنے سر پر سرداری کا شملہ رکھنے کے بعد پہلی بار آگاہ ہوا تھا۔

اس کی زندگی میں پہلی بار سامنے آنے والی سازش نے ہی اسے جڑوں سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنے آس پاس والوں کا منافقانہ طرزِ عمل دیکھا تھا، اسے محبت کے نام پر دھوکا دیا گیا تھا اور سرداری کے حصول کے لیے اس کے باپ کو چالاکی سے قتل کرنے کے بعد اس کے لیے بھی جال تیار کیا جا رہا تھا۔ وہ اس جال کو کاٹ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ان دھوکوں اور سازشوں نے اس کے اندر ڈھیروں تلخی بھر دی تھی۔ اندر بھری یہ تلخی ہی تھی جس نے اسے لوئیس کی حرکت کو معاف نہیں کرنے دیا تھا اور اس نے طبیب اور اس کے نائب سلیمان کی مدد سے اس سازش کو بے نقاب کرنے کا انتظام کر دیا تھا جو ابوکیٹی نے لوئیس کے جذبات کا فائدہ اٹھا کر تیار کی تھی۔

''کیا کسی عورت کی محبت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنی آزادی اور جوانی کو خاطر میں لائے بغیر خود کو قید و بند اور تشدد کی بھٹی میں جھونک دے اور جان جانے کی پروا کیے بغیر اس عورت کے حصول کے لیے اندھے راستوں پر چلتا چلا جائے؟'' لوئیس کے طرزِ عمل کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے دماغ میں سوال ابھرا تو ساتھ ہی ایک تلخی سی بھی جسم و جاں میں دوڑ گئی۔ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہی اتنا بڑا فریب ثابت ہوئی تھی کہ اس کی زندگی کو تہ و بالا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دل سے عورت ذات کا اعتبار اٹھا دیا تھا پھر بھی وہ سوچ رہا تھا۔

''کیسی ہو گی وہ عورت جس کی خاطر لوئیس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا منظور کر لیا؟ کیا وہ مطربہ سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گی؟''

''خوب صورت تو ناگن بھی بہت ہوتی ہے تو کیا انسان کو اپنا آپ ڈسنے کے لیے اس کے حوالے کر دینا چاہیے؟'' اپنے سوال کے جواب میں اس کے ذہن سے ایک اور تلخی میں ڈوبا سوال ابھرا تھا لیکن پھر اس نے اس عورت نامی معمے کو اپنے دماغ سے جھٹک دیا اور اپنے اور لوئیس کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر طبیب ہمت کر کے امیر ارغل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا تو لوئیس کا مستقبل تاریک اور اس کا بہتر ہونے کے امکانات تھے۔ امیر اپنے خاندانی راز تک رسائی اور اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی لوئیس کی جسارت کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا اور چونکہ اس نے اس کے مجرم کی نشاندہی میں بنیادی کردار ادا کیا تھا اس لیے وہ اس کی عنایات کا حق دار ٹھہر سکتا تھا۔

''مجھے جونہی اس زمین پر قدم جما کر کھڑے ہونے کا موقع ملا، تم سب کے زمین کے نیچے جانے کا وقت آ جائے گا۔'' اپنے مستقبل کے بارے میں اچھی آس قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے چشمِ تصور سے ان غداروں اور دھوکے بازوں کو دیکھتے ہوئے دھمکی دی جن کی صورتیں اس کے حافظے پر نقش ہو گئی تھیں۔ ان صورتوں کو خیالوں ہی خیالوں میں ان کے انجام کے بارے میں دھمکاتا، وہ کب نیند کی وادی میں اترا اسے خبر نہیں ہو سکی۔ دوبارہ آنکھ بازو ہلائے جانے پر کھلی۔

''اٹھ جا بھائی! کیا طبیب نے تیری دواؤں میں نشہ آور سفوف ملا دیا تھا جو اتنی گہری نیند سو رہا ہے؟'' وہ ایک پہرے دار تھا جو اسے نیند سے جگا رہا تھا۔

''کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے جو تمہیں لگتا ہے کہ

www.aitraylie.com

مجھے جگائے بغیر دن کا آغاز نہیں ہوگا؟'' تہ خانے میں ہونے کے باعث قید خانے میں دن رات اندھیرا ہی چھایا رہتا تھا لیکن اس کی تیز حسیات اندازہ لگا سکتی تھیں کہ رات بیت چکی ہے اور نئے دن کا سورج طلوع ہو چکا ہے۔

''میں تو نہیں لیکن لگتا ہے کہ طبیب صاحب تمہیں دیکھے بغیر دن کا آغاز نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے انہوں نے اپنے عزیز نائب سلیمان کو تمہیں لانے کے لیے یہاں تک بھجوا دیا ہے۔'' پہرے دار کی اطلاع پر اس کا دل اچھل پڑا اور اندر سے گواہی آئی کہ وہ سب ہو چکا ہے جس کے ہونے کا اسے انتظار تھا۔

''آج اس حبشی نے اپنا خوب صورت جلوہ نہیں دکھایا۔'' اندر ہوتی کھد بد نے اسے قید خانے کے نگراں کے بارے میں سوال کرنے پر اکسایا۔

''مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ میں رات کے آخری پہر قید خانے کے پرانے پہرے داروں کی جگہ لینے والے نئے پہرے داروں کی ٹولی کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس کی دی اطلاع سے ظاہر تھا کہ رات بہت کچھ ہوا ہے۔ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں مکمل اور درست اطلاعات سلیمان سے ہی مل سکتی تھیں چنانچہ وہ فوری طور پر پہرے دار کے ساتھ جانے کے لیے روانہ ہو گیا۔ سلیمان تہ خانے سے باہر اس کمرے میں اس کا منتظر تھا جہاں قیدیوں کے بارے میں معلوماتی دستاویزات محفوظ کی جاتی تھیں۔

''تم خوش قسمت ثابت ہوئے میرے دوست! آج کا سورج تمہارے لیے آزادی کے ساتھ ساتھ انعام و اکرام کی امیدیں لے کر طلوع ہوا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ استاد محترم بڑی بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' اسے دیکھتے ہی سلیمان اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور پُرجوش انداز میں اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اطلاع دی۔ استاد محترم سے مراد یقیناً وہ بوڑھا طبیب ہی تھا جس نے اس کے زخم زخم وجود کے علاج میں بڑی جاں فشانی اور مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔

''کیا ابوبکی گرفتار ہو چکا ہے؟'' اس نے سرگوشی میں سلیمان سے دریافت کیا تو اس کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''تم میرے ساتھ چلو تو سہی۔ ساری تفصیلات تمہارے علم میں آ جائیں گی۔''

''جیسا تم کہو۔'' وہ اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہاں سے شفا خانے تک کا راستہ اسے ازبر تھا لیکن آج پہلی بار وہ کھلی آنکھوں سے اس راستے پر سے گزر رہا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ اسے ایک مفرور کی حیثیت سے اس راستے پر سے گزرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اور وہ ایک قیدی کے بجائے آزاد آدمی کی حیثیت سے یہاں سے گزر رہا تھا۔

''آزادی مبارک ہو نوجوان! آؤ میں پہلے تمہارے زخموں کا معائنہ کر لوں پھر ہم آپس میں گفتگو کریں گے۔'' طبیب کے ہونٹوں پر اسے دیکھتے ہی خوشگوار مسکراہٹ آ گئی اور وہ شفا خانے میں اس کا خوش اخلاقی سے استقبال کرتے ہوئے بولا۔ ساشا کے دل میں حالات و واقعات جاننے کے لیے کھد بد مچی ہوئی تھی لیکن اس نے تحمل سے کام لیا اور طبیب کے اشارے پر بستر پر لیٹ گیا۔

''بہت عمدہ، تمہارے زخم کل کے مقابلے میں مزید بہتر حالت میں ہیں اور مجھے امید ہے کہ اگر اسی رفتار سے زخم بھرتے رہے تو تم آئندہ ایک دو دن میں مکمل صحت یاب ہو جاؤ گے۔'' طبیب اس کے زخم کے معائنے کے بعد خوش ہو کر بولا اور پہلے ہی کی طرح بہت توجہ اور احتیاط سے زخموں پر مرہم کا لیپ کرنے لگا۔

''گزشتہ شب کیا ہوا میں جاننے کے لیے سخت بے تاب ہوں۔ اگر آپ میری یہ الجھن دور کر دیں تو میں بہت اچھا محسوس کروں گا۔'' طبیب کا کام ختم ہونے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھا تو بہت شوق سے دریافت کیا۔ حالات بدلے تھے تو اس کا لب و لہجہ بھی بدل گیا تھا اور آج وہ بوڑھے طبیب کو عزت و احترام سے مخاطب کر رہا تھا۔

''مکمل تفصیلات کا تو مجھے علم نہیں ہے لیکن اتنا جانتا ہوں کہ لوئیس کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور قید خانے کے حبشی نگران سمیت اس کے تمام قریبی ساتھی اور ماتحت بھی گرفتار ہو چکے ہیں۔''

''لوئیس، حبشی کے ہمراہ میرے سامنے ہی قید خانے سے باہر نکلا تھا۔ کیا ان دونوں کو ایک ساتھ گرفتار کیا گیا ہے؟'' طبیب کے مختصر جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی اس لیے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا۔

''مجھے ملنے والی معلومات کے مطابق حبشی نگراں اور اس کے ماتحتوں کو اچانک فرائض کی تبدیلی کا حکم نامہ بھیج کر قصر کے منتظم اعلیٰ کے روبرو طلب کیا گیا تھا اور وہیں سے غداری کے الزام میں گرفتار کرنے کے بعد قید خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا جبکہ لوئیس کی گرفتاری امیر زادی حورم کی خواب گاہ میں عمل میں آئی تھی۔''

www.aliibayeem.com

''امیر زادی کی خواب گاہ میں.....؟'' ساشا سن کر دنگ رہ گیا۔

''یعنی آپ نے امیر کو ان کی صاحب زادی اور لوئیس کے تعلق سے آگاہ کرنے کی ہمت کر لی تھی؟''

''ہرگز نہیں۔'' طبیب نے فوراً انکار کیا۔ ''میں اتنی خطرناک جرأت کر ہی نہیں سکتا تھا لیکن امیر نے میری توقع سے زیادہ دور اندیشی سے کام لیا۔ لوئیس کی چھوٹی بہن انطونیہ جو کہ امیر زادی حورم کی خدمت گار رہ چکی تھی، اسے خفیہ طریقے سے گرفتار کر کے عقوبت خانے میں پہنچایا گیا اور اس سے یہ راز اگلوا لیا گیا کہ لوئیس کی اس بے پناہ ہمت کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔''

''اوہ.....'' ساشا کے ہونٹ گولائی میں سکڑے۔

''مجھے اس بے قصور لڑکی کے حال پر افسوس ہے لیکن خاندان کے مرد ہوش کی راہ چھوڑ کر عشق کی دیوانگی اختیار کر لیں تو اس خاندان پر عموماً مصیبتوں کے پہاڑ ہی ٹوٹتے ہیں۔'' طبیب کے چہرے پر تاسف تھا۔

''آپ نے بالکل درست فرمایا۔ عورت کا عشق واقعی مرد اور اس کے خاندان کے لیے تباہی لاتا ہے۔'' طبیب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی نگاہوں میں مطربہ کا عکس گھوم رہا تھا۔ وہ بھی تو اس کے ہوش ربا حسن میں کھو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اگر حکیم حاذق کی کنیز عین وقت پر اسے ہوشیار نہ کر دیتی تو آج شاید وہ بھی اپنے باپ کے برابر ایک قبر میں دفن ہوتا۔

''دوسرے کمرے میں ناشتے کا اہتمام کر دیا گیا ہے۔ پہلے اس سے استفادہ کر لیا جائے پھر مزید بات چیت ہوتی رہے گی۔'' سلیمان جو اسے طبیب کے پاس چھوڑ کر غائب ہو گیا تھا، اچانک ہی واپس آ گیا اور خوش گوار لہجے میں بولا تو ساشا کو یاد آیا کہ یہاں آنے کی جلدی میں اسے ناشتا فراہم نہیں کیا گیا تھا اور وہ خود بھی حالات جاننے کی بے تابی میں اس بات کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اب سلیمان نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی تو بھوک نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''آ جاؤ نوجوان! پہلے ناشتا کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ کی خواہش میں، آج میں نے بھی معمول سے تاخیر اختیار کر لی تھی۔'' طبیب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے شفقت سے اس سے کہا تو وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ فرشی دسترخوان کھانے پینے کی نعمتوں سے سجا ہوا تھا۔ طبیب اور سلیمان کے اصرار پر اس نے خوب پیٹ بھر کر کھایا پیا۔ آخر میں خوشبودار قہوہ پیش کیا گیا جس کی چسکیاں لیتے ہوئے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

''یقیناً آپ نے امیر کے سامنے میرا ذکر کیا ہو گا تب ہی لوئیس کی گرفتاری کے بعد میری آزادی ممکن ہو سکی؟''

''تمہارے ذکر کے بغیر امیر تک اطلاع پہنچانا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر سازشیوں کے چوکنا ہو جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو تمہیں رات بھی قید خانے میں نہ گزارنی پڑتی۔'' طبیب نے اس کے خیال کی تائید کی۔

''اتنی احتیاط کے باوجود ابوبکیٰ کیوں گرفتار نہ ہو سکا؟'' اسے اس مغرور شخص کے گرفتار نہ ہو سکنے کا بہت افسوس تھا جس نے بلاوجہ ہی اسے قید اور تشدد کا نشانہ بنوایا۔

''اسے محض ابوبکیٰ کی خوش قسمتی کہا جا سکتا ہے۔ جس وقت میں نے امیر کو ساری سازش سے آگاہ کیا، ابوبکیٰ اس سے بہت پہلے ہی اپنے خاص آدمیوں کے دستے کے ساتھ قصر سے روانہ ہو چکا تھا۔ سنا ہے ان دنوں وہ زیادہ سے زیادہ ہتھیاروں کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ اس نے امیر ارغل کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اگر امیر سالک اور دوسرے دشمنوں سے بچنا ہے تو زیادہ سے زیادہ ہتھیاروں کا حصول ناگزیر ہے۔ وہ ہتھیاروں کی خریداری کے سلسلے میں ہی سفر پر نکلا تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ نقشے کے غیاب کے وقت قصر سے دور رہ کر خود کو ہر طرح کے الزام اور جوابدہی سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔'' اسے ابوبکیٰ کے گرفتار نہ ہونے کی وجہ سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ طبیب نے اس کی عدم موجودگی کے بارے میں بھی اپنی رائے دی۔

''کیا امیر ارغل کے پاس ایسے جانبازوں کی کمی ہے جنہیں ابوبکیٰ کے تعاقب میں بھیجا جا سکتا؟'' اس نے بھویں اچکا کر سوال کیا۔

''بالکل نہیں لیکن ابوبکیٰ جیسے قریبی شخص کی غداری کے بارے میں جان کر امیر سخت اضطراب کا شکار ہو گئے تھے اور انہیں خدشہ تھا کہ اگر فوری طور پر ابوبکیٰ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تو تیار کی گئی سازش پر عمل نہیں کیا جائے گا اور ملزمان رنگے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ جائیں گے۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے ملزمان جب ابوبکیٰ کے روبرو اعتراف جرم کریں گے تو اس کے پاس صحت جرم سے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔''

''لیکن ایسا تو تب ہی ہو گا جب ابوبکیٰ گرفتار ہو جائے۔'' ساشا کا لہجہ تیز ہوا اور اضطرابی کیفیت میں اس نے سلیمان کے ابھی ابھی اپنی پیالی میں بھرے گئے گرم قہوے کی چسکی لی۔ قہوے کی گرمی نے اس کے ہونٹوں اور

www.urdtaypoint.com

زبان کو جلایا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

''امیر کو ابوکیلیٰ کی گرفتاری کے سلسلے میں زیادہ تردد نہیں ہے۔ وہ جس علاقے میں گیا ہوا ہے، وہاں کا امیر، امیر ارغل کے گہرے دوستوں میں سے ایک ہے۔ امیر کی طرف سے پیغام بھیجے جانے پر وہ اسے از خود بھی گرفتار کر کے یہاں بھجوا سکتا ہے لیکن تم تسلی رکھو..... امیر نے علی الصباح ایک دستہ ابوکیلیٰ کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا ہے۔ جلد ہی ابوکیلیٰ اپنے ساتھیوں کے ساتھ قید خانے میں سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔''

''اب تمہیں ابوکیلیٰ کے بجائے اپنے حال کی فکر کرنی چاہیے دوست! ابوکیلیٰ اب تمہارے بجائے امیر محترم کا مسئلہ ہے۔'' سلیمان جو اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے میزبانی کے فرائض انجام دیتا رہا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ چونک گیا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''مطلب یہ کہ تمہارے امیر سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اس ملاقات سے قبل تمہیں اپنا حلیہ سدھارنا ہوگا۔ امیر تم سے ایک قیدی کے بجائے معزز مہمان کی حیثیت سے ملاقات کرنا پسند کریں گے۔'' سلیمان نے اسے اپنی بات کا مطلب سمجھایا تو اس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی لیکن پھر خیال آنے پر بول پڑا۔

''ایک لٹا پٹا غریب الوطن مسافر امیر سے ملاقات کے لائق حلیہ بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میری بے اسبابی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا امیر میرے حلیے سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔''

''اب تم قصر کے معزز مہمان ہو۔ اس لیے تمہیں اپنے بے اسباب ہونے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارا معائنہ اور ذہنی الجھنیں دور کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں قید خانے سے تمہیں سیدھا اس مہمان خانے میں لے جاتا جہاں امیر محترم کے حکم سے تمہاری رہائش کا انتظام مکمل کیا جا چکا ہے۔'' سلیمان نے اسے اطلاع دی تو وہ تقدیر کی اس کایا پلٹ پر زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ سردار سے ایک زیرِ ستم قیدی اور قیدی سے ایک امیر کے معزز مہمان کے مراحل اتنی تیزی سے طے ہوئے تھے کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

''تو تم ہو وہ نوجوان جس کی بدولت ہم ایک بھیانک سازش سے آگاہ ہوئے۔'' ساشا سے مخاطب شخص نے بے حد قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بیش قیمت پتھروں سے مزین انگوٹھیاں موجود تھیں۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا اور دائیں کان میں ہیرے جڑی بالی جھول رہی تھی۔ اس کا فربہ جسم اور بیٹھنے کا تساہل بھرا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی محنت و مشقت سے کام نہیں لیا اور ہمیشہ عیش و عشرت کے مزے لوٹتا رہا ہے۔ وہ امیر ارغل تھا۔ اس قصر کا مالک اور اردگرد کے علاقے کا بے تاج بادشاہ۔

''جی ہاں، میں ہی وہ خوش قسمت ہوں جسے امیر کی یہ خدمت انجام دینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔'' وہ میزا جا سرکش ندی کی طرح تھا لیکن یہ اس کے دانا باپ کی تربیت تھی جو اسے امیر ارغل جیسے لوگوں سے گفتگو کے قرینے کا بھی علم تھا۔

''ہم تمہیں تمہاری اس خدمت کا خاطر خواہ انعام دیں گے۔ تمہاری وجہ سے ہم اپنی زندگی کے بدترین حادثے سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' امیر کے اندازِ گفتگو سے ظاہر تھا کہ رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کے باوجود وہ اندر سے مضطرب ہے۔

''آپ کی خوشنودی ہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔ ابوکیلیٰ کے ہاتھوں میری گرفتاری یقیناً آپ کے خلاف ہونے والی سازش کو طشت از بام کرنے کے لیے قدرت کی طرف سے ایک مدد تھی۔'' اس بار بھی اس نے عاجزی سے کام لیا۔

''ہمارے سامنے اس غدار کا نام نہ لو۔ اس کا نام سن کر ہمارا خون کھولنے لگتا ہے۔ ہم نے اسے عزت دی اور اس نے ہماری ہی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی سازش تیار کر ڈالی۔'' امیر کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ پڑ گیا۔ فوراً ہی اس کے دائیں جانب کھڑی کنیز حرکت میں آئی اور اس کے ہاتھ میں موجود پیالے کو سرخ شراب سے بھر ڈالا۔ امیر نے ایک ہی سانس میں ساری شراب اپنے حلق سے نیچے اتار لی اور پیالہ اٹھا کر دور پھینکا۔ شاید اس کی نیت پیالے کو دیوار پر دے مارنے کی تھی لیکن فاصلہ زیادہ تھا اور امیر کے مشقت سے ناواقف بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ پیالے کو یہ درمیانی فاصلہ طے کروا پاتے اس لیے وہ دیوار تک پہنچنے کے بجائے درمیان میں ہی گر گیا اور فرش پر بچھے دبیز قالین کی وجہ سے ٹوٹنے سے محفوظ رہا۔ کنیز نے لپک کر پھرتی سے گرا ہوا پیالہ اٹھا لیا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ اس شخص کی غداری نے آپ کو صدمہ پہنچایا ہے لیکن آپ کو اطمینان ہونا چاہیے کہ اب بھی آپ کے اردگرد بہت سے وفادار اور جاں نثار موجود ہیں۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ذرا سا خم دیا تو امیر ارغل اسے غور سے دیکھنے لگا۔ چند لمحے نظروں ہی نظروں

www.aitbayjeem.com

میں اسے جانچا اور پھر بولا۔

''ہم نے سنا ہے کہ تم ایک تاجر ہو جو ملکوں ملکوں قیمتی جواہرات اور کپڑے وغیرہ فروخت کرتے پھرتے ہو۔ ایک تاجر سے ہم اپنے لیے کس خدمت کی امید کر سکتے ہیں؟''

''آپ نے میرے متعلق جو کچھ سنا ہے مجھے اس سے انکار نہیں لیکن میں آپ کی یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک تاجر کے بازوؤں میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کو میری جانچ مقصود ہو تو اپنے کسی بھی شمشیر زن سے مقابلہ کروا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو میری شمشیر زنی کی صلاحیت متاثر نہیں کر سکی تو بھی آپ میری زبان دانی کی صلاحیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک صاحبِ اختیار شخص کو مجھ جیسے آدمی کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے۔'' وہ امیر سے ملاقات کی اطلاع ملنے کے بعد سے مسلسل اس کے دربار میں اپنی جگہ بنانے کے بارے میں سوچتا رہا تھا اس لیے پہلا موقع ملتے ہی اس سلسلے میں گفتگو شروع کر دی۔

''ہم تمہاری خواہش کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ہم حیران ہیں کہ ایک کامیاب تاجر کو ہماری ملازمت میں کیا کشش محسوس ہو رہی ہے؟'' امیر کے ہاتھوں میں ایک نیا پیمانہ آ چکا تھا اور اس سے گھونٹ گھونٹ مشروب حلق میں انڈیلتا وہ آنکھوں میں تجسس لیے ساشا سے پوچھ رہا تھا۔ مؤدب اور سجی سنوری کنیزیں امیر کے روبرو بیٹھے اس کے مہمان کی مدارت میں بھی پیچھے نہیں تھیں لیکن ساشا امیر کے مقابلے میں بہت سست روی سے پی رہا تھا اور انہیں بہت کم اس کی خدمت کا موقع مل سکا تھا۔

''مجھے امیر کی کشادہ دلی کی اطلاعات اور اپنی کسمپرسی نے اس درخواست کی ہمت عطا کی ہے۔ جیسا کہ آپ کو خبر ہو گی کہ میں ایک چھوٹی ریاست کا باشندہ ہوں تو میرے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ میں کوئی بہت زیادہ مالدار تاجر ہوں، درست نہ ہو گا۔ ہاں یہ اتفاق ضرور تھا کہ زیادہ منافع کی خواہش میں، اس بار میں اپنے کل مال و متاع کے ساتھ تجارتی قافلہ لے کر گھر سے نکلا تھا اور امید رکھتا تھا کہ جب لوٹ کر واپس اپنے گھر جاؤں گا تو پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہو چکا ہوں گا لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ لٹیروں نے شب کی تاریکی میں اس طرح ہمارے قافلے پر حملہ کیا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ یقیناً ہماری تباہی میں رات کے پہرے داروں کی غفلت کا بھی عنصر شامل ہو گا لیکن اب کسی کو موردِ الزام ٹھہرانے اور تفتیش سے گزارنے کا موقع ہی کہاں ہے؟ آج کی سچائی بس اتنی ہے کہ میں لٹیروں کے ہاتھ سے اپنی جان کے سوا کچھ بھی بچا کر لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور ان خالی ہاتھوں کے ساتھ لوٹ کر گھر واپس جاؤں گا تو وہاں گھر کا انتظام و انصرام سنبھالنے والے ملازمین کے لیے چھوڑے گئے تھوڑے سے اناج اور محدود رقم کے سوا ایسا کچھ نہیں ہے جو مجھے دوبارہ سے معاشی طور پر مضبوط بنانے میں مدد دے سکے..... ایسے میں میرے پاس آپ سے یہ گزارش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ آپ مجھے اپنی خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔'' اسے اپنے قدم جمانے کے لیے زمین کی ضرورت تھی اور وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ اسے امیر ارغل کے ساتھیوں کے درمیان اپنی جگہ بنانی ہے۔ اس لیے اتنی دلسوزی سے وہ جھوٹی داستان سنا رہا تھا جو امیر کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکے۔

''ہمیں تمہارے حالات جان کر گہرا دکھ ہوا۔ بہرحال جب تک تم یہاں ہو خود کو بے سروساماں محسوس کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ تم چاہو تو غیر معین مدت کے لیے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے بھی قصر میں رہ سکتے ہو، بصورتِ دیگر تمہارے لیے تمہاری حسبِ خواہش کسی ملازمت کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔'' امیر کا جواب اس کی امیدوں اور خواہشات کے مطابق تھا۔

''میں آپ کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ فخر محسوس کروں گا۔'' اس نے ادب سے جواب دیا جسے سن کر امیر مسکرایا۔ ابھی اس کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک خدمت گار نے باریابی کی اجازت چاہی۔ اس مداخلت پر امیر کی تیوریوں پر بل پڑے۔ ساشا سے اس ملاقات کے دوران اس کی خاص کنیزوں کے سوا کسی کو وہاں موجود رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں اسے یہ مداخلت ناگوار نہ گزرتی تو کیا ہوتا لیکن پھر وہ کسی خیال سے چونکا۔ اس کے حکم سے سرتابی کا مطلب تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا ہے۔ اس نے خدمت گار کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

''کیا ہم اس مداخلت کی وجہ جان سکتے ہیں؟'' امیر نے اپنے سامنے مؤدب کھڑے ہونے والے خدمت گار کے بندھے ہاتھ اور جھکی نگاہیں دیکھیں اور بھویں اچکا کر پوچھا۔

''ابوسعید کی گرفتاری کے لیے آپ کے دوست امیر سفیان کی خدمت میں درخواست لے کر جانے والا دستہ واپس آ چکا ہے اور دستے کا سالار آپ کے حضور باریابی کی اجازت کا خواستگار ہے۔'' خدمت گار نے مدعا بیان کیا۔

www.aldayeen.com

''اوہ صادق..... وہ ہماری توقع سے جلدی واپس آ گیا۔ اسے جلد از جلد ہماری خدمت میں پیش کیا جائے۔ وہ ہمیں ابوبکیٰ کی گرفتاری کی خوش خبری سنانے کے لیے بے قرار ہوگا۔'' امیر اطلاع سن کر کھل اٹھا اور بڑبڑانے کے سے انداز میں مزید بولا۔

''بہت ممکن ہے کہ ہمارے دوست امیر سفیان نے صادق کے ہاتھ ہمیں کوئی پیغام بھیجا ہو اور صادق اس پیغام کو جلد از جلد ہم تک پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہو۔''

امیر کے جوش و خروش اور خوش فہمیوں سے قطع نظر ساشا کی نگاہیں خدمت گار کے چہرے کے تاثرات کھوجتی رہی تھیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا اور امیر سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ممکن ہے امیر نے اس کی جھکی نظروں کو اپنے ادب و احترام پر محمول کیا ہو لیکن ساشا کی نظریں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ خدمت گار جس شخص کے لیے اذنِ باریابی طلب کرنے آیا ہے، وہ شخص امیر کے لیے کم از کم خوشی کی کوئی خبر لے کر نہیں آیا ہوگا۔ مذکورہ شخص اندر آیا تو اس کے چہرے پر چھائے مایوسی، حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات نے اس کے اندازے کو مزید تقویت بخشی۔ اس بار امیر بھی چونک گیا۔

''کیا بات ہے صادق! ہم تمہارے چہرے پر وہ تاثرات نہیں دیکھ رہے جو ایک کامیاب مہم سے واپسی پر ہمیں نظر آنے چاہیے تھے۔''

''مجھے افسوس ہے امیر محترم لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی اچھی خبر لانے سے قاصر رہا ہوں۔'' اس شخص نے پست آواز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' جتنا اس کا لہجہ پست تھا امیر نے اتنے ہی بلند لہجے میں سوال کیا۔

''میں آپ کے حکم کی تعمیل میں ابوبکیٰ کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔'' امیر کو غصے میں آتا دیکھ کر صادق کی آواز لرزنے لگی تھی۔

''کیا ابوبکیٰ تمہارے وہاں پہنچنے سے قبل فرار ہو چکا تھا؟''

''اگر ایسا ہوتا تو آپ کا یہ خادم دنیا کے آخری کنارے تک اس کا تعاقب کرتا۔''

''ہم سے معموں میں بات نہ کرو صادق؟''

''ابوبکیٰ کو آپ کے دوست امیر سفیان اپنی پناہ میں لے چکے ہیں۔ انہوں نے اسے میرے حوالے کرنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔'' صادق کی دی اطلاع امیر ارغل پر بجلی بن کر گری۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ امیر سفیان..... ہمارا دوست..... وہ ہمارے ایک غدار کو کیسے پناہ دے سکتا ہے۔ تم نے اسے بتایا ہوتا کہ تم ہمارے حکم پر ابوبکیٰ کو گرفتار کرنے پہنچے ہو۔''

امیر کی حیرت دور نہیں ہو رہی تھی جبکہ اس کے قریب بیٹھا ساشا اس صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

''میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ ابوبکیٰ کو پناہ دینا ہمارے امیر محترم کی دوستی سے کنارہ کش ہونے کے مترادف ہوگا۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟'' امیر نے بے تابی سے پوچھا۔

''ان کا کہنا تھا کہ ابوبکیٰ جیسے کارآمد آدمی کے حصول کے لیے.....'' صادق اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

''ہم امیر سفیان کا مکمل ارشاد سننا چاہتے ہیں۔'' صادق کے رکنے پر امیر ارغل نے غرانے کے انداز میں اسے ٹوکا۔

''ایک مفاد پرست دوست کے گستاخانہ جملے کو دہراتے میری زبان جلتی ہے امیر محترم.....'' صادق نے معذوری کا اظہار کیا۔

''ہم اپنے سگے بھائی کی طوطا چشمی سہہ سکتے ہیں تو ایک دوست کے گستاخانہ الفاظ سننے کے لیے بھی ہماری سماعتوں میں گنجائش ہے۔ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہمیں امیر سفیان کے خیالات سے لفظ بہ لفظ آگاہ کیا جائے۔''

''ان کا کہنا تھا کہ ابوبکیٰ جیسے کارآمد آدمی کے حصول کے لیے.....'' صادق ایک بار پھر رکا لیکن امیر کی گھورتی نظروں کی تاب نہ لا کر لرزتی آواز میں جملہ مکمل کر ہی لیا۔

''امیر ارغل جیسے نکمے دوست کا ساتھ چھوڑ دینا کوئی مہنگا سودا نہیں۔''

امیر ارغل اگرچہ خود پوری بات جاننے کے لیے اصرار کر چکا تھا پھر بھی صادق کا جملہ مکمل ہونے پر اس کا چہرہ بے پناہ سرخ ہو گیا اور وہ یوں طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا جیسے ابھی صادق کی زبان کھینچ لے گا۔

''میری کوئی خطا نہیں امیر محترم! میں نے صرف آپ کے اصرار پر امیر سفیان کی بات.....'' صادق کو یقیناً اپنی خیریت مشکوک نظر آنے لگی تھی جو ہاتھ جوڑتے ہوئے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن امیر ارغل نے اسے اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی۔ اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوتے ہی صادق کی زبان بند ہو گئی۔

www.urdtrayjeem.com

''تم اب جا سکتے ہو۔ آنے والا وقت جلد سفیان کو بتا دے گا کہ امیر ارغل کی دوستی سے محرومی کتنا مہنگا سودا ہے۔''
امیر کے بھینچے ہوئے جبڑے اس کے اندر ہوش مارتے غیظ و غضب کا پتا دے رہے تھے۔ صادق کے جانے کے بعد بھی وہ سخت طیش کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی چہیتی کنیزیں کمرے کے گوشوں میں سمٹ گئیں اور وہاں ایسا ہُو کا عالم ہو گیا جیسے کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اپنی جگہ پر بیٹھا ساشا بھی بالکل ساکت تھا جبکہ امیر کا یہ حال تھا کہ وہ گویا اپنے سوا وہاں پر کسی کی موجودگی سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ کافی دیر اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے گزارنے کے بعد ساشا کو بے چینی ہونے لگی۔ ماحول پر چھایا جمود توڑنے کے لیے وہ دھیرے سے کھنکھارا تو گوشوں میں سمٹی کنیزوں کے چہرے یوں فق ہو گئے جیسے اس نے کسی سوئے ہوئے عفریت کو جگانے کی غلطی کر ڈالی ہو۔
''اوہ..... تم ابھی تک یہیں ہو؟'' امیر اس کے کھنکھارنے پر چونکا اور اس کی جانب دیکھ کر استعجاب سے بولا۔
''امیر محترم کی اجازت کے بغیر خادم کے قدموں میں جنبش کی تاب نہیں تھی۔'' روم میں رہ کر رومی بن جانے کے مقولے کے مصداق اس نے بھی امیر کے نمک خواروں کا سا لہجہ اختیار کیا۔
''ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔ کل ہم تمہیں ایک ایسا دلچسپ تماشا دیکھنے کے لیے دعوت دیں گے جو اب سے قبل تم نے شاید کبھی نہ دیکھا ہو۔'' امیر ارغل کی آنکھوں میں ایک بھیڑیے کا سا غضب اور کینہ دکھائی دینے لگا۔ ساشا جیسا بے جگر اور نڈر آدمی بھی اس کی آنکھوں کے تاثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے امیر کی آنکھوں میں خون کی بھوک پڑھ لی تھی۔ وہ یہ بھوک کس کے خون سے مٹائے گا، اس سوال کا جواب اسے آنے والے دن میں ہی مل سکتا تھا۔

☆☆☆

گھوڑے کی پشت پر موجود سوار کے چہرے کی معصومیت اور نرمی اس کی کم سنی کا اعلان کر رہی تھی اور وہ جس طرح نڈھال سا گھوڑے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یا تو زخمی ہے یا طویل اور کٹھن مسافت نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی ہے۔ گھوڑا بھی کچھ اس انداز سے چل رہا تھا جیسے اس کے لیے ہر قدم دوبھر ہو لیکن چلتے چلے جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ ہو۔
''تمہارا بہت شکریہ دوست! تم نے اپنی طاقت سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم ان ظالموں سے بہت دور نکل آئے ہیں اور اب ہمارے پاس اتنی گنجائش ہے کہ کچھ دیر آرام کر سکیں۔ وہ دیکھو..... وہ درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا ہے۔ اگر تم وہاں تک چلنے کی ہمت کر سکو تو ہم ان درختوں کے سائے میں زیادہ بہتر طور پر آرام کر سکیں گے۔'' نوجوان سوار جس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں اور درد سے بدن کا ہر جوڑ ٹوٹ رہا تھا، گھوڑے کی گردن سے لپٹے لپٹے یوں سرگوشی میں بولا جیسے یقین ہو کہ گھوڑا اس کی ہر بات سمجھ رہا ہو۔ تھکے ماندے گھوڑے نے اس کے اس یقین کی تائید میں سر اٹھا کر درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا اور ہنہنا کر اپنا رخ اس کی طرف کر دیا۔ سوار نے طمانیت کے گہرے احساس کے تحت آنکھیں بند کر لیں۔ پل بھر کے لیے شاید اسے جھپکی بھی آ گئی تھی چنانچہ جب دوبارہ آنکھیں کھول کر دیکھا تو خود کو گھوڑے سمیت درختوں کے جھنڈ کے درمیان پایا۔
''تھکن کی شدت سے مجھ میں تو کھانے پینے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ تم یہاں لگی تازہ گھاس اور درختوں کے پتوں سے شغل کرو لیکن میری پہلی ترجیح آرام ہے۔'' سوار جس نے عربی طرز کا لباس پہنا ہوا تھا، گھوڑے سے نیچے اتر کر اپنے کہنے کے مطابق سبز اور نرم گھاس پر دراز ہو گیا۔ سرہانے کے طور پر اس نے اپنے جسم پر موجود بڑی سی چادر کو بل دے کر اس طرح گولائی میں لپیٹ لیا تھا جیسے کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ لمحہ بھر میں ہی اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہو گئیں اور شدید تھکن کی غماز گہری اور بوجھل سانسیں سنائی دینے لگیں۔ سوئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ گھوڑے کی تیز ہنہناہٹ نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا اور ایک خودکار عمل کے تحت اس نے سونے سے قبل سرہانے کے نیچے رکھا جانے والا خنجر کھینچ نکالا۔
''خنجر پھینک دو نوجوان! تم اس وقت بہترین تیر اندازوں کے گھیرے میں ہو۔ تمہارا یہ معمولی خنجر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' خنجر ہاتھ میں پکڑے اس کی متلاشی نظریں ابھی اِدھر اُدھر بھٹک ہی رہی تھیں کہ ایک چوڑے تنے کے درخت کے پیچھے سے کسی نے بھاری اور گونجیلی آواز میں اسے متنبہ کیا۔
''تم کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کا کیا مقصد ہے؟'' نوجوان نے اپنی سراسیمگی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لہجے کو ذرا مضبوط بنا کر پوچھا۔
''اگر تم ہمیں یقین دلا دو کہ تم سے ہمیں کوئی نقصان

www.urdupoint.com

نہیں پہنچے گا تو یقین رکھو کہ ہم تمہارے لیے قطعی بے ضرر ثابت ہوں گے۔''

''میں ایک تنہا شخص بھلا کسی کو کیسے نقصان پہنچا سکتا ہوں۔'' نوجوان کے لہجے سے حیرت جھلکی۔

''تنہا شخص اگر ایک جاسوس ہو تو پوری قوم کو بھی تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' اس بار جواب دینے والے کے لہجے میں تلخی تھی۔

''جاسوس..... کس کا جاسوس!'' نوجوان کی حیرت سوا ہوگئی۔

''مجھے تمہاری حیرت پر حیرت ہے۔ یہ بات تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ آج کل اپنی جان بچا کر اِدھر اُدھر بھٹکنے والے قافلوں کے پیچھے کس کے جاسوس لگے رہتے ہیں۔'' لہجے کی تلخی سوا ہوگئی۔

''میں بہت دور سے سفر کرتا ہوا اس علاقے میں پہنچا ہوں اور خود ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ میں بھلا کس کے لیے جاسوسی کروں گا۔'' نوجوان نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

''پھر تمہیں خیر سگالی کے اظہار کے لیے اپنا خنجر اب تک پھینک دینا چاہیے تھا۔''

''یہ صرف خود حفاظتی کے لیے ہے۔'' نوجوان نے وضاحت دی، جواب میں بیک وقت کئی تیر اس کے قریب سے سنسناتے ہوئے گزرے اور اردگرد کے درختوں کے تنوں میں پیوست ہوگئے۔ سراسیمہ نوجوان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل کر رہ گئیں۔

''تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تم اس خنجر سے کس حد تک اپنا دفاع کر سکتے ہو اس لیے بہتر ہے کہ اب اسے پھینک دو تاکہ ہم ایک دوسرے کے روبرو گفتگو کر سکیں۔''

نوجوان میں تاب نہیں رہی تھی کہ سخت لہجے میں دیے گئے اس حکم کو ماننے سے انکار کر سکے۔ چنانچہ اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں خنجر دور پھینک دیا۔ فوراً ہی درخت کے پیچھے سے ایک دراز قد اور مضبوط جسامت کا جوان برآمد ہوا اور نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آٹھہرا۔ کچھ پل وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر نوجوان نے مقابل کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیں۔

''کون ہو تم اور اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟'' کاٹ دار لہجے میں سوال کیا گیا۔

''میرا نام قاسم ہے۔ میں اور میرے والد ایک تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے ہمارے قافلے پر حملہ کر دیا۔ افراتفری میں ہم سب اپنی جان بچانے کے لیے بھاگے۔ میں بھاگتے بھاگتے دور نکل گیا اور اپنی راہ کھو بیٹھا۔ اب دو دن سے اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہوں لیکن ابھی تک اپنا قافلہ یا اس کا کوئی ساتھی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔'' نوجوان نے جھکی نظروں کے ساتھ اسے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔

''تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ کیا وہ تاجر ہیں؟'' مقابل کی نظریں اس طرح اس پر جمی ہوئی تھیں جیسے اسے اندر تک کھوج رہی ہوں۔

''ان کا نام ابوبکر ہے۔ وہ کپڑے اور میوہ جات کی تجارت کرتے ہیں۔'' نوجوان نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرنے کی کوشش کی۔

''تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟''

''ملک شام سے۔'' نوجوان نے اختصار سے جواب دیا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' اس شخص نے یک دم ہی اپنی تلوار نکال کر اس کی گردن پر رکھ دی۔

''تم مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکتے۔'' نوجوان تنک کر بولا۔

''میں صرف الزام نہیں لگا رہا، اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ اول یہ کہ تم کوئی شامی نہیں ہو۔ تمہارا لہجہ شامیوں سے قطعی مختلف ہے۔ دوم یہ کہ بے شک تم طویل مسافت کے باعث تھکن کا شکار ہو لیکن یہ جھوٹ ہے کہ تم اپنے قافلے پر ڈاکوؤں کے حملے کے بعد افراتفری میں جان بچا کر بھاگے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تم تھکن کے علاوہ بھوک و پیاس سے بھی نڈھال ہوتے لیکن میں تمہارے اندر ایسے کوئی آثار نہیں دیکھ رہا۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارے گھوڑے کی خرجین میں اب بھی کھانے پینے کی اشیا کا کچھ ذخیرہ موجود ہے اور افراتفری میں بھاگ کھڑے ہونے والے اس قدر انتظام کے ساتھ نہیں بھاگتے۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے اس کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کر رہا تھا۔ نوجوان نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جب میں اپنی بات مکمل کر لوں تو بے شک تم اپنی صفائی میں جو چاہے بول سکتے ہو۔'' اس کی تنبیہ پر نوجوان نے اپنے ہونٹ بھینچ کر خاموشی اختیار کر لی۔

''تمہارے بارے میں میرا تیسرا اور آخری اندازہ یہ ہے کہ تم ایک نوجوان لڑکے کے بجائے لڑکی ہو۔'' اپنا جملہ مکمل کرتے ہی اس نے تلوار کو جنبش دی۔ اس جنبش کے

www.alibayteem.com

نتیجے میں نوجوان کے سر پر عربیوں کے مخصوص انداز میں رکھا بڑا سا رومال نما کپڑا اپنے دائرے سمیت دور جا گرا اور نوجوان کی سر کے گرد دائرے کی شکل میں مضبوطی سے لپٹی چوٹی واضح ہو گئی۔

''کیا تاتاریوں کے پاس مسلمانوں کے قافلوں کا کھوج لگانے کے لیے کوئی مرد نہیں بچا تھا جو انہوں نے ایک عورت کو ہماری جاسوسی کے لیے بھیج دیا؟'' اس نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں حقارت سے پوچھا۔

''نہیں، بخدا نہیں..... آپ میرے بارے میں بالکل غلط گمان کر رہے ہیں۔ بے شک میں نے اپنے متعلق غلط بیانی سے کام لیا ہے لیکن وہ بھی سچ نہیں جو آپ میرے متعلق سوچ رہے ہیں۔'' وہ جواب تک قصداً آواز کو بھاری کر کے بول رہی تھی، نرم نسوانی لہجے میں بولی تو مقابل پل بھر کے لیے اس کی آواز کی نغمگی میں کھو سا گیا لیکن پھر اسے جلد ہی اس کی مشکوک حیثیت اور اپنا فرض یاد آ گیا اور دانستہ لہجے کو سخت بنا کر بولا۔

''میں تمہارا سچ سننا چاہتا ہوں۔ اس سچ کو پرکھنے کے بعد ہی میں فیصلہ کر سکوں گا کہ تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ سچ کی طاقت اپنا آپ تسلیم کروا لے گی۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ اعتماد در آیا اور وہ قریب کھڑے اپنے گھوڑے کی پشت کو پیار سے تھپتھپا کر ایک بڑے سے پتھر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''میری داستان کچھ طویل ہے، آیئے اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''تمہارا گھوڑا لاجواب ہے۔'' اس نے بے ساختہ اس کے گھوڑے کو سراہا اور اپنے جملے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس کی وفاداری اور ہوشیاری ہی تھی کہ تم میرے خود تک پہنچنے سے قبل ہوشیار ہو گئیں۔ اگر یہ ہنہنا کر تمہیں نہ جگاتا تو تم میری تلوار کی نوک اپنی گردن میں چبھنے سے ہی جانتیں۔''

''میں نیند کو ترس چکی تھی اور طویل سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس لیے یہ جھنڈ نظر آتے ہی آرام کا فیصلہ کیا۔ اپنے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے مجھے اپنے گھوڑے کی ہوشیاری اور وفاداری پر بھرپور اعتماد تھا۔'' وہ جو بڑے سے پتھر پر ایک شہزادی کی سی شان سے بیٹھ چکی تھی، مسکرا کر بولی۔

''اب تم اپنے بارے میں جلدی جلدی سب بتا ڈالو۔ مجھے اور میرے ساتھی کو پڑاؤ سے نکلے بہت دیر ہو چکی ہے۔ زیادہ دیر ہو گئی تو ہمارے باقی ساتھی پریشان ہو جائیں گے۔'' وہ اس کے مقابل ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کے ساتھ صرف ایک ساتھی ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''مجھ پر جس رفتار سے تیر برسائے گئے تھے، مجھے گمان ہوا تھا کہ میرے اردگرد کم از کم چار تیر باز موجود ہیں۔''

''ہم دو ہی اپنی اس صلاحیت کے باعث دس پر بھاری پڑ سکتے ہیں لیکن اپنی اس غلط فہمی کو دور کر لو کہ وہ تیر تم پر برسائے گئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمہاری لاش بھی ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ ہم نے صرف تمہیں تنبیہ کی تھی کہ کسی بھی غلط حرکت سے باز رہو۔''

''بہت خوب۔'' اس نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ تمہارا وقت قیمتی ہے اور تمہیں اپنے پڑاؤ میں واپس لوٹ کر جانے کی جلدی بھی ہے اس لیے میں تمہارا مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی داستان بیان کرنا مناسب سمجھوں گی۔'' وہ شروع ہوئی تو روانی سے اپنے بارے میں بہت کچھ بتاتی چلی گئی۔ وہ توجہ سے سب کچھ سنتا ضروری مقامات پر سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا کر خاموش ہوئی تو کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی ہی چھائی رہی۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ مسکرا کر بولا۔

''اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا لیکن ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔''

''وہ تو آپ نے بھی نہیں بتایا۔'' اس نے بے ساختہ شکوہ کیا۔

''میں نے تو خیر ابھی اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا لیکن چلو نام بتا دیتا ہوں، میرا نام داؤد بن معیز ہے۔''

''مجھے آپ سارہ کہہ سکتے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں سے اوپر ابھی تک وہ باریک مصنوعی مونچھیں موجود تھیں جنہیں اس نے خود کو مردانہ روپ دینے کے لیے چسپاں کیا تھا اور چہرہ سفر کی گرد سے آلودہ تھا پھر بھی داؤد بن معیز نے اس کے ایک قطار میں موجود شفاف موتیوں کی لڑی سے دانتوں کی خوب صورتی میں اس کے حسن کو محسوس کر لیا۔

''سارہ کہہ سکتے ہیں کا مطلب ہے کہ تم سچ مچ سارہ نہیں ہو۔'' اپنی توجہ بٹانے کے لیے اس نے اس کی بات پکڑی۔

''سچ مچ میں کیا ہوں، اس کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن جس نام سے اب تک جانی جاتی رہی ہوں، اسے پوشیدہ رکھنے کے پیچھے اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنے کی خواہش موجود ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے تلاشتا ہوا آپ تک پہنچ جائے۔'' اس

www.aiilaylcom

کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔

''کیا تم ہم سے پناہ کی طلب گار ہو؟'' داؤد بن معیز نے اس کا جواب سن کر حیرت سے پوچھا۔

''میں نے پناہ کی امید میں ہی آپ کو اپنے متعلق سب کچھ بتایا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ویرانوں میں طویل مسافت طے کرنے کے باوجود میں اب تک کسی حادثے سے محفوظ رہی ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مجھے ایک محفوظ پناہ کی ضرورت ہے۔''

''میں تو تمہیں بہت مضبوط اور بہادر عورت سمجھ رہا تھا۔''

''کتنی ہی مضبوط اور بہادر سہی، ہوں تو عورت ہی نا اور عورت ہونا میری ایسی کمزوری ہے جو کسی بھی مقام پر مجھے بے بس کر سکتی ہے۔'' اس نے اپنے اس اعتراف سے ثابت کر دیا کہ وہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ عقلمند بھی ہے۔

''پناہ کی امید رکھنے سے قبل یہ تو پوچھ لیتیں کہ میں نے تمہاری داستان پر اعتبار کیا ہے یا نہیں؟'' اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''مجھے بھروسا ہے کہ سچ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا اور پھر ذرا نخوت سے بولی۔

''مجھ پر تاتاریوں کی جاسوسہ ہونے کا الزام لگانے سے پہلے تمہیں سوچ لینا چاہیے تھا کہ کیا میرے نقوش چپٹی ناک اور چندی آنکھوں والی منگول عورتوں سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں۔''

وہ اس کے نازِ حسن پر بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر چھپا گیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''تاتاری کتنے ہی وحشی اور اجڈ سہی، ان کے بارے میں ایک بات طے ہے کہ وہ بے پناہ چالاک اور عیار قوم ہیں اور اپنی عیاری سے کام لے کر وہ دوسری قوموں میں سے کئی ایسے افراد کو اپنے تسلط میں لے چکے ہیں جو لالچ یا خوف کے تحت ان کے بہت سے مقاصد کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس لیے ایک غیر منگول عورت کا تاتاریوں کی جاسوسہ ہونا بعید از قیاس نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن ایک شے ہوتی ہے، آدمی کے دل کی گواہی..... کیا تمہارا دل میرے سچ پر کوئی گواہی نہیں دیتا؟'' اس کا لہجہ نرم لیکن آنکھوں کا تاثر تیکھا تھا۔ داؤد بن معیز کو اس تاثر نے لاجواب کر دیا اور اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے گردن کو دائیں رخ پر موڑ کر بلند آواز سے کہا۔

آپ پریشان!
آخر کب تک؟

ہماری معلومات کے مطابق ہر چوتھا انسان اپنی اعصابی کمزوری کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا ہربل اعصابی کورس تیار کیا ہے۔ اگر آپ اپنی گھریلو لائف پُرسکون بنانا چاہتے ہیں تو آپ ہمیں اپنی اعصابی کمزوری سے متعلقہ تمام علامات کے بارے میں فون کریں۔ اور آج ہی بذریعہ ڈاک وی پی VP ہربل اعصابی کورس منگوالیں۔ ان شاء اللہ ہمارا اعصابی کورس آپ کو بے حد طاقت دے گا۔ ہمارا اعصابی کورس سستا آسان اور مختصر ہے

دارلشفاء المدنی

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0301-8149979
0309-1604171
0346-0319995

اوقات رابطہ
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

''تم سامنے آسکتے ہو عبدالمالک! میں نے خاتون کو اپنے ساتھ پڑاؤ میں لے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہوں۔'' ردِعمل میں فوراً ہی ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا دو گھوڑوں کی باگیں تھامے ہوئے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ ان میں سے ایک گھوڑے پر شکار کردہ بھیڑ لدی ہوئی تھی۔ لڑکے نے داؤد کے اشارے پر دور گرا سارہ کا خنجر اٹھا کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

''ہمیں بہت طویل سفر درپیش ہے اس لیے موقع ملتے ہی ہم اپنی خوراک کا ذخیرہ بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج بھی خوراک کی تلاش میں گھومتے گھماتے تم تک آپہنچے تھے۔'' اس نے بھیڑ لدے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہوئے اسے بتایا۔ انداز دوستانہ تھا، یوں جیسے اس نے اسے اپنی ایک ساتھی کے طور پر قبول کرلیا ہو۔ داؤد بن معیز کی یہ مہربانی اس کے لیے نعمت سے کم نہیں تھی۔ اس نے جھٹ دور جا گرنے والا سر کا رومال اور کنڈلی کی طرح لپٹی چادر زمین سے اٹھائی اور دونوں چیزوں سے اپنے سر اور جسم کو ڈھانپ کر گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا اور قدرے موٹے کپڑے کا لباس پہلے ہی اس کے نسوانی خدوخال کو واضح نہیں ہونے دے رہا تھا۔ چادر کے استعمال نے مزید پردہ پوشی کا انتظام کردیا۔ داؤد اور عبدالمالک کے شانہ بہ شانہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی وہ شمال کی سمت ڈیڑھ دو میل آگے پہنچی تو اس کی آنکھوں نے زمین پر نصب خیمے دیکھ لیے۔ خیموں کے باہر بچے کھیل رہے تھے۔ چند بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کررہے تھے اور تین چار مسلح جوان مختلف مقامات پر کھڑے یقینی طور پر پہرے داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی اڑائی دھول اور ٹاپوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ بچے فوراً بھاگ کر اندر خیموں میں چلے گئے۔ بزرگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پہرے دار جوان چوکنے نظر آنے لگے پھر شاید انہوں نے اپنے ساتھیوں کو پہچان لیا۔ دو نوجوان بھاگ کر آگے آئے اور داؤد بن معیز کے گھوڑے پر لدی بھیڑ کو دیکھ کر ایک چہک کر بولا۔

''آخاہ! بھیڑ کا شکار کیا ہے اخی نے۔ آج تو ہم تازہ بھنے ہوئے گوشت سے لطف اندوز ہوں گے۔''

''اسے سنبھالو لطیف لیکن خیال رہے کہ اس کے گوشت پر دعوت اڑانے سے پہلے تمہیں میرے گھوڑے کو نہلانے کا انتظام کرنا پڑے گا۔'' داؤد نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا اور چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اتر گیا۔

''بہت خوشی سے اخی! یہ گھوڑا اپنی پشت پر ہماری پسندیدہ خوراک کا بوجھ لاد کر لایا ہے، اس کے جسم پر لگے خون کے دھبے دھونے میں ہم راحت محسوس کریں گے۔'' لڑکے کے لہجے کی چہکار برقرار تھی لیکن اب وہ اور اس کے پیچھے موجود دیگر لوگ اس تیسرے سوار کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے اجنبی تھا۔

''انہیں ثریا کے خیمے میں پہنچا دو عبدالمالک! اس سے کہنا کہ ایک مصیبت زدہ کو اس کی توجہ اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔'' اس نے آنکھوں کے سوال نظرانداز کرکے عبدالمالک کو مخاطب کرکے کہا تو وہ سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے خود ہی گھوڑے سے نیچے اتر آئی۔ عبدالمالک نے اپنے اور اس کے گھوڑے کی باگیں ایک لڑکے کو تھما دیں۔ اتنی دیر میں کسی خطرے کے پیش نظر خیموں میں جا گھسنے والے بچے دوبارہ باہر نکل آئے تھے اور دلچسپی سے اجنبی مہمان کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے محسوس کرلیا کہ ان بچوں کے علاوہ کچھ پوشیدہ آنکھیں بھی ہیں جو یقیناً خیمے کے دروازوں پر پڑی چلمنوں کے پیچھے سے اسے تاک رہی ہیں۔ عبدالمالک اسے لیے ہوئے ایک خیمے کے سامنے رکا اور ادب سے آواز دی۔

''ہمشیرہ ثریا! اخی نے آپ کو ایک مہمان کی خدمت کا اعزاز بخشا ہے۔''

''زہے نصیب! مہمان کو عزت سے اندر بھجوا دو۔'' چلمن کے پیچھے سے ایک نرم و مہذب نسوانی آواز سنائی دی۔

''اندر تشریف لے جایئے خاتون! ہمشیرہ ثریا کی صحبت میں انشاء اللہ آپ کوئی تکلیف محسوس نہیں کریں گی۔'' عبدالمالک نے مؤدبانہ اس سے کہا تو اس نے قدم آگے بڑھائے۔ چلمن اٹھا کر خیمے کے اندر داخل ہونے سے قبل اس نے پلٹ کر داؤد بن معیز کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے گرد جمع ہوجانے والوں کو دھیمی آواز میں کچھ بتا رہا تھا۔ اس نے داؤد کی روشن اور فراخ پیشانی پر ایک نظر ڈالی اور دل میں یہ یقین لیے اندر داخل ہوئی کہ راستے میں اس نے داؤد کو اپنے متعلق دوسروں کو سچ نہ بتانے کی جو درخواست کی تھی، وہ اس کا خیال رکھے گا۔

☆☆☆

سلیمان کے ساتھ بیٹھا ساشا پُرتجسس نظروں سے اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے آس پاس نشستوں پر اور بھی بہت سے لوگ براجمان تھے۔ ان لوگوں میں امیر کے عزیز و اقارب، دوست احباب، خدمت گار و

www.allthaiyeem.com

کنیزوں کے علاوہ علاقے کے عام افراد بھی موجود تھے اور تمام لوگوں کو حسب مراتب مختلف مقامات پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ لوگ ایک ایسی جگہ موجود تھے جہاں بیٹھنے کے لیے بنائی گئی نشستیں اوپر سے نیچے سیڑھیوں کی طرح تعمیر کیے گئے ایک ایسے چبوترے پر بنائی گئی تھیں جو نیم دائرے کی شکل میں تھا اور نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنے سامنے وہ گول میدان نما حصہ اچھی طرح دیکھ سکتے تھے جس کی پوری گولائی کو لوہے کے مضبوط جنگلے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہاں کھیلوں کے مقابلے اور مختلف تماشے منعقد کیے جاتے ہوں گے۔ مختصر الفاظ میں یہ جگہ ایک تماش گاہ تھی اور اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تماشائی منتظر تھے کہ کل کی منادی کے مطابق آج انہیں یہاں کون سا دلچسپ تماشا دیکھنے کو ملنے والا ہے۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہمیں یہاں کون سا تماشا دیکھنے کو ملے گا؟'' ساشا جو امیر کے خاص مصاحب کی طرح قیمتی پوشاک میں ملبوس تھا اور بہت سے افراد کی طرح اس کی تلوار اس کی نیام میں لٹکی ہوئی تھی، سلیمان کی طرف جھک کر اس سے پوچھنے لگا۔

''نہیں..... میں نہیں جانتا۔ عموماً اس مقام پر مختلف کھیلوں کے مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں یا پھر کبھی کبھی مسخرے، بازی گر اور بھانڈ وغیرہ اپنے کرتب دکھاتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آج یہاں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں جسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکے کہ ہم کس قسم کی تفریح سے لطف اندوز ہونے والے ہیں۔'' نفی میں جواب دیتا ہوا سلیمان خود الجھن کا شکار تھا۔

''یعنی میرے ساتھ ساتھ امیر تم سب کو بھی حیرت سے دوچار کرنے والے ہیں۔'' ساشا نے مسکراتے ہوئے اس حصے کی طرف نظر ڈالی جہاں زرنگار لباس میں چہروں کو نقابوں سے ڈھانپے خواتین اپنی نشستیں سنبھال رہی تھیں۔

''اس طرف مت دیکھو۔ وہ امیر محترم کی اعزاء اور کنیزیں ہیں۔'' سلیمان نے اسے ٹوکا تو اس نے اپنی نظروں کا رخ بدل لیا لیکن اسے چین نہیں تھا۔

''یہ تماشا کب شروع ہوگا؟ میں انتظار کرتے کرتے بیزار ہو گیا ہوں۔''

''تھوڑا سا صبر سے کام لو۔ مستورات کی آمد کا مطلب ہے امیر محترم بھی اب تشریف لایا ہی چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہونا ہے ان کی آمد کے بعد ہی ہوگا۔'' سلیمان نے اسے نصیحت کی۔ ابھی اس کے منہ سے بات نکلی ہی تھی کہ نقیب، امیر ارغل کی آمد کا اعلان کرنے لگا۔ تمام لوگ امیر کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساشا کو بھی ان کی تقلید کرنی پڑی۔ امیر نے اپنی نشست سنبھال لی تو باقی لوگ بھی بیٹھ گئے اور نمایاں مقام پر کھڑے اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے جو لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''معززین! آپ جانتے ہیں کہ اس تماش گاہ میں آپ کو ہمیشہ دلچسپ اور انوکھی تفریحات سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ آج بھی امیر محترم یہاں ایک منفرد اور انوکھا مقابلہ منعقد کروا رہے ہیں۔ میں واضح کر دوں کہ یہ کھیل منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کے لیے خوفناک بھی ہو سکتا ہے اس لیے جن خواتین و حضرات کے دل کمزور ہیں وہ چاہیں تو یہاں سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔''

اس اعلان کے ساتھ ہی وہاں موجود افراد کے درمیان بھنبھناتی چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساشا کی نظریں بے ساختہ خواتین والے حصے کی طرف اٹھیں۔ اس نے دیکھا کہ سیاہ لبادے میں ملبوس ایک سرو قامت عورت جس کا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا، اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے پردے میں ہونے کے باوجود ساشا یہ اندازہ لگانے میں کامیاب رہا کہ وہ ایک جوان العمر اور خوب صورت عورت ہے۔ وہ شاید اعلان کے بعد وہاں سے روانہ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن فوراً ہی اس کے دائیں بائیں بیٹھی خواتین نے اس کو بازوؤں سے تھام لیا اور نرمی سے نشست پر واپس بٹھانے لگیں۔ خواتین کی اس حرکت پر سیاہ لباس والی عورت نے جھٹکا دے کر اپنے بازو ان کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس کے بازو چھوڑنے کے بجائے ان پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ سیاہ لبادے والی عورت کی نقاب سے جھانکتی سرخ ڈوروں والی خوب صورت آنکھوں سے غضب جھلکنے لگا۔ وہ شاید طیش کے عالم میں خود کو گرفت میں لینے والی خواتین سے کچھ بولی بھی لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ ساشا تک اس کی آواز پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس طرف دیکھنے سے گریز کرو۔'' سلیمان نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر سختی سے دباتے ہوئے سرگوشی کی تو اسے اپنی نظروں کا رخ بدلنا پڑا۔ اب وہ باقی تماشائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اعلان کے بعد شاید ان میں سے چند واپس چلے گئے ہوں لیکن وہاں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ چند

www.pakistanipoint.com

افراد کی کمی کو محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''امیر محترم کو یقیناً یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہوگی کہ ان کے عوام کی اکثریت بہادر اور باہمت ہے۔'' لوگوں کی بڑی تعداد کو وہیں جمے بیٹھے دیکھ کر نقیب نے تبصرہ کیا جس کی داد تالیاں بجا کر دی گئی۔ ساشا نے کن انکھیوں سے خواتین کے حصے کی طرف دیکھا۔ اسے سیاہ لباس والی وہاں بیٹھی دکھائی دے گئی لیکن وہ مضطرب سی تھی اور اس کے انداز سے بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔

نقارے بجنے کی آواز نے ساشا کی توجہ اس کی طرف سے ہٹالی اور وہ تجسس سے لوہے کے جنگلے کا حصہ ہی معلوم ہوتے اس آہنی دروازے کے کھلنے کا منظر دیکھنے لگا جس کے دونوں پٹوں کو بیک وقت دو افراد دھکیل کر کھول رہے تھے۔ جنگلے کے اس حصے کے سامنے تماشائیوں کی نشستیں نہیں تھیں بلکہ نیم دائرے کے دونوں سروں کے درمیان موجود وہ راستہ تھا جسے تماشا گاہ میں آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ آہنی دروازوں کے کھلتے ہی اس راستے سے دو قوی ہیکل ہاتھی داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ اپنے نگرانوں کے ساتھ بڑے اطمینان سے سج سج چلتے جنگلے کے کھلے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازے سے گزر گئے اور ان کے نگران باہر ہی رک گئے۔ دروازہ کھولنے والے دونوں افراد جو اپنی اپنی جگہ بدستور موجود تھے، پھرتی سے حرکت میں آئے اور آہنی دروازے کے دونوں پٹ تیزی سے بند کر دیے۔ ان کے اس عمل سے بے نیاز دونوں ہاتھی اپنی سونڈیں اٹھائے جنگلے کے اندر سست روی سے چہل قدمی کرنے لگے۔

''صاحبان — قدردان! آج آپ ایک ایسا مقابلہ دیکھنے جا رہے ہیں جسے کسی ایک فریق کی موت تک جاری رکھا جائے گا۔ اس سنسنی خیز مقابلے کے لیے منتخب کیے جانے والے دونوں فریقین کے درمیان طاقت کے توازن پر آپ میں سے کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔'' اعلان کرنے والا اعلان کر رہا تھا اور ساشا سمیت تمام حاضرین کی نظریں جنگلے کے اندر چہل قدمی کرتے دونوں ہاتھیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ واقعی دونوں ہاتھی ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے اور کسی ایک کو دوسرے سے کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ انسان کو عقل میں دیگر تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے۔ انسان کی عقل اور عزم و حوصلہ یکجا ہو جائیں تو وہ بڑے سے بڑے وحشی جانور کو زیر کر سکتا ہے۔'' وہاں موجود لوگوں کی توجہ اعلان کرنے والے کے الفاظ سے زیادہ ہاتھیوں کی جوڑی کی طرف تھی پھر بھی وہ بغیر رکے اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا۔

''آج ان طاقتور ہاتھیوں سے جن دو انسانوں کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے، ان میں سے ایک کی طاقت اور قوت کا یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا شخص اتنا کائیاں ہے کہ بہترین حفاظتی انتظامات اس کے علم کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔'' اس شخص کے الفاظ نے ہر ایک کو چونکا دیا۔ وہ جواب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے سامنے ان دو ہاتھیوں کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے، یہ جان کر ششدر رہ گئے تھے کہ ان دیوہیکل ہاتھیوں کو انسانوں سے لڑوایا جانے والا ہے۔ پھر انہوں نے ہاتھیوں کے مقابلے میں لائے جانے والے ان دو افراد کو دیکھ لیا۔ وہ بھی اسی راستے سے لائے جا رہے تھے جس راستے سے ہاتھیوں کو لایا گیا تھا لیکن ان میں اور ہاتھیوں میں یہ فرق تھا کہ وہ ہاتھیوں کی سی آزادی سے نہیں لائے جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور سر سے گردن تک سیاہ غلاف منڈھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے نہ تو وہ کسی کو دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی انہیں دیکھنے والے انہیں شناخت کر سکتے تھے۔ ان کے جسموں پر لباس کے نام پر فقط لنگوٹیں کسی ہوئی تھیں اور عریاں جسموں پر نظر آنے والی سرخ لکیریں گواہی دے رہی تھیں کہ انہیں بہت بے دردی سے پیٹا گیا ہے۔ ایک شخص کی پیٹھ اور کلائیوں پر جلنے کے نشانات بھی تھے۔

انہیں توجہ سے دیکھتے ساشا نے فوراً ہی ان کے بارے میں نتیجہ اخذ کر لیا۔ چوڑے جسم کے مالک شخص کی جلد کی سیاہ رنگت اور اس کے ساتھی کی صاف رنگت نے اسے گواہی دی کہ ان میں سے ایک قید خانے کا حبشی نگران اور دوسرا دل میں امیر زادی کی تمنا رکھنے والا مفرور قیدی لوئیس ہے۔ جنگلے کے دروازے پر لا کر ان دونوں کے ہاتھ آزاد کر دیے گئے اور پھر ان کے سر اور منہ پر منڈھے غلاف اتار کر دروازہ کھول کر انہیں اندر دھکیل دیا گیا۔ دھکا اتنا شدید تھا کہ وہ دونوں زمین پر جا گرے۔ ان کے سنبھل کر کھڑے ہونے تک ان کی طرف دو تلواریں اڑتی ہوئی آ کر ان کے قدموں میں ڈھیر ہو چکی تھیں۔

''یہ دونوں افراد امیر محترم کے معتوب ہیں۔ امیر محترم چاہتے تو انہیں قید خانے میں ہی شدید اذیتوں سے

www.aiftayeem.com

گزار کر ان کی غداری کی سزا دے سکتے تھے لیکن اس مقابلے کی صورت میں ان نمک حرام غداروں کے لیے تھوڑی سی رعایت رکھی گئی ہے۔ اگر یہ دو چالاک اور زورآور لوگ ان دونوں ہاتھیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں ان کا جرم معاف کر کے رہائی دے دی جائے گی۔"

اعلان کرنے والا ایک بار پھر حاضرین کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس اعلان پر تماشائیوں کے اندر عجیب جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا اور وہ نعرے بازی کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ہاتھی جو حبشی اور لوئیس کے جنگلے کے اندر دھکیلنے کے باوجود ابھی تک بے نیازی سے چہل قدمی کر رہے تھے، اس شور و غل کے باعث مزید بے نیازی کا مظاہرہ نہیں کر سکے اور کان کھڑے کرتے اور سونڈیں لہراتے ہوئے گویا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ صورت حال کو حبشی اور لوئیس نے بھی سمجھ لیا تھا۔ ان کے پاس جان بچانے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ وہ ان قوی ہیکل ہاتھیوں کو پچھاڑ دیتے۔ ہاتھیوں کے ہوشیار ہو کر خود پر حملہ آور ہونے سے قبل ہی انہوں نے خود حملے میں پہل کا فیصلہ کیا اور اپنے قدموں میں گری ایک ایک تلوار اٹھا لی۔ تلواریں اٹھا کر وہ ہاتھیوں کی طرف لپکے اور دونوں نے بیک وقت ایک ایک ہاتھی پر حملہ کر ڈالا۔ لوئیس کا نشانہ اپنے حصے میں آنے والے ہاتھی کی سونڈ تھی جبکہ حبشی نے دوسرے ہاتھی کی آنکھ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ دونوں کے وار اتنے تیز اور قوت والے تھے کہ اصولاً لوئیس کے مقابل ہاتھی کی سونڈ کٹ کر دور جا گرنی چاہیے تھی اور حبشی کی تلوار کو ہاتھی کی آنکھ سے گزر کر اس کے دماغ تک رسائی حاصل کر لینی چاہیے تھی لیکن اگلا لمحہ ان دونوں کے ساتھ ساتھ تماشائیوں کو بھی چونکا دینے والا تھا۔ جس ہاتھی کی سونڈ کو نشانہ بنایا گیا تھا، اس کی سونڈ کٹ کر دور جا گرنے کے بجائے بس اتنی زخمی ہوئی تھی کہ اس کا تھوڑا سا خون نکل آیا جبکہ حبشی کی تلوار کا نشانہ بننے والے ہاتھی کی بھی آنکھ تو بے شک زخمی ہو گئی لیکن تلوار نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی جہاں تک حبشی اسے پہنچانا چاہتا تھا۔

"دونوں قیدیوں کو کند تلواریں دی گئی ہیں۔" صورت حال دیکھ کر ساشا بے اختیار بڑبڑایا۔

"اس مقابلے کی حیثیت بس شغل کی سی ہے ورنہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ امیر محترم اپنے مجرموں کو معاف کر دیں۔" اس کے پہلو میں بیٹھے سلیمان نے سرگوشی میں تبصرہ کیا۔ ادھر دونوں قیدی بھی یقیناً صورت حال سمجھ کر اس دھوکے بازی پر احتجاج کرنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن بپھر جانے والے ہاتھیوں نے انہیں اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ ہاتھیوں کے بپھرنے میں جہاں ان کے اوچھے وار کا کردار تھا، وہیں جنگلے کے باہر کھڑے کچھ افراد بھی انہیں غضب ناک کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ ان افراد نے اپنے ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس اٹھا رکھے تھے۔ ان بانسوں کے سروں پر تیز برچھیاں سی منسلک تھیں۔ جنگلوں کی سلاخوں کے درمیان سے بانس اندر لے جا کر وہ لوگ تیز برچھی نما آلات سے ہاتھیوں کو کچوکے لگا رہے تھے۔ بے در پے لگائے جانے والے ان زخموں نے ہاتھیوں کو سخت مشتعل کر دیا تھا۔ سونڈیں اٹھا اٹھا کر چنگھاڑتے ایک طرف وہ تماش بینوں کے جوش و خروش اور ہیجان میں اضافہ کر رہے تھے تو دوسری طرف حبشی اور لوئیس کا دہشت سے برا حال تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں موجود کند تلواریں پھینک کر رحم کی درخواست کرنے کے لیے امیر کے قدموں میں لیٹ جانا چاہتے تھے لیکن غیظ میں آنے والے ہاتھیوں نے انہیں اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ وہ زمین کا سینہ کوٹتے اور دیکھنے والوں کا دل دہلاتے حبشی اور لوئیس کی طرف بڑھے۔ حبشی نے ہوشیاری سے کام لے کر ایک طرف جست لگاتے ہوئے خود کو حملے سے محفوظ رکھا لیکن لوئیس کو اتنی بھی مہلت نہیں ملی اور ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ میں جکڑ کر اوپر کی طرف اٹھایا۔ سوئے اتفاق لوئیس کا تلوار والا ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور ہاتھ گھما کر تلوار کی نوک ہاتھی کی دائیں آنکھ میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا لیکن تکلیف سے بلبلا اٹھنے والے ہاتھی نے طیش کے عالم میں اسے جنگلے سے دے مارا۔ شدید شور کے باوجود اس کی چیخ نے ساشا کے کانوں تک رسائی حاصل کر لی۔ پتا نہیں کیوں اس نے بے ساختہ ہی خواتین والے حصے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک عجیب منظر اس کا منتظر تھا۔ سیاہ لبادے والی عورت کے اضطراب سے ظاہر تھا کہ وہ اس جگہ سے اٹھ جانا چاہتی ہے لیکن اس کے دائیں بائیں بیٹھی عورتوں نے اس کے دونوں بازو تھام رکھے تھے اور ایک عورت پشت پر کھڑی یوں اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی جیسے انہیں دبا رہی ہو لیکن حقیقتاً اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سیاہ لبادے والی عورت کو یوں کرسی کی طرف

www.allmyteam.com

دھکیل رہی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود وہاں سے اٹھنے میں ناکام تھی۔

ساشا کی تیز نظروں نے اس کی آنکھوں میں موجود آنسو بھی دیکھ لیے لیکن اگلے ہی پل وہ شور شرابے کے باعث جنگلے کے اندر جاری موت کے کھیل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ حبشی جو مسلسل حرکت کرتا اپنے مقابل موجود ہاتھی کو جل دینے میں کامیاب جا رہا تھا، ہاتھی کی دوسری آنکھ کو بھی نشانہ بنانے کی خواہش میں اس سے قریب ہوا اور جانے کیسے اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اس کے گرتے ہی ہاتھی کا بھاری بھرکم پاؤں اس کے سینے پر پڑا اور حبشی کی دلدوز چیخ نے تماشا دیکھنے والوں کے دلوں کو لرزا دیا۔ یقینی طور پر اس کی کئی پسلیاں ایک ساتھ ٹوٹ چکی تھیں لیکن کینہ پرور مشتعل جانور اسے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے اگلے دونوں پیر بار بار اٹھا کر حبشی کے سینے اور چہرے کو روندنے میں لگا ہوا تھا۔ مضبوط جسامت کا طویل قامت حبشی جس کے سامنے قید خانے کے قیدی کھڑے ہو کر... تھر تھر کانپتے تھے اور وہ بڑی بے رحمی سے ان کے لیے سزائیں اور اذیتیں تجویز کرتا تھا، حقیر چوہے کی طرح ایک جانور کے پیروں تلے کچلا جا رہا تھا۔ اس کے جسم کی تڑپ اور پھڑک سے ظاہر تھا کہ روح جسم کا پنجرہ چھوڑ کر پرواز کرنے کو ہے۔ عین اسی لمحے جبکہ حبشی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، لوئیس زندگی کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ کسی ترکیب سے لوہے کے اونچے جنگلے پر اتنی بلندی تک چڑھ گیا تھا کہ اس کے لیے جنگلے سے باہر کودنا ناممکن نہیں رہا تھا لیکن بانسوں سے لیس وہ افراد جو اب تک ہاتھیوں کو مشتعل کرنے کا کام کرتے رہے تھے، اب اس کے درپے ہو گئے تھے اور اسے کچوکے لگاتے اس بات کا بالکل موقع نہیں دے رہے تھے کہ وہ جنگلے سے باہر کود سکے۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے عجیب ہی حرکت کی اور جنگلے پر سے چھلانگ لگا کر اپنے مقابل ہاتھی کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس کی اس حرکت پر ہاتھی نے زور سے چنگھاڑ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے اپنے اوپر سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ لوئیس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دائیں بائیں بانہیں پھیلا کر اس کے دونوں کانوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی اس حرکت پر ہاتھی اتنی شدت سے غضبناک ہوا کہ اس کی چنگھاڑ نے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیوانگی کے عالم میں بھاگتا ہوا جنگلے تک دوڑتا ہوا گیا اور اتنی قوت سے جنگلے سے ٹکرایا کہ لوئیس کے لیے خود کو اس کی پشت پر قائم رکھنا ممکن نہیں رہا۔ وہ دھپ سے نیچے گرا۔ گرنے سے یقینی طور پر اسے چوٹ آئی تھی لیکن ابھی اس کے اندر سے بقا کی جنگ لڑنے کی خواہش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس خواہش کو قائم رکھنے میں ان دو آنسوؤں بھری آنکھوں کا بڑا اہم کردار تھا جو جنگلے کے اسی حصے کے سامنے سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جس جسم کا حصہ تھیں، وہ جسم وقت کے ان لمحات میں سانس لینا بھی بھول چکا تھا۔ بس دو آنسو بھری آنکھیں تھیں جو کسی بھی طرح لوئیس کو اس مشکل سے نکل کر زندہ دیکھنا چاہتی تھیں لیکن انسان کی ہر خواہش ہمیشہ کب پوری ہوتی ہے۔ ان آنکھوں کی خواہش بھی ہار گئی۔

لوئیس جو نیچے گر کر دوبارہ اٹھنے کے بعد بہت پہلے ہی اپنے ہاتھوں سے نکل جانے والی تلوار کے حصول کے لیے حرکت میں آیا تھا، اپنے مقابل ہاتھی سے تو بچ نکلا لیکن وہ حبشی کا بھرکس بنانے میں مصروف ہاتھی کو فراموش کر چکا تھا۔ غیظ سے بھرا وہ ہاتھی حبشی کی لاش کو گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے میں تبدیل کر کے پلٹا تو سیدھا لوئیس کی طرف لپکا۔ ابھی لوئیس اپنی گری ہوئی کند تلوار اٹھا نہیں سکا تھا کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ کو حرکت دی، لوئیس کا جسم اس کی سونڈ کی گرفت میں آیا۔ اوپر اٹھا اور پھر دور جا گرا۔ ابھی لوئیس کی چیخ کی گونج برقرار تھی کہ دوسرے ہاتھی نے حرکت کی۔ لوئیس کا جسم ایک بار پھر سونڈ کی گرفت میں آیا۔ فضا میں بلند ہوا اور پھر زمین پر پٹخ دیا گیا۔ اب وہاں ایک عجیب تماشا جاری تھا۔ غیظ، غضب اور انتقام سے بھرے دونوں ہاتھی کسی گیند کی طرح لوئیس کے جسم سے کھیل رہے تھے۔ اس کھیل میں لوئیس کی ہڈیاں ٹوٹنے کے دوران کب اس کی روح نے اس کے جسم کو چھوڑا تھا... چیختے چلاتے، سسکیاں لیتے، صدمے سے گنگ، خونی کھیل سے لطف اندوز ہو کر سسکاریاں لیتے، ہر طرح کے تماشائیوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں پتا چلا تھا کہ کب ایسا ہوا لیکن ان دو آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے وہ لمحہ پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اس لمحے کے گزرنے پر بھی وہ آنکھیں کھلی رہتیں، یہ کس طرح ممکن تھا۔ آنکھیں بند ہوئیں اور سیاہ لبادے والی خود کو گرفت میں لیے ہوئے ہاتھوں میں جھول گئی۔

سلیمان کے پہلو میں بیٹھے ساشا نے اس منظر کو دیکھا۔ اب اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ سیاہ لبادے والی نقاب پوش حسینہ کون تھی؟

(جاری ہے)

www.urdupoint.com

میک اپ سے بھرے چہرے لیے، بھڑکیلے لباسوں میں ملبوس اجسام بے ہنگم انداز میں ناچ رہے تھے۔ سُر تال کے سنگم سے بے نیاز کئی آوازیں مل کر ساتھ ساتھ بے ڈھنگے انداز میں گا بھی رہی تھیں۔ گانے کی تیز آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا کر اس کی سماعتوں کو چیرتی جا رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کانوں پر رکھنے چاہے مگر ہاتھ جیسے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

جلتے الاؤ پر ٹھنڈی پھوار بن کر برس جانے والے ایک کمزور بادل کا قصہ

یوں تو ہر انسان اپنی ذات میں کسی نہ کسی حوالے سے ادھورے پن کا شکار ہوتا ہے مگر... جسمانی نقص نہ صرف اس انسان کو جیتے جی مار دیتا ہے بلکہ قریبی رشتوں سے بھی ہمت اور حوصلہ چھین لیتا ہے... وہ ایک نامکمل انسان تھا مگر... انسان تو تھا... اور افسوس اس کے ادھورے پن نے اس سے انسان ہونے کا حق بھی چھین لیا... پوری دنیا اس کے لیے گرم ریت کا صحرا بن گئی تھی۔ فقط ماں کی ٹھنڈی چھاؤں نے اسے جینے کا حوصلہ دیا لیکن کب تک... بالآخر ایک شام یہ چراغ بھی بجھ گیا...

پناہ گاہ

غزالہ یاسمین

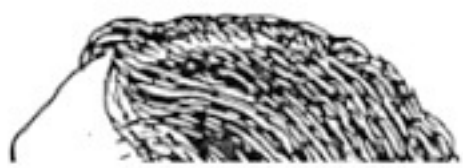

www.urdtayjeen.com

اس سے پہلے کہ اس کے اعصاب جواب دے جاتے یا وہ اپنے حواس کھو دیتی گانے کی آوازیں کچھ مدھم ہونے لگیں مگر اس کے ساتھ ہی پس منظر سے تالیاں پیٹنے کی آواز ابھرنے لگی۔

اور پھر تالیاں پیٹتے کئی ہاتھ اس کی جانب بڑھنے لگے۔

یکدم اسے احساس ہوا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ جو اس کے پاس ہے، وہ ان کی تحویل میں جانے دینے سے بچانا ہے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی چیز کو چھپانے کی کوشش کی جیسے ان سب کی نظروں سے بچانا چاہتی ہو مگر آنے والوں کی نظریں اسی شے پر گڑی تھیں۔ کپڑے میں لپٹی اس شے کو اس نے اور بھی سختی سے دبوچ لیا۔

اور پھر ان ہاتھوں نے آگے بڑھ کر اس سے وہ چھین لیا جو وہ ہرگز انہیں نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے ان ہاتھوں کو جھٹکنا چاہا مگر وجود بے جان کھڑا رہا۔ اس نے پوری طاقت لگا کر چیخنا چاہا مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ان چہروں نے ایک آخری نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور اس سے دور ہٹ گئے۔ اس سے چھینی گئی شے اب ان کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ چاہ کر بھی نہ احتجاج کر پائی تھی، نہ ان ہاتھوں سے اپنی چیز کو چھیننے کی ہمت سمیٹ پائی۔

اس نے ایک تیز چیخ ماری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ تنفس تیز تر تھا جیسے کئی گھنٹوں سے دوڑتی آ رہی ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنے پہلو میں دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ ''تو یہ ایک خواب تھا۔'' اس نے خود کلامی کی اور اگر یہ خواب سچ ہو گیا تو..... اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

''تم کر کیا سکتی ہو؟'' اندر جیسے کوئی ہنسا۔

واقعی وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب کچھ نہیں تھا۔ جو تھا، وہ اس نے خود گنوا دیا تھا۔ اب وہ تہی داماں تھی۔

☆☆☆

آفس نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ لکڑی کے خوبصورت کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی نک سک سی تیار جدید لباس پہنے ریسپشنسٹ کھڑی تھی جو مگن انداز میں ایک ہاتھ فون کی طرف بڑھاتی تو دوسرے ہاتھ سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی ہوئی نظریں کمپیوٹر اسکرین کی طرف مرکوز کر لیتی۔

ریسپشن سے ذرا ہٹ کر دائیں طرف جدید اسٹائل کا ایل شیپ صوفہ رکھا تھا جو آنے والوں کو وہاں آرام دہ انتظار فراہم کر رہا تھا۔ بائیں طرف کی دیوار مختلف تصاویر سے مزین تھی۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور نظریں دوسری طرف گھمائیں۔ صوفے کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا فریج تھا جس میں رکھا پانی اور کئی طرح کے مشروبات اس کے گلاس ڈور سے نمایاں تھے۔ اسے یہاں بیٹھنے کا کہتے ہوئے آفس بوائے نے اس فریج سے استفادہ کرنے کا بھی کہہ دیا تھا مگر وہ اب اٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ یہاں انٹرویو کے لیے آیا تھا۔ وہ انٹرویو بھی فارمیلٹی ہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی سلیکشن ہو چکی ہے۔ اسے یہاں بھیجنے والے نے اپنا کارڈ تھماتے ہوئے جن ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا، وہ اسے یقین دلانے کے لیے کافی تھیں کہ اس کا ''انتخاب'' ہو چکا ہے۔ اب بس رسمی کارروائی کی غرض سے اسے بلایا گیا تھا۔

بالآخر ریسپشنسٹ..... کا فون ختم ہوا اور اس نے اسے آواز دی۔

''آپ آ جائیں پلیز۔''

وہ چپ چاپ اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لڑکی نے ایک فارم نکالا اور اس پر کچھ لکھنے لگی۔ وہ سر جھکائے جوتے کی نوک سے کسی نادیدہ نشان کو کھرچنے کی کوشش کرنے لگا۔

''آپ کا نام؟'' اس کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''احمد..... احمد حسن۔'' وہ جیسے کچھ سوچ کر بولا۔

لڑکی دیگر معلومات لے کر فارم پر اتارنے لگی۔ عمر، قد، رنگت، جنس اور ایسے دیگر بہت سے سوالات جو سراسر نجی نوعیت کے تھے۔ چند سوالوں پر اسے باقاعدہ پسینا آیا۔ اس نے کاغذ اپنی طرف سرکا کر خود لکھنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے ہلکی مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے فارم پُر کر کے خاموشی سے اس کے سامنے کر دیا۔ لڑکی پروفیشنل انداز میں مسکراہٹ چہرے سے چپکائے فارم پر درج مندرجات کمپیوٹر پر منتقل کرنے لگی۔ تمام انٹریز سے فارغ ہو کر اس نے آفس بوائے کو آواز دے کر بلایا۔

''ظفر! انہیں اسٹوڈیو میں لے جاؤ۔''

اور اس کے ہاتھ میں پُر کیا فارم تھما دیا۔ وہ لڑکی سے نظریں چراتا ہوا آفس بوائے کے ساتھ چل پڑا۔

''پتا نہیں کیا سوچ رہی ہو گی میرے بارے میں۔''

پچھلے پانچ منٹ میں دس بار یہ خیال اس کے دماغ میں آیا اور ہر بار اس کی شرمندگی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ حالانکہ لڑکی کے لیے وہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ روز

www.alfaayeem.com

ایسے کتنے ہی لوگوں کو وہ ڈیل کرتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو چکی تھی۔

مگر یہ سب اس کے لیے معمول کا کام نہیں تھا۔ انہی سوچوں میں گم وہ اسٹوڈیو کے دروازے تک آ گیا۔

آفس بوائے نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اندر چلا گیا۔ اندر ایک میز پر کئی فائلیں اور فولڈرز پھیلائے ایک شخص کام میں مگن تھا۔ ان کی آمد پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور سامنے کھلی فائل تھوڑی سی دائیں جانب سرکا دی۔

''سر جی! ان کو میڈم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

آفس بوائے نے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس شخص کو اطلاع دی۔

کرسی پر بیٹھا شخص اسے گہری نظروں سے گھورنے لگا جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی نظروں نے اوپر سے نیچے تک اس کا بغور جائزہ لیا۔ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بار پھر اس نے خشک لبوں کو تر کرنے کے لیے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی اضطراری کیفیت اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔ یقیناً سامنے بیٹھا شخص بھی یہ سب بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آفس بوائے کو باہر جانے کا کہا۔ وہ خاموشی سے کرسی سرکا کر بیٹھ گیا اور فارم اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس شخص نے فارم پکڑا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

''اچھا، رانا صاحب نے بھیجا ہے آپ کو؟'' کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

''جی —'' وہ یک لفظی جواب ہی دے پایا۔

''رانا صاحب کی چوائس بھی خوب ہے۔'' وہ شخص ہلکا سا ہنسا۔

''پہلے کبھی یہ کام کیا ہے؟'' اس شخص نے پھر اسے نظروں میں تولتے ہوئے پوچھا۔

''ایسے کسی ادارے کے ساتھ نہیں کیا۔ ویسے کیا ہے۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

''ہوں — ہمارے ہاں یہ کام بہت پروفیشنل طریقے سے ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے آپ کو اسی انداز میں تربیت دینی ہوگی۔ ہمارے پاس اس کام کے لیے ٹرینر موجود ہیں جو آپ کو مکمل گائڈ کر دیں گے۔ مگر اس سے پہلے آپ کا پورٹ فولیو بنے گا۔''

سامنے بیٹھا شخص اسے ادارے کے قوائد و ضوابط اور طریقہ کار سے آگاہ کر رہا تھا اور وہ سر جھکائے بس سن رہا تھا۔

''پہلے کوئی پورٹ فولیو بنا ہوا ہے آپ کا؟'' اس نے پوچھا تو اس نے بغیر کچھ بولے بس گردن نفی میں ہلا دی۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ یہ کام ابھی ہو جائے گا۔''

اب وہ اسے سمجھانے لگا کہ کن کن زاویوں سے اس کی تصاویر لی جائیں گی اور اسے کس طرح سے کیمرے کو دیکھنا ہے۔ کیسے تاثرات دینے ہیں اور کس طرح سے پوز کرنا ہے۔

وہ اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ تاہم فوٹوگرافر کے الفاظ پر اس کے کان پوری طرح الرٹ تھے۔

''سب سمجھ گئے؟''

اس نے بغیر کچھ بولے سر ہلایا۔ سمجھ تو وہ گیا تھا مگر کیا یہ اس سے ہو پائے گا؟ اس کا جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

''چلو پھر اب شروع کریں۔''

اس نے خود کو کیمرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا۔ سب کچھ ذہن سے نکال کر — کیونکہ اسے اب یہ کرنا ہی تھا۔

اب وہ بتائے گئے طریقے کو ذہن میں لا کر ویسے ہی پوز بنانے لگا۔ فوٹوگرافر نے کئی تصاویر لیں مگر اس کے چہرے کے تاثرات یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہے۔ اس نے اسے دوبارہ سے سمجھایا اور پھر کیمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ارے اس طرح نہیں۔ ایسے پوز کرو۔''

کچھ دیر بعد جب پھر وہ مطلوبہ شاٹس نہیں دے پایا تو فوٹوگرافر نے جھلا کر کہا اور دوبارہ اسے کر کے سمجھایا۔ سمجھ تو وہ پہلی بار میں ہی گیا تھا مگر جو کہا گیا تھا وہ — وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب مشکل ہوگا مگر اتنا مشکل ہوگا اس کا اندازہ نہیں تھا۔

اس کا جسم پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سب چھوڑ کر بھاگ جائے مگر کیا بھاگنے سے وہ بچ سکے گا؟ سوال اندر کلبلانے لگا۔

زندگی آپ کو ہمیشہ دو چوائس دیتی ہے مگر دوسری چوائس پہلی کا متبادل ہو یہ ضروری نہیں۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ دیے گئے دونوں راستوں میں سے کسی کا بھی انتخاب کرے، اس کی منزل ایک ہی ہے۔

☆☆☆

وہ چادر سنبھالتی ہوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے ننگے پیر سیڑھیوں کی خنکی اور چکناہٹ کو واضح طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ ماربل کی سیڑھیاں جن کے کنارے کئی جگہ سے تڑخے ہوئے تھے۔ جن پر گزرنے والے اپنے

www.aliharjeem.com

نشان ثبت کر رہے تھے۔

نادیدہ مگر نہ مٹنے والے پختہ نشانات..... جنہیں وہ سیڑھیوں پر نظریں گاڑے کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی دیر تیزی سے آ جا رہے تھے جن کا میل سیڑھیوں کو اور بھی میلا بنا رہا تھا۔

ایک ایک سیڑھی کو بغور دیکھتی وہ اوپر آ گئی۔ سامنے لوگوں کا جم غفیر تھا۔

ہر شکل، جسامت کے لوگ۔ امیر غریب، جوان بوڑھے۔

اپنی اپنی خواہشات کا انبار اٹھائے لوگ جھولیاں پھیلائے کھڑے تھے۔ کسی کو اولاد چاہیے تھی تو کوئی اولاد کے دیے دکھ پر مرہم لینے آیا تھا۔ کسی کو دولت کی طلب تھی تو کوئی دولت دے کر سکھ لینے آیا تھا۔ غرض جتنے لوگ تھے اتنی ہی ضرورتیں۔

ضرورت تو اسے بھی یہاں کھینچ لائی تھی مگر وہ کچھ مانگنے نہیں دینے آئی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے نا ہم رب سے مانگتے ہیں اور بے تحاشا مانگتے ہیں اور پھر اس کی دین کو اپنی خواہش کے ترازو میں تول کر دیکھتے ہیں۔ دین کا پلڑا کبھی خواہش کے آگے جھک جاتا ہے کبھی خواہش کو جھکا دیتا ہے اور جب ملی ہوئی چیز خواہش کو پورا نہ کر پائے تو ہم اسے واپس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسے بھی رب نے وہ دیا تھا جس کی اسے کبھی خواہش نہیں تھی۔ اسے کیا کسی کو بھی اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ دین نہیں ''عذاب'' تھا جو کسی کردہ گناہ کے بدلے میں اسے ملا تھا۔ خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اس دین نے اسے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے لمس نے اس کی خواہش کو کب کا مفلوج کر دیا تھا مگر اب خواہش اور اختیار اس کے ہاتھ میں ہی کب رہا تھا۔ اب وہ چاہ کر بھی وہ دی گئی چیز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے اس کو لوٹانا ہی تھا اور اب وہ وہی لوٹانے آئی تھی۔

یہاں آنے سے پہلے اس نے بہت سوچا کہ کہاں کہاں جائے۔ اس کے پاس کئی آپشنز تھے مگر وہ چاہ کر بھی ان میں سے کسی کو اپنا نہیں سکی۔ پھر پتا نہیں کیسے اس کے قدم اس دربار کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں خدا کے پیارے ہوتے ہیں۔ جن کی عرضی خدا کبھی رد نہیں کرتا۔ اسے بھی یہاں سے ایسی ہی سفارش درکار تھی۔

اِدھر اُدھر دیکھتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ باہر کی نسبت اندر لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ کہیں پر لوگ نوافل ادا کر رہے تھے اور کہیں جالیوں سے سر ٹکائے زار زار رو رہے تھے۔ کہیں کہیں ایک دم سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا اور تھوڑی دیر میں چھٹ جاتا۔ وہ لنگر بٹنے کا عمومی منظر تھا۔

اسے بھی بھوک کا احساس ہوا۔ وہ صبح ناشتا کیے بغیر گھر سے نکلی تھی اور اب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ انسان کیسی ہی تکلیف میں کیوں نہ ہو، بھوک کبھی نہیں مرتی۔ اس کی بھی بھوک زندہ تھی مگر اشتہا مر چکی تھی۔

وہ ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ نیاز بانٹتی ایک عورت بیٹھے ہوئے لوگوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی انہیں پیکٹ پکڑا رہی تھی۔ ایک پیکٹ اس نے اس کی جھولی میں بھی ڈال دیا۔ جو اس نے بغیر دیکھے سائڈ پر رکھ دیا۔ کافی دیر ایک ہی زاویے سے بیٹھے رہنے کے بعد وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ گزرتے وقت کا احساس ایکدم ہی جاگا۔ وہ جو کام کرنے آئی تھی... اسے جلدی کر کے گھر جانا تھا..... مدثر کے آنے سے پہلے مگر ایک بار پھر اس کی ہمت ٹوٹنے لگی۔ ضبط پھر سے ہارنے لگا۔

کیا کرے اور کیسے، کس سمت جائے؟

لوگوں کے اتنے ہجوم میں بھی اسے اپنا آپ تنہا لگ رہا تھا۔

ایک طرف سے قوالی کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ وہ بلا سوچے سمجھے اسی سمت چلنے لگی اور چلتے چلتے وہاں آ گئی جہاں شاید اسے نہیں آنا تھا۔

قوال لہک لہک کر قوالی گا رہا تھا۔ گانے والے کی آواز میں بے حد سوز تھا کہ لوگ بے اختیار جھومنے لگتے۔ کئی لوگ باقاعدہ رقص کر رہے تھے اور انہی میں وہ فقیر بھی تھا۔

لوگوں کے ہجوم سے گزرتی اس کی نظر اس فقیر پر پڑی اور وہیں ٹھہر گئی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی پلکیں نہیں جھپکا پائی۔ اتنے بدلے حلیے میں بھی اسے اس کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

پچھلے آٹھ گھنٹے اور چودہ منٹ میں اس نے بہت سے ممکنات سوچے تھے۔ بس جو نہیں سوچا تھا، وہ یہ تھا۔

سابقہ تین ماہ اور اٹھارہ دن میں اس نے ہر روز اس کے بارے میں ہی سوچا تھا مگر وہ اسے یہاں مل جائے گا، یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی جو ارد گرد سے بے نیاز وجد کی سی کیفیت میں جھوم رہا تھا۔

☆☆☆

الفاظ کیا تھے جیسے سیسہ پگھل کر اتر گیا ہو کانوں میں اور اس نے باقی سب آوازوں کی راہ بند کر دی ہو۔

www.aldhayjeem.com

زینب کے وہ الفاظ اس کے کانوں میں گھس کر آنکھوں سے پانی بن کر نکل رہے تھے اور وہ سن بیٹھا رہا تھا۔

''نہیں ہے یہ میرا بھائی۔''

''مت کہیں اسے میرا بھائی۔''

اماں اسے چپ کروا رہی تھیں مگر آج وہ بولتی جا رہی تھی۔ سالوں کا زہر زبان اگلنے لگی تھی تو بند اتنی جلدی کیسے بندھ جاتا۔

''اس کی وجہ سے لوگ آتے جاتے چھیڑتے ہیں۔ میری دوستیں میرے پیچھے میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ ہنستی ہیں مجھ پر۔''

وہ چلانے لگی۔ اماں کی ڈانٹ ڈپٹ، تسلی، پچکار آج کچھ بھی اس کے غصے اور تیز لہجے کو روکنے سے قاصر تھے۔

اور وہ چپ تھا، بالکل چپ..... کسی مجسمے کی طرح بے جان۔

وہ ساکت بیٹھا بس فرش کی بجری میں کچھ کھوج رہا تھا۔ مگر کان پوری طرح ہر لفظ کو اندر اتار رہے تھے۔

''اس کی وجہ سے کبھی میرا گھر نہیں بسے گا۔ میں بتا رہی ہوں اماں۔ اس نے اپنی نحوست میرے مقدر پر بھی مل دی ہے۔'' اب اس کے چیخنے چلانے میں رونا بھی شامل ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔ آج بھی اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکلا صرف اس کی وجہ سے۔

سب ٹھیک تھا، انہیں زینب پسند آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورتی کے آگے کرائے کا چھوٹا سا مکان بھی ماند پڑ گیا تھا۔ لندن پلٹ انجینئر بیٹے کے لیے وہ گوہر نایاب مل گیا تھا جس کو وہ تین سال سے تلاش رہی تھیں اور شاید ہی پورے شہر میں کوئی بیری بچی ہو جسے وہ چھان پھٹک نہ چکی ہوں۔

رسماً ہاں ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد شادی کی خواہاں تھیں۔ انہیں نہ جہیز کی خواہش تھی نہ ہی کوئی لالچ۔ بس وہ زینب کو جلد از جلد بہو بنا کر گھر لے جانا چاہتی تھیں۔ سب ٹھیک تھا مگر پھر انہیں اس ''بھائی'' کی خبر ہو گئی تھی۔

اور..... انہوں نے انکار کر دیا۔

زینب جانتی تھی کہ پھر ایسا ہی ہوگا۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ اس کے لیے اب یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر ہر بار امید کا دیا جلا کر بیٹھ جاتی۔

مگر کب تک؟ جیسے ہی حقیقت سے پردہ ہٹتا پھر سے اندھیرا ہو جاتا اور یہ اندھیرا تو اب مقدر تھا جو ان کی زندگیوں پر برسوں سے چھایا ہوا تھا۔

اس بار پھر اس نے وہی غلطی کی تھی۔ امید باندھنے کی غلطی۔

مگر ایک ڈر ساتھ ساتھ رہا تھا۔ ان کے آنے سے لے کر رشتے کے لیے ہاں کہنے تک وہ اسی ڈر کو محسوس کرتی رہی تھی مگر کہیں ایک آس تھی جو اس بار کسی معجزے، کسی انہونی کے ہونے کی نوید پر قائم تھی۔

ہوا وہی جو ہونا تھا مگر اس بار اس سے برداشت نہ ہو سکا۔

کب تک برداشت کرتی وہ۔ بتیس سال سے برداشت ہی تو کر رہی تھی اور ہنسی خوشی برداشت کر رہی تھی مگر اب تھک گئی تھی۔

بچپن سے سب سہتی آئی تھی۔ ہمیشہ چپ رہی۔ کبھی ماں کی ممتا کے آگے..... کبھی اکلوتے بھائی کے خیال میں۔

کبھی خود اس کی ڈھال بنتی تھی، کبھی اس کے گلے لگ کر ساتھ روتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تضحیک کے زخم اس نے بھی سہے تھے۔ قطرہ قطرہ، لفظ لفظ اترتا تنفر کہیں نہ کہیں اسے بھی متاثر کرتا رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی ہمیشہ جڑ کر کھڑی رہی۔

مگر زمین زہریلی ہو تو کب تک جڑیں سہارا دیں گی۔ کبھی نہ کبھی تو تنا بھی کھوکھلا ہو کر گرے گا ہی۔

اور آج مرتضیٰ کا وہ سہارا چھن گیا تھا۔ آج زینب نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تھا۔

وہ جو اس کی اکلوتی دوست تھی، رازداں تھی..... اس کی غم گسار تھی۔ وہ بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔

مرتضیٰ نے کبھی کسی سے امید نہیں رکھی تھی کہ کوئی اس کے درد کو سمجھے، تسلی دے یا مداوا کرے مگر زینب سے اسے امید نہیں مان تھا کہ وہ اس کی تکلیف کو سمجھتی ہے۔ ساری دنیا بھی ساتھ نہ ہو تو بھی وہ اس کے ساتھ ہے اور آج وہ مان ٹوٹ گیا تھا۔

وہ نہ ہوتا تو آج وہ بتیس سال کی عمر میں بھی رشتے کے انتظار میں بڑھتی عمر کے ماہ و سال نہ گن رہی ہوتی۔

مگر اب اپنی وجہ سے وہ اس کی زندگی مزید برباد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

ثریا کی سوکھی کوکھ تیرہ سال بعد ہری ہوئی تھی۔ ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد نور حسن نے سالوں بیٹے کی خواہش میں دعائیں کرتے دن گزارے مگر قدرت جیسے اس کا صبر آزما رہی تھی اور اب جب کوئی امید نہ بچی تھی تو معجزہ سا ہو گیا۔

کتنی دیر تک وہ بے یقینی سے ثریا کی شکل دیکھتا رہا۔

''تو سچ کہہ رہی ہے نا۔ کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟''

اور وہ ہنس کر رہ گئی۔

''ڈاکٹر نے غلط رپورٹ تو نہیں دے دی ہے؟'' وہ

www.urdhaytemp.com

اب بھی ماننے کو تیار نہ تھا۔

''میرا وارث میری شامت آنے والا ہے۔'' خوشی اس کے چہرے سے چھلکی جا رہی تھی۔

''بس آج سے تو کوئی کام نہیں کرے گی۔ آرام کر، اپنا اور میرے بیٹے کا خیال رکھ۔'' اس نے اسے لے جا کر کمرے میں بٹھا دیا۔

نور حسن خوش تھا، بے حد خوش..... آنے والے کی آمد کی خبر نے ہی اس کے وجود میں خوشی بھر دی تھی۔ اسے اپنا آپ یکدم جوان اور توانا لگنے لگا..... اس نے پیدائش سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ بیٹا ہوگا۔

اس نے گھر کے کام کاج سے ثریا کو منع کر دیا اور پہلی فرصت میں جا کر گاؤں سے بڑی بہن کو لے آیا۔

رخسانہ آپا نور حسن سے چار سال بڑی تھیں مگر کم عمری میں شادی کے باعث اب خود بھی اپنے بچوں کی شادیاں کر کے فارغ تھیں۔

زینب ابھی تیرھویں سال میں تھی۔ گو اتنی سمجھدار نہ تھی مگر آنے والے مہمان کی آمد کا اسے بھی پتا تھا۔ بھائی ہوتا یا بہن، اسے اس سے غرض نہیں تھی۔ بس اس کے اکیلے پن کو دور کرنے کوئی آنے والا تھا، اس کے لیے یہی خوشی بہت تھی۔

سارے گھر کا کام رخسانہ آپا پر آ پڑا تھا اور اسے شرمندگی سی ہونے لگتی کہ وہ بس سارا دن آرام کرتی رہتی ہے۔ ایسے میں نور حسن کی نظر بچا کر رخسانہ آپا کی کچھ مدد کرنے کی کوشش کرتی تو نہ جانے کیسے نور حسن کو خبر ہو جاتی اور وہ سر پر پہنچ جاتا۔

''آپا! آپ ہی اسے منع کر دیا کریں۔ پتا ہے نا آپ کو کہ اسے آرام کی کتنی ضرورت ہے۔''

اس کے ساتھ ساتھ رخسانہ آپا کو بھی سننا پڑتی اور آپا بیچاری صفائیاں پیش کرتی رہ جاتیں۔

ثریا نور حسن کی اتنی توجہ اور محبت سے جہاں نہال ہوتی وہیں اس کا بیٹا ہونے کا یقین بھی اسے ڈرانے لگتا۔

''نور حسن کا یقین سلامت رکھنا میرے مالک۔'' ہر نماز کے بعد وہ ہاتھ اٹھا دیتی۔

اور آخر کار وہ دن آ ہی گیا جس کا ان دونوں کو شدت سے انتظار تھا۔

کئی گھنٹوں کے جان لیوا انتظار کے بعد آخر کار نرس نے ایک ننھا وجود لا کر نور حسن کے حوالے کیا۔

''میرے مالک تیرا لاکھ لاکھ شکر!'' نور حسن نے بلند آواز سے رب کا شکر ادا کیا۔ ''میری بیوی ٹھیک ہے نا؟''

اس نے بچے پر نظریں لگائے پوچھا۔

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' نرس نے بتایا۔

اور نور حسن کو مزید پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ چہرے کے نقوش نے ہی بتا دیا کہ اس کا یقین سلامت ہے۔ وہ اپنی خوشی میں مگن اور اپنے یقین پر نازاں تھا۔ نرس کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر چپ چاپ اندر واپس چلی گئی۔

گلابی کمبل میں لپٹا وجود نور حسن کے لیے خدا کی سب سے بڑی دین تھا۔ اس کا سب سے پیارا انعام۔ اس نے اس کے پھولے ہوئے گالوں کو نرمی سے چھوا اور ماتھے پر پیار کیا پھر اس کے کانوں میں اذان دی۔

اس کے بعد اس نے بچہ رخسانہ آپا کی گود میں دے دیا اور انہوں نے بچے کو محبت پاش نظروں سے دیکھا اور انگلی پر ذرا سا شہد لے کر چٹا دیا۔ پھولے گالوں والا بچہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔

''ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔ بالکل تجھ پر گیا ہے۔'' رخسانہ آپا نے اس کی بلائیں لیں۔

اس نے ثریا سے بہت پیار کیا تھا۔ بہت چاہا تھا اسے مگر محبت کا جو احساس اسے آج ہوا تھا، وہ یکسر جدا تھا۔ ایسی محبت تو اسے زینب کی پیدائش پر بھی نہ ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے بیٹی سے پیار نہیں تھا۔ زینب بھی اسے بہت پیاری تھی۔ وہ اس کی پیدائش پر بھی بہت خوش ہوا تھا مگر آج بیٹے نے تو جیسے سوکھی زمین پر ساون برسایا تھا۔ ایسا احساس پہلی بار جاگا تھا..... وہ جتنا نہال ہوتا اتنا کم تھا۔

آج اس کا چھوٹا سا گھرانا مکمل ہو گیا تھا اور اس خوشی میں اس نے محلے بھر میں مٹھائی بانٹی تھی۔

وہ خوشی سے سرشار تھا، اس بات سے بے خبر کہ وہ خوشی جلد ہی ماتم میں بدلنے والی ہے۔

☆☆☆

سب سے پہلا انکشاف رخسانہ آپا پر ہوا اور ان کے پیروں تلے سے زمین سرکتی چلی گئی۔

لاڈلے بھائی کی نسل پر یہ داغ..... اتنا بڑا کلنک..... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ کچھ ایسا ہو جائے گا۔

اب کیسے بتائے اس کو۔ وہ جو اس سانحے سے بے خبر خوشیاں منا رہا تھا جس نے تیرہ سال کا بن باس کاٹ کر منزل پائی تھی..... اس کو کیسے خبر کرے کہ سارا سفر لاحاصل تھا۔

مگر بتانا تو تھا ہی اور جتنا جلدی بتایا جاتا، اتنا ہی اچھا تھا۔

www.aiffayiem.com

پورا دن وہ ہمت مجتمع کرتی رہیں۔ الفاظ ترتیب دیتی رہیں۔

پھر شام میں انہوں نے نور حسن کو پاس بٹھا کر پہلے ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر ایکدم سے وہ سچ کہہ دیا جو صرف کڑوا ہی نہیں تھا بلکہ زہریلا بھی تھا۔

اور نور حسن کا سارا وجود نیلا پڑ گیا۔

وہ سانس روکے ساکت سا رخسانہ آپا کو دیکھ رہا تھا۔ کتنی دیر تک تو وہ بول ہی نہ پایا اور پھر جب چپ ٹوٹی تو بھی یقین سلامت تھا۔

''نہیں آپا! تجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے سر جھٹک جھٹک کر تردید کر دی۔

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی نور حسن۔ کاش کہ یہ غلط فہمی ہی ہوتی مگر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی ہوں۔'' آپا نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''یہی سچ ہے نور حسن۔ میرا یقین کر۔''

''آپا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیسے مان لوں میں؟''

''تجھے میری بات کا یقین نہیں تو لے خود دیکھ لے۔''

رخسانہ نے بچہ لا کر اس کی جھولی میں ڈالا۔

مگر نور حسن کو تو اپنے یقین پر یقین تھا اور دیکھ کر وہ اپنا یقین توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بچے کو بستر پر لٹایا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ رخسانہ بے بسی اور ترحم سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

دو دن اس نے بچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ثریا پکڑاتی بھی تو بہانہ کر کے واپس کر دیتا یا رخسانہ کو دے دیتا۔

اس کا بچہ نامکمل تھا۔ وہ نہ اس کا بیٹا تھا نہ بیٹی۔ اور اس بات پر وہ چاہ کر بھی یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

''اللہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ اتنا طویل انتظار، اتنی دعائیں، اتنا صبر..... اور انعام کیا ملا..... ایک ادھورا وجود.....''

شکوے شکایتیں اور ناشکری سر اٹھانے لگی..... وہ بچہ اسے آزمائش نہیں سزا نظر آنے لگا۔

یہ نامکمل بچہ نہیں چاہیے تھا اسے جو نہ اس کی نسل بڑھانے کے قابل تھا، نہ اس کا نام قائم رکھنے کے بلکہ یہ تو بدنامی کا باعث تھا اس کے لیے۔ کیا کہیں گے لوگ کہ نور حسن ایک ہیجڑے کا باپ ہے۔ کیسی کیسی آوازیں کسیں گے۔

لوگوں کا ان کے ساتھ سلوک، ذو معنی فقرے، گھٹیا مذاق، چھیڑ خانی..... جو اس نے بھی کئی بار کیا تھا بغیر کسی ندامت کے، بنا کسی شرمندگی کے..... کیونکہ اس کی نظر میں بھی ایسے ادھورے وجود اسی کے مستحق تھے مگر کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے گھر میں بھی ایسا وجود آنکھ کھول دے گا۔

اور اب وہ اس حقیقت کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔

''پھر کیا سوچا تو نے؟'' رخسانہ آپا نے بالآخر خود ہی پوچھ لیا۔

وہ جواب تک شرمندگی سے نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ واضح حقیقت کو نظر انداز کر رہا تھا، ٹھٹک کر رک گیا۔

''کیا سوچنا تھا آپا؟'' وہ سمجھ اور ناسمجھی کے بیچ کھڑا تھا۔

''یہی کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ کیا پالے گا اس کو؟'' رخسانہ نے سیدھا سوال کیا۔

''تو اور کیا کروں آپا؟'' اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا۔ ساری دنیا تھو تھو کرے گی۔ پوری برادری میں مذاق بن کر رہ جائے گا۔''

رخسانہ نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''تو اور کیا کروں آپا۔ کہاں جا کر پھینکوں اس کو؟'' بالآخر وہ جھلا گیا۔

''کسی یتیم خانے کے باہر رکھ آ یا ہیجڑوں کے گھر چھوڑ آ..... ابھی تو بات گھر تک ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کو پتا چلے اس سے جان چھڑا۔'' مشورہ دیا گیا۔

''محلے والے تو جانتے ہیں نا کہ بیٹا ہوا ہے۔ ہر گھر مٹھائی بھیجی تھی میں نے۔ اور ثریا اس کو کیا کہوں؟ کتنی چاہ تھی اسے بیٹے کی، وہ تو برداشت ہی نہیں کر پائے گی۔''

اندر کہیں سے کمزور سے جواز سر نکال کر اٹھنے لگے۔

''ثریا کو پتا چلے گا تو وہ بھی سمجھ جائے گی اور محلے والوں کا کیا ہے، کہہ دیں گے بیمار ہو گیا تھا، اسپتال میں رکھا ہے۔ ثریا کو کچھ دن کے لیے میں ساتھ لے جاؤں گی..... تو کہہ دیں گے کہ بچہ وہیں فوت ہو گیا اور وہیں دفنا دیا۔''

رخسانہ آپا نے چٹکیوں میں سارا مسئلہ حل کر دیا۔

وہ اس ادھورے بچے کے ساتھ اپنا نام نہیں جوڑ سکتا تھا۔ اسے پال کر جگ ہنسائی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اب بھلائی اسی میں تھی کہ اس سے جان چھڑا لی جائے۔

وہ بھی حقیقت جان چکی تھی مگر چپ تھی۔ کیوں چپ تھی، یہ بس اسے ہی پتا تھا۔

ثریا کی طبیعت سنبھلی تو آپا نے بھی سامان باندھا کہ انہیں بھی جا کر گھر سنبھالنا تھا۔ نور حسن نے سوچا کہ آپا کو چھوڑ کر تسلی سے ثریا سے بات کرے گا۔ جہاں اتنے دن گزرے، وہاں چند دن اور سہی۔

اور پھر وہ دن آ ہی گیا جب اسے ثریا سے بات کرنی پڑی۔

کئی تمہیدوں، بہت سے لفظوں اور ان گنت

www.aiwayjeem.com

جوازوں کو ذہن میں رکھ کر اس نے بات شروع کی۔

''ثریا! دیکھ جو بات میں کرنے لگا ہوں وہ حوصلہ کر کے سننا۔ بس اتنا جان لے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں جانتا ہوں تجھے تکلیف ہوگی۔ بہت دکھ ہوگا مگر برداشت کرنا پڑے گا۔'' نور حسن نے تمہید باندھی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ نور حسن کیا کہنا چاہتا ہے اور کیوں نہیں کہہ پا رہا۔

''ہاں، ہمارا بچہ مکمل نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے۔'' نور حسن کی ادھوری بات اس نے پوری کر دی۔ نور حسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

ثریا سمجھ گئی ہے..... یہ سوچ کر اس کی کب کی رکی سانس بحال ہوئی۔

''تو کیا تجھے دکھ نہیں ہوا؟'' نور حسن کی آنکھوں میں سوال تھا

''ہوا تھا مگر پھر رب کی رضا پر راضی ہوگئی۔ اس کی مرضی جو بھی دے۔''

''دیکھ ثریا! میں مانتا ہوں رب کی مرضی ہے کہ اس نے ہمیں بیٹا نہیں دیا۔ اس پر بھی صبر کر لیا کہ مجھے بغیر وارث کے قبر میں اترنا ہے مگر میں اس ادھورے بچے کو گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ اسے نہیں پال سکتا۔ ابھی تو اس کی حقیقت ہمیں ہی پتا ہے، بڑا ہوگا تو سارے محلے کو پتا چل جائے گا۔ لوگ تھو تھو کریں گے۔ پیٹھ پیچھے آوازیں کسیں گے، ہنسی اڑائیں گے اور یہ سب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے کہیں چھوڑ آؤں گا۔''

نور حسن قطعیت سے بولتا چلا جا رہا تھا اور ثریا کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔

''نور حسن! یہ ہماری اولاد ہے۔ ہمارا خون ہے۔ نو مہینے کوکھ میں رکھا ہے میں نے۔ جنم دیا ہے اسے۔ کیسے خود سے الگ کر کے پھینک دوں اور اس معصوم کی کیا غلطی کہ یہ مکمل نہیں ہے۔ یہ تو رب کی مرضی تھی کہ اسے ایسا بنا کر بھیج دیا۔'' نور حسن کے سفاکانہ ارادے پر ثریا تڑپ کر رہ گئی۔

''مانتا ہوں کہ یہ میرا ہی خون ہے۔ میری ہی اولاد ہے مگر اس کے وجود سے جو بدنامی جڑی ہے، وہ مجھے نہیں چاہیے۔ بڑا ہو کر بھی اس نے ہیجڑوں سے ہی جا ملنا ہے تو ابھی سے ہی ان کے پاس چلا جائے تو اچھا ہے۔ ہم بھی بدنامی سے بچ جائیں گے۔'' نور حسن کے لہجے کی مضبوطی ثریا کو دہلانے لگی۔

''دیکھ زینب کے ابا۔ رب کی آزمائش ہے یہ۔ ہو سکتا ہے کہ تو اس سے پیار کرے، اس کو پالے تو رب پوری اولاد بھی دے دے۔ تیرا وارث تیری نسل کا امین تجھے مل جائے۔'' ثریا نے سمجھانے کے ساتھ ساتھ ترغیب بھی دی۔

''اب رب بیٹا دے یا نہ دے مگر مجھے یہ ہیجڑا نہیں چاہیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تو بھی دل کو سمجھا لے۔'' نور حسن قطعیت سے کہتا ہوا باہر نکل گیا اور ثریا اس ننھی سی جان کو گود میں لیے بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

چھ دن ثریا نے نور حسن سے کوئی بات نہ کی اور نور حسن بھی کام کے لیے زینب کو آواز نہیں دیتا۔ یہ پہلی بار تھا کہ ان کا کوئی جھگڑا اتنے دن چلا تھا۔ ورنہ صبح کے جھگڑے پر شام کو ثریا منا لیتی یا شام کی ناراضگی پر صبح تک نور حسن بول پڑتا۔

ساتویں دن نور حسن نے بچے کے سب کپڑے سمیٹے اور ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھنے لگا۔ ثریا چپ چاپ ساری کارروائی دیکھتی رہی۔ چھٹی حس کچھ برا ہونے کا عندیہ دے رہی تھی..... سب سمیٹ کر وہ پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ثریا کی تمام حسیات بیدار ہوگئیں۔ بظاہر وہ بچے کے کپڑے بدلنے میں مشغول تھی مگر کان نور حسن کی بات پر تھے جو جلد ہی اس کی زبان سے ادا ہونے والی تھی۔

''میں نے ایک جاننے والے سے بات کر لی ہے۔ وہ اسے ایک فلاحی ادارے میں جمع کروا دے گا۔ وہ وہاں اس کا اچھے سے خیال رکھیں گے۔'' وہ فیصلہ سناتے ہوئے تسلیاں بھی دے رہا تھا۔

''اس کا سامان بھی رکھ دیا ہے۔ لا اب مجھے دے دے اسے، میں دے آؤں۔'' اس نے بچے کی سمت ہاتھ بڑھائے تو ثریا نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔

''میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ تجھے اسے نہیں رکھنا نہ رکھ۔ میں اسے خود پال لوں گی۔''

وہ بچے کو سینے سے لگائے دھیمی مگر پُرعزم آواز میں بولی۔

''دیکھ ثریا! ہم اسے نہیں رکھ سکتے۔ ہم کل کو کیا منہ دکھائیں گے لوگوں کو کہ ہمارے گھر ہیجڑا ہوا ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ تماشا بن کر رہ جائے گا ہمارا۔'' اب کی بار وہ رسانیت سے سمجھانے لگا۔

''تجھے لوگوں کی پروا ہے، اس جان کی نہیں۔ دنیا کا ڈر ہے اللہ کا خوف نہیں؟''

''بکواس بند کر اور آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ اسے مجھے لے جانے دے، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

www.urdtayjeem.com

''تُو نے جو کرنا ہے کر لے مگر میں اپنا بچے ایسے نہیں پھینکنے دوں گی۔''

نور حسن تھوڑی دیر اسے تیز نظروں سے گھورتا رہا جیسے بہت ضبط کر رہا ہو اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

زینب دروازے کی اوٹ سے ماں باپ کی لڑائی سن رہی تھی۔۔ جو کچھ کچھ اسے سمجھ آ رہی تھی اور کچھ سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ وہ خود اس لڑائی سے سہم گئی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ایسا اس نے پہلی بار دیکھا تھا کہ کسی بات پر اس کے ماں باپ ایسے لڑے ہوں۔ باپ کے جاتے ہی اس نے کمرے میں جھانکا تو ثریا بے آواز آنسوؤں کے ساتھ مرتضیٰ کو سینے سے لگائے روئے جا رہی تھی۔ ماں کا رونا دیکھ کر اسے بھی رونا آ گیا۔

وہ آہستہ سے چلتی ہوئی ثریا کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ثریا نے ایک نظر اس کے بہتے آنسوؤں پر ڈالی اور اسے بھی ساتھ لگا لیا۔ اب اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ زینب اور مرتضیٰ کو خود سے چپکائے وہ کتنی ہی دیر روتی رہی۔

☆☆☆

اور پھر فیصلہ ہو گیا۔

نہ ثریا کی ممتا ہاری اور نہ نور حسن کی دنیا داری۔ ہارا تو ان دونوں کا رشتہ ہار گیا۔ دکھ سکھ میں ساتھ رہنے کا وعدہ ٹوٹ گیا۔

کئی جھگڑوں، کئی تکراروں اور کئی بحثوں کے بعد دونوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ ثریا نے اولاد کو چنا اور نور حسن نے دنیا کو۔

آخری لمحے تک ثریا کے دل میں امید کا دیا جلتا رہا کہ شاید اب نور حسن رک جائے۔ اس کے درد کو سمجھ جائے جیسے بغیر کہے پہلے سمجھ جاتا تھا مگر نور حسن کو نہ سمجھنا تھا اور نہ وہ سمجھا۔

آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جب امید کا دیا ٹمٹماتے ہوئے آخری سانس لے کر پوری طرح بجھ گیا۔ پھر سے کبھی نہ جلنے کے لیے.....

اور نور حسن نے اسے چھوڑ دیا ہمیشہ کے لیے۔ وہ گھر سے چلا گیا تھا کبھی نہ آنے کے لیے۔

ثریا نے ایک آخری بار آنسو بہائے اور پھر خاموش ہو گئی۔ اب اسے پھر سے نئے سفر کا آغاز کرنا تھا اپنے لیے نہیں مرتضیٰ کے لیے۔ وہ جانتی تھی کہ آگے وقت کٹھن ہو گا مگر اسے مقابلہ کرنا ہو گا حالات کا۔ جس بچے کے لیے اس نے اپنی ازدواجی زندگی کی قربانی دے دی، اب اسے اس کو پالنا ہے۔

پرانا ٹرنک کھول کر اس نے اپنی تعلیمی اسناد کو تلاشا۔ بی ایڈ کا ڈپلوما جو کبھی ایسے ہی وقت گزاری کے لیے کر لیا تھا، آج نعمت محسوس ہوا۔ پہلی فرصت میں اس نے سب قریبی اسکولوں میں درخواست جمع کرا دی اور کسی اچھی خبر کی آمد کے دن گننے لگی۔

ڈیڑھ ماہ کے طویل انتظار کے بعد جب ساری جمع پونجی ختم ہونے کو تھی، اسے ایک اسکول سے بلاوا آ گیا..... کسی پرائیویٹ اسکول کی نوکری اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی مگر ایسے حالات میں وہی غنیمت تھی۔ اس عرصے میں اس نے آس پاس کے گھروں میں بھی ٹیوشن کے لیے کہنا شروع کر دیا تھا اور چند لوگوں نے اپنے بچوں کو بھیجنا بھی شروع کر دیا۔ جیسے تیسے کر کے زندگی کی گاڑی رینگنا شروع ہو گئی۔

مگر اصل مشکل تو مرتضیٰ کی شکل میں ہنوز سامنے تھی۔

ثریا نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی کو بھی مرتضیٰ کی جنس کا پتا نہ چل سکے۔ وہ ہمیشہ اسے پورے کپڑے پہنا کر رکھتی۔ کبھی اسے کسی کے ساتھ اکیلا نہ چھوڑتی۔ ہر وقت سائے کی طرح اس سے چپکی رہتی مگر جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا، اس کا ظاہر اس کے باطن کو عیاں کرنے کے درپے تھا۔

جب تک اسے بولنا نہیں آیا، اسے دیکھنے والوں کو اس میں کچھ الگ محسوس نہیں ہوا تھا۔ مگر اب اس کی آواز کی نزاکت ایک لمحے کے لیے سننے والوں کو چونکانے لگی تھی۔

''بیٹا! اس طرح نہیں بولتے۔''

ثریا اس کے باریک آواز میں بولنے کے انداز پر سرزنش کرتی تو وہ ناسمجھی سے دیکھتا رہ جاتا۔

''تو اماں کیسے بولوں؟''

اور اس ''کیسے'' کا ثریا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

ایک دن ٹیوشن کے لیے آئی چھوٹی بچیاں پڑھنے کے بعد وہیں کھیلنے بیٹھ گئیں۔ زینب نے اپنے پرانے کھلونے نکال کر ان کو دے دیے تو وہ اور بھی خوش ہو گئیں۔

بچیاں گھر گھر کھیل رہی تھیں۔ ایک بچی گھڑ بن کر سب کے لیے اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں فرضی کھانا بنانے لگی تو دوسری بچی گھر کی صفائی ستھرائی میں مگن ہو گئی۔

ان سب سے دور ایک کونے میں بیٹھا مرتضیٰ خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اماں کی سختی سے تاکید تھی کہ وہ لڑکیوں والے کسی کھیل کو نہ کھیلے، یہ اور بات کہ اسے وہ سارے کھیل

www.dilkayjeem.com

بہت اچھے لگتے تھے اور اس کا دل انہیں کھیلنے کو مچلتا تھا۔
ایک بچی نے مٹی کے چھوٹے سے چولہے پر جھوٹ موٹ کی ہانڈی چڑھائی۔ اماں کا بڑا سا دوپٹا سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی وہ اس وقت گھر کی سربراہ کا کردار ادا کر رہی تھی۔
اور مرتضیٰ اس کھیل کے ایک ایک عمل کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا خاموش تماشائی جو بظاہر کوئی کردار نہیں ہوتا مگر ہر کردار میں خود کو دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے۔
تھوڑی دیر بعد بچیاں کھیل ختم کر کے چلی گئیں۔
سب کھلونے ایسے ہی بکھرے پڑے تھے۔ اماں کا دوپٹا جو کچھ دیر قبل ایک بچی کے دائیں بائیں بے ترتیبی سے جھول رہا تھا، اب ایک طرف پڑا تھا۔ اس نے اٹھ کر دوپٹا اٹھایا اور اپنے اردگرد لپیٹ لیا۔ دوپٹا کافی بڑا تھا سو کئی بل دینے پڑے۔ پھر وہ اسی بچی کی طرح گھر خاتون خانہ بن کر چیزوں کو سمیٹ کر سجانے لگا۔ ثریا کسی کام سے کمرے سے نکل کر صحن میں آئی تو سامنے کے منظر نے اس کا خون کھولا دیا۔ تیزی سے اس نے مرتضیٰ سے دوپٹا چھینا اور ساتھ ہی ایک ہاتھ اس کے نازک گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔
"کتنی بار سمجھایا ہے کہ یہ حرکتیں مت کیا کر۔ سمجھ کیوں نہیں آتی؟" وہ اس پر چلائی۔
اور اسے واقعی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اماں اسے کیوں روکتی ہیں۔ جو باقی سب کر سکتے تھے، وہ اسے کیوں نہیں کرنے دیا جاتا؟
وہ بغیر آواز کے آنسو بہاتا ہوا گال پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔

☆☆☆

"دوبارہ بول کر دکھاؤ نا۔"
وہ بچہ اس کا بازو تھامے اس سے فرمائش کر رہا تھا۔ بچے کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اردگرد کئی اور بچے کھڑے تھے جو اس کے بلانے پر جمع ہوئے تھے۔
اس نے انہیں بھی وہ باریک آواز سنانے کے لیے بلایا تھا جسے سن کر وہ بہت ہنسا تھا اور اب چاہتا تھا کہ اس کے باقی دوست بھی اسے سن کر اتنا ہی انجوائے کریں۔
مرتضیٰ کا اس اسکول میں وہ پہلا دن تھا جو ہرگز خوشگوار نہیں تھا۔ خوشگوار تو سابقہ اسکول کے ایام بھی نہیں تھے۔ یہ سب وہاں بھی ہوتا رہا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ ان رویوں کا عادی ہو گیا تھا یا وہاں موجود بچوں کے لیے وہ تفریح پرانی ہو چکی تھی۔ تاہم وہ بہت کم اور انتہائی ضرورتاً ہی بات کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ اچانک ثریا نے اس کا دوسرے اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ وجہ کیا تھی اسے نہیں معلوم تھی مگر یہاں اب اسے پھر سے سب مراحل طے کرنا تھے۔
پہلے دن ہی بچے اس کی باریک زنانہ سی آواز سن کر اسے گھیرے ہوئے تھے اور وہ کسی ایسے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا جیسے جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھ پکڑا گیا ہو۔ اب وہ سب اس کی وہی آواز پھر سے سننے کی فرمائش کر رہے تھے۔
"اے بولو نا۔"
بچے نے اب اس کا ہاتھ کھینچ کر ہلانا شروع کر دیا۔ جیسے وہ میجک مین ہو اور ٹوپی ہلا کر کچھ ایسا نکال دے گا جو سب کو دنگ کر دے۔ باقی بچے نظریں گاڑے اس جادو کے ہونے کے انتظار میں بے چین تھے۔
یہ سب کب تک چلتا پتا نہیں مگر کلاس ٹیچر آ گئی اور سب تیزی سے اپنی اپنی سیٹوں کی طرف بڑھے۔
"مس! یہ مرتضیٰ لڑکیوں کی طرح بولتا ہے۔" بچہ زیادہ دیر خود کو وہ انکشاف کرنے سے نہیں روک پایا۔ کسی نئی کھوج، نئی دریافت کی خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ مرتضیٰ کی نظریں اب ڈیسک سے پھسل کر اپنے جوتوں میں کچھ تلاشنے لگیں۔
"بری بات حمزہ۔" ٹیچر نے بچے کو سرزنش کی۔ "نئے کلاس فیلو کو تنگ نہیں کرتے۔ بلکہ آپ سب کو تو اس سے دوستی کرنی چاہیے۔"
"مس! یہ بولے گا تو دوستی ہو گی نا۔" ایک تیز طرار بچے نے جواب دیا اور باقی بچے دبی آواز میں ہی ہی کرنے لگے۔
ٹیچر نے سب کو ڈانٹ کر چپ کروایا اور کتاب کھولنے کا کہا۔
ٹیچر کی ڈانٹ سے سب بچے خاموش ہو گئے۔ اب ان کا دھیان مرتضیٰ سے ہٹ کر بورڈ پر تیزی سے مارکر چلاتے ٹیچر کے ہاتھ کی طرف تھا۔
مگر وہ ایک وقتی سرزنش تھی جس کا بچوں پر اثر کلاس ختم ہونے تک ہی رہ پاتا اور یہ بات مرتضیٰ اچھے سے جانتا تھا۔

☆☆☆

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے بچے کو اس اسکول میں مزید نہیں رکھ سکتے۔"
پرنسپل مناسب ترین الفاظ میں اسے مرتضیٰ کے اسکول سے نکال دیے جانے کا عندیہ دے رہی تھی۔
"کیا میں وجہ جان سکتی ہوں؟" ثریا نے وجہ معلوم

www.aldhayjeem.com

ہونے کے باوجود بھی پوچھنا ضروری سمجھا۔

''مرتضیٰ نارمل بچہ نہیں ہے۔ اس کا یہاں رہنا باقی بچوں کو متاثر کر سکتا ہے بلکہ کر رہا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات؟''

پرنسپل نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کی جنس کی تخصیص کی اور اسے کسی اچھوت سے مشابہ قرار دے دیا کہ جس کے ہونے سے باقی بچوں کو کوئی بیماری لگ جاتی یا ان کے ساتھ کچھ برا ہو جاتا۔

''میں سمجھ رہی ہوں آپ کی بات..... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ پڑھائی میں اچھا ہے۔ کسی کو تنگ نہیں کرتا۔ صرف اس کی نامکمل جنس کی وجہ سے آپ اسے اسکول سے کیسے نکال سکتے ہیں؟'' ثریا نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

''ہماری مجبوری کو سمجھیں۔ ہم اسے رکھ بھی لیں تو کل کو بچوں کے والدین کو پتا چلے گا تو وہ احتجاج کریں گے۔ اگر ہم نے مرتضیٰ کو نہیں نکالا تو وہ اپنے بچوں کو کسی اور اسکول میں داخل کروا دیں گے۔ ایک ایسے بچے کے لیے ہم باقی بچوں سے ہاتھ تو نہیں دھو سکتے نا۔'' پھر تر یہ کہا۔

''آپ تو خود ٹیچر ہیں۔ ان سب معاملات کو اچھے سے سمجھتی ہیں۔''

اور ثریا سب سمجھتی تھی۔ اسے ہی سمجھنا پڑتا تھا۔ اتنے سالوں سے سمجھتی ہی تو آئی تھی۔

ابتدائی سالوں میں وہ اپنے اسکول میں ہی مرتضیٰ کو لے جاتی رہی۔ طوعاً و کرہاً اس کے وہاں ٹیچر ہونے کی بنا پر اسکول انتظامیہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے بچے کو برداشت کرتی رہی۔

بچوں کے لیے وہ ٹیچر کا بیٹا تھا لہٰذا کسی حد تک خیال کر جاتے مگر پرائمری کے بعد وہاں صرف بچیوں کو پڑھایا جاتا تھا اس لیے مجبوراً ثریا کو اسے دوسرے اسکول میں داخل کروانا پڑا اور یہیں سے ایک نئی آزمائش کا آغاز ہوا۔

چند ماہ کے بعد اسکول انتظامیہ کی طرف سے اسے نکالنے کا نوٹس مل جاتا۔ اگلے سالوں میں مرتضیٰ نے اسکول میں کم اور گھر میں زیادہ پڑھا۔

سات اسکول اور چار محلے تبدیل کر کے وہ میٹرک تک آ گیا تھا۔ میٹرک کے بعد اس نے اسکول کا رخ نہیں کیا۔ گھر پر ہی تیاری کر کے پرائیویٹ ایف اے کے پیپرز دیے اور اب وہ پرائیویٹ بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔

انیس سال کی عمر تک آتے آتے وہ اچھے سے جان گیا تھا کہ وہ باقی سب سے کتنا الگ ہے..... اور وہ لوگوں کے لیے کیا ہے یہ تو وہ بہت پہلے ہی جان چکا تھا۔

اپنے وجود کی شناخت سے بھی قبل جب نو سال کی عمر میں اس نے چاچا قدیر کے اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں کی غلاظت محسوس کی اور جب اس نے اپنا بے جان وجود پاتال میں گرتا دیکھا..... جب وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو سمجھ تک نہیں پا رہا تھا۔

وہ محض نو سال کی عمر میں جس اذیت سے گزرا تھا، وہ اسے یہ بات سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ وہ اپنے گھر سے باہر محفوظ نہیں ہے اور کیوں محفوظ نہیں ہے، یہ جاننے میں اسے کچھ وقت لگا۔

وہ گھر تک محدود رہنے لگا۔ دوست پہلے ہی کوئی نہیں تھے کیونکہ پڑوس کے سب ہی بچوں کو اس کے ساتھ نہ کھیلنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ اب اس نے باہر جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ اس نے ثریا کو کچھ نہیں بتایا مگر وہ پھر بھی سب جان گئی تھی۔ پتا نہیں کیسے؟ شاید اس کے چہرے پر اترے خوف سے یا شاید اس کے تار تار وجود سے۔

ثریا نے اس سے کچھ نہیں پوچھا مگر کچھ دنوں بعد وہ ایک نئے محلے میں شفٹ ہو گئے۔ مرتضیٰ جانتا تھا کہ اب پھر سے اسی کہانی کا آغاز ہو گا۔

صرف چہرے بدلیں گے مگر کردار وہی رہیں گے۔ کہانی اسی کی ہو گی۔ سب تماشائی ہوں گے اور وہ کھیل ہو گا..... محض ایک کھیل۔

☆☆☆

مرتضیٰ نے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی تھی مگر رب سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔ رات کے آخری پہر میں وہ اکثر اللہ سے بہت سے شکوے کرتا تھا۔

'خدا نے مجھے ایسا کیوں بنایا ہے؟ اگر خدا نے قبول کر لیا تو لوگ قبول کیوں نہیں کرتے؟ کیوں خدا کی دین پر سوال کرتے ہیں؟'

اس کی آنکھیں کتنی ہی دیر تکیے کو بھگوتی رہتیں۔

کبھی کبھی اس کا شدت سے دل چاہتا کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو کہے کہ نامکمل میں نہیں تم سب ہو۔ تم سب ذہنی طور پر ادھورے ہو جو تمہیں مجھ میں کاملیت کی تلاش ہے۔

کبھی کبھی اس کا شدت سے دل چاہتا کہ سب کی اصل صورتیں عیاں ہو جائیں۔ بغیر کسی تمہیدی لبادوں کے، بنا کسی سجاوٹ کے ان سب کے مسخ اور مکروہ چہرے سامنے آ جائیں اور وہ پھر سب کو آئینہ دکھائے کہ دیکھو یہ تمہارا اصل ہے۔ تم سب کتنے ادھورے اور ناقابلِ برداشت ہو۔

www.adhdayjeem.com

مگر کون راضی ہوتا اپنی اصل صورت دیکھنے کو۔ اسے قابلِ برداشت بنانے کو منافقت کے پہناوے پہنانے پڑتے ہیں..... لفظوں کے ہیر پھیر سے الٹا سیدھا کرنا پڑتا ہے تاکہ مسخ صورت دلکش ہو جائے۔

اور مرتضیٰ کبھی ایسے الفاظ نہ کھوج پایا جو اس کے نامکمل وجود کو پورا کر سکیں۔

☆☆☆

''میں صدقے میں واری۔ کتنی سوہنی لگ رہی ہے۔''

بیلا نے اس کا میک اپ مکمل کر کے اس کی بلائیں لیں۔

''ایمان سے کہتی ہوں اگر بیلا مرد ہوتی تو پاگل ہو جاتی تیرے عشق میں۔'' اس نے اب وگ اس کے سر پر اچھی طرح سے جماتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا۔

مگر وہ سپاٹ چہرہ لیے خاموش بیٹھا رہا۔

''چل آ ذرا اپنا روپ تو دیکھ شیشے میں۔'' اس نے اسے سنگھار میز کے سامنے لا کھڑا کیا۔

''قسم سے بس ناچ سیکھ لے تو آگ لگا دے۔ سارے شہر میں بس تیرے نام کا ڈنکا بجے۔''

وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئی جا رہی تھی اور وہ ساکت کھڑا اپنے اس روپ کو دیکھ رہا تھا جو وہ نہیں تھا مگر وہی تھا یا شاید جو نظر آ رہا تھا وہی اس کا اصل تھا جس سے وہ اتنے سالوں تک بھاگتا رہا تھا۔

بس یہی انجام تھا میرا، جس سے بچانے کو اماں سالوں سب سے لڑی۔ اپنا گھر توڑا..... اذیتیں سہیں۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو اس نے دھیرے سے آنکھیں خشک کیں اور شیشے سے دور ہٹ گیا۔

گرو جی کے ڈیرے پر آئے اسے دس روز ہو گئے تھے جبکہ گھر سے نکلے تقریباً مہینا بیت چکا تھا۔

زینب کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ مزید اس کی اذیت کا باعث نہیں بنے گا۔ کہیں دور چلا جائے گا۔ اتنا دور کہ اس کی نحوست کا سایہ اس کے مقدر پر نہ پڑ سکے۔

اس دن زینب بہت چیخی چلائی۔ بتیس سال کا سارا زہر اگلتی رہی اور وہ زہر دھیرے دھیرے مرتضیٰ کے وجود میں سرایت کر کے اسے بے جان کرتا چلا گیا۔

ثریا اس رات دیر تک مرتضیٰ کے پاس بیٹھ کر روتی رہی مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ کہتے بھی تو کیا..... کوئی بھی الفاظ تکلیف کا مداوا کرنے سے قاصر تھے۔

صبح مرتضیٰ نے ثریا سے کہہ دیا کہ وہ جا رہا ہے۔ اور ثریا یہ تک نہ پوچھ پائی کہ کہاں؟

اور پوچھ کر کرتی بھی کیا؟ اس سوال کا جواب اسے پتا تھا اور مزید کچھ پوچھنے کے قابل زینب نے چھوڑا نہیں تھا۔

زینب صبح سے کمرے میں بند تھی مگر باہر ہونے والی ہر حرکت کی اسے بخوبی خبر تھی۔ اسے مرتضیٰ کے جانے کا بھی پتا تھا۔ باوجود تمام تر ندامت کے اس نے مرتضیٰ کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ یہی بہترین قدم ہے جسے شاید بہت پہلے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

گھر سے نکلتے وقت وہ اپنے دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ تیسری چیز ثریا کی اور اپنی تصویر لے کر آیا تھا۔ باقی سب چھوڑ آیا تھا حتیٰ کہ اپنی تعلیمی اسناد تک بھی۔

اور تمام اسناد اب مرتضیٰ کے لیے بے کار چیزیں تھیں اور اس کا ادراک ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا جب ایف اے کے رزلٹ کے بعد اس نے کتنے دن تک ہر اخبار چھانا کتنی ہی جگہوں پر درخواست بھیجی اور اسے بلایا بھی گیا مگر ہمیشہ اس نے ایک ہی بات سنی۔

''ہم خواجہ سراؤں کو نوکری پر نہیں رکھتے۔ دفتر کا ماحول خراب ہوتا ہے۔'' یہ وہ جواب تھا جو اسے تقریباً ہر جگہ سے سننے کو ملا۔

مگر اس جواب کے ساتھ کتنی ہی جگہوں پر اپنے وجود میں پیوست ہوتیں، چبھتی، پیغام دیتی نظریں بھی محسوس کیں۔

اور مرتضیٰ بس سوچ کر رہ جاتا کہ کسی خواجہ سرا کو باعزت نوکری دینے سے ماحول خراب ہوتا ہے مگر اس کی عزت اتارنے سے ماحول کو کچھ نہیں ہوتا.....

اس نے چھوٹی سے چھوٹی نوکری کے لیے اپلائی کیا مگر جواب وہی رہا۔ حتیٰ کہ گھریلو ملازم تک بننے کی کوشش کی مگر کوئی رکھنے کو تیار نہ تھا۔ ایسے میں وہ ڈگریاں اور تعلیم اس کے لیے صرف ثریا کو خوش کرنے کا راستہ تھی ورنہ وہ جانتا تھا کہ ان سب کا اس کے لیے اب کوئی مصرف نہیں۔

جانے کیوں ثریا اب تک اس خوش فہمی میں جی رہی تھی کہ مرتضیٰ پڑھ لکھ جائے گا تو یہ معاشرہ اسے قبول کر لے گا جبکہ مرتضیٰ کب کا حقیقی دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے جان لیا کہ انسانوں کی بستی میں ایک خواجہ سرا صرف تماشا ہو سکتا ہے، تماش بین نہیں۔ اسے بھیک تو مل سکتی ہے مگر نوکری نہیں۔

☆☆☆

''ہو گئیں تم دونوں تیار؟'' گرو جی نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

www.aldbayjeem.com

''جی گروجی ہو گئیں۔'' بیلا چہکی۔

''اور یہ دیکھیں، کتنی سوہنی لگ رہی ہے ہماری لاڈو رانی۔'' بیلا نے اسے گروجی کے سامنے کیا۔

''ماشاءاللہ کیا روپ چڑھا ہے۔ کسی ریشم کی طرح نرم ملائم۔ بس آج سے تیرا نام ریشم ہے۔''

گروجی نے اس کے گال تھپتھپا کر اسے نیا نام دیا۔

وہ اب بھی خاموش کھڑا تھا۔ بیلا اسے تیار کر کے خود تیار ہونے چلی گئی۔

''کیا بات ہے ریشم..... اداس کیوں ہے اتنی؟''

گروجی نے اس کی آنکھوں میں چھپے درد کو بھانپ لیا۔ ''جو بھی تیرے دل میں ہے نا سب بول دے مجھ سے۔ آج سے میں ہی تیری ماں ہوں، میں ہی تیرا باپ۔ میں گرو ہوں تم سب کی۔ تم سب میرے بچے ہو۔ تم میں سے کسی کی بھی اداسی دل کاٹ دیتی ہے میرا۔ بول میرا بچہ کیا بات ہے؟''

گروجی نے اسے پیار سے پچکارا تو اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

''کچھ نہیں گروجی، بس ماں کی یاد آ گئی تھی۔ اس نے بڑے دکھ اٹھائے کہ میں کبھی ایسا نہ بنوں مگر دیکھو پھر بھی میں یہ سب کر رہا ہوں۔''

''چل ادھر آ کر بیٹھ۔'' گروجی نے اسے پلنگ پر بٹھایا اور خود موڑھا کھینچ کر ساتھ بیٹھ گیا۔

''دیکھ ریشم! ہم لوگ ایسے ہی بنے ہیں اور ہمیں ایسے ہی رہنا ہے۔ کتنا بھی اپنے اصل سے بھاگ لیں، ایک دن قدم یہیں آ کر رکتے ہیں۔'' گروجی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''کتنے سال اور رہ لیتی تو وہاں؟ ایک دن تجھے یہیں آنا تھا۔ وقت یا حالات کبھی نہ کبھی ادھر دھکیل ہی دیتے۔''

'حالات اور وقت سے زیادہ تو کسی اپنے نے دھکیلا ہے' اس نے دل میں سوچا مگر زبان چپ رہی۔

''ہم میں سے کوئی بھی خوشی سے یہاں رہنے نہیں آیا ریشم۔ سب کو زندگی نے پھینکا ہے اور ہم میں سے کسی کا بھی اس زندگی کے آگے کچھ بس نہیں چلتا ورنہ کبھی ایسی دربدری نہ چنتے۔'' گروجی کی آواز میں اداسی نمایاں تھی۔

''گروجی! آپ یہاں کیسے آئیں؟'' بلا ارادہ سوال زبان سے پھسلا۔

گروجی نے ایک نظر اسے دیکھا اور سرد آہ بھری۔

''شاید ایک ماہ کی تھی میں جب میرا باپ ایک رات مجھے چپکے سے اٹھا کر کھیتوں میں لے گیا۔ گلا گھونٹ کر مارنے والا تھا کہ گلابو کی نظر پڑ گئی مجھ پر اور اس نے منتیں کر کے مجھے اس سے لے لیا۔ میرے باپ نے سوچا کہ اچھا ہے جان چھوٹی، قتل کا گناہ کرنے سے بچ گیا اور اس وعدے پر اس کو دے دیا کہ اس کا مجھ سے تعلق کبھی کسی کو پتا نہ چلے اور وہ مجھے لے کر کبھی اس علاقے میں قدم نہ رکھے۔ پھر گلابو نے مجھے اپنے بچے کی طرح پالا پوسا۔ جوان کیا اور چھمیاں نام رکھا میرا۔ مجھے ناچ سکھایا، گانا سکھایا اور اپنے فن میں طاق کر دیا۔''

گروجی ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگے

''جب جوان ہوئی تو ساری برادری میں میرے ناچ اور خوبصورتی کی دھوم تھی۔ دور دور سے بلاوے آتے تھے۔ پھر ایک دن چودھری برکت کے پنڈ سے بلاوا آیا۔ چھتیس مربعوں کے مالک چودھری کے بیٹے کا ویاہ تھا۔ چودھری رج کے رنگین مزاج تھا۔ کسی دوسرے پنڈ کے ایک ویاہ میں اس نے مجھے دیکھا اور عاشق ہو گیا۔ گلابو نے کبھی مجھ سے دھندے کا نہیں کہا مگر خالی ناچ گانے کی کمائی سے پیٹ کب بھرتا ہے تو مجبوراً مجھے کبھی کبھار یہ سب کرنا پڑتا تھا۔ میں روز یہ سب نہیں کرتی تھی مگر جب کبھی اچھے پیسے مل جاتے میں تیار ہو جاتی۔ اس دن بھی چودھری برکت کے بلاوے کے ساتھ رات گزارنے کی پیشکش بھی تھی۔ اچھی خاصی رقم مل رہی تھی چنانچہ میں نے فوراً ہامی بھر لی۔''

''گلابو بوڑھی ہو گئی تھی مگر اس کی ہڈیوں میں بڑی جان تھی۔ وہ اب بھی میرے ساتھ جاتی تھی۔ اس دن بھی ساتھ گئی تھی۔ ناچ گانے سے فارغ ہو کر چودھری برکت نے ہمیں مردانے میں بلایا تو میں اور گلابو اس سے ملنے چل پڑے۔ چودھری ساٹھ کے پیٹے کا تنومند آدمی تھا۔ گلابو کافی دیر اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتی رہی اور وہ مجھ پر نظریں گاڑے دیکھتا رہا۔ یکدم گلابو نے چودھری سے وہ پوچھ لیا جس نے مجھے اور چودھری کو ہلا کر رکھ دیا۔''

''تو وہی آدمی ہے نا جو دسمبر کی رات میں کماد کی فصل میں ایک بچے کو مارنے گیا تھا اور ایک ہیجڑے نے تجھ سے وہ بچہ لے لیا تھا؟''

''اے..... کیا بکواس کر رہی ہے۔ کون ہے تو؟''

چودھری نے گھور کر اسے دیکھا۔

''میں وہی ہیجڑا ہوں چودھری صاحب اور یہ چھمیاں وہی بچہ جسے آپ اس رات مارنے گئے تھے۔''

چودھری قہر آمیز نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔

''اپنی یہ بکواس بند کرو۔ میرا کسی ہیجڑے یا ایسے

www.urdupoint.com

بچے سے کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ زبان چلائی تو کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' چودھری گرجا۔

''اوئے طیفا کہاں مر گیا؟'' اب کی بار اس نے بلند آواز سے کسی کو بلایا۔

''جی چودھری صاحب..... حکم؟''

ایک لمبے چوڑے ڈیل ڈول کا شخص فوراً حاضر ہوا۔

''اٹھا کر باہر پھینکو ان دونوں کو اور دوبارہ کبھی پنڈ میں دکھائی دیں تو زندہ زمین میں گاڑ دینا۔'' چودھری نے آگ برساتی نظروں سے ہمیں گھورا اور کمرے سے نکل گیا۔

''میں اور گلابو چپ چاپ واپس گھر چلے آئے۔ اس دن مجھے اپنے اصل کا پتا چلا۔ گلابو نے اس سے پہلے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے اس سے کچھ پوچھا تھا۔ پوچھ کر کرتی بھی کیا۔ ہم جیسوں کی کہانی میں کچھ بھی خاص نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں کی ان چاہی اولادیں ہوتی ہیں جنہیں وہ ہم جیسوں کی ہی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

''اپنا اصل جان کر بھی مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس سے میری تکلیف بڑھی تھی، کم نہیں ہوئی تھی۔ اگلی صبح میری زندگی پھر سے سابقہ معمول پر آ گئی مگر اس صبح کی رات نے سب بدل کر رکھ دیا۔ رات کو ہمارے گھر میں تین لوگ گھس آئے۔ وہ مجھے مارنا چاہتے تھے۔ کتنی ہی دیر میں اور گلابو ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ کتنی جگہوں پر مجھے اور گلابو کو چاقو لگے مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ جو ہاتھ آیا اس سے ان کا مقابلہ کیا۔ ایک چاقو کا نشان تو آج بھی میرے بازو پر موجود ہے۔'' گرو جی نے آستین چڑھا کر اسے زخم کا نشان دکھایا جہاں اب گوشت ابھر کر چڑھا ہوا تھا مگر کھال کی رنگت کا فرق نمایاں تھا۔

''اور پھر..... میری جان بچاتے ہوئے گلابو نے اپنی جان دے دی۔'' اتنا کہہ کر گرو جی خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی نمی گزرے وقت کی تکلیف کو دہرا رہی تھی۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ پھر بولنے لگے۔

''وہ برکت کے غنڈے تھے۔ چودھری کسی ہیجڑے کے ساتھ اپنی رات رنگین کرنے کو تو تیار تھا مگر وہی ہیجڑا اسے بطور اولاد منظور نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور یہاں اس شہر میں آ گئی۔ تب سے یہیں ہوں۔ اپنے جیسوں کے ساتھ ہوں اور ان کو پال رہی ہوں۔''

گرو جی اپنی داستان سنا کر پھر سے خاموش ہو گئے اور مرتضیٰ اس بوڑھے چہرے کو دیکھتا رہا جہاں گردشِ ایام کی داستان رقم تھی۔

''یہ بیلا سات سال کی عمر میں آئی تھی میرے پاس۔ اس کی ماں خود چھوڑ کر گئی تھی اور ریما نے گیارہ سال کی عمر میں خود گھر چھوڑا تھا۔ وہ اس گھر میں رہ تو رہی تھی مگر گھر والے بس اس کی موت کے خواہاں تھے۔''

کافی دیر کی خاموشی کے بعد گرو جی نے پھر سے بولنا شروع کیا۔

''پتا ہے ریشم یہ دنیا تیرے میرے جیسے لوگوں کے لیے بنی ہی نہیں ہے۔ یہاں لوگ کسی اندھے، گونگے لنگڑے کو تو رحم سے دیکھتے ہیں انسان مانتے ہیں مگر ہم جیسے لوگ ان کے نزدیک اچھوت ہیں..... ادھورے ہیں۔ انہیں ہم پر کبھی رحم نہیں آتا بلکہ ہنسی آتی ہے۔ ہم صرف ایک تحول ایک مذاق ہیں، ان کے نزدیک جو ان کو ہنسانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔''

گرو جی کی آنکھیں کھارا پانی اگلنے لگیں تو مرتضیٰ کو بھی ہونٹوں پر نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔

''ریشم! زمانہ چاہے پچاس سال بعد کا ہو یا پہلے کا..... ہم جیسوں کی قسمت ایسی ہی رہے گی۔ ہر دور میں ہم تماشا تھے اور تماشا ہی رہیں گے۔ اس تماشے کو ہی ہماری روزی روٹی بننا ہے ورنہ بھوکے پیٹ مریں گے مگر تماشا ہمارا پھر بھی لگے گا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں گرو جی۔ بالکل ٹھیک..... مجھے اب یہیں رہنا ہے، تماشا بننا ہے۔''

مرتضیٰ اب گرو جی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

مرتضیٰ کو یہاں آئے کئی مہینے بیت گئے تھے۔ اس نے ناچ گانا بھی کافی حد تک سیکھ لیا تھا مگر اب بھی وہ پوری طرح اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔ بیلا یا ریما کی طرح اسے اٹھلا کر چلنا نہیں آیا تھا۔ ضد کر کے پیسے نکلوانے میں بھی وہ بالکل کورا تھا۔ بلکہ وہ تو بول ہی نہیں پاتا تھا۔ بس بیلا اور ریما کے ساتھ ساتھ کھڑا رہتا۔

بیلا کے بار بار کہنے پر بھی اس نے بال نہیں بڑھائے تھے۔ وہ وگ ہی لگاتا تھا۔ انہیں بتانے کے لیے اس کے پاس جواز تھا کہ اسے اماں کے پاس جانا ہوتا ہے۔ وہ بڑھے ہوئے بالوں کے ساتھ ان کے پاس نہیں جا سکتا۔ وہ انہیں نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں رہ رہا ہے اور کیا کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی بال بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

ثریا نے اسے لڑکے کی طرح پالا تھا تو اس کی سوچ،

www.dilthayjeem.com

اس کی پسند، اس کا پہناوا ویسا ہی تھا۔ عورت کا روپ تو عارضی تھا جو اسے لینا پڑتا تھا۔ وہ اس کے لیے نوکری تھی جس سے اسے کچھ رقم کمانا تھی۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا، وہ اس کی مجبوری تھی خوشی نہیں۔

اس نے ثریا سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ اسے نوکری مل گئی ہے۔ وہ یہ سب نوکری سمجھ کر ہی کر رہا تھا۔ ایک ہیجڑے کو ایسی ہی نوکری مل سکتی تھی۔ اس عرصے میں وہ دو بار رات میں جا کر چپکے سے ثریا سے بھی مل کر آیا تھا۔ ثریا نے اب پھر محلہ تبدیل کر لیا تھا۔ ایک جگہ زینب کے رشتے کی بھی بات چلائی ہوئی تھی۔ ثریا کی کوشش تھی کہ زینب کی جلد از جلد شادی کر کے مرتضیٰ کو واپس بلا لے۔ زینب کی شادی کی وجہ سے ہی تو وہ اس گھر سے گیا تھا۔

اب آس پاس والوں کے لیے ثریا کی اکلوتی اولاد صرف زینب تھی جس کی اسے شادی کرنا تھی۔

☆☆☆

''کتا کمینہ..... سمجھتا کیا ہے خود کو۔ اس کی تو میں.....''

ریما نے غصے سے دروازہ کھولا اور تن فن کرتی اندر آئی۔

''کیا ہوا ریما؟'' مرتضیٰ اور بیلا اس کی طرف لپکے۔

ریما کو اتنے غصے میں مرتضیٰ نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے دھیمے مزاج کی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ مرتضیٰ کو وہ باقی سب سے زیادہ اچھی لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ صرف ناچ گانا کرتی تھی، دھندا نہیں کرتی تھی۔

''وہ سالا..... دلاور اس کے آدمی دھمکی دے رہے تھے مجھے کہ شرافت سے ان کے ساتھ چلوں ورنہ زبردستی اٹھا لیں گے۔ اس کی تو.....'' ریما کی گالیاں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔

''اس کمینے کی اتنی مجال..... میں گرو جی کو بتاتی ہوں۔ وہ اس کو سیدھا کرواتی ہیں۔ ساری برادری کو اس کی گلی میں بھیج کر ایسا تماشا لگوائیں گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔'' بیلا کو بھی غصہ آ گیا۔

''نہیں رہنے دے۔ اس خبیث کو تو میں خود سیدھا کر دوں گی۔ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ پیسا ہے تو کیا سب کو خرید لے گا سالا.....''

ریما کا پارا اب تک ہائی تھا۔ بیلا اور مرتضیٰ اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

دلاور برسر اقتدار پارٹی کے ایم این اے چودھری اکرام کا چچیرا بھائی تھا اور خود بھی سیاسی طور پر خاصا سرگرم تھا۔ ایک عیاش اور بدکار شخص میں جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب اس میں تھیں۔ گزشتہ ہفتے سگنل پر اس کی گاڑی رکی تو شامت کی ماری ریما اس کی گاڑی کا شیشہ بجا کر پیسے مانگنے لگی۔ اس نے پانچ سو کے ایک نوٹ کے ساتھ اپنا کارڈ دے کر اسے شام میں اپنی کوٹھی پر آنے کا کہہ دیا۔ ایسے بلاووں سے ریما خوب اچھی طرح واقف تھی... اور ایسی پیش کش کرنے والوں کی موقعے پر ہی خوب تواضع کرنے میں بھی پیش پیش رہتی تھی۔ اس نے نوٹ اور کارڈ پھاڑ کر اس کے منہ پر مارا اور گالیاں دیتی ہوئی دوسری گاڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔

شام تک وہ یہ بات بھول بھی چکی تھی کیونکہ جانے ایسے کتنے ہی لوگ روز سڑک پر مل جاتے تھے جو ذومعنی فقرے کستے، گندے اشارے کرتے اور ساتھ چلنے کی دعوت دیتے۔ یہ سب روز کا معمول تھا جنہیں وہ دو چار گالیاں دے کر وہیں حساب چکتا کر آتی۔

مگر دلاور کے لیے یہ روز کا معمول نہیں تھا۔ ایک ہیجڑے نے اسے انکار کیا اور گالیاں دیں۔ یہ بات بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں سے ریما کا ٹھکانا معلوم کیا اور دھمکی آمیز پیغامات بھیجنا شروع کر دیے۔ ریما نے ان سب دھمکیوں کو چٹکی سے اڑایا اور اپنا معمول جاری رکھا اور یہیں وہ غلطی کر بیٹھی۔

☆☆☆

دیساں دا راجا۔ میرے بابل دا پیارا۔ امبڑی دے دل دا سہارا، نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا.....

ریما ٹھمکے لگا رہی تھی اور بیلا ناچنے کے ساتھ ساتھ لہک کر گا بھی رہی تھی۔ بیلا کی آواز ان سب میں خاصی اچھی تھی سو زیادہ تر وہی گاتی تھی۔

مرتضیٰ بھی رنگین لباس میں ملبوس میک اپ زدہ چہرے کے ساتھ ان کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر یہ کوشش کچھ خاص کامیاب نہ تھی۔

وہ تینوں کسی کی شادی میں پہنچے ہوئے تھے۔ براتیوں کے آگے آگے ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ برات میں شامل لوگ باقاعدہ فرمائش کر کے ان سے ڈانس کروا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ کئی منچلوں کی چھیڑ خانی بھی جاری تھی۔

دُلہے کے دوست اور کئی براتی نوٹ ہاتھ میں لہراتے تو ریما جھومتی ہوئی جا کر ان سے وہ نوٹ اچک لاتی۔ کبھی کبھی تو نوٹ پہلی کوشش میں ہی ہاتھ آ جاتا اور کبھی دینے والا خوب ستاتا.....

برات میں ناچ گا کر پیسے سمیٹ کر انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو بیلا نے وہاں سے کھانا بھی شاپر میں ڈلوا لیا۔ اگرچہ ابھی کھانا کھلنے میں وقت تھا مگر بیلا کے آگے کس کی چلتی

www.alibayjeem.com

تھی۔ وہ ایسے کاموں میں ماہر تھی۔ منتظمین نے بھی اپنی جان چھڑانے کو انہیں کھانا نکال کر دے دیا۔ برات والے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر ایک گھر میں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ خبر برات میں پڑی تو اس نے وہاں سے نکلتے ہوئے اس گھر کا پتا بھی پوچھ لیا۔

وہاں جاتے ہوئے راستے میں کئی بچے بھی ان کے پیچھے آنے لگے۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی بچے بھی انہیں ستانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہ رہے تھے۔ بیلا نے چند گالیاں دے کر انہیں بھگانے کی کوشش کی مگر بچے خاصے ڈھیٹ تھے۔

اس گھر کے سامنے پہنچ کر بیلا نے بدھائی کے بول اونچے سروں میں گانا شروع کر دیے۔ آس پاس کے گھروں سے گردنیں نکل کر باہر جھانکنے لگیں مگر اس گھر کا دروازہ نہیں کھلا جس پر انہوں نے ہلا بولا تھا۔

گھر کے مکین یا تو لمبی تان کر سو رہے تھے یا پھر جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھول رہے تھے۔ مگر وہ تینوں بھی پوری ڈھٹائی سے وہاں براجمان تھیں۔

گلی میں لوگوں کا رش بڑھنے لگا۔ گزرنے والے مفت کا تماشا دیکھنے کے لیے رک رہے تھے۔ کئی گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے دبی دبی ہنسی اور آوازوں کے ساتھ دوپٹوں کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔

ناچار اس گھر کے مکینوں کو دروازہ کھولنا پڑا۔ بہت بحث و تکرار کے بعد ریما اور بیلا نے ان سے پیسے نکلوائے اور واپسی کی راہ لی۔

واپسی تک سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ گھر پہنچتے ہی ان تینوں نے شاپروں سے نکال کر کھانا کھایا اور بیلا لمبی تان کر سو گئی۔ البتہ ریما نہانے کے لیے چلی گئی۔ نہانے کے بعد وہ اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کرنے لگی اور مرتضیٰ بچا کھچا کھانا اور برتن سمیٹنے لگا۔

''مرتضیٰ! تو یہاں کیوں چلا آیا؟ جیسے بھی رہ رہا تھا، اپنے گھر میں ہی رہتا نا۔''

اچانک سے ریما نے اس سے پوچھا۔ وہ واحد تھی جو اسے اس کے اصلی نام سے پکارتی تھی۔

''وہاں اب مزید نہیں رہ سکتا تھا ریما باجی۔ آپ تو سب جانتی ہیں کہ میں کن حالات میں نکلا ہوں۔''

مرتضیٰ نے افسردگی سے جواب دیا۔ بیتے دنوں کی یاد ذہن کے پردے پر لہرانے لگی۔

''جانتی ہوں اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بولنے دیتا بہن کو۔ سن لیتا دو چار باتیں مگر وہیں رہتا۔ تو ابھی بچہ ہے۔ دنیا دیکھی ہی کہاں ہے تو نے۔ پناہ گاہ چھوڑ کر بھیڑیوں کے جھنڈ میں آ گیا ہے تو۔''

''چلا جاؤں گا ریما باجی۔ بس زینب کی شادی ہو جائے۔ اس کے بعد اماں کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔ بس تب تک کچھ پیسے جمع کر لوں۔'' سہانے مستقبل کی امید اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔

''بھلا ہے تو۔ اب نہیں جا پائے گا۔ ایک بار جس کا رشتہ کٹ جائے نا اپنوں سے وہ پھر چاہ کر بھی جوڑ نہیں پاتا۔'' ریما کی آنکھوں میں اداسی چمکنے لگی۔

''ایک بات پوچھوں ریما باجی.....؟'' مرتضیٰ نے سمیٹے برتن وہیں کونے میں رکھے اور ریما کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں پوچھ۔''

''آپ یہاں کیسے آئیں؟''

''جیسے سب آتے ہیں۔ جیسے تو آیا جیسے بیلا آئی۔''

''مطلب...؟''

''مطلب یہ کہ مرتضیٰ ہم دھتکارے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم میں سے کون خوشی سے آتا ہے یہاں۔ ہمیں مجبور کیا جاتا ہے، نکالا جاتا ہے اور پھر ہمارا یہی ایک ٹھکانا بچتا ہے۔'' ریما نے ایک تلخ ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

''تجھے پتا ہے مرتضیٰ..... کبھی کبھی میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں مکمل مرد یا عورت ہوتی۔ میرا بھی ایک گھر ہوتا۔ میں کسی کی بیوی ہوتی یا کسی کا شوہر۔ چھوٹے چھوٹے پیارے بچے ہوتے میرے۔ ان کے مستقبل کی فکر میں لگی رہتی۔'' وہ برش ہاتھ میں پکڑے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے کھوئے کھوئے انداز میں بولنے لگی اور مرتضیٰ اس کے چہرے پر موجود حسرتوں کو گننے لگا۔

''مرتضیٰ! کبھی کبھی بڑا دل دکھتا ہے۔ رب نے کیوں ظلم کیا اتنا ہم پر۔ کیا تھا جو ہمیں بھی مکمل بنا تا تو آج ہم بھی عزت سے جیتے۔ تجھے پتا ہے یہ ادھورا پن اذیت نہیں ہے۔ اذیت تو لوگوں کا رویہ ہے جو بار بار احساس دلاتا ہے کہ ہم نامکمل ہیں۔ کسی اچھوت کی طرح ہیں۔''

اچانک دروازہ زور سے بجا اور ریما یکدم چپ ہو گئی۔

''میں بھی پتا نہیں کیا باتیں لے بیٹھی۔ جا، جا کر دیکھ کس کو موت پڑی ہے اس وقت۔'' وہ اپنی سابقہ جون میں پلٹ آئی۔ اس کے کنگھی کرتے ہاتھ پھر سے چلنے لگے۔

مرتضیٰ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا، اتنی دیر میں دروازہ پھر سے بجا۔

www.dilbaytoon.com

''آرہا ہوں۔'' اس نے آواز لگائی اور دروازہ کھول دیا۔
دروازہ کھلتے ہی دو تین پولیس والے تیزی سے اندر گھستے چلے آئے۔
''چل نذیر جلدی سے تلاشی لے۔'' ایک بھاری وجود کے اہلکار نے کرخت آواز میں اپنے ساتھی کو کہا۔ اسی اثنا میں ریما بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔
''تلاشی کیوں جی۔ ہم نے کیا کیا ہے؟''
اس نے تنومند اہلکار سے پوچھا۔
''اوئے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تم ہیجڑے دھندا کرتے ہو اور ساتھ میں منشیات کی سپلائی بھی کرتے ہو۔''
''تو یہ کریں تھانیدار جی۔ پورے محلے سے پوچھ لیں، ریما نے کبھی کوئی نشے والی چیز دیکھی تک نہیں۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔''
''اوئے زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ اطلاع سچی ہے یا جھوٹی۔''
اس پولیس والے نے یہ کہتے ہوئے قدم اندر کی طرف بڑھائے۔
''ہاں اوئے نذیر..... کچھ ملا؟''
اسی شور شرابے میں بیلا کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر سب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''یہ دیکھیں سر جی۔ یہ پیکٹ ملے ہیں۔''
تھوڑی دیر بعد نذیر نامی شخص دو پیکٹ ہاتھ میں اٹھائے اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ مرتضیٰ اور ریما ہونقوں کی طرح ان پیکٹوں کو دیکھ رہے تھے جو ہرگز ان کے نہیں تھے۔
تنومند پولیس والے نے ایک پیکٹ کو پھاڑ کر سونگھا اور پھر انگلی کی نوک پر رکھ کر ذرا سا چکھا۔
''ہوں۔ چرس ہے۔ اوئے کب سے کر رہے ہو یہ دھندا..... اور کون کون شامل ہے تم لوگوں کے ساتھ؟ مال کدھر سے لاتے ہو؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال داغ دیے۔
''قسم لے لیں تھانیدار صاحب، یہ پیکٹ ہمارے نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں پتا کہاں سے آئے۔'' ریما نے جواب دیا۔
''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے تھانیدار صاحب۔ ہم نے تو کبھی چرس کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' بیلا نے بھی آگے بڑھ کر وضاحت دی
''شوکت! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔'' تنومند اہلکار نے ساتھ کھڑے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا۔

''ان کو تھانے لے چلو۔ چار چھتر پڑیں گے تو سارا سچ باہر آجائے گا۔''
پھر ان کے سارے واویلے کے باوجود انہیں پولیس جیپ میں ڈال کر لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔ گرو جی اس سارے سانحے سے بے خبر تھے۔ وہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے' شام میں جب وہ گھر پہنچے تو دروازے پر ہی انہیں ساری کارروائی کی خبر مل گئی۔ انہوں نے وہیں سے تھانے کا رخ کیا۔

☆☆☆

لفظوں کے گھاؤ اس نے بہت سہے تھے مگر جسمانی زخم کیسے ہوتے ہیں، یہ اسے آج پتا چلا۔ آج اسے ادراک ہوا کہ جسمانی تکلیف بھی کتنی اذیت ناک چیز ہے۔
لاک اپ میں قید ہوئے انہیں تین گھنٹے بیت چکے تھے اور وہ تین گھنٹے اس کی زندگی کے بدترین لمحات میں سے ایک تھے۔ کسی تھانے میں مجرموں سے سچ اگلوانے کے ضمن میں جو جو پرتشدد کارروائی ہو سکتی تھی، وہ سب ان کے ساتھ ہوئی۔ اب وہ نیم مردہ حالت میں لاک اپ کی دیوار سے سر لگائے آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ریما اور بیلا پڑی کراہ رہی تھیں۔
''نذیر! زبان کھولی کہ نہیں ان ہیجڑوں نے۔''
وہی تنومند اہلکار جو اس تھانے کا انچارج ایس ایچ او لقمان تھا، اس نے کانسٹیبل نذیر سے پوچھا۔
''نہیں سر جی! بڑی ڈھیٹ ہڈی ہیں۔ پرتسی فکر نہ کرو۔ صبح تک کا ٹائم دے دو، دیکھنا کیسے سب یاد آتا ہے ان کو۔''
نذیر نے دانت نکالتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا ڈھنڈورا پیٹا۔
''چل جا عیش کر صبح تک ان کے ساتھ۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔'' ایس ایچ او نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کھلی چھوٹ دی۔
اسی اثنا میں گرو جی بھی تھانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی ایس ایچ او کو سلام جھاڑا۔
''سلام تھانیدار صاحب۔ سنا ہے سرکار میری بچیوں کو تھانے لائے ہیں۔ سرکار کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معاف کر دیں۔'' گرو جی ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ ان کے لہجے میں لجاجت تھی.....
''اچھا تو تم ہو ان کے گرو۔ تو یہ سارا کاروبار تم نے چلایا ہوا ہے۔'' ایس ایچ او نے کڑی نظروں سے گرو جی کو گھورا۔

www.waqtayjeem.com

''کونسا کاروبار تھانیدار صاحب۔''

''منشیات کا کاروبار بھولے بادشاہو۔'' ایس ایچ او نے کرسی جھلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سرکار! کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم ناچ گا کر روٹی کمانے والے لوگ ہیں۔ ہم کبھی اس دھندے میں نہیں پڑے۔'' گرو جی نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اس دھندے میں نہیں پڑے مگر چرس تمہارے گھر سے نکلی ہے۔'' ایس ایچ او نے تیکھی نظروں سے گرو جی کو گھورا۔

''نہیں سرکار! وہ ہماری نہیں ہوگی۔ یہ ضرور کسی کی سازش ہے۔ میں نے اور میری بچیوں نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ ہم نے تو کبھی سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔''

''یہ تو ابھی پتا چل جائے گا جب پولیس کی مار پڑے گی کہ کس کس کو ہاتھ لگایا ہے۔''

''اوئے نذیر! اس بیجڑے کو بھی اندر ڈال۔ یہی ان کا سرغنہ ہے۔ اچھا ہے یہ خود آ گیا، اسے تلاش کرنے نہیں جانا پڑا۔''

ایس ایچ او نے کانسٹیبل کو آواز دے کر نیا حکم جاری کیا۔

☆☆☆

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ریشم۔۔۔''

''ہوں۔۔۔۔۔ اچھا نام ہے۔۔۔۔ تمہاری طرح۔''

بیڈ پر نیم دراز ایک بھاری وجود کے شخص نے ہاتھ میں پکڑے جام سے ایک گھونٹ بھرا اور تولتی نظروں سے اس کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

مرتضیٰ کی سانس رکنے لگی۔ اس کی نظریں زمین میں گڑ کر کچھ کھوجنے لگیں۔ وہ آنے والے لمحات سے باخبر تھا۔ اسے وہ کرنا تھا جو کرنے کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جسم کا سودا کرنے والی کسی عورت کی تکلیف کو وہ آج صحیح معنوں میں محسوس کر سکتا تھا۔۔۔۔

اب تک کی گزری زندگی میں بہت بار اسے لگا کہ شاید اس سے زیادہ مشکل کبھی نہ آئے مگر آج اسے اس حد کی بھی حد نظر آ رہی تھی۔ آج اسے پامالی کا سفر اپنی رضا سے طے کرنا تھا۔

ایس ایچ او نے گرو جی کو بھی ان کے ساتھ لاک اپ میں ڈال دیا تھا۔ گرو جی کی بوڑھی ہڈیاں تھوڑی دیر کی مار کے بعد ہی جواب دے گئیں اور وہ بے جان ہو کر گر پڑے۔ وہ تینوں ان کو سنبھالنے لگے۔ بیلا رو رو کر تھانیدار سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد کانسٹیبل نذیر نے ریما کو لاک اپ سے باہر نکالا اور اسے ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔ دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ آ کر خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ریما؟ کیا کہا تھانیدار نے؟''

تجسس مرتضیٰ کو بھی تھا مگر بیلا زیادہ دیر ریما کی خاموشی برداشت نہیں کر پائی۔ مگر ریما چپ رہی اور سامنے لگی سلاخوں کو گھورتی رہی۔

''کیا ہوا؟ بتاتی کیوں نہیں ہے؟ بتا نا کیا کہا اس مردود نے۔۔۔۔ کیوں بلایا تھا تجھے کمرے میں؟'' بیلا اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

''اس نے کہا ہے کہ اگر رہائی چاہیے تو چودھری دلاور کی کوٹھی پر جا کر اس سے معافی مانگو۔ اگر وہ معاف کر دے تو کیس ختم ہو جائے گا۔''

ریما نے لاک اپ کی سلاخوں پر نظریں جمائے جواب دیا۔

''مطلب یہ سب اس کمینے چودھری دلاور نے کروایا ہے۔'' بیلا غصے سے بولی۔

''آہستہ بول، یہ سب اسی کے بندے ہیں۔ اسی کے ٹکوے چاٹتے ہیں۔ جا کر بتا دیں گے اسے کہ تو نے ایسا بولا۔۔۔۔'' ریما نے نفرت سے آہستہ آواز میں کہا۔ ''پہلے ہی میں اپنی دی گئی گالیوں کی سزا بھگت رہی ہوں۔''

''ہاں تو بتا دے۔ اس سے برا اور کیا کر سکتا ہے وہ مردود۔'' بیلا نے نفرت سے کہا۔

''پھر کیا کہا تو نے؟'' تھوڑی دیر بعد بیلا کو آگے کی بات جاننے کا خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

''میں نے کہا مجھے منظور ہے۔'' اس نے بیلا کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''پاگل ہے تو۔ کیوں کہا ایسے۔ کوئی ضرورت نہیں اس حرامزادے سے معافی مانگنے کی۔ اس سے معافی کا مطلب جانتی ہے نا۔''

''ہاں جانتی ہوں اور تو بھی جانتی ہے کہ نہ مانگنے سے کیا ہوگا۔ مجھے چودھری دلاور کے پاس جانا ہی ہوگا ورنہ گرو جی تو شاید صبح تک بھی نہ بچیں۔''

ریما نے دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور

www.aiibayjeem.com

مرتضیٰ اور بیلا اسے تاسف سے دیکھتے رہ گئے۔

''اور صرف مجھے ہی نہیں تم دونوں کو بھی ساتھ جانا ہوگا۔''

تھوڑی دیر بعد اس نے ان دونوں کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

''کیا..... مگر ہم سب کو کیوں؟ یہ تو نری بے غیرتی ہے اس خبیث کی۔'' بیلا پھٹ پڑی۔

''مجھے معاف کر دے مرتضیٰ میری وجہ سے آج تو بھی مصیبت میں ہے۔'' شرمندگی سے بھری نظریں اٹھا کر اس نے مرتضیٰ کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''تو بھی مجھے معاف کر دے بیلا..... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' اب کی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مرتضیٰ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب بات اس کے یا ریما کے اختیار میں نہیں رہی۔ چودھری دلاور یا ایس ایچ او جو چاہتے ہیں اب وہی ہوگا۔

گروجی کو بچانے کے لیے وہ یہ سب اب کریں یا ان کی موت کے بعد خود کو بچانے کے لیے کریں..... مگر ہر صورت میں سب کرنا ہی پڑے گا۔

دس سال قبل کا منظر اس کی یادداشت میں سرسرانے لگا۔ چاچا قدیر کے غلیظ ہاتھوں کا لمس اسے پھر سے اپنے وجود پر محسوس ہونے لگا۔ وہ بے جان سا ہو کر لاک اپ کے ٹھنڈے اور گندے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

رات گئے پولیس کی گاڑی ان تینوں کو چودھری دلاور کی کوٹھی پر چھوڑ آئی۔

چودھری اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا تھا۔ اس نے فاتحانہ اور جتاتی ہوئی نظروں سے ریما کی طرف دیکھا۔

''آؤ ریما آؤ..... سنا ہے بڑا زبردست ڈانس کرتی ہو۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ آہاہ..... آج تو تیرے ساتھ دو اور تتلیاں بھی ہیں۔'' اس نے بیلا اور مرتضیٰ کو حریصانہ نظروں سے دیکھا۔

''واہ چودھری! ایک نہ شد تین شد۔ قسمت کا دھنی ہے تو تو۔'' اس کے ساتھ بیٹھا شخص مکروہ ہنسی ہنسا۔

''یہ تمہاری قسمت کا رزق چل کر آیا ہے۔ آج میرے مہمان بنو اور خوب عیش کرو۔'' چودھری دلاور نے اپنے دوستوں کو آفر کی اور وہ سب قہقہے لگانے لگے۔

وہ پوری رات ان تینوں نے چودھری دلاور اور اس کے دوستوں کا دل بہلانے میں گزاری۔

انہی دوستوں میں سے ایک رانا مشتاق بھی تھا جس نے رنگین رات کے انعام میں صبح مرتضیٰ کو ایک کارڈ دے کر کہا۔

''اپنے آپ کو چند پیسوں میں مت بیچو۔ تم باقی نیچوں سے بہت الگ ہو۔ ذرا سا پالش ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے۔ اس پتے پر چلے جانا، وہاں تمہیں اس کام کا کئی گنا معاوضہ ملے گا۔''

اور اس نے بغیر کچھ کہے چپ چاپ کارڈ رکھ لیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ گروجی کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ مرتضیٰ دیر تک بستر پر پڑا چھت کے شہتیروں کو گھورتا رہا۔

سچ کہا تھا ریما نے..... وہ بھیڑیوں کے جھنڈ میں پھنسا ہے۔ اب شاید چاہ کر بھی نہ نکل سکے۔ جس چیز سے بچانے کے لیے ثریا نے اسے ہمیشہ ساتھ ساتھ رکھا، دربدری جھیلی..... وہ تو پھر بھی اس کا مقدر بن گئی۔

اسے سمجھ نہ آیا کس سے شکوہ کرے۔ ریما سے جو خود اس تکلیف سے گزر رہی تھی۔ حالات سے جنہوں نے ایسا رخ اختیار کیا تھا۔ زینب سے جس کی وجہ سے وہ یہاں تک آ گیا تھا یا رب سے جس نے اسے اس طرح کا بنا کر دنیا میں بھیجا اور اسے ایسا بنا بھی دیا تو ایسی پتھر دل مخلوق کیوں بنائی؟ انسان کو حیوان سے بدتر کیوں کر دیا؟

کل سے ان چاروں میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ بیلا نے ہمت مجتمع کر کے کھانا بنایا اور گروجی اور ریما کو کھلایا۔ اسے بھی اس نے زبردستی کھانے پر راضی کیا مگر وہ بمشکل دو نوالے ہی کھا پایا۔ عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اسے لگا کچھ بھی اندر گیا تو سب باہر آ جائے گا۔

گزشتہ رات کے مناظر اس کی آنکھوں کے پردے سے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھے۔ وہ اس دن جہنم کدہ سے نکل آئے تھے۔

مگر اس کے بعد کی کئی راتیں انہوں نے کبھی چودھری دلاور اور کبھی ایس ایچ او کی خلوت میں گزاریں۔

وہ کام جس سے ریما بچتی آئی تھی، وہ کام جس کا مرتضیٰ نے کرنے کا کبھی نہیں سوچا تھا..... وہ اب انہیں اکثر کرنا پڑتا تھا۔ ایس ایچ او کے ہنٹروں کے زخم روح کی پامالی پر بھاری پڑ گئے تھے۔

اور پھر ایک رات ریما چودھری کے بلاوے پر گئی تو واپس نہیں آئی۔ وہ اور بیلا کتنی بار چودھری دلاور کی کوٹھی پر اس کا پتا کرنے گئے مگر ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ یہاں آئی ہی نہیں۔

انہوں نے ایس ایچ او کی بھی کتنی ہی منتیں کیں کہ وہ

www.aiwayjeem.com

ریما کو ڈھونڈیں مگر اس کا یہی جواب تھا۔

''بھاگ گئی ہوگی اپنے کسی یار کے ساتھ۔ آجائے گی خود ہی واپس دو چار دن رہ کر۔ تم ہیجڑوں کو کسی نے پکڑ کر یا مار کر کیا کر لینا ہے۔''

اور تین دن بعد گندے نالے سے اس کی تار تار زخمی اور کٹی پھٹی لاش ملی۔

اس رات وہ دونوں گرو جی کے گلے لگ کر بہت روئے۔ اس رات گلی کے کتے بھی رات گئے تک انسانیت کی موت پر بین کرتے رہے مگر انسان خاموش رہے۔

صبح تک گرو جی نے اپنا مختصر سامان باندھ کر وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ شہر رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بیلا بھی ان کے ساتھ جا رہی تھی اور مرتضیٰ کیسے جا سکتا تھا۔ اس کا تو سب کچھ اسی شہر میں تھا مگر وہ ایک بار پھر سے بے گھر ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آیا تو اماں کو بخار میں تپتے پایا۔ نقاہت کے باعث وہ آنکھیں بھی نہیں کھول پا رہی تھیں۔

''اماں کو کیا ہوا ہے؟''

بہت عرصے بعد مرتضیٰ نے زینب سے کوئی بات کی تھی۔ چپ کی ایک دیوار دونوں کے بیچ کب سے حائل تھی جسے عبور کرنے کی نہ تو کبھی زینب نے کوشش کی، نہ مرتضیٰ کی ہمت ہوئی۔ مگر آج ثریا کو بستر سے لگا دیکھ کر وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

زینب اسے آج گھر پر ہی مل گئی تھی۔ اس کی شادی کے بعد وہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کا لباس اس کی خوشحال زندگی کی عکاسی کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ کتنا خوش ہے۔

مرتضیٰ کے دل سے اس کی دائمی خوشیوں کی دعا نکلی۔

''بار بار بخار ہو رہا تھا اماں کو۔ گردے میں بھی درد تھا۔ ڈاکٹر کو چیک کروایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اماں کے گردے میں پتھری ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا۔'' اس نے اماں کی خرابی طبیعت کی وجہ بتائی۔

''میں پیسوں کا بندوبست کر دوں گا۔ تم کسی اچھے اسپتال سے اماں کا علاج کروانا۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش بیٹھی رہی پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ''مرتضیٰ! تجھ سے ایک بات کرنی تھی۔''

''بول.....؟''

''تو یہاں مت آیا کر۔'' وہ اتنا بول کر رک گئی۔ اس کی بات پر مرتضیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''میرا بھرا پرا سسرال ہے۔ کوئی بھی کسی بھی وقت اماں سے ملنے آ سکتا ہے۔ اگر کسی نے تجھے یہاں دیکھ لیا تو میں کیا بتاؤں گی۔'' اس نے آنکھیں چرا کر اپنی بات کی وضاحت کی۔

''اگر کسی کو بھی تمہارے بارے میں پتا چل گیا تو میرا بسا بسایا گھر اجڑ جائے گا۔ اس لیے میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تو یہاں مت آیا کر۔'' اب کی بار اس کے لہجے میں لجاجت در آئی اور مرتضیٰ اسے بس دیکھتا رہ گیا۔

اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کیسا ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیسے جی رہا ہے؟ کہاں رہ رہا ہے؟ ایک نظر یہ تک نہیں دیکھا کہ اس کے چہرے پر چوٹوں کے کتنے نشان ہیں۔ ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ زندگی کی ٹھوکریں اسے کس شدت سے لگ رہی ہیں۔

اسے آج بھی بس اپنی زندگی، اپنا گھر عزیز تھا اور آج بھی مرتضیٰ کو زینب کی خوشی عزیز تھی۔ اس نے پہلے اس کی بات نہیں ٹالی تھی تو اب کیسے ٹال دیتا۔

''ٹھیک ہے اب نہیں آؤں گا۔''

وہ بس اتنا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اب ایک بار پھر سے وہ در بدر تھا۔ وہ گرو جی کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ یہ سوچ کر گھر آ گیا کہ اب اماں کے ساتھ رہے گا مگر زینب نے ایک بار پھر اسے جانے کا کہہ دیا تھا۔

اب وہ گرو جی کے ڈیرے پر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ گرو جی جاتے وقت اپنا سب سامان لے گئے تھے اور مکان کسی اور کے حوالے کر گئے تھے۔ ایک بار پھر سے اس کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اس نے جیب سے رانا مشتاق کا دیا ہوا.... کارڈ نکالا۔ ''ٹیلنٹ میک'' نامی ادارے کا پتا درج تھا۔ وہ اس ادارے سے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا ہے اور وہاں کیا ہوتا ہے مگر اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس سے وہاں وہی کام لیا جانا تھا جو وہ چودھری دلاور کی کوٹھی میں پولیس کی مار کے بعد کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

جو اب تک مجبوری میں کیا وہ اب اسے رضامندی سے کرنا ہوگا۔

گرو جی کے ڈیرے نے اسے ایک نیا نام، نئی شناخت دی تھی۔ اسے ریشم کے قالب میں ڈھالا تھا۔ اب وہ ایک اور مکروہ کام کا آغاز کرنے جا رہا تھا تو اسے ایک اور

www.aitbayjeem.com

نیا نام چاہیے تھا۔

سو اس نے اب ریشم سے ''احمد حسن'' تک کا سفر شروع کر دیا۔

''ٹیلنٹ میک'' کے آفس میں کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد بالآخر ان کی من پسند تصاویر کھینچ لی گئیں جنہیں اس کے پورٹ فولیو میں لگا کر گاہکوں کو بھجوانا تھا۔ پھر جو اسے بک کرتا، اس کے آرڈر کا تیس فیصد معاوضہ مرتضیٰ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا۔

بظاہر اس ادارے میں نئے ٹیلنٹ کو شوبز کی دنیا میں متعارف کرایا جاتا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں ماڈلنگ اور اداکاری سیکھنے کے لیے آتے تھے مگر پس پردہ امراء کو ان کی پسند کی عیاشی فراہم کی جاتی تھی۔

ابھی اس کی باقاعدہ ٹریننگ ہونا تھی جس میں اسے سکھایا جاتا کہ اسے کسٹمر کو کیسے ڈیل کرنا ہے۔ کس انداز سے بات کرنی ہے۔ کیسے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔

سب کام منظم طریقے سے انجام دیا جا رہا تھا۔ اس دفتر میں بیٹھ کر یہ دھندا نہیں تھا، آرٹ تھا، بزنس تھا، ٹیلنٹ تھا اور وہ اپنا فن بیچنے آیا تھا۔

ایک ادھورے انسان نے مکمل لوگوں کی تشنہ خواہشات کی تکمیل کرنی تھی۔ قوم لوط کے پیروکار نفس کا بازار سجائے بیٹھے تھے اور وہ اب ''بکنے'' کو تیار تھا۔

☆☆☆

رانا مشتاق نے ٹھیک کہا تھا۔ ہیجڑوں کے ڈیرے پر جس کام کی کمائی چند سو روپے تھی، وہ ایک منظم ادارے میں ہزاروں تھی۔ اس نے بہت جلد ٹریننگ مکمل کر لی تھی۔ اگرچہ یہ سب اس کے لیے بہت مشکل تھا مگر وہ سب مشکل تب تب آسان لگنے لگی جب جب اسے یاد آیا کہ اماں بیمار ہے اور اسے جلد از جلد زیادہ رقم اکٹھی کرنی ہے تاکہ ان کا علاج ہو سکے۔

اس ٹریننگ کو جلد مکمل کرنے میں اس کی ادھوری تعلیم نے بھی بہت ساتھ دیا۔

اس کے ساتھ یہاں اور بھی کئی نوعمر لڑکے تھے۔ اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا جب اسے معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی خواجہ سرا نہیں تھے بلکہ مرد تھے۔ کچھ کو مالی مجبوریاں یہاں کھینچ لائی تھیں اور کئی ایسے تھے جو شوق سے اس فیلڈ میں آئے تھے۔ حیرتوں کا ایک جہان تھا جو اب مرتضیٰ پر کھلنے جا رہا تھا۔

بہت جلد وہ پسندیدہ ''بوائز'' کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ چند کسٹمرز سے حاصل کردہ آمدن اس نے ایک رات جا کر ثریا کو پکڑا دی۔ ثریا کی طبیعت اس بار قدرے بہتر تھی۔

''اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟''

اتنی رقم مرتضیٰ کے ہاتھوں میں دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

''اماں، نئی نوکری مل گئی ہے۔ کچھ صاحب سے ایڈوانس بھی لیا ہے۔ بس اب تو اپنا علاج کروا، رقم کی فکر نہ کر۔''

اتنے عرصے میں اسے ثریا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سلیقے سے جھوٹ بولنا آ گیا تھا۔

ثریا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کا بیٹا آج واقعی بیٹا بن کر اس کا خیال رکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

لوگوں کے ہجوم کے بیچ وہ کسی اجنبی کی طرح کھڑا تھا۔ کہیں لوگ دلاسا دے رہے تھے تو کسی کے رونے کی آواز ماحول کی سوگواری میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔

اور اس سارے ہجوم میں وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ بین اس کے دل میں بھی جاری تھا۔ خشک آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی مگر وہاں اس کا غم دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتائے کہ اس کی دنیا اجڑ گئی ہے۔ وہ آج بے سہارا ہو گیا ہے۔ بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔

اس کی ماں جس نے ساری دنیا سے لڑ کر اسے سینے سے لگایا، پناہ دی..... پیار دیا، آج وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

اور وہ اتنا بے بس تھا کہ اس کی موت پر رونے تک کا اختیار بھی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے دور کھڑی زینب پر ایک نظر ڈالی۔ اسی پل زینب نے بھی اسے دیکھ لیا مگر وہ نظریں چرا کر آنسو صاف کرنے لگی۔

مرتضیٰ سمجھ گیا کہ وہ آج بھی نہیں چاہتی کہ وہ یہاں نظر آئے۔ اسے آج بھی ماں کے جانے پر رونے کے لیے بھائی کا کندھا نہیں چاہیے تھا بلکہ بھرم درکار تھا۔

اتنے سال ماں سے دور رہ کر اس نے اس کا بھرم برقرار رکھا تھا تو آج کیسے توڑ دیتا؟

اب وہ وہاں مزید نہیں رک سکتا تھا۔ رک کر کرتا بھی کیا؟ جو رشتے بچے تھے سب جانے والی کے ساتھ آج ختم ہو گئے تھے۔ اب ان رشتوں کی باقیات بھی جلد ہی دفن ہونے والی تھیں۔

www.aiffaayjeem.com

اماں چلی گئی تھی۔ اب کیا فرق پڑتا کہ وہ اسے آخری بار بھی نہ دیکھ پاتا تو۔

اس نے دور سے ایک نظر ماں کے زندگی سے عاری وجود پر ڈالی اور واپس مڑ گیا۔ اس بار اس نے کہاں جانا تھا، وہ پھر سے نہیں جانتا تھا۔ بس یہ جانتا تھا کہ اس بار واپسی کا کوئی در کھلا چھوڑ کر نہیں جا رہا۔

☆☆☆

زینب نے اس دن آخری بار مرتضیٰ کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ بغیر کسی گلے شکوے کے وہ چلا گیا تھا۔ اسے بھی قلق تھا کہ وہ اماں کا آخری بار چہرہ تک نہیں دیکھ پایا مگر شاید یہی ان دونوں کے حق میں بہتر تھا۔ مرتضیٰ اماں کو دیکھ کر روتا تو وہ کسی کو کیا بتاتی کہ یہ کون اجنبی ہے جو اس کی ماں کے مرنے پر اتنا رو رہا ہے۔

اماں چلی گئیں، اس کے ساتھ مرتضیٰ بھی ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے چلا گیا۔ اس کا بھرم رہ گیا۔ اب اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے تھا۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ مدثر اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اپنی ملنسار اور خدمت گزار طبیعت سے اس نے ساس سسر کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا اور اب تو وہ گھر بھر کی لاڈلی بن گئی تھی۔ وہ اس گھر کے اکلوتے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے جا رہی تھی۔

زندگی یکدم بہت خوبصورت ہو گئی تھی۔ وقت گزرے ایام کی سب تکلیفوں کا مداوا کر رہا تھا۔ وہ رب کی متشکر تھی۔ اب وقت آگے کو بڑھ رہا تھا، سو اس نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔

☆☆☆

کہتے ہیں وقت خود کو دہراتا ہے۔ کہانی نئے کرداروں کے ساتھ پھر سے جنم لیتی ہے اور نفع کے متلاشی کبھی کبھی گھاٹے کی گلیوں میں بھی بھٹک جاتے ہیں۔ ایسا ہی زینب کے ساتھ بھی ہوا۔

وہ جو ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ آئی تھی، بس ایک ہی ٹھوکر سے واپس اسی مقام پر آ گئی۔

وہ جو ماں بننے کی خوشی سے سرشار پاؤں زمین پر نہیں ٹکا رہی تھی، اس انکشاف سے ہل کر رہ گئی کہ اب پاؤں تلے زمین ہی نہیں رہی۔ ماں بننے کے غرور میں جیتے ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا کہ نامکمل بچے کے انکشاف نے اسے مار دیا۔

وہ آج وہیں تھی جہاں اکیس سال پہلے ثریا تھی۔ آج اسے ثریا کی تکلیف سمجھ آ رہی تھی۔ آج اسے مرتضیٰ کا درد بھی محسوس ہو رہا تھا مگر اب مکافات کا پہیا گھوم گیا تھا شاید۔

اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ کاش کہ وہ وقت میں پیچھے جا کر سب بدل سکتی۔ بس ایک کاش..... کتنے دن وہ اس ننھی جان کو خود سے لگائے پریشان پھرتی رہی کہ مدثر کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔

مگر کب تک؟ آخر ایک دن وہ جان ہی گیا۔ اسے جاننا ہی تھا اور مدثر نے زینب کے ساتھ وہی کیا جو کبھی نور حسن نے ثریا کے ساتھ کیا تھا۔

''یہ تمہاری اولاد ہے..... اس کو اس طرح کیوں دھتکار رہے ہو جیسے کوئی جانور ہو یہ۔''

''یہ غلاظت میری اولاد نہیں ہے۔ پہلے بتا دیتیں تو اسے اسپتال میں ہی کہیں چھوڑ آتا۔ مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ اسے دو، میں اب چھوڑ آؤں گا۔'' ایک دنیادار شخص ایک بار پھر اپنی اولاد کو دھتکار رہا تھا۔

''میں اسے خود دے آؤں گی کسی دارالامان میں۔''

اس نے مدثر کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

''ٹھیک ہے کل تک کا وقت ہے۔ جہاں چھوڑ کر آنا ہے چھوڑ آؤ۔ جہاں بھیجنا ہے بھیج دو۔ پرسوں مجھے یہ اس گھر میں نظر نہ آئے۔ ورنہ اس کے ساتھ ساتھ تم بھی باہر جاؤ گی۔'' اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

اس کی نظروں میں حقارت تھی، تنفر تھا۔ اپنے ہی خون کے لیے۔

☆☆☆

زینب نے یہاں آنے سے پہلے تمام تر ممکنات سوچ لیے تھے۔ اسے اپنے لخت جگر کو کہیں سیڑھیوں پر چھوڑنا ہے، کسی گروپ کی شکل میں بیٹھی فیملی کے پاس چپکے سے رکھ آنا ہے یا کسی کی منت کر کے اس کی رضامندی سے اس کے سپرد کرنا ہے..... ان میں سے کوئی بھی آپشن ہوتا، وہ یہ بات اچھے سے جانتی تھی کہ وہ تمام تر چہرے اس کے لیے اتنے ہی انجان ہوں گے جتنا اس کا چہرہ ان میں سے کسی کے لیے ہوتا۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہاں اسے مرتضیٰ بھی مل سکتا ہے وہ بھی اس حال میں۔ کسی دربار پر رقص میں تیزی سے اٹھتے پیروں کے ساتھ، ایک چوغے میں ملبوس، تمام تر بے نیازی اور خوف سے عاری چہرہ لیے۔

اسے مرتضیٰ کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی مگر اس کے چہرے کو تلاشنے میں وقت لگا۔ بے شک نقوش وہی تھے مگر

www.alhayjeem.com

یہ وہ چہرہ نہیں تھا۔ ایک نامکمل مرد کا چہرہ نہیں تھا۔ کسی خواجہ سرا کا چہرہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی بے شناخت اور ٹھکرائے ہوئے وجود کا چہرہ تھا۔

آج اس چہرے پر بے نیازی تھی، بے خوفی تھی، تقدس تھا، پہچان تھی۔

زینب کو لمحہ لگا فیصلہ کرنے میں۔ وہ فیصلہ جو سابقہ ایک سو آٹھ دنوں میں نہیں کر پا رہی تھی، وہ فیصلہ جو گزشتہ آٹھ گھنٹے اور چودہ منٹ میں متزلزل رہا، وہ اس نے ایک پل میں کر لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مرتضیٰ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

مرتضیٰ کا جھومتا وجود کسی اور کی موجودگی کے احساس سے ٹھہر گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

ان نظروں میں نہ پہچان تھی، نہ ہی بیگانگی۔ بس ٹھہراؤ تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا اسے دیکھنے لگا۔

''کیسے ہو مرتضیٰ؟'' وہ خاموش رہا۔

''میں زینب..... تمہاری بہن۔'' اسے لگا شاید وہ پہچان نہیں پایا اسی لیے خاموش ہے۔

''جانتا ہوں۔'' دو لفظ ادا ہوئے مگر نہ آنکھوں میں پہچان ابھری تھی، نہ چہرے پر اپنائیت۔

تب زینب کو یاد آیا کہ وہ اس کی بہن تھی ہی کب۔ بس وہی اس کا بھائی تھا جسے اس نے دھتکار کر دور کر دیا تھا۔ شرمندگی سے اس کی نظریں جھک گئیں۔

''مجھے معاف کر دو مرتضیٰ۔ میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ۔''

''میں نے اپنی بدقسمتی کا ذمے دار تمہیں ٹھہرایا۔''

''تمہیں اماں سے ملنے سے روکا۔ ان کو آخری بار دیکھنے بھی نہیں دیا۔''

''تمہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا۔''

''تمہیں بھیڑیوں کی دنیا میں اکیلے نکل جانے پر مجبور کیا۔''

وہ بولتی جا رہی تھی اور مرتضیٰ خاموش کھڑا تھا بالکل خاموش۔ جذبات سے عاری چہرہ لیے مگر اندر خاموشی نہیں طوفان مچا تھا۔ ایک ایک اذیت ناک منظر نگاہوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

''یہ دیکھو، اللہ نے مجھے میرے کیے کی سزا دے دی۔ مجھے تمہاری بددعا لگ گئی مرتضیٰ۔ مجھے بھی اللہ نے نامکمل اولاد دے دی۔'' وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مرتضیٰ نے اب ایک نظر اٹھا کر اس کی گود میں سوئے بچے پر ڈالی۔

''تو اب بھی زینب تمہارے لیے میں اور مجھ جیسا وجود سزا ہے، بددعا ہے؟'' اس نے تلخی سے سوچا۔

''مدثر کو یہ بچہ نہیں چاہیے۔ اس نے بھی اسے دھتکار دیا جیسے ابا نے تمہیں دھتکارا تھا۔'' اس کے آنسوؤں میں روانی آنے لگی۔

'ایسا ہی ہونا تھا۔ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔' مرتضیٰ نے سوچا۔

''میں اسے یہاں چھوڑنے آئی تھی۔ مدثر کو یہ ادھورا بچہ نہیں چاہیے۔ اگر میں نے اسے نہیں چھوڑا تو وہ مجھے چھوڑ دے گا۔'' اس کے آنسو ہچکیوں کے ساتھ بہنے لگے۔

'تو اب بھی زینب تمہیں اپنا گھر اپنا شوہر عزیز ہے؟ نامکمل اولاد تمہیں بھی نہیں چاہیے۔ ہر ایک ماں ظرف میں ثریا نہیں بن پاتی۔' مرتضیٰ نے تلخی سے سوچا۔

''مرتضیٰ تم اسے رکھ لو۔ اسے پال لو۔ یہ تمہارے پاس رہے گا تو مجھے تسلی رہے گی کہ یہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ تم اسے لے لو گے نا؟'' اس نے آس بھری نظروں سے مرتضیٰ کو دیکھا۔

اور مرتضیٰ نے اس تمام عرصے میں پہلی بار اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ آج تک اس سے مانگتی آئی تھی مگر آج پہلی بار کچھ دینے آئی تھی۔ وہ بھلا کیسے انکار کرتا؟

اس نے ہاتھ بڑھا کر بچہ اس سے لے لیا۔ زینب کی آنکھوں میں تشکر امڈ آیا۔

''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں یہاں تم سے ملنے آیا کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے بچے کا بہت خیال رکھو گے۔''

وہ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہتی جا رہی تھی اور مرتضیٰ اب بھی چپ تھا۔

اس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ زینب کو جو چاہیے تھا، وہ اسے مل چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اور بولتی رہی پھر جلد دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے پلٹ گئی۔

جاتے وقت وہ کتنی ہی بار مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ مرتضیٰ اب تک وہیں کھڑا تھا۔ زینب کے جانے کے بعد اس نے کمبل میں لپٹے بچے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ فرشتوں کی سی معصومیت لیے وہ سوتے میں بھی مسکرا رہا تھا۔

'اسے کتنی کٹھن زندگی ملی ہے، اس معصوم کو خبر تک نہیں ہے۔'

مرتضیٰ نے ایک لمحے کو سوچا پھر اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اسے ایک نامکمل وجود کو مکمل کرنا تھا۔

⌘⌘⌘

www.aiffaayjeem.com

اللہ کے ایک نیک فطرت اور برگزیدہ بندے کا مقام

جب کسی دل میں عبادتِ الٰہی کا شوق اور رمزِ کائنات کو سمجھنے کا ذوق ہو تو اس دل کی تڑپ اسے جگہ جگہ لیے پھرتی ہے اور جب تک یہ پیاس بجھ نہ جائے اسے بیٹھنے نہیں دیتی... حسین بن منصور حلاج کا شوق اور ذوق بھی انہیں مسلسل سفر میں رکھے ہوئے تھا... جہاں بھی موقع ملا تصوف کے اسرار و رموز سیکھتے رہے مگر ان کی وحشت انہیں کہیں بھی سکون سے رہنے نہ دیتی۔ ہمیشہ ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہتے۔

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ

رضوانہ ساجد

دوسرا حصہ

www.iqbalkalmati.com

"پھر شاید انہیں قرار آ جائے۔"

آپ نے صوفیانہ لباس ترک کر کے اہلِ دنیا کا لباس اختیار کر لیا۔ مشائخ کی صحبت بھی ترک کر دی اور اہلِ دنیا کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

"عشق ہر حال میں ہے عشقِ بلا خیز مرا....."

لوگوں کو اب بھی چین نہ آتا تھا۔ کچھ دنوں تک تو لوگوں نے اس تبدیلی کو حیرت کی نظر سے دیکھا اور پھر حاسدوں نے اسے بھی ڈھونگ قرار دیا۔

''منصور ڈھونگی ہے اور اب اس نے نیا بہروپ اختیار کیا ہے۔''

عقیدت مند آپ کی اس حالت کو بھی کسی کرامت سے تعبیر کر رہے تھے اور اس سلسلے میں مبالغہ آمیز باتیں کرتے پھر رہے تھے۔

منصورؒ کا عشق اب اس منزل پر تھا کہ بسمل کو تڑپنے کے لیے گنجائش چاہیے تھی اور یہاں یہ حال کہ عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کو گھیرے ہوئے تھا۔ آپ نے اسی میں عافیت جانی کہ یہاں سے بھی چلے جائیں۔ انہوں نے ایک رات خاموشی سے تستر چھوڑ دیا۔ اس مرتبہ وہ اپنی زوجہ اور بیٹے احمد کو بھی ساتھ لے کر نہیں گئے بلکہ انہیں بتایا تک نہیں کہ ارادہ کدھر کا ہے۔ اہلِ تستر کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کہاں گئی۔

آپ کے صاحبزادے احمد بن حسین کی زبانی یہ روایت تاریخ میں ملتی ہے۔

''ہمارے والد پانچ سال تک ہم سے دور رہے۔ بس لوگوں کی زبانی خبریں ملتی رہتی تھیں کہ میرے والد خراسان تشریف لے گئے ہیں۔ پھر کہنے والوں نے کہا کہ وہ ماوراالنہر کے علاقے میں دیکھے گئے ہیں۔ پھر کچھ عرصے بعد یہ خبر ملی کہ وہ سجستان کی سیاحت میں مصروف ہیں۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ ایران میں موجود ہیں۔ پرانی روش پر لوٹ آئے ہیں۔ مجالس منعقد کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔''

ایران میں ان کی شہرت اتنی بڑھی کہ ''عبداللہ زاہد'' کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ ایران میں قیام کے دوران انہوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

اسی زمانے میں وہ ''اہواز'' چلے گئے۔ انہوں نے زوجہ اور صاحبزادے کو بھی اہواز بلا لیا۔ یہاں بھی ان کی مجالس کی شان اور مقبولیت قابلِ دید تھی۔

اہواز والوں نے انہیں ''حلاج الاسرار'' کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔

ان کی بے قراری نے انہیں یہاں بھی نہیں رہنے دیا۔ وہ دوبارہ بصرہ تشریف لے گئے۔ یہاں مختصر قیام کے بعد آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

اس بار ان کا حال عجیب تھا۔ وہ ایک گدڑی کے ساتھ بہت اونچا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ ان کے ساتھ چل رہی تھی۔

حضرت ابو یعقوب بن اسحاق نہرجوریؒ اس دور کے نہایت عظیم المرتبت بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ کے فیض یافتہ تھے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ چونکہ ان کے استاد مکرم تھے اور حضرت عثمان مکیؒ، حضرت منصور سے ناراض تھے اس لیے حضرت ابو یعقوب بھی حضرت منصور کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے جو یہ گرم بازاری دیکھی تو شدت سے مخالفت پر اتر آئے۔ جہاں بھیڑ دیکھتے وہاں پہنچ جاتے اور لوگوں سے مخاطب ہوتے۔

''تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ایک شعبدہ باز کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہو۔ منصور کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے۔''

لوگوں پر تو ان باتوں کا کیا اثر ہوتا، بعض علماء ان کی باتوں میں آ گئے اور اپنے مواعظ میں حضرت منصورؒ کے خلاف باتیں کرنے لگے۔

حضرت منصور حلاجؒ اپنے مخالفین سے بھی تنگ تھے اور عقیدت مندوں سے بھی۔ جب انہیں یہاں بھی ان دونوں گروہوں سے سابقہ ہوا تو ایک ماہ کے مختصر قیام کے بعد مکہ مکرمہ چھوڑ دیا۔ پہلے ''اہواز'' تشریف لائے اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔

بغداد میں وہ ایک سال رہے لیکن حضرت جنید بغدادیؒ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ خانقاہِ بغدادیہ سے ایک مرتبہ اٹھے تو دوبارہ پھر نہیں گئے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ اپنے اس شاگرد سے ناراض تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت منصور کے خلاف کوئی بات کہی ہو۔ انہیں شعبدہ باز و ساحر جیسے الفاظ سے یاد کیا ہو۔

www.altbayjeem.com

اگر حضرت منصورؒ بدعقیدہ ہوتے تو دین کے معاملے میں حضرت جنیدؒ کبھی خاموشی اختیار نہ کرتے۔ ان کی یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ ان کی یہ ناراضی ذاتی تھی۔ ویسی ہی ناراضی جو کبھی کبھی استاد اور شاگرد کے درمیان ہو جاتی ہے۔ حضرت منصورؒ کا حال بھی یہی تھا۔ وہ بھی حضرت جنیدؒ سے ملاقات کے لیے نہیں گئے لیکن کبھی ان کی شان میں گستاخی نہیں کی۔

اہل و عیال کو بغداد میں چھوڑا اور ایک مرتبہ پھر آپ مفقود الخبر ہو گئے اور کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان میں موجود ہیں اور دعوت و تبلیغ میں مشغول ہیں۔

حضرت منصورؒ نے ہندوستان تک پہنچنے کے لیے بحری راستے کا انتخاب کیا۔ دریائے سندھ سے ہوتے ہوئے آگے بڑھتے گئے پھر ملتان پہنچے اور وہاں سے کشمیر گئے۔

کشمیر میں انہوں نے دیکھا کہ اہواز کے تجارتی قافلے کشمیر آتے ہیں اور تستر کا زربفت (قیمتی کپڑا) کشمیر لا کر فروخت کرتے ہیں۔ انہیں ایک مضبوط سہارا مل گیا۔ وہ انہی تجارتی قافلوں کے ساتھ ہو لیے اور دشوار گزار راستے طے کرتے ہوئے چین تک چلے گئے۔

یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہندوستان میں انہوں نے کتنے عرصے قیام کیا۔ سفر کے حالات کا علم بھی نہیں ہوتا البتہ آپ کی ذات اور شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بت پرستوں کے درمیان رہ کر اسلام کی تبلیغ ضرور کی ہو گی۔ ان کی گفتگو سن کر اور ان کی کرامات کو دیکھ کر بہت سے لوگ اسلام لائے ہوں گے۔ اس اندازے پر اس لیے بھی یقین آتا ہے کہ ہندوستان والوں نے انہیں "مغیث" کا لقب دیا تھا جس کے معنی ہیں فریاد کو پہنچنے والا۔ چونکہ اللہ کی ذات ہی ایسی ہے جو اپنے بندوں کی فریاد کو پہنچتی ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ خود کو خدا کہلواتے ہیں حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ چین اور ترکستان کے لوگوں میں "مغیث" کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک اہم مقدس نام ہے جس کے معنی ہیں روزی دینے والا۔

حضرت منصور کے حاسدوں نے ان القابات سے فائدہ اٹھا کر کہنا شروع کر دیا کہ حضرت منصور خود کو "خدا" کہلوا کر خوش ہوتے ہیں۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ لوگ ان کی پرستش کرنے لگیں گے۔

حضرت منصورؒ ان الزامات کی برسرِ عام تردید کر رہے تھے لیکن آوازوں کے ہجوم میں ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ شعبدہ باز اور جادوگر سے بات آگے بڑھ کر کافر و زندیق تک پہنچ گئی تھی۔

اب ایک ہی الزام رہ گیا تھا۔ جب آپ تیسری بار 290ھ میں حج کے لیے حجازِ مقدس پہنچے تو یہ الزام بھی شاملِ حال ہو گیا۔

سوزشِ عشق سے ایسے وارفتہ ہوئے کہ میدانِ عرفات آپ کی اس دعا سے حیرت زدہ ہو گیا۔

"اے خدائے بزرگ و برتر! مجھے اس سے زیادہ بے نوا اور حاجت مند بنا دے جیسا کہ میں نظر آتا ہوں۔ اے خالقِ عالم! مجھے رسوا کر دے تاکہ لوگ مجھ پر لعنت بھیجیں۔ اے پروردگار! لوگوں کو مجھ سے بیزار کر دے تاکہ شکر کا ہر وہ کلمہ جو میری زبان سے نکلتا ہے صرف اور صرف تیرے ہی لیے ادا کیا جائے اور اے رب کریم! مجھے اس بات پر استقامت عطا فرما کہ تیرے سوا کسی کا احسان نہ اٹھاؤں۔"

شیخ فریدالدینؒ نے اس دعا میں یہ اضافہ بھی کیا ہے۔

"اے رب کریم! تو سرگرداں کو راہ دکھانے والا ہے اور اگر میں واقعی کافر ہوں تو میرے کفر میں اضافہ کر دے۔"

یہ عجیب دعا تھی جو آپ مانگ رہے تھے۔ جو لوگ آپ کو بلند آواز سے دعا مانگتے دیکھ کر آپ کے پاس جمع ہو گئے تھے، انہوں نے آپ کو مجنوں سمجھا اور آپ کے پاس سے ہٹ گئے۔

عوام الناس واقف ہی نہیں تھے کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ ان کے بہت سے القابات میں ایک لقب کا اور اضافہ ہو گیا۔ مشہور کر دیا گیا کہ وہ "مجنون" ہیں۔ مجنوں کی سزا کیا لیکن یہ سزا ہی بہت تھی کہ انہیں مجنوں کہا جا رہا تھا اور اسے مجنوں کہا جا رہا تھا جو دن رات میں چار سو رکعت نماز پڑھتے تھے اور اس قدر نماز کو اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا..... مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

دو سال بیت الحرام کی مجاوری کرتے رہے۔ واپس آئے تو حالت بالکل ہی بدل چکی تھی۔ عشق کی "لے" اتنی تیز ہو چکی

www.allthoyteen.com

تھی کہ سربستہ راز بر سرِ عام بیان کرنے لگے۔ خواص تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ انہوں نے عام مخلوق کو دعوتِ فکر دی۔ یہ کلام ان لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں جاتے مطعون ہوتے۔ جہاں قیام کرتے نکالے جاتے۔ آپ کی مخالفت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور آپ کو تقریباً پچاس شہروں سے نکال دیا گیا۔

☆☆☆

ابھی تک آپ کی کرامات عام لوگوں تک محدود تھیں لیکن ایک واقعہ ایسا ہو گیا کہ آپ کو دربارِ شاہی میں جانا پڑ گیا اور وہاں جو کرامت آپ سے ظاہر ہوئی اس نے آپ کو شاہی ریشہ دوانیوں میں ملوث کر دیا۔ آپ کو معلوم بھی نہ ہو سکا اور آپ کے خلاف وہ منصوبہ بندی ہوئی جس کے خطرناک نتائج مرتب ہوئے اور تاریخ اسلامی خون میں نہا گئی۔

عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے ایک امیر ابن نصر قشوری کو کوئی بیماری لاحق ہو گئی۔ طبیب خاص کو طلب کیا گیا۔ اس نے معائنہ کیا، دوا بھی تجویز کی لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بار بار دوائیں تجویز کی گئیں لیکن فائدہ نہ ہوا۔ آخر طبیب نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، اس مرض میں سیب کھانا مفید ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی دوا کارگر نہیں ہو گی بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ سیب کا استعمال ہی اس مرض کی دوا ہے۔ میں نے اب تک سیب اس لیے تجویز نہیں کیا تھا کہ یہ موسم سیبوں کا نہیں۔ اگر کہیں سے سیب میسر آ جائے تو آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

ابن نصر قشوری کے حکم پر اس کے خدمت گاروں نے بغداد اور اس کے مضافات کا چپا چپا چھان مارا مگر سیب کہیں نہ ملا۔ جب ہر تلاش بے سود ہوئی تو ایک خدمت گار نے حضرت منصور حلاج کا حوالہ دیا۔

''یہاں ایک ولی اللہ حضرت منصور ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے تو وہ سیب فراہم کر سکتے ہیں۔''

''وہ ولی اللہ ہیں یا سیبوں کے تاجر؟''

''وہ تاجر تو نہیں ہیں لیکن باکرامت بزرگ ہیں۔ ان کے اشارے پر سکوں کی بارش ہو جاتی ہے، یہ تو پھر سیب ہے۔''

''میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت ہر مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ تم انہیں بلاؤ۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔''

''فقیروں کے مزاج آپ جانتے ہیں، اگر انہوں نے یہاں آنے سے انکار کیا تو آپ کو وہاں جانا پڑے گا۔''

''کسی کی کیا مجال جو ہمارے حکم سے انکار کر دے۔'' ابو نصر نے غصے سے کہا لیکن جیسے اسے خود احساس ہو گیا ہو کہ وہ غلطی پر ہے۔ ''اچھا، اگر وہ کہے گا تو ہم اس کے پاس جانے کو تیار ہیں۔''

خدمت گار حضرت منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے تمام کیفیت بیان کی۔ عجیب ماجرا ہوا کہ حضرت منصور نے خود آمادگی ظاہر کی۔

''ابو نصر اچھا آدمی ہے۔ چلو اس کی عیادت کرتے ہیں۔''

حضرت منصور اس خدمت گار کے ساتھ شاہی محل میں گئے اور کسی تمہید کے بغیر امیر ابو نصر سے مخاطب ہوئے۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہیں سیب کی حاجت ہے؟''

''جب آپ کو معلوم ہے تو سیب فراہم کیوں نہیں کر دیتے؟''

''اسی لیے تو آیا ہوں۔'' حضرت منصور نے ہاتھ بلند کیا۔ ہاتھ نیچے کیا تو اس میں سیب تھا۔ اس وقت بہت سے عمائدین موجود تھے۔ سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس سے قطع نظر کہ سیب کہاں سے آیا، یہ کرامت کیا کم تھی کہ کہیں جائے بغیر سیب ہاتھ میں آ گیا تھا۔

بعض لوگوں نے اسے بھی نظر کا دھوکا یا کوئی شعبدہ قرار دیا اور حضرت منصور سے پوچھا۔ ''سیب کا موسم تو نہیں، تم یہ پھل کہاں سے لائے؟''

''جنت سے۔'' حضرت منصور نے جواب دیا۔ اس جواب پر کئی چہروں پر ہنسی آ گئی۔ یہ ہنسی اس وقت ہر چہرے پر نظر آنے لگی جب اس کو کاٹا گیا تو اس میں سے ایک کیڑا نکلا۔

''لیجیے جناب! یہ عجیب جنت کا پھل ہے کہ اس میں سے کیڑا نکلا۔'' پھر کچھ لوگ حضرت منصور سے مخاطب ہوئے۔

''جنت کے پھل میں کیڑا کیسا؟''

''اس پر تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ پھل دارِ بقا سے دارِ فنا میں آیا ہے۔ یہ تغیر اسی کی نشانی ہے۔''

www.alifbayeem.com

اس جواب سے کچھ لوگ مطمئن ہوئے کچھ نہیں ہوئے لیکن ابونصر آپ کی بزرگی کا قائل ہو گیا۔

ابونصر کا مرض جاتا رہا تو خلیفہ مقتدر باللہ تک خبر پہنچی اور وہ بھی ان سے ملنے کا مشتاق ہوا۔

مقتدر باللہ کا وزیر حامد بن عباس آپ کا سخت ترین دشمن تھا۔ اسے جب اس تمام کارروائی کا علم ہوا تو وہ فکر مند ہوا۔ اب یہ آگ قصر شاہی تک پہنچ گئی تھی۔ اسے بجھانا ضروری تھا۔

حضرت منصور نادانستگی میں شاہی سیاست کا حصہ بن گئے۔ اب عباسی سیاست آپ کے گرد گھومنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

☆☆☆

ایک بار تقریباً چار سو درویش سفر حج میں حضرت منصور کے ہمراہ تھے۔ سفر طویل سے طویل ہوتا جا رہا تھا۔ نہ پانی کی نہیں تھی، نہ کھانے کی امید۔ برستی دھوپ، تپتی زمین تھی۔ تھکن تو برداشت ہو جاتی لیکن بھوک سے حال برا تھا۔ کچھ درویشوں نے ہمت کر کے حضرت منصور سے درخواست کی۔

''یہ استقامت کا سفر ہے۔ بس اسی طرح استقلال کے ساتھ چلتے رہو۔''

''اب ہم سے خالی پیٹ نہیں چلا جاتا۔''

''کچھ بھی ہو، چلنا تو ہوگا۔'' حضرت منصور نے فرمایا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ کچھ دور جا کر آپ نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ آپ کے ساتھی تھک کر زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ حضرت منصور واپس آئے اور درویشوں سے پوچھا۔ ''تمہیں آخر کس کا انتظار ہے۔ یہاں کیوں بیٹھ گئے؟''

''ہمیں کسی قافلے کا انتظار ہے۔ شاید کوئی قافلہ ادھر سے گزرے اور اس کے پاس غذائی سامان ہو۔''

''اگر کوئی قافلہ آیا بھی تو اس کے پاس اتنا سامان نہیں ہوگا جو تم سب کی ضرورت کو پورا کر سکے۔''

''اللہ مالک ہے۔ دیکھا جائے گا۔''

''اللہ کو مالک بھی کہتے ہو اور غیر اللہ کا انتظار بھی کر رہے ہو۔ اگر اللہ کو مالک کہتے ہو تو اس کے بھروسے پر دستر خوان بچھا لو۔ تمہارا رزق وہی تمہیں پہنچائے گا۔''

اللہ پر بھروسا تو سب کو تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ویرانے میں ان کا رزق ان تک کیسے پہنچے گا لیکن تمام لوگ حضرت منصور کی کرامات سے واقف تھے اس لیے اپنے اپنے رومال زمین پر بچھا کر بیٹھ گئے کہ منصور حلاج حکم دے رہے ہیں تو اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔

صف بندی ہو گئی۔ تمام درویش صفیں بنا کر بیٹھ گئے۔ پریشانی ان کے چہروں سے ظاہر تھی۔ سب کی آنکھیں حضرت منصور پر جمی ہوئی تھیں۔

حضرت منصور ہاتھ پیچھے کر کے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد حضرت منصور کا ہاتھ سامنے آیا تو سالن کا برتن اور دو روٹیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ پھر اسی طرح ہاتھ پیچھے کرتے رہے اور سالن کا برتن ایک ایک درویش کے ہاتھ میں تھماتے رہے۔ تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھایا۔

درویشوں کو حیرت ضرور ہوئی لیکن حضرت منصور کے جواب سے سب کو تشفی ہو گئی۔

''اللہ رازق ہے۔ اس پر بھروسا کرو گے تو اسی طرح رزق ملتا رہے گا۔''

قافلے والوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئے لیکن انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اب ان کی ہر خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے اپنی دوسری خواہش کا اظہار کر دیا۔

''شیخ! ہمارا دل تازہ کھجوروں کو چاہ رہا ہے۔''

اس مرتبہ بھی حضرت منصور نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور قناعت کی تلقین کی لیکن جب وہ لوگ نہ مانے تو آپ ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔

''مجھے زور زور سے ہلاؤ۔''

درویشوں نے ایسا ہی کیا۔ اس مرتبہ بات حیرت سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ درویش منصور حلاج کے جسم کو ہلا رہے تھے اور نتیجے میں زمین پر تازہ کھجوروں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔

درویشوں نے جی بھر کے تازہ کھجوریں کھائیں اور قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

www.alifbayeem.com

اب حضرت منصور حلاج کی باقاعدہ نگرانی کی جارہی تھی۔ اس قافلے میں بھی وزیر حامد بن عباس کا ایک مخبر درویش کے بھیس میں موجود تھا۔ مخبر نے یہ خبر حامد بن عباس تک پہنچادی۔ حامد بن عباس پہلے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ امیر ابونصر، حضرت منصور کا عقیدت مند ہو چکا ہے۔ اس کے گھر کی بیگمات تک حضرت منصور کو ولی باکرامات تسلیم کرتی ہیں۔ ابونصر کی طرف سے اس کے دل میں جو کدورت تھی، اس کا تقاضا تھا کہ وہ اسے نیچا دکھائے۔

وہ ابھی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور مخبر ایک دوسری خبر لے آیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ مخبر خبر لایا تھا کہ منصور حلاج ''انا الحق'' کی صدا لگا رہے ہیں۔

یہ وقت وہ تھا جب آپ پر سکر وحدت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ آپ درجہ فنا فی الفنا پر فائز ہو گئے تھے۔ یہ غلبہ شوق اور جذبہ عشق اور مراتب و مدارج کو ضبط نہ کرنے کی وجہ سے تھا۔ جذبہ عشق ایک ایسی شے ہے کہ جب محبت اپنے منتہا کے مقام پر پہنچتی ہے تو عاشق اس کی سوزش سے جل جاتا ہے اور اس کو خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں سوائے محبوب کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسے محبوب کی طرف سے سمجھتا ہے۔ رات اور دن کی ظاہری اور باطنی نگاہ میں سب اس کو محبوب دکھائی دیتے ہیں حتیٰ کہ اسے دونوں عالم میں سوائے محبوب کے جلوے کے اور کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ جب عاشق اس درجے پر پہنچتا ہے تو اس کے سامنے جو چیز بھی آتی ہے وہ محبوب کے جلوے کی کثرت سمجھتا ہے۔ پس حضرت حسین بن منصور حلاج اس مقام و حال میں تھے۔ عالم بے خودی اور فرط عشق کے غلبے سے انا الحق کہہ بیٹھے۔ دراصل ان کی نگاہ میں سوائے محبوب کے اور کوئی نہیں سما سکتا تھا۔

ظاہر بیں نگاہیں آپ کی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ فقہا بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ خود پر قابو نہ پا سکے اور ایک اہم راز ظاہر کر بیٹھے۔ اس کی انہیں سزا ملی۔

وزیر حامد بن عباس کو ان حالات کی خبر ہو گئی تو اسے ایک بہترین موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ ابھی مقتدر باللہ سے ملاقات کا فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ 301ھ میں حضرت منصور اور آپ کے غلام کو گرفتار کر کے بغداد پہنچا دیا گیا اور دو اونٹوں پر سوار کر کے گلی گلی تشہیر کرائی اور ان پر ایک کتبہ بھی لگوا دیا جس پر تحریر تھا۔ ''میرے پاس شہادت موجود ہے کہ حلاج خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور حلول کا قائل ہے''۔

حضرت منصور کی گرفتاری کو درست ثابت کرنے کے لیے ان پر مختلف الزامات لگائے گئے تھے یا یوں کہہ لیجیے کہ مختلف اسباب تھے جو آپ کی گرفتاری کا بہانہ بنے۔

پہلا سبب یہ قرار دیا گیا کہ منصور حلاج قرآن کے مثل آیت بنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

دوسرا الزام یہ لگایا گیا کہ منصور نے ایک خط کے ذریعے اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی بنیاد ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط قرار دیا گیا تھا۔

تیسرے الزام کے مطابق وہ جادو کا علم سیکھنے ہندوستان گئے تھے۔ (ان کی کرامات کو جادو کا نام دیا جا رہا تھا)۔

حضرت منصور کی گرفتاری کا چوتھا سبب ان کا زندیقوں جیسا کلام تھا۔

پانچواں سبب وہ کفریہ اشعار تھے جو آپ کی زبان سے ادا ہوئے یا ان کے نام سے پھیلا دیے گئے۔

ایک اور سبب یہ بھی بتایا گیا کہ ان کے مرید اور خدمت گار انہیں خدا مانتے ہیں اور وہ انہیں نہیں روکتے۔

اب ساتواں الزام یہ بھی آ گیا تھا کہ وہ انا الحق کا نعرہ لگاتے ہیں۔

ان الزامات کی سچائی کا عالم یہ تھا کہ آپ نو سال تک جیل کی تاریکی میں رہے اور ان میں سے کوئی الزام بھی ثابت نہ ہو سکا۔

روایت ہے کہ منصور حلاج اس وقت شاہی محل میں نظر بند تھے اور خاص و عام کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ ابن نصر قشوری ان کا نگہبان تھا جو ان کا عقیدت مند تھا لہٰذا آپ کو تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ خاص و عام کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ حاسدین کو یہ رعایت قابل قبول نہیں تھی لہٰذا خلیفہ مقتدر نے حلاج کو علی بن عیسیٰ کے حوالے کر دیا۔ یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جب آپ کو سختیوں کا نشانہ بننا تھا۔ علی بن عیسیٰ انہیں روزانہ اپنی مجلس میں طلب کرتا اور طرح طرح سے ذلیل کرتا۔ جب بات آپ کی برداشت سے آگے بڑھ گئی تو ایک دن علی بن عیسیٰ کو آپ کے جلال کا سامنا کرنا پڑا۔

www.altbayan.com

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ کڑوی بات: دنیا کے سارے کافر مل کر بھی جتنی مرضی سازشیں کر لیں، یہ کبھی بھی مسلمانوں کو عقل استعمال کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ بات تو سچ ہے مگر کڑوی ہے۔ (مستنصر حسین تارڑ)

☆ محبت: محبت تو یہ ہے کہ کوئی آپ کو احساس دلائے بغیر آپ کے درد کو سمیٹ لے۔ آپ کی کمزوریوں کو ڈھانپ لے۔ اس میں نہ کوئی وعدے ہوں، نہ کوئی انتظار۔ اس میں کچھ طلب کرنے کی نوبت ہی نہ آئے ورنہ رابطے میں رہنا، گفتگو میں بلند و بانگ دعوے کرنا، زبان کا چسکا تو ہو سکتا ہے محبت نہیں۔ (اشفاق احمد)

منزل: اگر آپ راستے میں بھونکنے والے ہر کتے کو رک کر پتھر مارتے رہیں گے تو یقین کیجیے، آپ اپنی منزلِ مقصود پر کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے۔ (سر ونسٹن چرچل)

☆ سیکھا: میں نے تمیز، بدتمیز لوگوں سے، خاموشی باتونی لوگوں سے اور ادب بے ادب لوگوں سے سیکھا ہے۔ (خلیل جبران)

☆ معافی: دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دکھ، تکلیف، دھوکا تو انسانوں کو دیتے ہیں اور معافی اللہ سے مانگتے ہیں۔ (شیخ سعدی)

☆ فکر: ہمارے اپنے گریبان میں سانپ اور بچھو لٹک رہے ہوتے ہیں اور ہم دوسروں کی مکھیاں اڑانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ (اشفاق احمد)

☆ مذہب: لوگ مذہب کی خاطر لڑیں گے، جھگڑیں گے، مذہب پر لکھیں گے، لیکچر دیں گے، حتیٰ کہ مذہب کی خاطر جان دے دیں گے مگر مذہب کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے۔ (خلیل جبران)

☆ وجہ: کہتے ہیں کہ رزق عورت کے مقدر سے ملتا ہے اور اولاد مرد کے مقدر سے ملتی ہے لیکن اکثر یوں ہوتا ہے کہ اولاد نہ ہونے پر ہر مرد عورت کو چھوڑ دیتا ہے اور رزق نہ ہونے پر یا کمی ہونے کی وجہ سے عورت مرد کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

☆ صورت بغیر سیرت کے ایسا پھول ہے جس میں کانٹے تو بہت زیادہ ہوں مگر خوشبو بالکل نہ ہو۔

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ حیدر آباد

www.alifbayeem.com

''اے علی بن عیسیٰ! اگر اب تیری گندی زبان سے ایک لفظ بھی اور نکلا تو میں تیرے اوپر زمین کا تختہ الٹ دوں گا۔''

وہ آپ کا یہ غصہ دیکھ کر ڈر گیا۔ آپ کی کرامات سے واقف تھا۔ اقتدار کے نشے میں مست ہو کر لعن طعن کر رہا تھا لیکن جیسے ہی آپ کی پیشانی پر بل دیکھے تو سہم گیا۔ اسی وقت آپ کو اپنی مجلس سے رخصت کر دیا اور سوچ لیا کہ وہ اس معاملے سے خود کو الگ کر لے گا۔

ادھر وزیر حامد بن عباس برابر ان کوششوں میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح منصور حلاج کو اس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ ان پر کفر کا الزام ثابت کر کے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دے۔ یہ دراصل ابن نصر قشوری کو نیچا دکھانے کا منصوبہ تھا۔

اس نے ایک روز رات کی تنہائی میں خلیفہ مقتدر باللہ سے ملاقات کی اور اپنی چرب زبانی سے اسے قائل کر لیا کہ حضرت منصور کو وہ اس کے حوالے کر دے۔

''آخر تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ اس صوفی کو تمہارے حوالے کر دیا جائے؟'' خلیفہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس کی موجودگی سے خلقِ خدا میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔''

''اس کی گرفتاری سے کیا ہوگا؟''

''میں یہ نہیں چاہتا کہ اسے ہمیشہ کے لیے گرفتار کر لیا جائے بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اس پر جو الزامات ہیں، ان کی پوری طرح تحقیق ہو اور ان لوگوں کو سزا ملے جو اس کے نام سے یہ باتیں پھیلا رہے ہیں۔'' حامد بن عباس نے مکر سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری نیت اچھی ہے لیکن میں پھر بھی یہ چاہوں گا کہ منصور کے معاملے میں انصاف سے کام لیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم کسی پاکباز کو سزا دے بیٹھیں۔''

''میری ان سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔'' حامد بن عباس نے کہا۔

خلیفہ کو احکامات جاری کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی علی بن عیسیٰ کی درخواست پہنچ گئی۔ وہ اس معاملے سے خود کو الگ کر رہا تھا۔

حضرت منصور کو حامد بن عباس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سفاک نے آپ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر حوالۂ زنداں کر دیا اور نگہبانی کے لیے پہرے داروں کی بڑی تعداد مقرر کر دی۔ اس نے کئی ماہ تک آپ کو جیل کی تاریک کوٹھڑی میں قید تنہائی میں رکھا تاکہ بقول اس کے آپ کا دماغ درست ہو جائے۔ اس عرصے میں وہ اپنے حق میں علماء کی رائے بھی ہموار کرتا رہا تاکہ حضرت منصور کے خلاف فتویٰ لے سکے۔ جب اس نے چند علماء کو اپنا ہم نوا بنا لیا تو حضرت منصور کو اپنی مجلس میں طلب کیا۔ بغداد کے کئی نامور علماء اس مجلس میں موجود تھے۔ حامد بن عباس نے آپ سے گفتگو شروع کی۔ بہت سے ایسے بے ہودہ سوال کیے جس پر غصہ آنا لازمی تھا لیکن آپ کمال برداشت سے سنتے رہے۔ ایسے نپے تلے جوابات دیے کہ اعتراض کا کوئی موقع نہ ملنے پائے۔ حامد بن عباس نے بہت کوشش کی کہ آپ کوئی کمزور جواب دیں اور علماء اسے واجب القتل قرار دیں لیکن آپ نے یہ موقع نہ دیا۔

مجلس برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن پھر ایسی ہی مجلس منعقد ہوئی۔ ان الزامات کو ایک ایک کر کے بیان کیا گیا جو آپ پر لگائے گئے تھے۔ آپ نے ان الزامات کی صحت سے انکار کیا۔

''میں نہ تو شعبدہ باز ہوں نہ ساحر۔ نہ کفریہ کلام کہتا ہوں۔ اللہ کا بندہ ہوں۔ اسی کی عبادت کرتا ہوں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری رسول مانتا ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی شہادت ہے تو پیش کریں۔''

یہاں شہادت کس کے پاس تھی۔ سنی سنائی باتوں پر مقدمہ لڑا جا رہا تھا۔ بات یہیں سے شروع ہوتی تھی کہ ہم نے فلاں سے سنا، فلاں نے فلاں سے سنا۔ رہی بات کرامات کی تو علمائے حق یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ ایسی کرامات اہل اللہ سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

جب کئی ماہ اس تحقیق میں گزر گئے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو حامد بن عباس غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے اپنے ہم نوا علماء سے بھی باز پرس کی اور اپنے مخبروں کے بھی کان کھینچے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم لوگ غلط اطلاعات پہنچاتے رہے ہو۔ اس پر کوئی الزام ثابت ہی نہیں ہونے پاتا۔''

''ہماری اطلاعات غلط نہیں۔'' مخبروں نے کہا۔ ''اس پر جو الزامات ہیں، وہ تحریری شکل میں نہیں اس لیے وہ بڑی ہوشیاری سے انکار کر دیتا ہے۔''

''کچھ بھی ہو جائے۔ مجھے ایسے ثبوت درکار ہیں جنہیں بنیاد بنا کر میں اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا سکوں۔''

''اب تو ایک ہی صورت ہے۔'' ایک مخبر نے اٹھ کر کہا۔ ''میری رسائی ایسے لوگوں تک ہے جو منصور کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو بلایا جائے۔ اگر انہوں نے قبول کر لیا تو منصور پر الزام خود بخود ثابت ہو جائے گا۔''

حامد بن عباس کو نئی راہ مل گئی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ مخبر ایسے لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایسے لوگ جہاں سے ملے، انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یہ لوگ کمزور بھی تھے، نادان بھی اور کم پڑھے لکھے بھی۔ حامد بن عباس کے تیز و تند سوالات کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے اور جلد ہی اقرار کر بیٹھے۔ انہوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ حلاج کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ حامد بن عباس نے ایک کاغذ پر لکھوا لیا اور ان کے دستخط لے لیے تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں۔

دوسرے دن اس نے حضرت منصور کو بھی طلب کیا اور ان لوگوں کو بھی بلوایا۔

''کیا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟''

''ہاں، ان میں سے اکثر کو پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ اکثر میرے پاس آیا جایا کرتے تھے۔''

''جانتے ہو یہ تمہارے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ ان کے دلوں میں کیا ہے؟''

www.alitbayicom.com

''میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں دلوں کا حال جانتا ہوں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں جتنا میرا خدا مجھے بتا دیتا ہے۔''

''یہ لوگ تجھے خدا مانتے ہیں۔ انہوں نے لکھ کر دے دیا ہے۔''

''میں کسی کے قول و فعل کا ذمے دار نہیں۔ یہ میرے بارے میں کچھ بھی گمان کریں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔''

حامد بن عباس کا یہ وار بھی خالی گیا۔ علماء نے فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔

''ان لوگوں کے اقرار سے قصوروار یہ لوگ خود ہوتے ہیں حضرت منصور نہیں۔''

حامد بن عباس تلملا کر رہ گیا۔ اسے ان لوگوں سے سروکار نہیں تھا۔ اسے تو حضرت منصور کو تہ تیغ کرنا تھا۔ اس نے لوگوں کو جانے دیا۔ ان لوگوں نے باہر نکل کر اسے بھی حضرت منصور کی کرامت سے تعبیر کیا ورنہ ایسے جابر وزیر سے چھٹکارا ملنا آسان نہیں تھا۔

یہ مقدمہ ایسا نہیں تھا کہ بغداد تک محدود ہو کر رہ جاتا۔ اس کی گونج دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ قصر شاہی میں تو چند علماء ہی آتے تھے۔ باہر بیٹھے ہوئے علماء میں بھی یہ بحث جاری تھی۔ اسی لیے حامد بن عباس ڈرتا تھا کہ اگر کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر حضرت منصور کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو سارا الزام اس پر آ جائے گا۔ اسی لیے وہ نامور علماء و مشائخین سے فتویٰ لینے پر بضد تھا لیکن وہ ریاستی جبر کے باوجود زیر دام آنے کو تیار نہیں تھے بلکہ بعض تو وہ تھے جو کبھی حضرت منصور کے خلاف تھے لیکن تحقیق کے بعد اپنی رائے تبدیل کر لی تھی۔

ایسے لوگوں میں حضرت ابوالعباس ابن عطا جیسے بزرگ کا نام بھی آتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ منصور حلاج کے قبضے میں جنات ہیں لیکن جب ایک سال بعد ان سے ان کی رائے پوچھی گئی تو انہوں نے جواب دیا۔ ''حسین بن منصورؒ کی کرامات حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔''

جب ان سے پوچھا گیا کہ رائے بدلنے کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا۔ ''اس وقت مجھے منصور حلاج کے حالات کی تفصیل تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں تھی مگر اب میں اس حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں۔''

حامد بن عباس تک یہ خبریں تواتر سے پہنچ رہی تھیں۔ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس معاملے کو کسی نتیجے تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

اس وقت یہ طریقہ عام تھا کہ کتابوں میں تحریفات کر دی جاتی تھیں۔ حضرت منصور کی بھی کسی تصنیف میں تحریف کی گئی اور اس کے مضامین کو بنیاد بنا کر قتل کا فتویٰ لکھوا لیا گیا۔ کسی نے یہ زحمت بھی نہ کی کہ جو کتاب برسرِ مجلس دکھائی گئی، اس کی تحقیق کی جاتی کہ اصل کے مطابق ہے یا نہیں۔ بس حضرت منصور سے یہ پوچھا گیا کہ یہ تصنیف تمہاری ہے اور بس۔ اور یہ پوچھا گیا کہ تو نے اس کتاب کے لیے مضامین کہاں سے اخذ کیے۔ آپ نے حضرت حسن بصری کی کتاب کا نام لے دیا۔

مؤرخ خطیب بغدادی نے تحریر کیا ہے کہ حامد بن عباس کی مجلس میں حضرت منصور ملزم کی حیثیت سے کھڑے تھے جبکہ اس مجلس میں قاضی ابوعمر، قاضی ابوجعفر، قاضی ابوالحسن اور دیگر علمائے کرام کی ایک جماعت موجود تھی۔

جرح کے دوران قاضی ابوعمر کے منہ سے منصور حلاج کے خلاف یہ بات نکل گئی۔ ''اے حلال الدم۔'' (حلال الدم اسے کہتے ہیں جس کا خون جائز ہو)۔

یہ لفظ سنتے ہی وزیر حامد بن عباس چونکا جیسے گوہر مقصود ہاتھ آ گیا ہو اور قاضی ابوعمر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! یہ جو ابھی آپ نے کہا ہے اسے کاغذ پر لکھ دیجیے۔''

مطلب یہی تھا کہ قتل کا فتویٰ فرما دیں۔

قاضی ابوعمر کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ غصے میں نامناسب لفظ کہہ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن حامد بن عباس اپنی بات پر اڑا رہا۔

''آپ نے ابھی کہا ہے کہ منصور حلاج واجب القتل ہیں۔ اسے ایک کاغذ پر لکھ دیں۔''

قاضی ابوعمر نے پھر بات ٹالنے کی کوشش کی۔ حامد بن عباس بھی ہوشیار آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ قاضی صاحب اپنے ہی کلمات میں الجھ گئے ہیں اور اب نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حامد بن عباس نے قلم دوات اور کاغذ قاضی

www.altaqyeem.com

ابو عمر کے سامنے رکھ دیا اور نہایت سخت لہجے میں کہا۔ ''تم نے ابھی جو کچھ منصور حلاج کے بارے میں کہا ہے اسے اس کاغذ پر لکھو۔''

یہ درخواست نہیں حکم تھا۔

قاضی ابو عمر نے حامد بن عباس کے تیور دیکھے تو اقتدار کی بھول بھلیاں یاد آنے لگیں۔ انہوں نے قلم اٹھایا اور لکھ دیا کہ منصور حلاج کا قتل جائز ہے۔

حامد بن عباس کا مقصد پورا ہوا۔ اس نے اس کاغذ کو مجلس میں موجود دیگر علمائے کرام کے سامنے باری باری پیش کیا۔ اب کس کی ہمت تھی کہ دستخط نہ کرتا۔

ایک ایک کر کے اس ناحق قتل پر مہریں لگنے لگیں۔

پورا مقدمہ پہلے دن ہی سے یک طرفہ تھا۔ اس وقت بھی یہ ساری کارروائی یک طرفہ ہو رہی تھی۔ حضرت منصور حلاج یہ تمام منظر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر آپ کی آواز گونجی۔

''میری پشت شرعی طور پر ممنوع و محفوظ ہے اور میرا خون حرام ہے۔ تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم جھوٹی باتوں کی بنا پر میرے قتل کا فتویٰ دو حالانکہ میرا عقیدہ اسلام کے موافق ہے۔ میرا مذہب سنت مطہرہ کے مطابق ہے اور میں چاروں خلفائے راشدین اور تمام عشرہ مبشرہ کی فضیلت کا قائل ہوں۔ سنت کے بیان میں میری تصانیف کتب فروشوں کے پاس ہیں۔ پس میرے قتل کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔''

حضرت منصورؒ اللہ سے ڈرو کی تکرار کر رہے تھے اور علماء برابر ان کے قتل نامے پر دستخط کرتے جا رہے تھے۔ کسی نے آپ کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

حامد بن عباس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے مجلس برخاست کر دی۔

حضرت منصور کو پھر اسی قید خانے میں بھیج دیا گیا جہاں وہ قید تھے۔

یہ مقدمہ نو سال تک چلتا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل سکا تھا اور پھر اچانک ایک لفظ ''حلال الدم'' کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پس پردہ حقائق کچھ اور تھے۔

حضرت منصور کی زندگی کی طرح ان کا مقدمہ بھی پراسرار ہی رہا۔

☆☆☆

اس رات آپ اپنے اس کمرے سے باہر نکل آئے جہاں آپ کو قید کیا ہوا تھا۔ اسی رات ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ اپنے کمرے میں بند تھے۔ جیل کے دوسرے کمروں میں تقریباً تین سو قیدی بند تھے۔ آپ کے پیروں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ باہر تالا بھی موجود تھا لیکن آپ کسی روحانی قوت کی بدولت کمرے سے باہر آ گئے اور دوسرے قیدیوں کے پاس آئے اور ان سے فرمایا۔ ''کیا میں تم سب کو رہا کر دوں؟''

قیدیوں نے آپ کے پیروں کی طرف دیکھا جن میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور یہ ہمیں آزاد کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا اور آپ سے پوچھا۔

''آپ اگر اتنی طاقت رکھتے ہیں تو خود کو آزاد کیوں نہیں کرا لیتے؟''

''تم اپنی مرضی بتاؤ۔ میری فکر چھوڑو۔ میں تو اللہ تعالیٰ کی قید میں ہوں۔ شریعت کا پاس کرتا ہوں اس لیے خود کو رہا نہیں کرا سکتا۔'' آپ نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے ایک اشارے سے تمام قیدیوں کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں۔

اب تک یہ قیدی اس دعوے کو مذاق سمجھ رہے تھے لیکن اب وہ حیرتوں کے پہاڑ تلے دب گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔

(جاری ہے)

www.alifbayjeem.com

دنیا گول

ناہید سلطانہ اختر

دائرے کی خوبی یہ ہے کہ جس نقطہ سے آغاز ہوتا ہے اسی پر اختتام بھی ہو جاتا ہے... گویا سفر کیا ہی نہ ہو مگر... تھکن بتاتی ہے کہ جیسے کوئی اپنی مکمل زندگی جی چکا اور... آخر میں اس کے حصے میں بھی محض تھکن تو آئی تھی... بچپن کی محبت جب خیالوں میں ساتھ رہے تو حقیقت میں کبھی ساتھ نہیں مل پاتا... بس یہی حقیقت اس نے بھی تسلیم کر لی تھی۔

زمانہ طالب علمی کی بے شمار یادوں میں سے

ایک خوب صورت یاد کا سہارا

دنیا گول ہے!
دنیا واقعی گول ہے!

عدنان جس کا نک نیم سنی تھا، انگلستان کے مقام سلاؤ میں پیدا ہوا تھا۔ یوں پیدائشی طور پر وہ برطانوی قومیت کا حامل تھا لیکن ناگزیر خاندانی حالات کے باعث اسے چار سال کی عمر میں اپنے والدین کے وطن پاکستان آنا پڑا جہاں وہ اپنے افرادِ کنبہ کے ساتھ تقریباً نو برس مقیم رہا پھر چند اسباب کے تحت اسے اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے

ساتھ انگلستان مراجعت کرنا پڑی۔

پاکستان میں نو سالہ قیام کے دوران سنی کے باپ نے اسے اور اس کے باقی بہن بھائیوں کو شہر کے ایک انگریزی تعلیمی ادارے میں داخل کرا دیا تھا۔ پہلے سنی کی بڑی بہن فائزہ اور بھائی رحمان اس اسکول میں داخل کیے گئے۔ پھر سنی اور دو ڈھائی برس کے وقفے سے اس کی چھوٹی بہن عائزہ کا داخلہ کرا دیا گیا۔

مذکورہ تعلیمی ادارہ شہر کا ایک مستند تعلیمی ادارہ تھا جہاں امیر اور خوش حال گھرانوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کر پاتے تھے۔ فیس بہت زیادہ تھی اور معاشی اعتبار سے کمزور گھرانے اپنے بچوں کو اس ادارے میں تعلیم دلوانے کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔

ادارہ وسیع و عریض رقبۂ اراضی پر قائم تھا۔ ادارہ ایک نہیں کئی عمارتوں میں بٹا ہوا تھا اور تمام عمارات نہایت شاندار تھیں۔ کشادہ، روشن، ہوادار اور آرام دہ کمرے، طویل راہداریاں، آرام دہ فرنیچر، تقریبات کے لیے وسیع و عریض سماعت گاہ..... کھیلوں کے میدان، کیفے ٹیریا، بک شاپ، یونیفارم شاپ اور بار برشاپ۔

انتظامی طور پر ادارہ ایک ہی سربراہ کی زیر نگرانی تھا۔ سربراہِ ادارہ انگلستان کی ایک معروف یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی نگرانی میں ادارہ تین مختلف سیکشنز میں کام کر رہا تھا۔ جونیئر ونگ جس کی منتظمہ ایک خاتون تھیں۔ اس سیکشن میں لڑکے اور لڑکیاں پانچویں جماعت تک اکٹھے تعلیم حاصل کرتے۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد لڑکیاں گرلز ونگ میں چلی جاتیں اور لڑکے بوائز ونگ میں۔ چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک طلباء اور طالبات کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارات تھیں۔ وقفہ تینوں ونگز کو مختلف اوقات میں دیا جاتا۔ وقفے کے دوران طلبہ میدان میں چلے جاتے جہاں ایک جانب کیفے ٹیریا اور کینٹین کے ساتھ یونیفارم اور بک شاپس تھیں اور بار برشاپ بھی۔ تمام دن اسکول پروکٹر، اسپورٹس ٹیچرز اور پی ٹی ماسٹر اپنی چھڑیوں اور گلے میں پٹے سے لٹکی سیٹیوں کے ساتھ مستعد پھرتے اور حسبِ ضرورت اپنی اپنی سیٹیاں بجاتے رہتے۔

شہر کے متمول گھرانے اس ادارے میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

سنی اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ہمراہ پاکستان آمد کے بعد تقریباً ایک سال کے وقفے سے اس ادارے میں پہلی جماعت میں داخل ہوا اور ساتویں جماعت تک وہاں پڑھتا رہا۔ طبعاً وہ کم گو، شرمیلا اور اپنی ہی دنیا میں گم رہنے والا بچہ تھا۔ وہ ذہین اور تیز دار تھا۔ اس کی دوستی جماعت کے چند ہی بچوں سے تھی اور وہ سب کے سب بھی ذہین اور پڑھاکو تھے۔ پانچویں جماعت تک لڑکیاں بھی سنی اور دیگر ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہیں۔ چھٹی جماعت میں بٹوارا ہو گیا۔ لڑکیاں گرلز ونگ میں چلی گئیں اور لڑکے بوائز ونگ میں آ گئے۔

ساتویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد سنی کو اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ انگلستان مراجعت کرنا پڑ گئی۔ اس کے والد نے پاکستان میں اپنا کاروبار جمانے کی پوری کوشش کی مگر اتنی مشکلات نے گھیرا ڈالا کہ بالآخر انہوں نے انگلستان واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں بھی محنت تو کرنا پڑتی تھی مگر یہاں کی طرح حالات دگرگوں نہ تھے۔

انگلستان واپسی کے بعد سنی کو نئے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ شروع شروع اسے اپنے پاکستانی ہم جماعت بہت یاد آئے لیکن آہستہ آہستہ وہ نئے دوستوں کا عادی ہو گیا۔ پاکستان کی طرح انگلستان میں بھی اس کی دوستی چند ہی ہم جماعتوں سے ہو سکی۔

انگلستان واپسی کے بعد اس کے باپ نے اپنا کاروبار شروع کیا اور مسلسل محنت اور دیانتداری سے اس کے کاروبار نے خوب فروغ پایا۔

☆☆☆

کئی سال بیت گئے۔

سنی کی بڑی بہن اور بھائی اپنی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد زندگی کے نئے راستوں، نئی منزلوں کے راہی ہو گئے۔ اس کی بڑی بہن نے ایک مصری نوجوان کو اپنا ہمسفر بنا لیا۔ بھائی جو رئیل اسٹیٹ بزنس میں تھا، ایک اسکاٹش دوشیزہ کے دامِ الفت کا اسیر ہو کر اس سے شادی رچا بیٹھا۔ باپ اس کے اس اقدام سے خوش نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی مسلمان لڑکی بہو بن کر اس کے گھر آئی ہوتی۔ اپنی اس خواہش میں وہ تنہا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی یہی چاہتی تھی۔ ان جیسے لاتعداد والدین تھے دیارِ غیر میں جن کے بیٹے اور بیٹیاں غیر مذہب یا لامذہب مرد و زن سے زندگی کا رشتہ جوڑے بیٹھے تھے۔ ترکِ وطن سے حاصل ہونے والے سود کو کچھ تو زیاں بھی جھکتا ہی تھا۔

سنی کی شادی کا مرحلہ آیا تو سنی نے والدین کے کہے بنا خود ہی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ پاکستان جا کر

www.urdayiqra.com

پاکستانی مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا۔ ماں اور باپ کی تو امیدوں کے کنول کھل اٹھے۔ ماں تو کب سے اپنے بہن بھائیوں میں سے کسی کی بیٹی کو بہو بنا کر لانے کی خواہش دل میں پال رہی تھی۔ سنی اگر اپنے ددھیال میں کسی لڑکی کا انتخاب کر لیتا تو ماں کو اس پر بھی چنداں اعتراض نہ تھا۔ اپنا اگر ننھیالی ہو تو کیا کہنا۔ ددھیالی بھی غیر سے بہتر اور غیر مذہب سے تو نا قابل شمار گنا اعلیٰ و برتر!

سنی کو اس کے ماں باپ شادی کے ارادے سے پاکستان لے آئے۔ خیال یہ تھا کہ سنی خاندان کی لڑکیوں کو خود دیکھے اور لڑکی کا انتخاب خود کرے۔ یہ تو طے تھا کہ ننھیال یا ددھیال میں سے وہ جس لڑکی کا انتخاب کرے گا، لڑکی والوں کی طرف سے اسے پذیرائی ملے گی۔ ننھیال اور ددھیال دونوں اطراف کے رشتے دار ان کی قدم بوسی کو فعال ہو گئے۔ والدین اور لڑکیاں سنی اور اس کے اماں ابا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگیں۔ والدین ایک دوسرے کو حریفانہ تیوروں سے دیکھتے۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے رشک و حسد میں مری جاتیں۔ ہر دل اس جستجو میں تھا کہ قرعۂ فال کس کے نام کھلتا ہے۔

سنی اور اس کے والدین کی روزانہ ہی کسی نہ کسی رشتے دار کے ہاں دعوت ہوتی اور ہر دعوت میں وہ اہتمام ہوتا جیسے سنی کی شادی کی بات چیت اسی گھرانے میں طے ہونے جا رہی تھی۔ سنی اور اس کے والدین ہی نہیں، اس کی بہنوں اور بھائی حتیٰ کہ مصری نژاد بہنوئی اور اسکاٹش بھابی کے لیے بھی تحائف دیے جاتے۔ امیدوار لڑکیاں خوب بن سنور کر سنی اور اس کے اماں ابا کے سامنے آتیں اور اپنی اداؤں سے سنی کو اور باتوں سے اس کے والدین کو لبھانے کی کوشش کرتیں۔

بھلا ہو سنی کا یا شاید بُرا کہ خاندان کے تمام گھرانوں کی دعوتیں اڑانے، تحائف سمیٹنے اور لڑکیاں دیکھنے کے بعد جب سنی سے اس کی پسند پوچھی گئی تو اس نے ایک ہوشربا انکشاف کیا اور وہ یہ کہ پاکستان تو وہ اپنے پرائمری اسکول کی ایک کلاس فیلو سے شادی کی خواہش دل میں لے کر آیا تھا۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے اپنے ایک کزن سے کیا جس سے اس کی خاصی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ اسی کزن کے توسط سے والدین کو فراہم کی جانے والی تفصیلات کے مطابق..... سنی کی مذکورہ ہم جماعت ان دنوں جب وہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ پاکستان میں قیام پذیر تھا، پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک اسکول کے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ مارچ 2020ء
کی جھلکیاں

بے اماں
اپنے وطن میں بھی اسے اماں نہ ملی، وہ آزاد بھی تھا اور اسیر بھی

خاف
درندہ صفت دہشت گردوں کے سامنے وہ سینہ سپر تھا

سرکشت ہیرو
مرد ہو کر بھی اس نے تین بچوں کو جنم دیا، انتہائی حیران کن واقعہ

فراری
وڈیروں کی جیل سے فرار ہونے والے جوڑے کی دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ
طویل سرگزشت "روسیاہ"، فلمی دنیا کی دلچسپ داستان "باپ بیٹا" ایک الگ انداز کا سفرنامہ "سفر پیلا پیلا"

اور بھی بہت سے سچے واقعات، دلچسپ سچ بیانیاں، سچے قصے، اہل ذوق کے لیے ہر تحریر قیمتی تحفہ ہے

جونیئر ونگ میں اس کے ساتھ پڑھتی رہی تھی اور سنی کو وہ دل ہی دل میں بہت اچھی لگتی تھی۔ سنی کو ان دنوں محبت کے معنی تو کیا شاید محبت کی ''ب'' پر تشدید کا علم بھی نہیں تھا مگر بہت سال بعد اس پر یہ کھلا تھا کہ وہ آفرین سے محبت کرتا تھا۔ آفرین اسی لڑکی کا نام تھا۔ باپ کے نام کی نسبت ساتھ لگ کر اس کا نام آفرین حیات بن جاتا تھا۔ حاضری لیتے ہوئے جب کلاس ٹیچر آفرین حیات کا نام پکارتی تو سنی کے کان کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

سنی نے اپنے بچپن کی اس محبت کا اپنے کزن پر انکشاف کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ بس دور دور سے اسے دیکھ کر شرمایا کرتا تھا۔ دونوں میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بھولے سے بھی نہیں مگر وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ اتنی اچھی کہ وہ پانچویں جماعت پاس کر کے اسکول کے جونیئر ونگ سے بوائز ونگ میں جانے کے بعد بھی اسے نہیں بھول پایا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ تقریباً دو سال بوائز ونگ میں گزارنے کے بعد اپنی فیملی کے ساتھ انگلستان واپس چلے جانے کے بعد بھی وہ اسے نہ بھلا سکا تھا اور اب جبکہ اس کے والدین اس کی شادی کا پروگرام بنا رہے تھے تو بھی اسے صرف آفرین ہی یاد تھی۔ وہ اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

سنی کے اس انکشاف نے خاندان میں اس سے شادی کے امیدواروں کی امیدوں پر گہری اوس ڈال دی۔ اس کے والدین کو اچنبھا ہوا کہ ان کا کم گو اور شرمیلا بیٹا اتنے برس اپنے بچپن کی محبت کو اس قدر رازداری سے دل میں چھپائے بیٹھا رہا تھا۔ ماں نے ہنس کر کہا۔ ''سنی! میرے بیٹے..... وہ لڑکی تو اب نہ جانے کہاں ہو گی۔ تم اپنے خاندان ہی میں اپنی پسند ہمیں بتاؤ تاکہ ہم بسم اللہ کریں۔ وقت کم ہے، گھر بھی واپس جانا ہے۔''

''میں اسے تلاش کر لوں گا مم۔'' سنی نے کہا۔

''کیسے؟''

''دنیا اتنی بڑی نہیں ہے مم۔'' سنی کا جواب گول مول تھا۔

''دنیا بڑی نہیں گول تو ہے۔'' ماں کا جواب سنی کے جواب سے بڑھ کر گول مول تھا۔

''کیا مطلب؟'' سنی چونکا۔

''کوئی کنارہ ہاتھ میں نہ ہو تو آدمی گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں سے چلا ہوتا ہے۔''

''وہیں پہنچنے کی تو کوشش میں یہاں آیا ہوں۔'' سنی نے کہا۔

ماں نے شانے اچکانے پر اکتفا کیا۔ وہ خاصی مایوس ہو رہی تھی۔ بڑا بیٹا اسکالش لڑکی کے چکر میں پھنس گیا تھا اور اب چھوٹا..... ایک ایسی لڑکی سے شادی کا متمنی ہو رہا تھا جس کا کچھ اتا پتا ہی نہ تھا۔

☆☆☆

اپنے بچپن کی محبت کی تلاش میں سنی اپنے ساتھ اسکول جا پہنچا۔ پرنسپل کی کرسی پر نیا چہرہ براجمان پایا۔ جونیئر ونگ کی نگراں بھی نئی تھیں۔ بہت سے پرانے اساتذہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ زیادہ تر نئے تھے۔ آفس سپرنٹنڈنٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ فوت ہو چکے تھے۔ کیشیئر بھی نیا تھا البتہ ایڈمن میں دو بابو ایسے تھے جنہیں سنی نے پہچان لیا۔ اللہ یار سولنگی اور عبدالرؤف۔ سنی نے ان سے اپنا تعارف سابق طالب علم کے طور پر کرایا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ سنی کے کزن نے انہیں اعتماد میں لے کر اپنی آمد کے مقصد سے رازدارانہ انداز میں آگاہ کیا۔ دونوں مسکرائے پھر ایک نے کہا۔ ''ہزاروں اسٹوڈنٹس آئے اور چلے گئے۔ اتنے لمبے عرصے بعد کسی کے بارے میں بتانا کہ وہ اب کہاں ہے، ممکن نہیں۔''

''مجھے یاد ہے ہماری کلاس انچارج حاضری رجسٹر میں ہر اسٹوڈنٹ کے گھر کا ایڈریس، والد کا آفس ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی نوٹ کیا کرتی تھیں تاکہ کسی ضرورت کے تحت والدین سے رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔ کیا پرانے رجسٹرز سے اس لڑکی کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر مل سکتا ہے؟''

''پرانے حاضری رجسٹر تو ایک مقررہ مدت بعد اسٹور میں جمع کرا دیے جاتے ہیں البتہ داخلہ رجسٹرز ہمارے دفتر ہی میں محفوظ رکھے جاتے ہیں اور ہر طالب علم کے وہ بنیادی کوائف جن کا آپ نے ذکر کیا، ہم داخلہ رجسٹر میں بھی درج رکھتے ہیں۔'' اللہ یار سولنگی نے کہا۔

''پلیز مدد کیجیے..... بہت مہربانی ہو گی۔'' سنی کے کزن نے کہا۔

''آپ کو اپنا داخلے کا سال یاد ہے؟'' عبدالرؤف نامی بابو نے سنی سے پوچھا۔

''جی بالکل یاد ہے..... غالباً.....'' سنی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے داخلے کا سن بتایا۔

بابو عبدالرؤف نے ایک پرانی الماری کھولی جس میں پرانے مجلد رجسٹرز عموداً ترتیب سے کھڑے تھے۔ رجسٹروں کو آگے پیچھے کر کے اس نے الماری سے دو رجسٹرز نکال کر اپنی میز پر رکھے اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ایک رجسٹر کھولا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

www.allpaksoft.com

"اپنا داخلہ نمبر تو آپ کو یاد نہیں ہوگا؟" بابو عبدالرؤف نے رجسٹر کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔"

خاصی دیر بابو رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے میں محو رہا، پھر اس نے رجسٹر بند کر کے ایک طرف سرکایا اور دوسرا رجسٹر کھول لیا۔ چند اوراق پلٹے پھر ایک صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے اس پر ایک مخصوص مقام پر انگلی رکھ کر بولا۔

"عدنان رحیم سن آف عبدالرحیم۔"

"جی..... جی۔" سنی جو بیم و رجا کی کیفیت میں تھا، پُرامیدی کے ساتھ سیدھا ہو بیٹھا۔

"وہ بھی اسی سال داخل ہوئی ہوگی۔" بابو کا لہجہ قیاس اور استفسار دونوں کیفیات سے عبارت تھا۔

"جی..... شاید۔" سنی بولا۔

بابو رجسٹر کی ورق گردانی میں مستغرق ہو گیا۔ سنی پھر بیم و رجا کی کیفیت سے دوچار دکھائی دینے لگا۔

"آفرین حیات قادر زیم ڈاکٹر حیات نصیر شاہ۔" بابو نے رجسٹر کے ایک صفحے پر اپنی دائیں انگشت شہادت کو افقاً حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"او گاڈ..... تھینک یو۔" سنی نے بے ساختہ کہا اور اپنے کزن کو دیکھا۔ سنی کا چہرہ یوں تمتما رہا تھا جیسے اسے دو جہان کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔

بابو نے قلم اٹھایا اور اپنی میز پر دھرا چٹکی میں دبا کاغذ کا دستہ اپنے سامنے رکھ کر گاہے گاہے رجسٹر میں دیکھ کر کچھ لکھنے لگا۔ چٹکی سے کاغذ کا دستہ نکال کر اس نے لکھا ہوا کاغذ دستے سے علیحدہ کیا اور سنی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے ایڈریس اب یہ نہ ہو، بہرحال ہمارے ریکارڈ میں یہی ہے۔"

"تھینک یو ویری مچ..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" سنی نے بابو سے کاغذ لے کر کہا۔

"چھوٹے بڑے سب کی دعا چاہیے۔" بابو نے کہا۔

"دعا کریں کہ لڑکی مل جائے..... آپ کو شادی میں ضرور بلائیں گے۔" سنی کے کزن نے بابو سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لگن سچی ہو تو اللہ ضرور ملاتا ہے۔" بابو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

سنی اور کزن ایک مرتبہ پھر نہایت گرمجوشی سے دونوں بابوؤں کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

دستیاب کوائف میں درج رہائشی پتے پر ڈاکٹر حیات نصیر شاہ کے بجائے کوئی اور شخص رہائش پذیر تھا اور اس کے بقول اس سے قبل وہاں ڈاکٹر حیات نصیر نہیں، بلکہ حقیقت احمد نامی کوئی شخص اپنی فیملی کے ساتھ مقیم رہا تھا۔ آس پاس آباد گھروں کے مکینوں سے البتہ یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حیات نصیر کو عرصہ ہوا اپنے اہل خانہ کے ساتھ اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک پڑوسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر حیات اسلام آباد کے ایک پوش سیکٹر میں کسی پرائیویٹ پریکٹس کر رہے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

سنی کے کزن نے اسلام آباد میں اپنے ذرائع سے ڈاکٹر حیات نصیر شاہ کا اتا پتا معلوم کرنے کے لیے اسلام آباد کے بیسیوں فون نمبر گھمائے تب کہیں جا کر یہ معلوم ہوا کہ اس نام سے ایک ڈاکٹر ایک پوش سیکٹر میں اپنا مطب تو کر رہے تھے۔ مطب کا فون نمبر بھی مل گیا۔ سنی کے کزن کی رائے تھی کہ فون کر کے ڈاکٹر حیات سے بات کی جائے مگر سنی کو فون کرنا مناسب نہ لگا۔ اسلام آباد جا کر بنفس نفیس بات کرنا زیادہ مناسب تھا۔

سنی اور کزن اسلام آباد پہنچے۔ ڈاکٹر حیات نصیر کا مطب تلاش کیا۔ مطب بند تھا۔ مطب کی داخلہ گاہ پر ایک نوٹس چسپاں تھا۔ "ڈاکٹر حیات نصیر شاہ دو ماہ کے لیے بیرونِ ملک گئے ہیں۔ اس دوران مطب بند رہے گا۔ مریضوں کو ہونے والی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔"

سنی اور کزن نے مطب کے آس پاس سے ڈاکٹر حیات کی رہائش گاہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا ڈاکٹر حیات اپنے سسر کی کوٹھی میں رہائش رکھتے تھے جو اس سیکٹر ہی میں واقع تھی۔

سنی خوش ہوا کہ کڑیوں سے کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔ منزلِ مراد نزدیک ہی نظر آتی تھی۔

سنی اور کزن ڈھونڈتے ڈھانڈتے ڈاکٹر حیات کے سسر کی کوٹھی تک بھی پہنچ گئے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے گھر کے اندر اطلاع پہنچائی اور صاحب خانہ کی اجازت پر انہیں گھر کے اندر آراستہ و پیراستہ بیٹھک میں لے جا بٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک خوش پوش بزرگ ان کے سامنے تھے۔

"ملک صفدر حسین۔" بڑے میاں نے اپنا تعارف کرایا۔

"سر! میں فراز علی اور یہ میرے کزن عدنان رحیم..... ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں۔" سنی کے کزن نے اپنا اور سنی کا تعارف کرایا۔

"جی فرمائیے..... لیکن اس سے پہلے یہ بتائیے کہ

www.urdayjeem.com

آپ لوگ چائے لینا پسند کریں گے یا کافی؟''
''تھینک یو سر..... کچھ نہیں۔''
''ایسا کیسے..... آپ لوگ مہمان ہیں..... اتنی دور سے آئے ہیں۔''
''سر! ابھی چائے پی کر ہی نکلے ہیں۔''
''شیور؟''
''یس..... تھینک یو۔''
''جی..... فرمایئے..... کیسے آنا ہوا؟'' بڑے میاں نے پوچھا۔
سنی نے کزن کو دیکھا۔
''اِن فیکٹ سر..... ہم لوگ ڈاکٹر حیات نصیر شاہ صاحب سے ملنے آئے تھے۔ ان کے کلینک گئے تو پتا چلا وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔'' کزن نے کہا۔
''جی ہاں..... پچھلے ہفتے ہی گئے ہیں..... اکتوبر میں واپسی ہے..... میرے لائق کوئی خدمت؟''
''شکریہ سر..... اصل میں میرے یہ کزن باہر ہوتے ہیں..... انگلینڈ میں۔'' کزن نے سنی کے بارے میں بتایا۔
''انہیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا تھا۔''
''آئی سی..... بیٹا! ملاقات ہے آپ کی ان سے؟''
بڑے میاں کا روئے سخن سنی کی جانب تھا۔
''نہیں سر۔'' سنی نے کہا اور مدد طلب نظروں سے کزن کو دیکھا۔
''سر! ملاقات تو نہیں لیکن ایک تعلق ضرور ہے۔''
''میں اس تعلق کی نوعیت پوچھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔'' بڑے میاں نہایت متانت سے مسکرائے۔
''لیکن میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں..... اِن فیکٹ میرے یہ کزن اور ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی آفرین حیات پرائمری اسکول میں کلاس فیلوز رہے ہیں۔''
''اوہ!'' بڑے میاں اب کھل کر مسکرائے۔
''آفرین میری اکلوتی نواسی ہے اور ڈاکٹر حیات اپنی اہلیہ کے ہمراہ اسی سے ملنے کے لیے انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے اس کی شادی کی ہے۔ اس کا ہسبینڈ بھی ڈاکٹر ہے۔''
سنی اور کزن نے ہڑبڑا کر ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے ان کے آس پاس کہیں ایٹمی دھماکا ہوا ہو۔
''آفرین سے میری بات ہوتی رہتی ہے..... بتاؤں گا اسے آپ کے بارے میں..... عدنان رحیم..... یہی نام ہے نا آپ کا؟''
''جی.....'' سنی نے پہلو بدلا۔
''آفرین کو آپ کے آنے کا پتا چلے گا تو وہ بہت خوش ہوگی۔ پرانے دوستوں سے مل کر وہ ہمیشہ خوش ہوتی ہے۔ کبھی ملیے اس سے..... آپ انگلینڈ میں کہاں ہوتے ہیں؟''
''کینٹ۔''
''کینٹ بہت خوب صورت ہے..... مجھے بہت پسند ہے..... آفرین سلاؤ میں رہتی ہے۔''
سنی نے چونک کر بڑے میاں کو دیکھا اور تنویمی سی کیفیت میں بڑبڑایا۔ ''سلاؤ.....''
''جی ہاں..... اس کا ہسبینڈ وہیں جاب کرتا ہے۔''
''سلاؤ میری جائے پیدائش ہے۔'' سنی کو اپنی آواز میلوں دور سے آتی محسوس ہوئی۔
''اچھا!'' بڑے میاں متانت سے مسکرائے پھر بولے۔ ''حسنِ اتفاق!''
سنی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کزن سے اٹھنے کو کہا۔
''اجازت دیجیے۔'' کزن نے آفرین کے نانا سے کہا۔
''اتنی دور سے آئے ہیں..... مہمان نوازی کا موقع دیجیے۔''
''بہت شکریہ۔'' کزن نے کہا۔
''آج شام ہماری واپسی ہے۔'' سنی کے لہجے میں ہارے ہوئے جواری کی سی دل شکستگی تھی۔
''آپ کے آنے سے مسرت ہوئی۔'' بڑے میاں نے سنی کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے مزید کہا۔ ''پھر کبھی اسلام آباد آنا ہو تو ضرور آیئے گا۔''
''جی..... ضرور!'' سنی نے فقط اتنا ہی کہا۔
سنی اور اس کے کزن کی اسلام آباد سے بے نیل و مرام واپسی پر سنی کی ماں نے ساری کتھا سننے کے بعد سنی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم سلاؤ میں پیدا ہوئے تھے اور وہ شادی ہو کر سلاؤ آ گئی..... کیسا عجیب اتفاق ہے۔''
''دنیا گول ہے بھئی۔'' سنی کے باپ نے کہا۔
سنی یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس کے باپ نے یہ بات مذاقاً کہی تھی یا معناً۔ بہرحال مذاقاً یا معناً اس بات سے تو سنی کیا کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا گول ہے۔
دنیا واقعی گول ہے اور گول گول گھومنے میں کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ کون کس کے پیچھے ہے اور کس کے آگے۔ بہرحال اب اسے ہر حال میں اپنا دائرہ مکمل کرنا تھا اور انہی میں سے کسی لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔

⌘⌘⌘

www.dilbayeem.com

دکھائی نہ دیا، میں نے سکون محسوس کیا اور آگے چل دیا۔ ابھی میں کچھ دور ہی گیا تھا کہ جونی بائک لے کر آ گیا۔

''آ جا۔'' اس نے بائک میرے پاس روکی۔ میں پیچھے بیٹھ گیا اور ہم اپنے آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں جونی نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس مشہور اداکارہ کے گیٹ پر سب کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے جیسا میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے راستے میں کہا۔

''جونی! لگتا ہے اس میڈم الینا کے لیے مجھے کسی پرائیویٹ جاسوس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''جاسوس سے کم تو تم بھی نہیں ہو لیکن اگر لازمی بندوبست کرنا ہے تو پھر میڈم کے سیکیورٹی گارڈ کے لیے کسی ہیوی ویٹ ریسلر کا انتظام کر۔'' میں اس کی بات سے متفق تھا۔ گارڈ پانچویں دفعہ مجھے ایسے ہی دھکا دے چکا تھا جیسے آج دیا تھا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی جو ابھی تک کسی چوٹ سے محفوظ تھا۔

''اب باس کو کیا منہ دکھائیں گے؟ آج پھر ناکامی ہوئی ہے۔''

''یہی منہ دکھا سکتے ہیں، چہرہ بدلنے کا آپشن فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے۔'' جونی نے سرد آہ بھر کر موسم کی ٹھنڈ میں اضافہ کیا۔ بائک آفس کے سامنے روک کر ہم اندر بڑھ گئے۔ باس حسبِ معمول لیپ ٹاپ سامنے رکھے خبریں دیکھ رہا تھا۔ ہمارے لٹکے ہوئے منہ دیکھ کر اس نے بغیر کوئی سوال کیے اپنی بات شروع کر دی۔

''سیاست کے حوالے سے کیٹگری میں آج میں نے تین خبریں لگا دی ہیں۔ کھیل کی خبریں بھی دلچسپ ہیں۔ اب رہ گیا شوبز تو اس حوالے سے ایک ہی اداکارہ ٹاپ پر ہے جس کی میں کوئی خبر نہیں لگانا چاہتا۔''

''کون؟'' ہم دونوں نے باس پیٹر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''ہے کوئی میڈم الینا۔''

''اس کی خبر کیوں نہیں لگائی؟''

''میرا خیال ہے وہ ہم جنس پرست ہے۔ اس لیے، مجھے ایسے لوگ پسند نہیں۔'' اس نے کندھے اچکا دیے۔ پیٹر پچاس سال کا تھا مگر ابھی تک خود کو جوان سمجھتا تھا۔ اس لیے اسے اکثر ایسی لڑکیوں سے چڑ رہتی تھی جو اس کے علاوہ کسی اور میں دلچسپی لیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر پیٹر کی طرف دیکھ کر جونی نے ہمارے خیالات کی ترجمانی کی۔

''ہم تو دو دن سے اس کے پیچھے تھے۔ چلو اچھا ہوا، کوئی خبر نہیں مل سکی اس کے حوالے سے..... نہ ہی وہ انٹرویو کے لیے راضی ہوئی ہے۔''

''تم دونوں ایسی ہی بیکار کوششوں کی وجہ سے نکمے کہلائے جاتے ہو۔'' پیٹر مسکرایا۔ ''اس نے آج تک کسی اخبار یا نیوز چینل کو انٹرویو نہیں دیا۔ ہماری اس نئی نویلی ویب سائٹ کو کیسے دے گی؟'' میں نے سر جھکا لیا۔ باس نے حقیقت بیان کی تھی۔ ''خیر، آج کے لیے میں نے کافی کام کر لیا ہے ادھر اُدھر سے تحقیق کر کے۔''

''چوری کر کے۔'' جونی کی بڑبڑاہٹ صرف مجھ تک پہنچی تھی اس لیے پیٹر کی گالیوں سے بچ گیا۔ ''اب تم دونوں سن لو، جونی! تم الینا کے علاوہ کسی بھی مشہور سیلیبریٹی کا انٹرویو لو گے، کسی بھی طرح۔ مارٹن! تم شوبز کے حوالے سے تمام خبریں دیکھو گے اس ہفتے کی۔'' میں نے سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی پیٹر سے اجازت لے کر ہم باہر آ گئے۔

☆☆☆

پیٹر، میں اور جونی دوست تھے۔ اس کے باوجود کہ ہماری عمر اور مالی حالات میں واضح فرق تھا۔ پیٹر کاروباری شخص کا بیٹا تھا جس کا باپ اس کے لیے کافی ساری دولت برباد کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ماضی سے میں اور جونی ناواقف تھے۔ اس نے بس اتنا بتایا تھا کہ محبت کی شادی میں ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنا شہر چھوڑ دیا تھا اور یہاں آ بسا تھا۔

جونی اور میں کلاس فیلو تھے۔ ہمارے حالات اور خاندانی بیک گراؤنڈ تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ میں نے لاوارث بچوں کو پالنے والے ایک ادارے میں آنکھ کھولی تھی، والدین کون تھے، اس بات سے میں ناواقف تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے چھوٹی موٹی نوکریاں کیں پھر پیٹر کے کہنے پر اس کی ویب سائٹ جوائن کر لی۔

جونی کو اس کی ماں نے پالا تھا اور جیسے ہی وہ اٹھارہ سال کا ہوا، اسے لات مار کے گھر سے نکال دیا۔ ''بیٹا! خود کما اور کھا۔'' جونی کو ماں کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رہے۔ اس لیے اس نے جتنی بھی نوکریاں کیں، کمایا اور کھایا۔ کبھی گھر بنانے یا مستقبل کے لیے نہ سوچا۔ ہم دونوں ایک ایسی عمارت کے فلیٹ میں رہتے تھے جس میں نوے فیصد غیر قانونی طور پر رہنے والے بستے تھے۔ اس لیے یہاں پولیس کی آمد ہوتی رہتی تھی۔ کچھ لوگ اسے پولیس کا سسرال بھی کہتے تھے جس سے میں اور جونی متفق تھے۔ یہاں صفائی اور نظم و ضبط جیسے الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے اور جونی کو

www.alibaytem.com

امید تھی کہ جلد پیٹر کی ویب سائٹ اتنے ممبر حاصل کرے گی کہ ہم ماہانہ اچھی آمدنی کے ساتھ اپنا طرز زندگی بدل سکیں گے۔ یہ امید ابھی تک تو پوری نہیں ہوئی تھی البتہ پیٹر کی وجہ سے ہمیں اچھا کھانا پینا اور پہننے کو اچھا لباس مل رہا تھا۔

پیٹر کا آئیڈیا منفرد تھا۔ اس کے خیال میں دنیا رفتہ رفتہ پرنٹ سے الیکٹرانک ہوتی جا رہی تھی اس لیے آن لائن نیوز کا کام جواب ذرا سست تھا، آنے والے دو سالوں تک عروج پر ہوتا۔ ویب سائٹ پر اشتہارات لگا کر وہ ان سے کمانا چاہتا تھا اور کامیاب ہوا بھی، ساتھ ہی اس نے ویب سائٹ پر باقاعدہ ممبرز بنانے شروع کر دیے جس سے آمدنی ہونے لگی تھی۔ وہ خود محنت کر رہا تھا اور پیسے بھی خرچ کر رہا تھا۔ اس لیے اس کے کامیاب ہونے کی ہمیں بہت امید تھی۔

''یار مارٹن! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' رات کو سونے کے لیے میں اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا جب جونی آدھمکا۔ اس کی عادت تھی، وہ دماغ میں آنے والے ہر آئیڈیا اور خیال کو مجھ تک پہنچا کر دم لیتا تھا۔

''بھونک۔'' میری بات کا بُرا مانے بغیر وہ شروع ہو گیا۔

''الینا کا انٹرویو ایک اور ذریعے سے کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس طریقے سے میں دو انٹرویو کر لوں گا۔''

''کیسے؟''

''دیکھ، اب تک الینا کا کسی اداکارہ یا اداکار کے ساتھ کوئی اسکینڈل سامنے آیا ہے نہ ہی کچھ اور..... ہاں مگر اس کی ایک دوست ضرور ہے جو اس کے ساتھ ہر وقت جڑی رہتی ہے۔''

''کون..... روز؟'' میں چونکا۔ اس کی بات مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔

''ہاں، وہی روز جو ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔''

''تو تم چاہتے ہو کہ روز کو پھنسا کر تم الینا تک پہنچ گے اور دونوں کا انٹرویو لو گے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پر بیٹا تم ایک بات بھول رہے ہو۔ الینا کے انٹرویو سے ہمیں باس نے منع کیا ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ارے چھوڑ باس کو۔ الینا کے انٹرویو کو دیکھ کر للچا جائے گا وہ۔ کوئی عام چیز تو ہے نہیں، اس کے بارے میں بس اتنا علم ہے لوگوں کو کہ وہ کسی دوسرے شہر سے آئی ہے اور ماں باپ ہیں نہیں اس کے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''چلو، کل روز سے ملنے کی کوشش کرو، اداکارہ تو وہ بھی ہے..... دیکھو ٹائم دیتی ہے یا نہیں؟''

''دے گی۔ میں تو یاد ہوں گا اسے۔'' روز کسی زمانے میں اس کی گرل فرینڈ رہ چکی تھی اس لیے اسے اعتماد تھا۔ اگلے دن اس نے مجھے کام پر بھیج دیا اور خود روز سے ملنے چلا گیا۔ میں شام کو واپس آیا تو وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اسے کال کی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا، مجھے پریشانی ہوئی۔ رات گئے تک جب اس کا نمبر آن نہ ہوا تو مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔

''سو رہا ہو گا اس اداکارہ کی بانہوں میں۔'' میں بڑبڑایا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ روز اور وہ پرانی یادیں تازہ کر رہے ہوں گے۔ اس معاملے میں روز کھلے دل کی مالک تھی۔ بارہ بجے کے قریب مجھے نیند آ گئی۔ میں سو کر اٹھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ جونی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے پولیس سے رابطہ کرنے کا سوچا۔ ابھی میں پولیس کا نمبر ملانے لگا تھا کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ یہ کسی فون بوتھ کا نمبر تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''میری بات دھیان سے سنو۔''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا باپ۔ کہا نا پہلے میری بات سنو۔'' وہ غرایا۔

''کرو بکواس۔'' مجھے لگا شاید کوئی رونگ کالرنگ کرنا چاہتا ہے۔

''روز سے ملنا ہے تو وہ الینا کے گھر کی پچھلی جانب موجود ہے اور جونی میرے پاس ہے، اسے واپس حاصل کرنے کے لیے تمہیں میرے چند کام کرنے پڑیں گے۔ موبائل پاس رکھنا، میں دوبارہ کال کروں گا۔ پولیس کو اطلاع دی تو جونی کی لاش ملے گی۔ وہ بھی ٹکڑوں میں۔'' میرے ماتھے پر پسینا چمکا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ مجھے ایک لمحہ بھی یہ سب مذاق نہیں لگا تھا۔ بولنے والے کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ میں نے باس کا نمبر ملایا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ خوش قسمتی سے جونی بائک نہیں لے گیا تھا۔ چابی میرے پاس تھی۔ کچھ دیر بعد بائک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

''جب میں نے تم دونوں کو منع کیا تھا کہ الینا کا انٹرویو نہیں لینا پھر یہ بے وقوفی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' باس غصے میں ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ میرا اس چہل قدمی سے سر چکرانے لگا۔

''آپ ایک منٹ رک کر میری بات تو سنیں۔'' میں جھنجلا گیا۔

www.aiffaiyjcom.com

''کیا سنوں تمہاری بات؟'' اس نے نظریں مجھ پر جمادیں۔ ''ایک وہ جونی جو اداکارہ کے چکر میں نہ جانے کس ڈان کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور دوسرے تم جو مجھے یہاں اپنی بات سنانا چاہتے ہو۔''

''باس! جونی روز سے ملنے گیا تھا اور اس کے ذریعے وہ الینا سے ملنا چاہتا تھا۔ اب وہ غائب ہوا ہے اور کال کرنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ روز، الینا کے گھر کی پچھلی جانب موجود ہے۔ تو ہمیں ابھی روز سے ملنا چاہیے تاکہ جونی کا سراغ معلوم ہو۔'' میں نے باس کو وہ سادہ بات سمجھانے کی کوشش کی جو وہ کافی دیر سے نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جو اس بار اسے میری بات سمجھ آئی۔

''چلو چلیں۔'' اس نے کار کی چابی اٹھائی اور پارکنگ کی طرف چل پڑا۔ باہر غضب کی سردی تھی۔ چند دن پہلے ہونے والی برف باری کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہوا تھا جس کے بعد اس موسم میں صرف دو قسم کے لوگ باہر نکلتے تھے۔ ایک کاروباری اور دوسرے ہم جیسے کوئی مجبور۔ باس نے کار موڑی اور الینا کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں چالیس منٹ لگے تھے۔ یہاں اتنی زیادہ رونق نہ تھی۔ پُرسکون علاقہ تھا بس ایک دو آدمی دکھائی دیے۔ الینا کے گھر کے پیچھے تو بس ایک پارک تھا جس کے گیٹ پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہم نے اردگرد دیکھا، روز کہیں نہ دکھائی دی۔ اچانک باس کی نظر پڑی۔

''وہ دیکھو۔'' پارک کے گیٹ پر کھڑی اکلوتی گاڑی کے پیچھے روز نام کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور بھاگتے ہوئے اس جانب بڑھے۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی تو دروازہ کھل گیا۔ گاڑی لاک نہیں تھی، نہ ہی اس میں کوئی تھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں۔'' میں نے باس کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے تو یہ کوئی مذاق لگ رہا ہے۔'' باس نے سوچتی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اچانک خیال آیا۔ گاڑی کی ڈکی ٹھیک سے بند نہیں تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں پھیل گئیں۔ روز کی لاش ڈکی میں موجود تھی۔ اس کے سر میں سوراخ ہو چکا تھا۔ اسے کہیں اور مار کر ڈکی میں پھینکا گیا تھا۔ باس کی حالت مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور واپس اپنی گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

''پولیس ہو یا کوئی اور..... تم نہ جونی کی گمشدگی کی بات کرو گے نہ ہی روز کی لاش کے بارے میں کسی کو کچھ بتاؤ گے۔'' باس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ گئے؟''

''پر باس..... وہ بلیک میلر؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس کو بھی دیکھ لیں گے، فی الحال تم یہاں سے فلیٹ پر جاؤ اور آرام سے رہو۔ اگر وہ کال پر کوئی بات کرے تو مجھے بتانا اور خبردار..... اگر میری لاعلمی میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' باس نے انگلی اٹھا کر مجھے وارننگ دی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور واپس فلیٹ پر لوٹ آیا۔ میرے دماغ میں کئی سوال گھوم رہے تھے جن کا جواب فی الحال میرے پاس نہ تھا۔ جونی کی گمشدگی کی پریشانی تھی۔ ہم کئی دنوں سے ساتھ تھے اور وہ میرے لیے سگے بھائیوں جیسا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے مشروب کا گلاس پیا جس کے بعد دماغ کچھ ٹھکانے آیا اور میری سوچوں کو ترتیب مل گئی۔ میں اب تک پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے لگا۔ جونی روز سے ملنے گیا تھا جس کے بعد روز کی لاش ملی تھی اور جونی غائب تھا۔ نامعلوم کالر کا یہ دعویٰ تھا کہ جونی اس کے پاس ہے۔

''نامعلوم کالر کون ہو سکتا ہے؟'' میں بڑبڑایا۔ میرے دماغ میں ایک ہی نام گونج رہا تھا..... ''الینا۔'' یہ قصہ اسی کے انٹرویو سے شروع ہوا تھا اور اب اسی کے گھر کے پچھلی طرف ایک کار میں لاش موجود تھی جس سے صرف دو لوگ واقف تھے۔ خدا معلوم کب پولیس والے اس گاڑی تک پہنچتے اور لاش دریافت ہوتی۔ میں کچن کی طرف بڑھ گیا اور اپنے لیے کافی کا کپ تیار کرنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت موبائل کی بیل بجی۔ میں نے دیکھا، یہ کسی فون بوتھ کا نمبر تھا۔

''ہیلو۔'' میری ہیلو کے جواب میں دوسری طرف وہی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مسٹر مارٹن! روز کی لاش تو تم نے دیکھ لی ہوگی۔ اس کار کے ڈیش بورڈ میں کار کی چابی موجود ہے۔ وہاں دوبارہ جاؤ، کار کی چابی لو اور لاش لے جا کر شہر کے جنوب میں بہنے والے دریا میں پھینک دو۔ گاڑی وہیں کھڑی کر دینا۔''

''مگر کیوں؟''

''تمہارے پاس سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''میں اگر تمہارا کہنا نہ مانوں تو؟''

''جونی کا بازو کل میں پارسل کر دوں گا..... گڈ

www.urdupoint.com

بائے۔'' وہ کال کاٹنے لگا تھا کہ میں چیخا۔

''نن نہیں..... بالکل نہیں۔ میں جاتا ہوں۔''

''شاباش، جلدی جاؤ اور ہاں کسی اور کو ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ورنہ...'' اس 'ورنہ' کے بعد کے الفاظ کا مجھے علم تھا۔ کال کٹتے ہی میں دوڑا اور بائک اسٹارٹ کی۔ مجھے باس کو اطلاع کرنے کا ہوش نہیں رہا تھا۔ شدید سردی میں بھی بائک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ گاڑی ابھی تک وہیں موجود تھی۔ میں نے ڈیش بورڈ سے اس کی چابی اٹھائی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کے ساتھ میں اسے موڑ کر سڑک پر لے آیا۔ شہر کے جنوب میں بہنے والا دریا بائیس تیئس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ بیس منٹ بعد میں وہاں موجود تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے روز کی لاش ڈکی سے نکالی اور اٹھا کر دریا میں پھینک دی۔ آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی وہیں چھوڑ دی۔ اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور واپس پیدل چل دیا۔ تقریباً آٹھ کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد مجھے لفٹ مل گئی جس سے شہر کی طرف سفر آسان ہو گیا۔

☆☆☆

''جب میں نے کہا تھا ہر بات کے بارے میں مجھے بتانا پھر کیوں نہیں بتایا تم نے بے وقوف؟'' پیٹر جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے چند مزید 'شاندار' الفاظ سے نواز کر دوبارہ کہا۔ ''کیا ضرورت تھی تمہیں اس اداکارہ کی لاش ٹھکانے لگانے کی؟ تم اس نامعلوم قاتل کی مدد کر رہے ہو۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''باس! اگر میں اس کی مدد نہ کرتا تو وہ جونی کو مار دے گا کیونکہ جونی اس کے پاس ہے۔''

''کیا ثبوت ہے کہ جونی اس کے پاس ہے؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''اس نے تمہاری بات کروائی جونی سے؟'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ باس کی دلیل مضبوط تھی۔ اب تک جتنی مرتبہ اس نامعلوم شخص سے کال پر بات ہوئی تھی، میری عقل جواب دے گئی تھی۔ میں نے اس سے کچھ پوچھا تھا، نہ ہی جونی سے بات کرنے کی ضد کی تھی۔

''اس نے اب تک جو کہا ہے سچ کہا ہے۔ جو روز کو مار کر اس کی لاش اسی کار میں رکھ سکتا ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں پولیس سے رابطہ کرنے لگا ہوں۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد پیٹر نے جواب دیا۔

''آپ ایسا نہیں کریں گے۔ اسے علم ہوا تو وہ جونی کو مار دے گا۔''

''مرنے دو جونی کو۔'' وہ چیخا۔ مجھے دکھ ہوا۔ جونی ہمارے لیے دوستوں سے بڑھ کر تھا۔

''آپ پولیس سے رابطہ نہیں کریں گے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں کروں گا۔'' باس کے لہجے میں بھی ضد تھی۔

''یہ میرا اور جونی کا معاملہ ہے آپ دور رہیں۔ میں خود سب کچھ سنبھال لوں گا۔'' میں واپس مڑا۔ ''اب ہمارے راستے الگ ہیں۔ جونی میرا بھائی ہے اور اسے میں خود بچا لوں گا چاہے اس کے لیے مجھے کسی کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ''اس معاملے کی جڑ الینا ہے۔ میں اس تک بھی پہنچ سکتا ہوں۔''

''مارٹن رکو۔'' اس نے پکارا مگر میں نہیں رکا۔ میرا فیصلہ جذباتی تھا۔ مجھے ایسے معاملات یا مجرمانہ کارروائیوں سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تجربہ باس کے پاس بھی نہیں تھا لیکن وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا اور یقیناً کوئی بہتر فیصلہ کر سکتا تھا مگر میرے لیے جونی کو بچانا ضروری تھا۔ میں پولیس سے رابطے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ واپس فلیٹ پر پہنچ کر میں نے پورے معاملے کو شروع سے ایک صفحے پر لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے جب کسی معاملے کی سمجھ نہیں آتی تھی تو میں اسی طرح لکھ کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے یہاں اپنی دو غلطیاں سمجھ آئی تھیں۔ ایک تو میں نفسیاتی طور پر بلیک میلر سے مرعوب تھا، دوسرا مجھے پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر چند فیصلے کیے، اپنی جمع پونجی اکٹھی کی اور نکل پڑا۔ مجھے جونی کو بچانا تھا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔

☆☆☆

''جونی تین دن بعد تمہارے پاس ہوگا۔ تم تب تک فلیٹ سے باہر نہیں جاؤ گے۔'' اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ میرا دماغ گھوم گیا۔

''میری جونی سے بات کرواؤ ورنہ میں تمہاری کسی بات پر عمل نہیں کروں گا۔'' میں نے جواب دیا..... میری آواز کانپ رہی تھی۔

''تم مجھے دھمکی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''تمہارے اور جونی کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم میرا کہنا مانو ورنہ جس نے روز کو مار دیا اس کے لیے مزید دو قتل کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔'' میرے پورے

www.dilpayjeem.com

جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' مجھے اپنی آواز میں بے بسی محسوس ہوئی تھی۔

''میری مرضی۔'' یہ کہہ کر اس نے کال منقطع کر دی۔ میں نے گہری سانس لی اور جیکٹ کی جیب میں موبائل ڈال کر دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلنا شروع کر دیا۔ حرارت کے احساس نے سردی کی شدت کچھ کم کی تو میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ میں اس وقت الینا کے گھر کے پاس تھا۔ میں گھوم کر پچھلی جانب آیا۔ یہ جدید ڈیزائن سے بنایا گیا گھر تھا جس کی طرز تعمیر میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا، پچھلی جانب سے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ مجھے علم تھا یہ میرا انتہائی قدم ہے جو ہو سکتا ہے مجھے پولیس اسٹیشن تک پہنچا دے مگر میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے راستہ مل گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو لاک پڑا تھا۔ میرے لیے لاک کھولنا مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ میں پوری تیاری سے آیا تھا۔ میں نے ماسٹر کی آزمائی اور لاک کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ کسی اسٹور روم کا تھا جس سے باہر نکلتے ہی مجھے آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟'' اپنی خوش قسمتی پر مجھے یقین ہو چلا تھا کیونکہ میرے سامنے الینا کھڑی تھی۔ وہی الینا جس سے ملنے کی ہر کوشش ناکام ٹھہری تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ اسکرین سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

''م..... میں۔'' اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ اٹھے اور میں لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا تو میں ایک صوفے پر موجود تھا۔ میں نے سر کو ٹٹولا، گومڑ سا بن گیا تھا مگر میں زخمی ہونے سے بچ گیا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نرم سی آواز نے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

''بیٹھے رہو۔'' الینا سامنے بیٹھی اپنے موبائل سے کھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی سیاہ فام ملازمہ میرے لیے کافی لے آئی۔ الینا کے ساتھ اس کا وہی سیکیورٹی گارڈ جو اکثر مجھے گیٹ سے بھگانے کا کام کرتا تھا، کھڑا تھا۔ اس نے اپنی مخصوص نظروں سے مجھے دیکھا۔ مجھے اپنے بے ہوش ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔

''تم چوری کرنے آئے تھے؟'' الینا نے پوچھا۔

''نہیں میم! یہ وہی پاگل ہے جو آپ کے انٹرویو کے لیے آتا رہتا ہے۔'' میرے بجائے سیکیورٹی گارڈ نے جواب دیا۔ الینا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا۔

''میں نے تم سے نہیں پوچھا جارڈن۔'' اس کی عزت افزائی پر مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ الینا نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ ''ہاں تو بتاؤ مسٹر نامعلوم۔ اس طرح گھر میں چوروں کی طرح گھس کر تم میرا انٹرویو لینا چاہتے تھے؟''

''نہیں میم! میں ایک انتہائی اہم سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم صاف الفاظ میں بتاؤ کیا چاہتے ہو ورنہ میں پولیس کو کال کرنے لگی ہوں۔'' اس نے موبائل پر نمبر ملایا۔

''میم پلیز! آپ کے بس چند منٹ لوں گا۔'' میں نے منت بھرے لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی میں نے جارڈن کو دیکھا۔ الینا میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے جارڈن کو اشارہ کیا۔

''تم باہر جاؤ اور دروازے پر کھڑے ہو جاؤ..... جیسے ہی میری آواز سنو تو فوراً اندر آ جانا۔''

''یہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے میم۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اس لمحے میرے دل میں اس کے لیے موجود نفرت ضرب ہو کر ڈبل ہو چکی تھی۔ میں نے دوبارہ الینا کی طرف دیکھا اور پہلے کی نسبت اعتماد سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں میم! میں بس بات کرنے آیا ہوں۔ آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔'' الینا نے کچھ دیر سوچا پھر جارڈن کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ مجھے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی الینا نے کہا۔

''ہاں بولو اب..... تمہارے پاس وقت کم ہے۔''

اس کی اجازت ملتے ہی میں نے بولنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے جولی کے روز سے ملنے کے لیے آنے سے لے کر، روز کی لاش دریا میں پھینکنے اور بلیک میلر کی آخری کال تک مکمل کہانی سنا دی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ شاید وہ خود روز کی کمی محسوس کر رہی تھی اور اس کا روز سے رابطہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

''میں نے اسے دو تین بار کال کی تھی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔''

''بس وہ خود بھی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی ہے اور میرے بھائیوں جیسے دوست کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔'' میں نے آہ بھری۔

''میرا خیال ہے تمہیں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔''

www.alfhayfem.com

''تم لے چکے ہو۔ اس نے تمہیں گھر سے باہر نہ نکلنے کا کہا تھا اور تم یہاں موجود ہو۔''

''میرا خیال ہے وہ جو کوئی بھی ہے، میرے فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہے اور آج میں چھپ کر نکلا ہوں۔'' میں نے فخر سے اسے بتایا۔ یہی وقت تھا جب میرے موبائل پر میسج آیا۔ میسج پڑھتے ہی میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ موبائل میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ الینا نے گھبرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''جونی کی لاش ملی ہے۔'' میری آواز کپکپا گئی۔ میں اپنی بات مکمل نہیں کر سکا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ الینا کی ملازمہ میرے لیے پانی لے آئی۔ کچھ سنبھلنے کے بعد میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے مجھے اب جانا چاہیے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

''ایک درخواست ہے۔'' الینا نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا؟''

''پولیس کے سامنے میرا نام مت لینا..... کسی بھی صورت۔'' میں نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

یہ بالکل سنسان علاقہ تھا۔ شہر سے باہر شاید ہی اس طرف کوئی آتا ہو۔ جونی کو مرے کم از کم اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ قاتل نے اس کی کھوپڑی میں کسی چیز سے کئی وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس کی لاش دیکھتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے کئی مناظر گھوم گئے۔ پیٹر میرے ساتھ تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ پولیس نے ہمارے بیان ریکارڈ کیے۔ میں نے انہیں بس یہی بتایا کہ جونی کسی کام سے دو تین دن کے لیے غائب ہو گیا تھا۔ پیٹر نے بھی بلیک میلنگ یا روز کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی گئی تو میں اور پیٹر اس کے گھر آ گئے۔ اس نے کافی کا کپ میرے سامنے رکھا۔ ہم کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ آخر اسے میری خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ اس نے افسردہ لہجے میں بات شروع کی۔

''مارٹن! بھولنے کی کوشش کرو سب۔''

''میں نہیں بھول سکتا باس۔ وہ میرا بھائی تھا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیا کر سکتے ہیں ہم؟ روز کی لاش کو تم نے ٹھکانے لگا دیا، اب اس کے پاس ثبوت بھی ہو گا کہ ہم جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ الینا سے مل نہیں سکتے جس کے ایک انٹرویو کی وجہ سے دو قتل ہو چکے، ایسے میں بے بس ہیں ہم۔''

''الینا کا انٹرویو یا اس کے گھر میں گھسنا اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ کوئی اس کے لیے دو لوگوں کو مار دے۔ آج نہیں تو کل روز کی گمشدگی کا معاملہ کھلے گا پھر بھی یہ سارا معاملہ سامنے تو آنا ہے۔ ایسے میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ مجھے پیٹر پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔ وہ بجائے جونی کے قاتل کا کھوج لگانے کے، الٹا مجھے مشورے دینے لگ گیا تھا۔

''تم جذباتی ہو رہے ہو، حقیقت پسند بن کر حالات کا جائزہ لو۔ پولیس ابھی تک اصل معاملے سے بے خبر ہے۔ ایسے میں اپنا بچاؤ کرو، کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال

استطاعت

جب سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو بہت سے پرندے اپنی چونچوں میں پانی لے کر آگ بجھانے آئے۔ ایک چیونٹی بھی اپنے منہ میں پانی بھر کر لے آئی تو پرندوں نے اس کا مذاق اڑایا کہ بی چیونٹی اتنے سے پانی سے بھلا کیا ہو گا تو چیونٹی نے جواب دیا کہ اس سے یہ ہو گا کہ روزِ قیامت میں اپنے پروردگار کی خدمت میں عرض کر سکوں گی کہ اے اللہ میں نے تو اپنی استطاعت کے مطابق تیرے خلیل کو آگ سے بچانے کی کوشش کی اور میرا رب کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ لہٰذا نیکی کے کام میں اپنی استطاعت کے مطابق کوشش ضرور کریں اور نتیجہ اللہ رب العزت پر چھوڑ دیں۔

حسن اخلاق

خالق کی خوشنودی اور مخلوق میں ہر دلعزیز ہونے کے لیے اچھا اخلاق سب سے بڑا، سب سے بہتر اور سب سے آسان ذریعہ ہے۔ انسان ہزار عالم و فاضل، عابد و زاہد ہو اگر وہ حسنِ خلق سے محروم ہے تو اس کا علم، عبادت و ریاضت سب ہیچ ہے۔ اعتقادی طور پر انسان خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن انسان میں حقیقی جوہر اعلیٰ اخلاق کا ہونا بہت ضروری ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدر آباد

www.alifbayeem.com

رہے ہو؟''

''میرا خیال ہے آپ کے یہ مشورے میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

''تم تب بھی میری بات نہیں مان رہے تھے اور دیکھ لو نتیجہ کیا نکلا۔'' اس کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ میں پیٹر سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی اور میری ذہنیت میں واضح فرق تھا۔ وہ مجھے سب بھولنے کا مشورہ دے کر چپ چاپ رہنے کا کہہ رہا تھا جبکہ میرے نزدیک یہ بزدلی تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں الینا تک پہنچ چکا تھا، اس بات سے ابھی تک وہ بے خبر تھا۔ میرا دماغ فی الحال اس کی کوئی بات سمجھنے سے انکاری تھا اس لیے میں دروازے کی طرف چل دیا۔

''سوری پیٹر! پر ابھی یہ مشوروں کا وقت نہیں ہے۔''

''تم بے وقوف ہو۔'' اسے غصہ آ گیا۔ وہ میرے پیچھے چلنے لگا۔ ''جونی بھی بے وقوف تھا نہ جانے کس کے ہاتھوں مارا گیا۔ تم نے بلیک میلر کی ہر بات مان لی تھی پھر آخری بھی مان لیتے۔ نہ جاتے گھر سے باہر تو وہ جونی کو نہ مارتا۔''

''جونی کو وہ پہلے ہی مار چکا تھا۔'' میں پھٹ پڑا۔ ''مجھ پر الزام مت لگاؤ۔ جونی کو مرے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔''

''تم اب کچھ نہیں کرو گے۔'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی گرفت سخت تھی۔

''مجھے الینا تک پہنچنا ہے۔ یہ سارا معاملہ اسی سے شروع ہوا تھا، اسی پر ختم ہو گا۔'' یہ کہہ کر میں واپس مڑا اور باہر چل دیا۔ پیٹر چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ میرا رخ خود بخود الینا کے گھر کی طرف ہو گیا۔ وہاں گیٹ پر حسب معمول جارڈن کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ میں مجھے طنز دکھائی دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔

''کدھر گھوم رہے ہو مسٹر مارٹن؟'' اس کی آواز سنائی دی۔

''مجھے میم سے ملنا ہے۔''

''بھول جاؤ، میڈم نے سختی سے منع کیا ہے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں جاؤں گا۔''

''دفع ہو جاؤ ورنہ۔''

''ورنہ کیا؟ قتل کر دو گے مجھے..... جیسے میرے دوست کو کیا تھا؟'' وہ چونکا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''بکواس بند کرو۔'' وہ غرایا۔

''میں سب جانتا ہوں جارڈن، تم نے ہی جونی کو مارا ہے اور بلیک میلر بن کر کال کرتے رہے ہو مجھے۔ آواز پہچان گیا ہوں میں تمہاری۔'' اب کی بار وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی مجھے کھوکھلی محسوس ہوئی۔

''جاؤ ثابت کرو، نکلو اب۔'' اس نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

''ثبوت مل جائیں گے جلد۔'' میں نے دھمکی دی اور باہر آ گیا۔ واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ کر میں نے تیزی سے کچھ چیزوں کا بندوبست کیا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اہم ہے اور یہ کیس حل ہونے والا ہے۔ رات تقریباً بارہ بجے میرے فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ میں نے جان بوجھ کر لاک نہیں لگایا تھا۔ جیسے ہی آنے والا اندر داخل ہوا، میرے ہاتھ میں موجود ہاکی اس کے سر پر پڑی۔ وہ نیچے گر گیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر صوفے پر ڈالا اور لائٹ جلا دی۔ اس کے سر سے خون نکل آیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے اور سر پر پٹی باندھ دی۔ اس کے منہ پر ٹیپ لگا کر میں باہر آ گیا۔ اب مجھے کم از کم دو دن گھر سے باہر رہنا تھا۔

☆☆☆

اس شہر میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں بس یہی سوچ کر آیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح کھوج لگا لوں گا۔ مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ پہلے دن کی شام ہی مجھے کھوج مل گیا تھا۔ دوسرے دن چند سو ڈالرز جو میں نے بُرے وقت کے لیے بچا رکھے تھے، وہ کام آ گئے اور ایک بڑھیا کی جیب بھرنے کے بعد مجھے اپنی مطلب کی تمام معلومات مل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے واپس اپنے شہر کا رخ کیا۔

اتوار کی شام تھی جب میں نے اپنے فلیٹ میں قدم رکھا۔ بیگ دور پھینک کر میں نے اپنے شکار کی طرف دیکھا۔ وہ نڈھال ضرور تھا مگر ابھی تک زندہ تھا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹائی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر اتنی طاقت اس کے پاس نہ تھی۔ میں نے برگر نکال کر اس کے منہ کے پاس کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ بے تابی سے کھانے لگا۔ بھوک مٹنے کے بعد اس نے پھر مجھے دیکھا۔ میں نے جیب سے برانڈی کی بوتل نکال کر اس کے منہ سے لگا دی جسے وہ ایک سانس میں چڑھا گیا۔ اب وہ ہانپ رہا تھا۔

''اب بتاؤ، کیوں مارا ان دونوں کو؟''

''تم اچھا نہیں کر رہے مارٹن، میں نے کسی کی جان نہیں لی۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا مگر مجھے یہ بتا دو آخر تم ان

www.albayan.com

دونوں کو میڈم الینا سے دور کیوں رکھنا چاہتے تھے؟''

''میں کیوں دور رکھوں گا کسی کو؟ وہ خود کسی سے نہیں ملتی۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

''تمہیں پتا ہے میں نے دونوں میں کیا معلومات اکٹھی کی ہیں؟''

''کیا؟'' وہ چونکا۔

''میں اس سیاہ فام ملازمہ میری تک پہنچ گیا ہوں اور اس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور میرے لہجے میں موجود سچائی کو محسوس کیا۔ وہ جنون میں آ گیا تھا۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولنے کی جنونی کوشش کی، وہ مجھ پر جھپٹنا چاہتا تھا۔

''تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔'' وہ چیخا۔ وہ مکمل بے بس ہو چکا تھا۔

''مجھے حقیقت بتا دو۔''

''وہ میری بیٹی ہے۔'' تھک کر اس نے ہار مان لی۔

''یہ میں جان چکا ہوں۔ وہ بیٹی نہیں ہے، نہ بیٹا ہے۔''

''ہاں ہاں، وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتی ہے۔'' وہ غصے میں چیخا۔ ''یہی بات چھپانا چاہتا تھا میں، اسی وجہ سے اس کی ماں چھوڑ گئی مجھے۔ وہ میری محبت تھی۔'' اس نے سر جھکا لیا۔ پیٹر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ ذہنی طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد وہ کچھ سنبھل گیا۔

''تم نے جونی اور روز کو کیوں مارا؟''

''روز اس کی سہیلی تھی۔ میں نے اتفاق سے جونی اور اس کو اکٹھا دیکھ لیا تھا۔ میرے دماغ میں یہ سوچ بیٹھ گئی کہ وہ دونوں اس کا راز فاش کر دیں گے۔ نام کی دوست تھی روز، حقیقت میں خود نا کام اداکارہ تھی اور اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ میرے، میری بیوی اور میری کے علاوہ اس کے راز سے روز واقف تھی۔ شک کی بنیاد پر میں نے دونوں کو اغوا کر لیا۔ روز کو مار کر وہیں پھینک دیا اور جونی کو ایک دن بعد مارا تھا جب اسے میری شناخت ہو گئی تھی۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''لاشوں کو تم خود ٹھکانے لگا سکتے تھے پھر مجھے کیوں بلیک میل کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی شک جو میرے دماغ میں بیٹھ گیا تھا۔ تم جونی کی گمشدگی کے بعد یقیناً اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے، اس لیے تمہیں خوفزدہ کرنے کے لیے میں نے یہ کھیل کھیلا۔''

''آج نہیں تو کل یہ راز کھل جاتا پھر الینا کی لیلڈ ہی ایسی ہے کہ یہاں کچھ راز نہیں رہتا پھر تم کیوں اتنے جنونی ہو گئے؟'' میں نے دکھ سے اسے دیکھا۔

''بس۔ اپنی زندگی میں اسے بدنام ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔'' اس نے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ سجائی۔ ''الینا ہماری پہلی اولاد تھی اور اس کا دکھ بہت بڑا تھا۔ دنیا جتنی مرضی ترقی کر لے ایسی جنس کو قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بیوی نے مجھے چھوڑ دیا تو الینا کو پالنا مشکل تھا اس لیے میں نے چپ چاپ اسے میری کو دیا اور خود شہر چھوڑ دیا۔ اس کی خبر لیتا رہا اور اس کا سارا خرچ اٹھایا۔ یہاں تک کہ وہ اداکاری سیکھ کر اس میدان میں آگے بڑھ گئی۔ اسے علم تھا کہ میں یہاں ہوں مگر کبھی نہ اس نے ملنے کی کوشش کی نہ میں نے۔ بس غیر ارادی طور پر میں اسے بچانا چاہتا تھا۔ شاید اولاد کی محبت تھی جو دوری کے باوجود شدت اختیار کر گئی اور آج میں ہار گیا۔'' اس کی آنکھوں میں دوبارہ نمی اتر آئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پولیس کے دو آفیسر اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول کر ہتھکڑی لگا دی۔ فلیٹ میں خاموشی چھا گئی تھی۔ میں نے چند لمحوں کی اس خاموشی کو توڑا۔

''تم نے بہت غلط کیا پیٹر۔''

''میں مجبور تھا۔ ایک سوال کا جواب دو۔''

''پوچھو۔''

''تمہیں مجھ پر شک کیسے ہوا؟''

''تمہاری پلاننگ اچھی تھی اور جذبات بُرے۔ جب آخری بار میں تم سے لڑ کر باہر جا رہا تھا تو تم نے مجھے کہا تھا کہ بلیک میلر نے مجھے فلیٹ سے باہر نہ نکلنے کا کہا تھا جس پر میں نے عمل نہیں کیا اور اس نے جونی کو مار دیا۔'' میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''میرے دوست یہ بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں تھی۔'' اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بہت معمولی غلطی تھی یہ۔''

''ہاں۔ بس یہیں سے مجھے شک ہوا تو تمہارے رویے کی سمجھ آ گئی۔ میں نے پھر جان بوجھ کر تمہارے سامنے الینا سے ملنے کا کہا اور وہاں گیا بھی اور اس کے بعد لوٹ آیا۔ تم مجھے بھی مارنے پر مجبور ہو گئے اور یہاں تک پہنچ گئے۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔'' میں نے کندھے اچکا دیے۔ پولیس اسے لے کر چلی گئی۔ فلیٹ میں خاموشی چھا گئی۔ اب اس خاموشی کو توڑنے والا کوئی نہیں تھا۔

⌘⌘⌘

www.dilkayeem.com

کربِ نارسائی

کاوش صدیقی

کم عمری کے خواب ہوں یا خواہش... ہمیشہ کے لیے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور وقفے وقفے سے اپنے ہونے کا احساس دلا کر دل میں ایک چبھن سی پیدا کرتے رہتے ہیں بالخصوص چاہت پانے کی تمنا میں خالی ہاتھ رہ جانے والے عموماً دل گرفتگی کے غم میں اپنے آس پاس بکھری محبتوں سے غافل رہتے ہیں۔ وہ بھی اسی غفلت میں اپنی شریکِ زندگی سے بے خبر بس ایک سائے کے مانند ساتھ نباہتا رہا تھا اور یہ بھول گیا کہ... محبت ہو یا نفرت ایک نہ ایک دن اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتی ہے لیکن اس کرب کا کون اور کیسے مداوا کرے جب احساس جاگ جانے پر انسان اپنے چاروں طرف محض تنہائی کا تماشا دیکھے اور کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا ہی نہ ہو۔

اپنا کا ساتھ ہی سے زندگی سے نکل جانے والی شریک زندگی کی دلفگار داستان

www.alifbayeen.com

جب مجھے پہلی بار محبت کا احساس ہوا تھا تو اس وقت میری عمر کا سولہواں سال چل رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بے چینی، کلبلاہٹ، الجھن اور کسی کو دیکھتے رہنے کو جی چاہنے کا مطلب محبت ہوتا ہے۔

وہ اچھے دن تھے جب محبت کا مطلب دیکھنا، تڑپنا اور بالآخر بچھڑ جانا ہوتا تھا۔ تب پہلی بار نذیر نے کہا۔ ''یار! تو بس اسی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا ہے، میری طرف بھی تو دیکھ ذرا.....'' وہ لڈو سجائے بیٹھا تھا۔

میں سامنے والی کھڑکی میں دھیان لگائے ہوئے تھا۔

''نہیں..... نہیں۔'' میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ ''میرا تو سارا دھیان ہی تیری طرف ہے۔ یہ لے تیری گوٹی پک گئی آیا میرا چھکا۔''

میں نے جلدی سے دونوں چھکے چھن چھن کی آواز سے بنائے۔

''تجھے تو یاد ہی نہیں کہ باری تیری نہیں میری ہے.....'' نذیر نے مجھے غور سے دیکھا۔

''ابے تو کیا ہوا..... تو چل لے.....'' میں نے نذیر کی طرف دیکھا اور چھکے والی ڈبیا اس کی طرف بڑھائی۔ تب ہی جیسے کسی لاسلکی تعلق سے بندھے میں نے گردن اٹھائی اور سامنے کھڑکی میں دیکھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میرا سارا دھیان لڈو سے پلٹ کر کھڑکی میں کھڑے نسوانی وجود کی طرف منتقل ہو گیا۔

''تو نہیں سدھرے گا.....'' نذیر نے مایوسی سے کہا اور لڈو کی ڈبیا رکھ دی۔

''اب کیا ہوا؟'' میں نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تیرا سر۔'' نذیر نے غصے سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا تو اب ہاتھوں سے نکل گیا۔'' اس کے انداز میں فکرمندی تھی۔

ہماری نگاہیں ملیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔

میں ایک گہری سانس لے کر افسردہ ہو گیا۔ میرا منہ لٹک گیا۔

''میں کیا کروں یار..... جی چاہتا ہے بس اسے دیکھتا رہوں۔ دیکھتا رہوں اور پھر اسے سوچتا رہوں۔ حالانکہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ابے تجھے محبت ہو گئی ہے۔'' نذیر نے میری حالت کا تجزیہ پیش کیا۔

''لے بھلا ایسے بھی کوئی محبت ہوتی ہے؟'' میں نے اس کے خیال کی نفی کی پھر مزید کہا۔

''نہ ہی ہم ملتے ہیں، نہ باتیں کرتے ہیں۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی پیر میں کانٹا چبھا ہوا ہے جو نکالنے پر بھی درد کرتا رہتا ہے۔ پھر چبھن سارے دل میں پھیل جاتی ہے۔'' نذیر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

میں نے تعجب سے نذیر کو دیکھا۔ وہ بہ مشکل تین چار سال مجھ سے بڑا ہو گا لیکن بعض باتوں میں اس کا تجزیہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ میں ایک گھریلو سا لڑکا تھا جس کو سوائے اسکول آنے جانے اور اپنے تمام تر وقت کا حساب کتاب اماں کو دینا ہوتا تھا۔ جبکہ نذیر کھلا ڈلا لڑکا تھا۔ جب اس کا جی چاہتا باہر نکل جاتا..... گھر آ جاتا۔ نذیر کا باپ کباڑیے کا کام کرتا تھا۔ نذیر کبھی اس کا ہاتھ بٹاتا اور کبھی گھر کی بیرونی بیٹھک میں بڑے سے تخت پر بیٹھا لڈو، تاش یا کیرم سجائے رکھتا۔ محلے کے لڑکے بالے سب اس کے دوست تھے۔

اس کی تمام سطح پر معلومات بے حد وسیع تھیں۔ کم از کم میرے نزدیک تو نذیر ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا تھا جس میں جہان بھر کی معلومات جمع تھیں۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تُو، تو ہاتھ سے گیا پیارے۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''اس میں تیرا قصور بھی نہیں ہے، وہ تو ہے ہی پٹاخہ۔''

نہ جانے کیوں مجھے برا لگا۔ ''یار! میں تو بس اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہی محبت ہے پیارے۔'' نذیر نے کہا۔ ''میرا یار اب مجنوں کلب میں داخل ہو گیا ہے۔''

''مجنوں کلب؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کونسی جگہ ہے؟''

''یہ دل والوں کا ٹھکانا ہے پیارے! جہاں لیلیٰ، مجنوں، شیریں فرہاد سارے عاشق جمع ہوتے ہیں۔''

''ہوں.....'' میں نے کندھے اچکائے۔

تاہم مجھے اپنے دل کی بے چینی کا مسلسل سبب معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے کھڑکی والی سے پیار ہو گیا تھا۔ اس سے جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں تھا اور جنہیں ابھی محلے میں آئے ہوئے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

رات کو اچانک آنکھ کھل جانا، پھر سوچ کے سفر کا

www.aldayeem.com

کھڑکی میں سجے چہرے تک رک جانا، بڑی عجیب سی بات تھی۔ پہلے میں گھوڑے بیچ کے بے خبر سوتا تھا۔ بقول اماں کے اس کو تو صور اسرافیل ہی جگائے گا مگر اب ہلکی سی آہٹ پر آنکھ کا کھل جانا..... کیا ہو گیا تھا مجھے؟

پھر مجھے یاد آتا کہ میرے مرض کی تو تشخیص ہو چکی ہے۔ نذیر نے نہایت وثوق سے میری بیماری کا نام پیار بتایا تھا۔

باہر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔

کمرے کی کھڑکی بند تھی، بیرونی کمرے میں اماں سوتی تھیں اور ان کے ساتھ میرے دو چھوٹے بہن بھائی۔ ہم اور بھائی پچھلے کمرے میں سوتے تھے۔ بقول اماں کے جب اولاد جوان ہونے لگے تو پہرا سخت کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ جوانی دیوانی کوئی بھی گل کھلا دیتی ہے اور پھر بندہ ہی نہیں پورا گھر ہی سیاپے میں پڑ جاتا ہے۔

مگر میری تو ابھی جوانی بھی نہیں آئی تھی اور مسیں بھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں اور میں پیار کے سیاپے میں پڑ گیا تھا اور اماں کی ساری احتیاطیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔

اماں بڑے بھائی کی طرف سے چوکنا تھیں۔ وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل، خوش بدن اور ہسوڑ تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ ایسے لڑکے پر لڑکیاں تو لڑکیاں جنیاں بھی عاشق ہو جاتی ہیں مگر میں جو دبو سا، ڈرپوک سا تھا..... گل کھلا بیٹھا تھا۔ اپنے من میں اور بقول مجھ سے چھوٹی بہن۔ ''اماں دیکھنا یہ بڑا میسنا ہے۔ گل یہی کھلائے گا۔''

مگر اماں اسے گھورتیں اور سخت لہجے میں تنبیہ کرتی تھیں۔ ''خبردار جو فضول بکواس کی تو نے۔ میرا بیٹا تو بڑا معصوم سا ہے۔ اس کو تو کتاب کاپیوں کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ یہی خاندان کا نام روشن کرے گا۔''

ہمارا خاندان خاصا کھاتا پیتا تھا۔ دو مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ ابا کا سبزی منڈی میں آڑھت کا کاروبار تھا۔ وہ رات ڈھائی تین بجے جاتے تھے اور صبح نو بجے تک ایک میلے سے تھیلے کو لٹکائے چلے آتے جس میں بہت سارے نوٹ بھرے ہوتے۔

اماں ہمیشہ ان کی اس حرکت پر نالاں رہتی تھیں۔ ''دیکھو بھلا..... اس طرح روپیا لے کر آتے ہو، کسی نے چھین لیا تو پھر کیا کرو گے؟''

ابا جواب دیتے۔ ''نیک بخت! لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ روپے بڑے محفوظ طریقے سے رکھتے ہیں۔ میں تو اس میلے سے تھیلے کو سائیکل کے اسٹینڈ پر سبزیوں کے ساتھ باندھ لاتا ہوں۔ کسی کو کیا پتا آلو پیاز کا یہ تھیلا ہزاروں کا ہے۔'' ابا خوش دلی سے قہقہہ لگاتے اور تھیلا اماں کو پکڑا دیتے۔ ابا کو اماں سے بہت پیار تھا۔

بقول ابا۔ ''تم سے شادی کے بعد ہی میری قسمت بدل گئی ورنہ میں تو آلو پیاز کا تھیلا لگائے گلی گلی پھرتا تھا اور پھر اسی دھندے میں تم مل گئیں۔''

اماں فخریہ مسکراتیں۔ ''اب یہ تو تمہاری قسمت تھی کہ ہم سے شادی ہو گئی۔ ورنہ ہمارے ابا نے بشیر کریانہ مرچنٹ کے حمید اللہ سے شادی کا ارادہ کیا ہوا تھا مگر قسمت تو تم سے جڑی تھی۔''

ابا ہنستے۔ اماں کا قہقہہ گھر میں گونجتا۔

مجھے بہت اچھا لگتا اور میں سوچتا ابا اماں کی محبت کی یہ کہانی کیا میری زندگی کی کہانی بن سکے گی؟ کیا مجھے بھی کوئی ایسی لڑکی رستے میں آتے جاتے ملے گی جس سے آنکھیں چار ہوں گی اور میں بھی ابا کی طرح قسمت والا ہو جاؤں گا۔

ابا، اماں کی محبت کی یہ کہانی ہم سب بہن بھائیوں کو ازبر تھی کیونکہ یہ تقریباً ہر روز دہرائی جاتی۔

ہم بھی صبح کے شو میں ہنستے اور خوش ہوتے۔ مجھے یہ منظر سب سے زیادہ دیکھنے کو اس لیے ملتا تھا کہ میں صبح کے بجائے دوپہر کے اسکول میں جاتا تھا۔ میرے دوپہر میں اسکول جانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے صبح اٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ لاکھ پٹنے گالیاں کھانے اور بالٹی بھر پانی پھینکنے کے باوجود اماں نے تھک ہار کے مجھے دوپہر کے اسکول میں داخل کرا دیا کہ چل نیند کے مارے اب تو جاہل نہ رہ جانا۔

ابا خوش مزاج تھے۔ گھر کا ماحول خوش گوار تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارے گھر میں غربت نہیں تھی ورنہ میرے دوست سلیم کے گھر روزانہ چخ چخ ہوا کرتی تھی اور اس کی بنیادی وجہ سلیم کے ابا کی کم تنخواہ اور سات بچے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہ جملہ عام نہیں ہوا تھا۔ ''جب کھلا نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو۔''

بلکہ بچوں کی پیدائش کو نعمتِ خداوندی گردانا جاتا تھا جس کی بنیادی وجوہات میں تفریح کے محدود ذرائع اور غربت تھی۔ لے دے کے جو تفریح کا واحد ذریعہ بچتا تھا، اس میں پھر یہی ہوتا تھا۔ ''بہت سے بچے۔ بہت سی غربت۔''

ہمیں یہ ساری رنگ کنٹری براہ راست سننے کا مسلسل موقع حاصل تھا۔ اس کی وجہ سلیم کے گھر کا ہمارے گھر سے

www.aldayeem.com

متصل ہوتا تھا۔

اکثر جب کافی لڑائی جھگڑا ہو چکتا تو اماں صحن کی دیوار کے ساتھ لگی سیڑھی پر چڑھ کر سلیم کی اماں کو آواز دیتی تھیں۔

''ارے بشیرن! کہاں ہو؟''

''ارے، میں کہاں جاؤں گی..... یہیں مر رہی ہوں۔'' بشیرن اندرونی کمرے سے لپک کر آتے ہوئے کہتی۔

''یہ لو سبزی بنا لو۔ آج بینگن بہت اچھے ہیں۔ نئی فصل کے ہیں اور ہاں..... اس کے ساتھ دھنیا، مرچیں اور ٹماٹر بھی ہیں۔ ذرا سا چٹ پٹا بنانا اور دیکھو، مجھے بھی دینا۔ ویسے تو تم بھرتا اچھا بناتی ہو۔''

اماں ہنس کر کہتیں' ان کے انداز میں کسی احسان کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔

''شکریہ باجی!'' بشیرن خالہ بڑی ممنونیت سے کہتیں اور سبزی تھام کے اپنے اسٹول سے اتر جاتی تھیں۔

ان دنوں ہر بڑی خاتون چاچی یا خالہ ہوتی تھی اور ہر مرد کے لیے عورت بہن کے لقب سے سرفراز ہوتی تھی اور پھر کبھی کبھی بڑے ہو کر یہی غیر بہن بچوں کی اماں بھی بن جاتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میرج بیورو نہیں تھے مگر رشتوں کا کال نہیں تھا اور عموماً لڑکے لڑکیوں کی شادی اپنے وقت پر ہو جاتی تھی۔

''کیا بات ہے، کیا سوچ رہے ہو؟'' اماں نے مجھے گم صم بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ وہ سبزی کاٹ رہی تھیں۔

''کچھ نہیں، بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو چپ کیوں بیٹھا ہے، مجھے بول دیتا۔ دو منٹ میں ناشتا بنا دیتی ہوں۔ رات کی سبزی سے روٹی کھاؤ گے یا پراٹھا؟ آلو کے بھرتے سے مزے کا لگے گا۔'' اماں نے فوراً ہی سبزی کے برتن اور چھری علیحدہ رکھ دیے۔

''پراٹھا بنا دیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''جاؤ ہاتھ منہ دھو لو۔''

اماں کا موڈ اچھا تھا یا میرا موڈ اچھا تھا..... پتا نہیں۔ کوئی بات ضرور تھی۔

میں ہاتھ منہ دھو کے آیا تو گرم پراٹھے کی خوشبو..... آ رہی تھی۔

''بس ایک پراٹھا۔'' میں نے اماں کو مزید پیڑے بناتے دیکھ کر کہا۔

''تمہارے ابا بھی آتے ہوں گے، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی ساتھ ہی بنا دیتی ہوں۔ انہیں آلو کا بھرتا بہت پسند ہے۔'' اماں نے جواب دیا اور پراٹھا توے سے اتار کے مجھے دے دیا۔

میں بسم اللہ پڑھ کر کھانے لگا اور پھر سوچنے لگا پھر میں نے دیکھا کہ اماں کی جگہ کھڑکی والی پراٹھے بنا رہی ہے اور ابا کی جگہ سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے میں اندر داخل ہو رہا ہوں۔

''بھئی تمہارے پراٹھوں نے تو گلی تک مہکائی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لو، اب گھر میں گھستے ہی باتیں بنانے لگے۔ چلو جلدی سے آ جاؤ۔'' کھڑکی والی نے مجھے دیکھا۔ اس کے بالوں کی لٹ اس کے رخسار پر ناچ رہی تھی۔ میں اسے محویت سے دیکھنے لگا۔

''ارے کیا ہوا..... کیوں لقمے کو گھورے جا رہا ہے بیٹا؟'' کسی نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ میں چونک گیا۔

سارا منظر تحلیل ہو گیا۔ ابا میرے پاس کھڑے تھے۔

میں پراٹھے کا لقمہ ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور اماں مجھے گھور رہی تھیں۔

''ارے کیا باؤلا ہو گیا ہے؟ کیا سوچے جا رہا ہے؟ کیا پراٹھا اچھا نہیں لگ رہا؟'' اماں نے پوچھا۔

ابا ہنسنے لگے۔

اماں نے پیار سے کہا۔ ''تو پگلا گیا ہے۔ کھانے پر دھیان دیا کر۔ کیسا سوکھا ہوا جا رہا ہے؟'' اماں کے لہجے میں بڑی ممتا تھی۔ اتنی دیر میں ابا بھی ہاتھ منہ دھو کے وہیں پیڑھی پر آ بیٹھے۔

''ہاں تو کیا چل رہا ہے۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

''جج..... جی کچھ نہیں۔'' میں نے گھبرا کے کہا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔

ابا پھر ہنسنے لگے۔ ''تو گھبرا کیوں رہا ہے۔ ناشتا کر۔''

''میرا یہ بچہ بہت سیدھا، بہت معصوم سا ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں کہ اس کو اپنے ساتھ لگا لو۔ ابھی سے کاروبار سیکھ لے گا تو کل کو تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے کھڑا ہو گا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ابا نے کہا۔

''اپنی اولاد تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ دوسرے کو جتنا بھی سکھاؤ، چند ہی مہینوں میں اپنی آڑھت لے کر کھڑا ہو جاتا ہے..... مگر پہلے یہ میٹرک تو کر لے۔''

میں نے فوراً موقع غنیمت جانا۔ ''ابا! ابھی تو میں آٹھویں کا امتحان دینے والا ہوں پھر اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوں گی تو میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ابا نے کہا۔

میں خوش ہو گیا۔ مجھے تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور ویسے بھی میں سوچتا تھا کہ پڑھ لکھ کے بھی تو کام ہی

www.allbayiean.com

کرنا ہے تو پہلے سے کیوں نہیں۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا ہوا۔ شاید دل کو دل سے راہ ہوتی ہے یا وہ جیسے کہتے ہیں کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں اسکول سے گھر آیا تو اماں سے ایک عورت باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دونوں کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

میں اندر داخل ہوا اور حسب معمول سلام کیا۔ تب اس عورت اور اس لڑکی دونوں نے بیک وقت مڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹک کے رہ گیا۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ وہ کھڑکی والی تھی۔

چھریرے بدن کی۔ لمبی گردن اور لمبی چوٹی والی۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری آنکھوں میں حیرت اور پہچان لیے جانے کی مسرت تھی۔

ہم دونوں کے درمیان نگاہوں کا برقی سرکٹ مکمل ہو گیا تھا۔ ایک انہونی شناخت کا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔

وہ عورت اب اماں سے باتیں کر رہی تھی۔ میں ابھی تک وہیں اور ویسے ہی کھڑا تھا اور وہ ابھی تک رخ موڑے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

اماں نے مجھے دیکھا اور بولیں۔ ''وہاں کیوں کھڑے ہو۔ ذرا باجی حمیرا کے گھر یہ سامان پہنچا دو۔''

''جی، اچھا.....'' میں نے کہا۔

وہ عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ طویل قامت دبلی پتلی تیکھے نین نقوش والی عورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لڑکی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے رہنے دو باجی۔ میں اٹھا لوں گی۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کوئی بات نہیں، گھر دور ہی کتنا ہے۔ یہ پہنچا دے گا۔'' اماں نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں کتابیں ایک طرف رکھ کر آگے بڑھا اور سامان سے بھری ٹوکری اٹھا لی جس میں اماں نے بہت ساری سبزیاں بھر دی تھیں۔ وہ اماں کو خدا حافظ کہہ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیں۔

وہ لڑکی میرے نزدیک سے گزری تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا قد اپنی ماں کی طرح لمبا ہے اور مجھ سے بھی چند انچ نکلا ہوا تھا۔

مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔ اب بھلا مرد عورت سے قد میں چھوٹا ہو تو جوڑ کیا اچھا لگے گا۔ مجھے آپ ہی اپنے خیال پر شرمندگی کے باوجود ہنسی آ گئی۔ میری ہنسی کی آواز پر اس لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔

میں ان کے پیچھے پیچھے ٹوکری اٹھائے چلنے لگا۔ جب میں نذیر کی بیٹھک کے سامنے سے گزرا تو نذیر اپنی بیٹھک کے دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر اس کی آنکھیں اتنی پھیل گئیں کہ جیسے ابھی حلقوں سے گوٹیوں کی طرح اچھل کر باہر آ جائیں گی۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا تو ایک فاتحانہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر تھی۔

اسی وقت اس کی ماں بڑبڑائی۔ ''اے منحوس یہاں کھڑا ہے۔ جب بھی کھڑکی کھولو، یہ منہ اٹھائے اوپر ہی دیکھتا رہتا ہے۔ دیدے پھاڑے منحوس اندھا نہ ہو جائے۔''

مارے گھبراہٹ کے میری مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ کیا اس کی اماں نے مجھے بھی بیٹھک میں دیکھا ہے؟ میں ہڑبڑا گیا۔

ماں کی بڑبڑاہٹ سن کر لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں فہمائش تھی۔

''اگر تمہیں بھی میری اماں نے اس منحوس کے ساتھ دیکھ لیا تو.....؟''

اتنی دیر میں ان کا گھر آ گیا۔ وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گئیں۔

''یہاں رکھ دو بیٹا۔'' اس عورت نے کہا۔

''جی.....'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔

''بیٹھو، شربت پی کے جانا۔'' اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔

ہم دونوں کھڑے رہ گئے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہمت کر کے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے عین اسی وقت پوچھا۔

نہ جانے کیا ہوا کہ ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ دبی دبی ہنسی تھی۔

''میرا نام زبیدہ ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''میرا نام ماجد ہے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

اس کی ماں اندر سے ایک گلاس میں سرخ رنگ کا شربت لے آئی۔ خوشبو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ روح افزا تھا۔

میں نے کہا۔ ''رہنے دیتیں خالہ..... کونسا میں اتنی دور سے آیا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''گرمی ہے پی لو۔''

پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئیں۔ ''ذرا یہ سبزی اٹھا

www.dilkay.com

کے باورچی خانے میں رکھ دو۔"

زبیدہ نے جھک کے سبزی کی ٹوکری اٹھائی اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ میرے ہونٹ گلاس کے کناروں پر تھے اور آنکھیں زبیدہ کے تعاقب میں۔

واپسی پر میں جیسے ہی نذیر کی بیٹھک کے پاس سے گزرا، اس کی آواز آئی۔ "اوئے اندر آجا۔"

میں نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں غڑاپ سے بیٹھک میں گھس گیا۔

"ابے کمال کر دیا تو نے..... کیسے ہوا یہ؟" نذیر کے انداز میں زبردست جوش تھا۔

"بس کر لیا۔" میں نے بے وجہ ہی فاتحانہ انداز میں سینہ پھلایا۔

"واقعی تُو تو میسنا ہے یار۔" نذیر نے مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"کیسے ہوا یہ سب کچھ..... کیا نام ہے اس کا؟ کون ہیں یہ لوگ؟ کہاں سے آئے ہیں؟" نذیر نے کئی سوالات پے در پے داغ دیے۔

"ابھی کچھ پتا نہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ کہہ رہا ہے؟" نذیر نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اتنی ساری سبزیاں تم نے بغیر کسی جان پہچان کے پہنچا دیں؟"

"وہ تو اماں نے کہا تھا..... سچی۔" میں نے فوراً ہی کہا۔

"چل کچھ نہیں تو نام تو تو نے پوچھا ہی ہوگا؟" نذیر نے بدستور تفتیش جاری رکھی۔

"نام تو..... اس..... کا..... زبیدہ..... ہے۔" میں نے رک رک کے کہا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے نذیر کا اس طرح اس کے متعلق اتنا زیادہ پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ شاید یہ بھی محبت کا کوئی چلن ہوتا ہو کہ جو آپ کو اچھا لگے، کوئی دوسرا اس کو سراہے تو برا لگتا ہے۔

نذیر نے مجھے چپ..... دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے، بڑا چپ چپ ہے۔ کوئی بات ہے کیا؟"

"نہیں....." میں نے جلدی سے کہا۔ "اماں نے کہا تھا کہ جلدی آنا، دال منگوانی ہے۔"

نہ جانے کیوں میں نے جھوٹ بول دیا۔

"اچھا جا۔ آئندہ جو بھی کچھ ہو بتاتے رہنا۔" نذیر نے کہا۔

پتا نہیں کیوں، میں نے بیٹھک کے دروازے سے نکلنے سے پہلے باہر کا جائزہ لیا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں جھپاک سے دو قدم بڑھا کے گلی کے بیچ میں آ گیا جیسے میں نذیر کی بیٹھک میں گیا ہی نہیں تھا۔

"منحوس نذیرا..... دیدے پھاڑ نذیرا۔"

میں نے سوچا اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔

☆☆☆

پھر ان ہی دنوں میرے آٹھویں کے امتحانات شروع ہو گئے۔ اماں کی سخت وارننگ تھی کہ خبردار جو اب فیل ہوا۔ چھوٹے بہن بھائی تیرے ساتھ کے ہو گئے ہیں مگر تجھے ذرا بھی شرم نہیں۔ اس لیے مجھے ہر حالت میں آٹھویں پاس کرنا تھی اور ویسے بھی اگر میرے فیل ہونے کی اطلاع زبیدہ اور اس کی ماں کو ملتی تو کتنا برا ہوتا۔

ان دنوں مائیں اپنے بچوں کے نتیجے بتانے سے پہلے جانتی تھیں کیونکہ سرکاری اسکول میں محلے کے سارے ہی بچے جاتے تھے اور کلاس میں ملنے والی تمام سزاؤں کی کارروائی روزانہ براڈ کاسٹ ہوتی تھی۔

اس دوران میں صرف دو مرتبہ سبزی دینے ان کے گھر گیا تھا اور دونوں ہی مرتبہ زبیدہ کے بجائے اس کی ماں نے سبزی وصول کی تھی اور بنا شربت پلائے دروازے سے ہی رخصت کر دیا تھا۔

حالانکہ ہم لوگ محلے میں کسی کو سبزی نہیں بیچتے تھے۔ آڑھت میں جو سبزی آتی تھی، وہ ابا لے آتے تھے اور اتنی ہوتی تھی کہ اماں محلے کے اکثر گھروں میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔ بقول اماں کے تقسیم کر کے کھانے سے رزق میں برکت ہوتی ہے اور یہ بات..... سچ تھی اماں کی۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے آٹھویں کے امتحان ختم ہوئے اور میری جان چھوٹی۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب مجھے نہیں پڑھنا۔ اس لیے امتحان کے چند دنوں بعد ہی میں نے ابا سے کہا۔

"ابا! میں بھی کل سے آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"ارے چھوڑو..... کہاں رات تین بجے خوار ہوتا پھرے گا۔" ان کے انداز میں بڑی محبت تھی۔

"تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "آپ بھی تو جاتے ہیں۔"

"میں....." ابا نے ہنس کر کہا۔ "مجھے تو لے جاتے ہیں۔"

"کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ذمے داریوں، ضرورتوں کے بھوت۔ خوشحالی کی طلب کے بھوت۔" وہ ہنسنے لگے۔

اماں نے کہا۔ "اب یہ کیا اول فول بولنا شروع کر

www.aldayjeem.com

دیا۔ اللہ کا شکر ادا کرو، تین بجے جا کے سات آٹھ بجے واپس آجاتے ہو۔ اچھا بھلا کماتے ہو۔ پیسا بھی، ثواب بھی۔''

''اب پیسا تو ٹھیک ہے، یہ ثواب کا فلسفہ کہاں سے نکال لیا تم نے؟'' ابا ہنسے۔

''یہ جو سبزیاں آتی ہیں، بکتی ہیں، کتنے ہی لوگ کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ تم لوگوں سے ٹھیلے، پتھاروں پر بیچنے کے لیے لے جاتے ہوں گے۔ کتنوں کی روزی روٹی کے سبب بنتے ہو۔ ان ہی کے طفیل اللہ پاک دے رہا ہے۔'' اماں ہر بات میں شکر کا، ثواب کا پہلو نکال لیتی تھیں۔

''کمال ہے، تم تو بہت اچھی باتیں کرتی ہو نصیرہ۔'' ابا جب بہت خوش ہوتے یا بہت محبت جتاتے تو اماں کا نام لے کر مخاطب کرتے۔

''اور کیا..... اپنے کام کو عبادت سمجھنا چاہیے جو کام ہو۔ رزق کمانے کا ذریعہ تو ہے۔ اللہ نے ہزاروں سے اچھا رکھا ہے۔ گھر بار، اولاد اور پیسا سب ہی تو ہے۔ بس اب تو بچوں کی شادیوں کی تیاری کرو۔''

''ارے کیا ہوا ماجد کی ماں..... یہ سب تو ابھی چھوٹے ہیں۔''

''ہاں مگر لڑکیاں تو لکڑیاں ہوتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہو جاتی ہیں۔'' اماں نے کہا۔ ابا چپ ہو گئے۔

میں نے ابا سے کہا۔ ''میں سونے جا رہا ہوں۔ مجھے لازمی اٹھا دیجیے گا۔''

''اچھا..... اچھا.....'' ابا نے کہا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا۔ کیا سوچ رہا تھا، کچھ واضح نہیں تھا لیکن کہیں دور پس منظر میں زبیدہ ضرور تھی۔

☆☆☆

رات ڈھائی بجے اماں نے مجھے اٹھایا اور میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ اماں کو بڑی حیرت ہوئی لیکن وہ کچھ بولیں نہیں۔ شاید وہ اسے میرا چند دنوں کا شوق سمجھ رہی تھیں۔

میرے ساتھ جانے کی وجہ سے ابا نے سائیکل کے بجائے موٹر سائیکل نکال لی۔ چلانا تو مجھے بھی آتی تھی لیکن ابا چلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ابھی چھوٹے ہو۔

ناشتا کر کے چائے پی کے ہم لوگ منڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کی خنکی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہم لوگ تھوڑی ہی دیر میں منڈی پہنچ گئے جہاں دیہی علاقوں سے آلو، پیاز، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں کے ٹرک اور ڈالے آ کے کھڑے ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں آڑھت شروع ہو گئی۔ ابا کی سب ہی سے جان پہچان تھی۔ آڑھت منڈی میں ہماری ایک چھوٹی سی دکان بھی تھی۔

''ٹماٹر بڑھیا ہیں۔'' ایک بیوپاری نے ابا سے کہا۔ میں نے دیکھا کہ واقعی ٹماٹر سرخ اور خوب پکے ہوئے تھے۔ ابا نے نظر انداز کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ ٹماٹر کیوں نہیں لیے؟''

ابا نے کہا۔ ''ٹماٹر بالکل تیار ہیں۔ دو دن بھی ٹھہر نہیں پائیں گے اور گلنا شروع ہو جائیں گے اس لیے ٹماٹر ہمیشہ وہ لو جو تھوڑے سے کچے ہوں تاکہ گلے سڑے نہ نکلیں۔'' ابا نے سمجھایا۔

واقعی اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔

مختلف لوگ آتے رہے۔ ابا مال لیتے رہے اور ہاتھ کے ہاتھ بیچتے رہے۔ کچھ مال انہوں نے کریم کے ساتھ لگوا دیا جو منڈی میں ہی ایک زمین پر بڑی سی چٹائی لیے بیٹھا تھا جس پر مختلف سبزیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''آج تو تم بھی آئے ہو..... کیا اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں؟'' کریم نے پانچ کلو کا تھیلا بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں امتحان ختم ہو گئے ہیں، میں نے سوچا کہ ابا کے ساتھ چلا آؤں۔ منڈی دیکھوں۔''

''اچھا کیا..... چائے پیو گے؟'' کریم نے پوچھا اور ساتھ ہی چائے والے کو اشارہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں چائے اور باقر خانی آگئی۔

ابا بدستور کبھی ایک ٹرک تو کبھی دوسرے ڈالے کا سودا کرتے پھر رہے تھے۔ بعض ٹرک تو انہوں نے لیتے ہی بیچ دیے۔ انہیں اِدھر اُدھر کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔

''یہ کام تو بڑے مزے کا ہے۔'' میں نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''مزے کا تو ہے، بس دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کس سبزی کی کھپت زیادہ ہے، کس کی کم۔'' کریم نے بتایا۔

''مگر آلو، پیاز، ٹماٹر تو ہمیشہ ہی بکتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''ہاں مگر آلو کی کھپت ہر اسکول کی چھٹیوں میں کم ہو جاتی ہے۔ فرق پڑ جاتا ہے۔'' کریم نے کہا۔ ''چپس کا چالو کام کم ہو جاتا ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' میں نے سر ہلایا۔ جیسے مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو۔

www.alhayeem.com

اس صبح گھر واپسی پر ابا نے مجھے پچاس روپے دیے۔
''اتنے سارے پیسے۔'' میں نے حیرت سے پیسے پکڑتے ہوئے پوچھا۔
''آج پہلا دن تھا تمہارا منڈی میں اور آج بکری بہت اچھی ہوئی ہے۔'' ابا کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ ''مجھے اچھا لگا کہ تم نے میرے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ تمہیں کیسا لگا؟''
''بہت اچھا۔'' میں نے جواب دیا۔
''اچھا منہ ہاتھ دھولو۔ میں ناشتا لا رہی ہوں۔'' اماں نے کہا۔
میں منہ ہاتھ دھو کے آکر بیٹھا ہی تھا کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں، میں بے خبر سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دو بج رہے تھے۔
اماں نے مجھے اٹھتے دیکھ کر کہا۔ ''بھوک لگی ہوگی۔ کھانا کھالو۔''
مجھے سچ مچ بہت زور کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کلی کی اور آکے اماں کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ابا نظر نہیں آرہے تھے۔ اماں نے بتایا کہ وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں شام تک آئیں گے۔
''تم کھانا کھالو پھر ذرا سبزی تو دے آنا۔'' اماں نے کہا۔
''کس کو دینی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔
''اپنے دوست کو دے دینا۔'' اماں نے کہا۔ ''نذیر کو.....''
''اچھا..... بس..... اور کسی کو نہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''کیوں، تمہیں کسی خاص کو دینا ہے کیا؟'' اماں نے پوچھا۔
''نہیں بھلا میں کس کو دوں گا۔ جس کو آپ کہیں گی اسی کو دینا ہوگی۔'' میں نے کہا۔
''اچھا یاد دلایا، کچھ سبزی حمیرا خالہ کے گھر دے آنا۔'' اماں نے کہا۔
''خالہ حمیرا کون؟'' میں نے پوچھا۔
''ارے وہی جو اس دن اپنی لڑکی کے ساتھ آئی تھی۔'' اماں نے کہا۔
''تو کیا وہاں بھی جانا پڑے گا؟'' میں نے بظاہر اوپری دل سے کہا۔
اماں بولیں۔ ''محلے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ مکان برسوں پہلے حمیرا کے باپ نے خریدا تھا۔ پھر وہ لوگ دوسرے شہر چلے گئے۔ اب بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا ہے تو حمیرا اپنے باپ کے مکان میں آگئی ہے۔ برسوں تو خالی پڑا رہا۔''
''اچھا.....'' مجھے حیرت ہوئی کہ اماں کو ان کے متعلق اتنا کچھ پتا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اس محلے میں نئے نئے آئے ہیں۔ حمیرا کے متعلق یہ بات ٹھیک تھی کیونکہ وہ واقعی اس محلے میں نئی تھیں لیکن ان کے والد کو محلے کے پرانے لوگ جانتے تھے۔
میں نے کھانا ختم کر کے ٹوکری سنبھالی جس میں اوپری تھیلا نذیر کے لیے تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے اس کی ماں نے جھانکا۔ میں نے انہیں سبزی کا تھیلا دیا اور آگے چل دیا۔
میری نظر اوپر اٹھی تو زبیدہ کا چہرہ کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، اس وقت ساری گلی ہی خالی تھی۔ میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔
میں نے جونہی دروازہ کھٹکھٹایا، زبیدہ نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔
''یہ میری اماں نے سبزی بھیجی ہے۔'' میں نے کہا۔
''اچھا جی.....'' زبیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں چمک۔ وہی چمک جو من پسند ہم جولیوں کے درمیان ہوتی ہے یا پھر شاید کچھ زیادہ۔
''تم خود نہیں لائے؟'' اس نے پوچھا۔
''کیا مطلب..... تو پھر کون لایا ہے؟'' میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔
''وہ..... میرا مطلب تھا کہ تم خود سے لائے ہو گے۔ اپنی مرضی سے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔
میں چپ رہا پھر بولا۔ ''یوں سمجھ لو کہ میں ہی لایا ہوں مگر اماں کی اجازت ضروری تھی۔''
''اچھا جی.....'' اس نے شوخی سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھولیں۔ ''اور کس کس بات میں اماں کی اجازت ضروری ہے؟''
''پتا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بات کہوں؟'' میں نے کہا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔
''کہو۔''
''وہ تم کھڑکی میں نہ کھڑی ہوا کرو۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔
''کیوں جی..... تمہیں کیا اعتراض اور کیوں اعتراض؟'' اس نے جرح کی۔
''دیکھو، اچھا نہیں لگتا کہ گلی کے سب لوگ تمہیں دیکھیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔
''اچھا.....'' وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔

www.alibayeen.com

''مانو گی نا میری بات..... زوبی.....'' میں نے بڑی آس لگا کے کہا۔

''زوبی.....'' وہ ہنسنے لگی۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا، وہ چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کے اندر بھاگ گئی۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ سبزی بیچ دروازے میں پڑی رہ گئی۔

میں نے چند منٹ انتظار کیا اور سوچا شاید اسے میری بات بری لگ گئی..... مگر کون سی؟ کھڑکی میں کھڑا ہونے کی یا پھر زوبی کہنا؟

میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر میں نے سبزی کی ٹوکری اندر سرکائی اور دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے واپس آ گیا۔

آتے ہوئے میرے قدم کہیں زیادہ بوجھل اور تھکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

رات مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی۔

حامد نے مجھے کروٹیں بدلتا دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا، کیا چارپائی میں کھٹمل ہو گئے ہیں؟''

''نہیں تو۔'' میں نے خوامخواہ ہی سر کھجایا اور اٹھ کے بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے کیا۔ اگر صبح ابا کے ساتھ نہیں جانا تو منع کر دو۔ پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' حامد نے کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''شاید میں واپس آ کے دوپہر تک سوتا رہا اس لیے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''ہاں.....'' حامد نے کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

میرے ذہن میں زبیدہ تھی۔ پتا نہیں کیوں میں نے اس کو زوبی کہہ دیا۔ ''کیا جو لوگ اچھے لگتے ہیں ان کو مختلف ناموں سے پکارنا اچھا لگتا ہے؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

میں نے دوبارہ زیر لب کہا۔ ''زوبی..... زوبی.....''

میں پتا نہیں کب زوبی کہتے کہتے سو گیا۔ رات تقریباً ڈھائی بجے اماں نے مجھے جگا دیا۔ ناشتا تیار تھا۔ ہم لوگ ناشتا کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ حسب معمول ابا نے موٹر سائیکل لے لی۔ موٹر سائیکل پر سبزی لانا بھی آسان ہوتا تھا۔

میں نے ابا سے پوچھا۔ ''آپ روز موٹر سائیکل پر کیوں نہیں جاتے تھے؟''

''یار! ایک تو پٹرول خرچ ہوتا ہے، دوسرے سائیکل چلانے سے ذرا ٹانگیں کھل جاتی ہیں۔ گوڈے گٹے سب مل جل کے سیٹ رہتے ہیں۔'' ابا نے ہنس کر کہا۔

منڈی میں وہی سماں تھا۔ البتہ کریم مجھے آج بھی دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی کہ میں نے واقعی کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔

مال خریدنے بیچنے کے چکر میں صبح ہو گئی۔ اس دوران میں دو مرتبہ میں نے چائے، بسکٹ سے خوب انصاف کیا۔ تیز لائٹوں میں منڈی میں دن کا سا سماں تھا۔

واپسی پر ابا نے کہا۔ ''مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ تم کام کو سمجھ رہے ہو۔ یاد رکھو، کم منافع اور تیزی سے فروخت کاروبار کی ترقی کا سب سے آسان نسخہ ہے۔ پیسا زیادہ دیر کے لیے نہ روکو۔ اسے حرکت دیتے رہو۔ یہ چلتے چلتے انڈے بچے دیتا رہے گا۔ رک گیا تو خود کو کھانا شروع کر دے گا۔''

''جی.....''

''کیا سمجھے؟''

''یہی کہ مال کو جلدی خرید کر جلدی بیچو۔ زیادہ منافع کے لالچ میں روکے نہ رکھو۔ کہیں قیمت گر گئی تو نقصان ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے یار! تو تو بڑا سمجھ دار ہے۔'' ابا نے تعریفی انداز میں کہا۔

''پتا نہیں.....'' مجھے شرم سی آ گئی اپنی تعریف پر مگر میں اندر ہی اندر بہت خوش ہوا۔

ہم نے گھر آ کے ہلکا پھلکا ناشتا کیا پھر میں لیٹ کے سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔

اماں نے کہا۔ ''تمہارے ماسٹر کلیم اللہ آئے تھے۔ پوچھ رہے تھے، ابھی تو چھٹیوں میں کچھ دن باقی ہیں۔ تم نے اسکول آنا کیوں چھوڑ دیا۔ اب تو نویں شروع ہونے والی ہے۔''

''اماں! میں اب نہیں پڑھوں گا۔'' میں نے صاف صاف کہا۔

''ارے میٹرک تو کر لے۔'' اماں نے پچکارا۔ ''بھلا آٹھویں پاس کو کون پوچھے گا؟''

''جیسے آپ نے ابا کو پوچھ لیا۔'' بے ساختہ میرے منہ سے جانے کیوں اور کیسے نکل گیا۔

اماں چند لمحے مجھے گھورتی رہیں پھر ہنس پڑیں۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں بس ابا کے ساتھ کام میں لگوں گا۔'' میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

''تجھے کمانے کی اتنی جلدی کیوں پڑ گئی؟'' اماں نے پوچھا۔

www.alifbayjeem.com

''سترہ برس کا ہو گیا ہوں میں.....'' میں نے کہا۔
''تو کیا ہوا؟'' اماں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم ستر برس کے بھی ہو کے میرے لیے بچے ہی رہو گے۔''
''آپ جو چاہے کہیں مگر اب مجھے نہیں پڑھنا، بس۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔
''چلو پھر دیکھیں گے۔'' اماں نے اپنائیت سے کہا اور میرے آگے ناشتے کی ٹرے رکھ دی۔

☆☆☆

میں پوری تندہی سے ابا کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ اماں میرے اس طرح ذمے داری سے اٹھنے پر حیران بھی تھیں اور خوش بھی۔ چلو کسی کام میں تو میرا دل لگا مگر میرے اندر شاید ایک لاشعوری خواہش تھی۔ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کیونکہ میں جب تک اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہوتا... میری من کی مراد پوری نہیں ہو سکتی تھی۔
مگر پھر جو باتیں خیالوں خوابوں اور تنہائیوں میں ہوتی تھیں..... جن کے وجود کے دم سے میرے اندر توانائی تھی، وہ وجہ اچانک ہی معدوم ہو گئی۔
اس دن گوبھی کی نئی فصل آئی تھی۔ خوش رنگ کھلی کھلی گوبھی بہت عمدہ تھی۔ اماں نے کہا۔ ''دو تین جگہ جا کے دے آ۔'' مگر اس میں حمیرا خالہ کا ذکر نہیں تھا۔
میں نے اماں سے پوچھا۔ ''کیا آپ حمیرا خالہ کے گھر سبزی نہیں بھیجیں گی؟''
''کیا مطلب؟ تمہیں معلوم نہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔
''کیا.....؟'' اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔
''وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ان کے بھائیوں کی آپس میں صلح صفائی ہو گئی۔ دونوں چھوٹے بھائی آ کے بڑے بھائی کو منا کے لے گئے۔ وہ تو جاتے ہوئے ملنے بھی آئی تھی مگر تم گھر پر تھے ہی نہیں۔ یہ حمیرا تمہارے لیے ایک ڈبا دے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی ماجد بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس میں اس کے لیے کچھ چیزیں ہیں۔ میں نے لے کر تمہارے کمرے کی الماری کے اوپری خانے میں رکھ دیا ہے۔''
''وہ..... وہ کب گئے؟'' میری آواز جیسے مردہ ہو گئی۔
''چار پانچ دن ہو گئے ہیں.....'' اماں نے کہا۔ اسی وقت چھوٹی بہن نے آواز دی، وہ باہر چلی گئیں۔
میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ اسٹول پر چڑھ کر میں نے ڈبا اتارا۔ جوتے کے ڈبے کو رنگین پنی کے کاغذ میں پیک کیا گیا تھا۔
میں نے بے تابی سے ڈبا کھولا۔ ڈبے میں کہانیوں کی ایک کتاب ''سمسن ڈیلائیلا'' رکھی تھی جو میں نے اس کو لا کر دی تھی جب اس نے کہا تھا کہ خالی سبزی ہی لاتے رہو گے بس؟ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے اس کو یہ کتاب دے دی تھی اور ایک لمبی چوٹی جو میں نے دیکھتے ہی پہچان لی تھی۔ یہ وہی چوٹی تھی جو زوبی اپنے بالوں میں گوندھتی تھی۔ جس کو میں بڑے غور سے دیکھتا تھا جب وہ اسے ہاتھ میں لے کر مل دیتی رہتی تھی۔
بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ محبت جو کہی نہیں گئی، وہ محبت جو سنی نہیں گئی، وہ محبت جو ابھی بیان ہی نہیں کی گئی تھی..... اس ان کہی محبت نے اپنے ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ زبیدہ کا یہ تحفہ اس بات کو صاف صاف بیان کر رہا تھا کہ میرا جذبہ یکطرفہ نہ تھا لیکن وہ جا چکی تھی۔
میں نے ڈبا واپس اپنے کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اگر گھر میں کوئی دیکھ لیتا تو اس تحفے کا جواز کیا پیش کرتا میں؟ میں لڑکا ہو کے بزدل تھا۔ وہ لڑکی ہو کے بہادر تھی جو اپنے احساسات کا اظہار کر گئی تھی۔
میں چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اماں اندر آئیں تو مجھے لیٹا دیکھ کر قریب آ گئیں۔ میں نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔ اس وقت کسی سوال جواب یا کسی سے بات کرنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔
اماں مجھے سوتا دیکھ کر واپس پلٹ گئیں اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر گئیں۔ کمرے میں تاریکی سی چھا گئی۔
اکیلا ہوتے ہی نہ جانے کب اور کیسے میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا... اور میں نہ جانے کتنی ہی دیر تکیے پر اوندھا لیٹا روتا رہا۔ آنسو بہاتا رہا اور روتے روتے آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کب میں خود سے بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو اماں میرے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں اور ابا سے کہہ رہی تھیں۔
''اب نہ لے جانا میرے بچے کو۔ رات نکلتے ہو، پتا نہیں کس کی اوپری نظر لگ گئی میرے بچے کو۔''
''میں کہاں لے جاتا ہوں اس کو، اپنی ضد سے جاتا ہے۔'' ابا نے احتجاجاً کہا۔
''بس میں نے کہہ دیا، اب بالکل بھی نہیں جائے گا۔'' اماں نے غصے سے کہا۔ ابا چپ رہے۔
مجھے بہت تیز بخار تھا جو تین چار دن جاری رہا۔ اس

www.aiilaayiteem.com

دوران میں صرف مجھے نذیر ہی ملنے آیا۔ اماں نے اسے میرے کمرے میں بھیج دیا۔

''تم دونوں باتیں کرو، میں تمہارے لیے چائے بسکٹ لاتی ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر چلی گئیں۔

''کیوں بخار چڑھالیا تو نے؟'' نذیر نے پوچھا۔

''لو بھلا، بخار کوئی پوچھ کر آتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تیرے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ تُو تو بڑا اداس اداس نظر آرہا ہے۔ خیر تو ہے نا؟''

''سب خیر ہے۔'' میں نے نظریں چرائیں۔

''اب تو اپنے ابا کے ساتھ کام پر جانے لگا ہے۔ خوب پیسے کمائے گا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''پتا نہیں۔''

''کہیں تجھے کوئی غم تو نہیں لگ گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیسا غم..... کس کا غم؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگا۔

''اسی کا جو چلی گئی۔'' نذیر نے اطمینان سے کہا۔

''بڑا کمینہ ہے تو.....'' میں نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے میری آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے اور میں ہنستے ہنستے رونے لگا۔

نذیر چپ چاپ مجھے دیکھنے لگا۔ باہر سے اماں کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں جلدی سے چپ ہو گیا اور انگلیوں سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

اماں چائے بسکٹ لے آئیں اور رکھ کے چلی گئیں۔

اماں کے جانے کے بعد نذیر نے کہا۔ ''یار چھوڑو، زندگی میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس طرح کرے گا تو مر جائے گا۔''

میں کچھ نہ بولا۔ بھلا ہر کوئی..... چاہے وہ نذیر ہی کیوں نہ ہو، آپ کے دل کی کیفیت کیسے اور کتنی جان سکتا ہے؟

میں نے کہا۔ ''مجھے اس کا غصہ نہیں ہے۔''

''پھر.....؟'' نذیر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''اس نے تو مجھے خوشی دی تھی۔ بس اس کے ہونے سے مجھے اچھا لگتا تھا۔''

''کیا اچھا لگتا تھا؟'' نذیر نے جرح کی۔

''پتا نہیں لیکن اس کے جانے کا سن کر میرے اندر جیسے کچھ خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ کچھ کمی ہو گئی ہے۔ کیا کمی؟ میں نہیں جانتا۔'' میں نے سچائی سے جواب دیا۔

نذیر کچھ نہ بولا۔ بس چائے میں بسکٹ ڈبا ڈبا کے کھاتا رہا پھر اس نے سڑک سڑک کے چائے پی۔

''میرا خیال ہے کہ تجھے اس سے سچا پیار ہو گیا تھا۔'' نذیر نے چائے کی خالی پیالی واپس رکھی۔

''تو کیا پیار جھوٹا بھی ہوتا ہے؟''

''جب سچا ہوتا ہے تو جھوٹا بھی ہوتا ہوگا۔'' نذیر نے منطقی جواب دیا اور ہنسنے لگا۔ ''پیارے! ابھی سے اس چکر میں نہ پڑ۔ بڑی عمر پڑی ہے۔ کچھ دنوں بعد تو سب بھول جائے گا اور کسی نئے پیار میں الجھ جائے گا۔''

''بکواس.....'' میں نے تیزی سے کہا۔

مجھے اچھا نہیں لگا اس کا جملہ۔ بھلا پیار بھی کوئی بدلنے کی، تبدیل کرنے کی چیز ہے۔

''زیادہ نہ سوچا کر۔'' نذیر نے کہا۔ ''مجھے دیکھ، کبھی کسی کے چکر میں بیمار دیکھا ہے؟''

''پتا نہیں، تم کونسا مجھے اپنے چکر بتاتے ہو۔''

نذیر پھر ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسنے کی عادت مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ہر سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو ایسے ہی لیتا تھا۔ جب اس کا دو سال پہلے دادا فوت ہوا تھا تو وہ تب بھی ہنس رہا تھا۔

''یار! اب ابا تو مجھے خوب مارا کرے گا۔ دادا تو بچا لیا کرتا تھا، ابا کے پیسے چرانے پر۔'' وہ ہنستے ہنستے بولا پھر رونے لگا۔

''اب تیرا کیا ہوگا کالیا۔'' وہ روتے روتے پھر ہنسنے لگا۔

میں کچھ اور تو نہ بولا۔ بس اسے گلے لگا لیا مگر مجھے اس وقت نذیر کا ہنسنا برا بلکہ بہت ہی برا لگ رہا تھا۔

''اچھا میں چلتا ہوں... یار! اماں کی چائے بہت مزے کی تھی۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''یار! یہ مجھے اچھا تو نہیں لگتا مگر میں کہے دیتا ہوں کہ تو بس جلدی سے ٹھیک ہو جا، پھر.....''

''تو پھر کیا؟'' میں نے بے دلی سے پوچھا۔

''پھر ہم اسے ڈھونڈنے چلیں گے۔'' نذیر نے کہا۔

''کیا.....؟'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں کئی گنا بڑھ گئیں۔

''ہاں۔'' اس نے کہا اور پھر بغیر رکے اور بغیر کچھ مزید بولے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یوں لگا جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر ایک جوش، ایک ولولہ بھر گیا۔ مایوسی کی کیفیت امید میں بدل گئی۔

اسی وقت اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

www.allpayfem.com

''لے بیٹا رات کی دوا پی لے۔'' انہوں نے دوا کی شیشی میری طرف بڑھائی۔ میں نے دوا پی لی۔

پھر میں نے پوچھا۔ ''اماں! یہاں سے حیدرآباد کتنی دور ہے؟''

''حیدرآباد۔'' اماں نے حیرت سے کہا۔ ''اب یہ اچانک حیدرآباد کی کیا سوجھی؟''

''وہ..... وہ..... نذیر کہہ رہا تھا وہاں کوئی شادی ہے۔ میں بھی ساتھ چلوں۔'' میں نے فوراً بہانہ تراشا۔

''دوسرا شہر ہے، بہت دور۔'' اماں نے کہا۔

''میں چلا جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

اماں نے جواب دینے سے پہلے کچھ سوچا پھر کہنے لگیں۔ ''اچھا بخار اتر جائے تو پھر دیکھیں گے۔''

''اماں! آپ بہت اچھی ہیں۔'' میں نے کہا۔ اظہارِ ممنونیت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''باؤلا ہوا ہے کیا۔ سترہ برس کا ہو گیا اور بات بات پر رونے بیٹھ جاتا ہے۔'' اماں نے مجھے ڈانٹا اور ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

پتا نہیں جانے کی جلدی تھی یا اس سے ملنے کا شوق۔ میرا بخار صبح تک اتر گیا۔ میں نے سیدھے نذیر کی ڈیوڑھی کا رخ کیا۔ وہ حسبِ معمول وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔

''یہ ہوئی نا جوانوں والی بات۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

میں نے اس کی خوش دلی کو نظرانداز کرتے ہوئے سیدھا سوال داغا۔ ''حیدرآباد کب چلنا ہے؟''

''حیدرآباد؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری پھر وہ بولا۔ ''ہاں..... ہاں۔ دو چار دن تو رک جا۔ میں نے ایک صاحب سے کہا ہے کہ وہ ذرا پتا نشان ڈھونڈ دیں۔ جیسے ہی وہ کچھ بتاتے ہیں، چلے چلتے ہیں پھر.....''

''وہ کب تک پتا کر لیں گے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کہا تو میں نے جلدی کا ہی ہے۔ کباڑ خانے آتے ہیں وہ۔ زیادہ جلدی کروں گا تو بات ابا تک پہنچ جائے گی پھر کون پوچھ گچھ کے چکر میں پڑے۔'' نذیر نے مجھے تسلی دی۔

''میں نے اماں سے کہہ دیا ہے کہ مجھے نذیر کے ساتھ شادی میں حیدرآباد جانا ہے۔'' میں نے نذیر کو بتایا۔

نذیر نے سن کے کہا۔ ''بہت اچھا کیا۔''

میں سوچنے لگا کہ اب کیا بات کروں نذیر سے۔ یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ نذیر سے بات کرنے کے لیے موضوع نہیں تھا میرے پاس ورنہ میری تمام دوستوں میں سب سے زیادہ گاڑھی نذیر کے ساتھ چھنتی تھی۔ ہم لوگ سارا سارا دن ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' نذیر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں.....'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

میں نذیر کی بیٹھک سے باہر نکل آیا۔ میں نے زبیدہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ دروازہ اور کھڑکی دونوں ہی کسی سہمے ہوئے مایوس شخص کے مقدر کی طرح بند تھے۔

☆☆☆

مجھ پر یہ عقدہ چند دنوں میں کھلا کہ میرے پیسے کمانے کی دھن کے پیچھے زبیدہ کے حصول کی خواہش کا طاقت ور جذبہ تھا۔

ہمارے معاشرے میں تو یہ بات عام ہے کہ جب تک لڑکا اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو جائے، اس کی شادی بیاہ کا سوچا بھی نہ جائے۔ شاید اسی لیے لاشعوری طور پر میں کام کی طرف راغب ہو گیا تھا مگر جب ایک بار آپ دریا میں کود پڑتے ہیں تو پھر ہاتھ پیر مارنا ہی پڑتے ہیں۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

طبیعت بہتر ہو گئی تو ایک دن ابا نے کہا۔

''ہاں بیٹا! پھر میں رات تمہیں تین بجے تک اٹھا دوں گا؟''

''جی اچھا.....'' میں نے جواب دیا۔ ابا نے یہ نہیں کہا تھا کہ چلنا ہے یا نہیں بلکہ سیدھا حکم دیا تھا کہ چلنا ہے۔

اماں فوراً بولیں۔ ''کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اٹھ جائے گا۔ ویسے بھی یہ بہت سمجھ دار ہے۔ دیکھنا یہ بہت ترقی کرے گا۔''

میں دوبارہ ابا کے ساتھ آڑھت پر منڈی جانے لگا۔ کئی دن گزر گئے۔

میں گاہے بگاہے پوچھتا رہتا تھا نذیر سے کہ حیدرآباد کب چلنا ہے مگر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کے ٹال دیتا تھا۔

ایک دن میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تو مجھے بہلا رہا ہے۔''

''دنیا ہی بہلانے اور ٹہلانے پر قائم ہے۔'' نذیر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے متعجب ہو کے پوچھا۔ ''تو مجھے بہلا رہا تھا؟''

''تو اور کیا؟'' نذیر نے اطمینان سے کہا۔ ''جس سے یار کا دل بہل جائے، چہرے پر رونق آ جائے، اس سے

www.aitbayteen.com

اچھی کوئی خبر نہیں اور اس میں جھوٹ میرا نہیں..... تیری عقل کا کھوٹ ہے۔"

"میری عقل کا کھوٹ؟" میں نے حیرت اور تاسف سے کہا۔ "مجھے ہی بے وقوف بنا کے مجھے ہی نام دھر رہا ہے۔"

"سامنے کی بات تھی۔" نذیر نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بقول اس کی اماں کے منحوس دیدے گاڑے ہر وقت کھڑکی کو تاڑتا رہتا ہے۔ ایسے میں وہ مجھے اپنا پتا بتا کے جاتے؟ میں نے تو تجھے بہلانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔" میں نے قریب پڑا گلاس اس کو کھینچ مارا۔ نذیر نے بڑی مہارت سے گلاس کو کیچ کر کے سائڈ پر رکھا اور پھر ہنسنے لگا۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔ اتنا ہنسا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

☆☆☆

چاند سورج ایک دوسرے کے پیچھے دن رات بھاگتے رہے۔ صبح، شام میں چھپتی رہی اور شام، رات کے پہلو میں دبکتی رہی۔ میری زندگی کے ماہ و سال بیتتے چلے گئے مگر ان بیتے ہوئے ماہ و سال راتوں کو بھی کبھی وہ ڈبا کھولنے پر مجبور کر دیتے جس میں کہانیوں کی کتاب سیسن ڈیلائیلا رکھی تھی اور زبیدہ کا پراندہ رکھا تھا۔ وہی چوٹی جو وہ اپنے لمبے لمبے بالوں میں گوندھتی تھی۔ اس میں سے آج تک اس کے بالوں کی خوشبو آتی تھی۔

گزرتے سالوں میں بڑے بھائی حامد کی شادی ہو گئی۔ ابا نے اسے اپنا کاروبار کروا دیا۔ وہ پھلوں کی آڑھت کرنے لگا۔ خواب تو اس کا ڈپٹی کلکٹر بننے کا تھا مگر دو مرتبہ مقابلے کے امتحان میں فیل ہو جانے کے بعد اس نے اس خواب کو لات ماری اور اس حقیقی دنیا میں آ گیا جہاں پیسا تھا اور چخ چخ تھی مگر پھر بھی ایک کسک تو ناکامی کی باقی رہتی ہے۔ جتنا وہ پڑھتا تھا ہمارا تو کیا پورے خاندان کا ہی خیال تھا کہ اس کی صاحبی میں بس ایک آنچ کی کسر ہے مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔

مجھ سے چھوٹی بہن رانی کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ اب اماں اور ابا میرے پیچھے پڑے تھے کہ میں شادی کر لوں مگر نہ جانے کیوں جب بھی اماں کسی لڑکی کا تذکرہ کرتیں تو میرے سامنے زبیدہ آ جاتی اور میں انکار کر دیتا۔

ابا نے کہا۔ "خالی لڑکیوں کے نام نہ گنواؤ۔ کسی کی تصویر دکھاؤ تاکہ اس کو سمجھ آئے۔"

پھر اماں نے لڑکیوں کی تصویریں دکھانا شروع کر دیں مگر مجھے ہر تصویر کے پیچھے زبیدہ کا چہرہ جھانکتا دکھائی دیتا۔ تصویر دھندلی ہو جاتی۔ زبیدہ حاوی ہو جاتی۔

ایک دن اماں نے زچ ہو کر کہا۔ "بات سن ماجد..... اب میں تجھے نہ نام بتاؤں گی، نہ تصویر دکھاؤں گی۔ بس سیدھا سیدھا تیری رخصتی کرا لاؤں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"لو جی دیکھو۔ ستائیس برس کا ہو گیا اور گھرداری کا ہوش نہیں۔" اماں کو غصہ آ گیا۔

"یہ میں ہوں..... تیری ماں۔ جو تیرا گھر بسانے کے لیے بے چین ہے۔ ورنہ میرے بعد بہن بھائی ان چکروں میں نہیں پڑتے کہ بھائی کی شادی کے لیے اُتاولے پھریں۔"

"مگر آپ کہاں جا رہی ہیں بھلا؟" مجھے اماں کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"اے لو۔ بھلا کوئی ہمیشہ بیٹھا رہتا ہے؟" اماں نے چمک کے کہا۔ "عجیب لڑکا ہے، سمجھتا ہی نہیں۔"

"اچھا بھئی، جیسا آپ چاہیں۔" میں نے اماں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

اماں نے جو لڑکی میرے لیے پسند کی اس کا نام زلیخا تھا جو عام سی شکل صورت کی لڑکی تھی جس کی سب سے بڑی خوبی اس کی کم گوئی اور اطاعت شعاری تھی۔

اس نے مجھ سے پہلے اماں کے دل میں گھر کر لیا۔ اماں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ماجد نے آٹھویں سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے ابا کے ساتھ کام میں لگ گیا تھا۔

اس نے جواب دیا۔ "جو مرد کام کرتے ہیں وہ کم ہی پڑھتے ہیں۔ میرا تو کوئی بھائی بھی پانچویں سے آگے نہیں پڑھا۔ تینوں کے تینوں خوش حال ہیں۔ ہنرمند ہیں اس لیے۔"

اماں نے کہا۔ "مگر دلہن! تم تو انٹر پاس ہو۔"

زلیخا بولی۔ "تو کیا ہوا اماں۔ ہماری تعلیم تو بس گھر سے نکلنے کا بہانہ ہوتی ہے اس لیے لڑکیاں پڑھ جاتی ہیں۔ ہمیں بھی آزادی سے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہونے کا حق دیں۔ راتوں کو باہر رہیں۔ یار دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا کھلا ڈلا موقع دیا جائے پھر دیکھیں لڑکیاں کتنا پڑھتی ہیں۔ روٹی گول نہ بنے تو ڈگری کی ذلت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ میری بہن کو اولاد نہیں ہوئی۔ بی اے کی ڈگری نے اس کو طلاق ملنے سے نہیں روکا۔"

اماں نے کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ خالی تعلیم نہیں، مقدر بھی ہوتا ہے اور میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ عورت ڈگری

www.alifayeem.com

سے کم اور نصیب سے زیادہ راج کرتی ہے۔"

میں اطمینان سے دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔

حیرت انگیز طور پر زلیخا کے انداز میں کوئی تلخی، کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں تھا بلکہ اس کے انداز میں ایسا تاثر تھا جیسے یہ ساری باتیں کسی غیر متعلقہ فرد کے بارے میں ہو رہی ہوں۔

زلیخا تو اس وقت بھی بڑے اطمینان سے بولی تھی جب میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں تمہیں زوبی کہہ لوں؟

"جیسے آپ کو اچھا لگے۔"

اس اللہ کی بندی نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ میں اس کو زلیخا کے بجائے زوبی کیوں کہنا چاہتا ہوں اور پھر بعد کے دنوں نے ثابت کیا کہ وہ ایسی موم کی عورت تھی جو کہ نا صرف اماں کے ارادوں میں ڈھل گئی بلکہ اس نے مجھ سے بھی کبھی کسی فرمائش، کسی آرزو کا اظہار نہیں کیا۔

☆☆☆

میرا پہلا بیٹا شادی کے ٹھیک دس ماہ کے بعد ہوا..... وہ ہو بہو میری کاپی تھا۔

"پہلا بچہ شوہر پر جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ بیوی کو شوہر سے بہت محبت ہے۔" اماں نے کہا۔

میں خوش تھا کہ میری تکمیل کا سفر شروع ہو رہا ہے۔

"سنا آپ نے..... اماں کیا کہہ رہی ہیں؟" میں نے زلیخا سے کہا۔

"جی....." اس نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئی۔

"کیا تم خوش نہیں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں بہت خوش ہوں۔" وہ دھیمے سے بولی۔ "اماں نے پوری بات نہیں کی۔"

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "وہی جو اماں کہہ رہی ہیں کہ اگر پہلا بچہ شوہر کی شکل پر جائے تو بیوی کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر شوہر کی محبت کا کیسے پتا چلے گا؟" اس نے پوچھا اور میری طرف دیکھا۔

میں حیران رہ گیا۔ پتا نہیں کیوں میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اگر زلیخا کی جگہ زوبی ہوتی تو.....

"کیا بات ہے؟" اس نے مجھے چونکا دیا۔

میں چپ رہا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے لب خاموش تھے اور آنکھیں بے تاثر۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا اور چھت پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

گزرتے وقت نے پھر ہمارا ایک بڑا نقصان کر دیا۔ ابا کی طبیعت رات کے وقت خراب ہوئی۔ انہیں اسپتال لے کر گئے مگر وہ چند ہچکیاں لے کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ابا یوں اچانک مر جائیں گے۔ ساری عمر انہیں چاق و چوبند دیکھا تھا۔ ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے۔ مجھے یاد نہیں کہ ابا کو دو چار دن بھی بخار میں دیکھا ہو۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا؟

میں ہی ابا کے سب سے زیادہ قریب تھا بلکہ ابا اور اماں دونوں ہی سے، میں ہی سب سے زیادہ قریب تھا اور ہم دونوں ہی کو بہت دنوں تک نہ مجھے، نہ اماں کو یقین آیا کہ ابا چلے گئے ہیں۔

اماں کی خالی اداس ویران آنکھیں، ان کی آواز کا وہ کرارا پن جیسے ڈھیلے سے لہجے میں تبدیل ہو گیا۔

ہم سب بہن بھائی اپنے اپنے گھروں کے تھے۔ سب کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ ابا سب کے فرائض پورے کر گئے تھے۔

کبھی کبھی میں اماں سے کہتا۔ "ویسے تو ابا کو کوئی بیماری کوئی تکلیف نہیں تھی، اللہ نے ان کے سارے فرائض پورے کرا دیے۔ پچھلے سال آپ اور ابا حج بھی کر آئے تھے۔"

اماں نے بلک کے کہا۔ "ہاں، اپنے بچوں کے سارے فرائض پورے کر گئے۔ میرا فرض تو باقی رہ گیا۔ تنہا کر گئے۔"

"آپ کا فرض؟" میں حیران ہو گیا۔

"ارے تجھے کیا پتا، عورت اپنے شوہر کے ہاتھوں دفن ہو تو اس کا فرض پورا ہوتا ہے۔ ہائے، میں کیسی بدقسمت ہوں کہ تیرے باپ کے ہاتھوں کی مٹی بھی مل نہ سکی مجھ بدنصیب کو۔" اماں نے کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔ محبت کا یہ انداز دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

میں نے بے اختیار پوچھا۔ "آپ اتنی محبت کرتی تھیں ابا سے؟"

اماں نہ جانے کس جنون میں تھیں، کہنے لگیں۔

"ہائے تو کیا جانے تیرے ابا کتنے اچھے، کتنے سادہ تھے۔ مجھے ان کی سادگی ہی تو اچھی لگی تھی۔ تیرے ابا ٹھیلے پر سبزیاں بیچتے تھے۔ گلی گلی آوازیں لگا کے، ان کے گلے میں بڑا سوز تھا۔ ایسے پُرسوز گانے گاتے تھے..... محمد رفیع کے، کشور کے اور اپنے مہدی حسن کے۔ میں تو ان کے انداز پر

www.aldayjeem.com

ہی مرتی۔"

اماں کی آنکھیں بھر گئیں اور وہ رونے لگیں۔ بے آواز۔ یہ محبت بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ اماں کو گلہ تھا کہ ابا نے انہیں پہلے چھوڑ دیا ورنہ ان کی ذمے داری تھی کہ وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے دفناتے۔

محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے؟

☆☆☆

زلیخا بڑی بھاگوان عورت ثابت ہوئی۔ میری آڑھت بڑھتی رہی۔ میں منڈی کا خاص بیوپاری بن گیا۔ اللہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی دے دی۔ روپے، پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن اوچھا پن نہیں تھا۔

آج بھی مجھے اپنے پرانے محلے میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ میرا واحد دوست نذیر بھی اسی محلے میں تھا۔ البتہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی کرخت آواز والی اماں اب کمر جھکا کے دھیرے دھیرے چلتی تھیں۔ سہ پہر کو میں اور نذیر بیٹھک میں بیٹھے پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہتے تھے۔

زبیدہ کا مکان ابھی تک خالی تھا۔ میں اس واقعے کے بعد کئی دن نذیر سے ناراض رہا تھا کہ اس نے مجھے حیدرآباد جانے کا جھوٹا آسرا کیوں دیا تھا مگر پھر نذیر نے مجھے منا لیا تھا۔

نذیر ابھی تک اسی طرح شوخ تھا۔ ہنستا مسکراتا تھا۔ اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑے لڑکے نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور شہر کے مشرقی حصے میں اپنا الیکٹرک اسٹور کھول لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب کباڑیے بھی فیشن ایبل ہو گئے ہیں۔ وقت بدل رہا ہے۔ ہمیں بھی بدلنا چاہیے۔

"الو کے پٹھے! کل باپ بھی بدل لینا۔" نذیر نے غصے سے چیخ کر کہا۔

"ابا! زیادہ نہ چیخیں، آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔" اس کے بڑے لڑکے قدیر نے کہا اور میری طرف رخ کر کے بولا۔ "چاچا جی! آپ ابا کو سمجھائیں نا۔"

"اب اس عمر میں تو مجھے سمجھائے گا۔" نذیر نے غصے سے کہا۔

"میں تو سمجھا سکتا ہوں مگر آپ نہیں مانتے تو میں کیا کروں؟" قدیر نے کہا اور باپ کے کباڑ میں سے پرانا وینٹل کا لیمپ پلاسٹک کے بڑے شاپر میں رکھنے لگا۔

"خبردار جو اس کو ہاتھ لگایا تو۔" نذیر نے غصے سے کہا۔ "پورے تین سو روپے کا ہے۔ جب جی چاہے منہ اٹھائے آتا ہے اور جو جی چاہے لے جاتا ہے۔ مفت میں کچھ نہیں ملتا۔"

"ابا یہ لو....." قدیر نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکالے اور گن کے تین سو روپے نذیر کی طرف بڑھائے۔

"لعنت ہے تجھ پر....." نذیر نے ہاتھ مار کے پیسے نیچے گرا دیے۔ "مجھے پیسوں کی ضرورت ہے کیا؟"

"ابھی تو پیسوں کو رو رہے تھے۔" قدیر نے تبصرہ لگایا۔

دونوں باپ بیٹوں میں یہ جھگڑا، یہ منظر باقاعدگی سے دوسرے تیسرے دن دہرایا جاتا تھا اور عموماً میں ہی اس کا گواہ ہوتا تھا۔

وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے پیسے اٹھائے اور زبردستی باپ کی جیب میں ڈال گیا۔

"ایک نمبر کا فراڈ یا کمینہ ہے۔" نذیر نے غصے سے کہا اور ہنسنے لگا۔

"کیا کرے گا یہ لیمپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"تو تو یوں پوچھ رہا ہے جیسے جانتا نہیں۔" نذیر میری طرف دیکھ کے ہنسا۔ "پالش کروائے گا۔ کسی سے دو چار سو سال پہلے کا اس کے پیندے میں سن کھدوائے گا اور چار پانچ ہزار میں نوادرات میں شامل کر کے بیچ دے گا۔"

"لوگ ہی بے وقوف ہیں۔" میں نے تاسف سے کہا۔

اندر سے اس کی بیوی کھانے کے لیے دہی بڑے ٹرے میں لے کر آئی اور مجھ سے بولی۔ "آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ کیوں ہر وقت بیٹے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ دیکھیں آٹھ برس میں اس نے ہم سے اچھا بڑا دو منزلہ مکان بنا لیا ہے۔ وہ کہتا ہے ہم اس کے پاس چلیں مگر یہ مانتے ہی نہیں۔"

"میں تو اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم اگر جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ بیٹے کی محبت پھٹی پڑ رہی ہے۔" نذیر کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی۔

"بھلا میں تمہیں چھوڑ کے کہاں جا سکتی ہوں مگر یہ بھی تو دیکھو کتنا خیال کرتا ہے وہ ہمارا۔"

"وہ بھی ہمیں لے جانے میں سنجیدہ نہیں۔" نذیر نے کہا۔ "اس کے لیے میں سونے کی کان ہوں۔ شہر بھر کے لوگ اپنا کاٹھ کباڑ ہمیں دے جاتے ہیں اور وہ ہم سے اپنے مطلب کی چیزیں سمیٹ کر چلتا بنتا ہے۔"

"کتنی ہی بار تو اس نے پیسے دینے کی کوشش کی مگر تم لیتے ہو بھلا؟"

"اب میں اس سے کاروبار کروں گا، پاگل ہو گئی ہے کیا؟"

نذیر ہنسنے لگا۔ نذیر کا چھوٹا بیٹا نصیر ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی لگی بندھی تنخواہ تھی جو وہ باقاعدگی

www.alifayiet.com

سے باپ کے ہاتھ پر لا کے رکھ دیتا تھا۔

ان کی یہ روز روز کی بک بک جھک جھک مجھے اچھی لگتی تھی۔ خصوصاً نذیر کی بیوی کا اپنے میاں سے لڑنا اچھا لگتا تھا اور اس دوران بار بار زبیدہ کی کھڑکی دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ جو کبھی نہیں کھلتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں مجھے ہمیشہ اپنی زوبی کھڑی دکھائی دیتی تھی۔

ہماری گفتگو کے دوران جب بھی کوئی وقفہ آتا یا نذیر کبھی ... کسی ضرورت سے اندر جاتا تو کوئی نادیدہ قوت میری گردن کو کھڑکی کی سمت موڑ دیتی تھی پھر میری اس خالی کھڑکی سے باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ جن کا سلسلہ نذیر کی آمد اور زور سے کھنکھارنے سے ہی ٹوٹتا تھا اور میں اپنی کھوپڑی پر جھینپ جاتا تھا۔

کبھی کبھی نذیر کی بیوی کہتی۔ ''یہ آپ دونوں اکثر اس کھڑکی کی طرف کیا دیکھتے رہتے ہیں؟''

''وہاں ایک پری رہتی تھی اپنی ماں کے ساتھ۔'' نذیر ڈرامائی انداز میں کہتا۔

''پری میری طرح!'' نذیر کی بیوی ہنستی۔

''ہاں تمہاری طرح۔'' نذیر ہنستا۔ ''بس معمولی سے فرق کے ساتھ۔''

''کون سا فرق؟''

''یہی کہ وہ پری تھی..... تم چڑیل۔'' نذیر بولتا اور پھر بلند آہنگ قہقہے سے بیٹھک گونج جاتی۔

نذیر کی بیوی غصے سے پیر پٹختی ہوئی چلی جاتی اور پھر تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ واپس آ جاتی۔

☆☆☆

دن رات یونہی گزر رہے تھے۔

ابا کے انتقال کے تین سال کے بعد اماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ سب سے زیادہ زلیخا سے خوش تھیں۔

''ماجد.....'' وہ مجھے کہتیں۔ ''تجھے جنت کی حور مل گئی ہے۔ اتنی تابعدار، خاموش طبع اور ہر معاملے میں تیری رضا کو مقدم جاننے والی ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ اس کو دکھ نہ دینا۔''

''میں کیا کروں، کیا کہوں گا۔ کبھی میں نے گھر کے معاملے میں کوئی مداخلت کی ہے؟'' میں نے اماں کو ہمیشہ دلاسا دیا۔ ''اور آپ ایسی مایوسی والی باتیں نہ کیا کریں، ابھی تو آپ نے اپنے پوتوں پوتیوں کی کتنی ہی خوشیاں دیکھنی ہیں۔''

''بس تم لوگوں کی خوشیاں دیکھ لیں، یہی کافی ہے۔'' وہ ہنس کر بولتیں۔

مگر ان کے لہجے سے گھن گرج، زندگی کی رونق معدوم ہو رہی تھی اور پھر ایک رات ذرا سی گھبراہٹ ہوئی اور وہ چند ہی لمحوں میں رخصت ہو گئیں۔

☆☆☆

اماں کیا گئیں جیسے گھر میں اداسی چھا گئی۔ میرا بڑا بیٹا اپنی دادی کا بہت لاڈلا تھا اور اسی لاڈلے پن کی وجہ سے مزاج کی تیزی اس کی شخصیت کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ سولہ برس کا تھا۔ قد کاٹھ اللہ نے اچھا دیا تھا۔ پورا جوان مرد لگتا تھا۔ پھر باقی بہن بھائی بھی قدبت کے اچھے تھے۔

ایک رات میں اپنی ٹانگوں میں ..... مالش کروا رہا تھا کیونکہ اب گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا دن بھر کی چلت پھرت میں شام تک پیروں میں سوجن آ جاتی تھی۔ نیم گرم نمک ملے پانی میں تھوڑی دیر پاؤں ڈال کے سکون ملتا تھا۔ پھر رمضو جو ہمارے پاس اوپر کے کام کاج کے لیے تھا، وہ پیروں کی مالش کر دیتا تھا۔

زلیخا اندر آئی تو خاموشی سے بیٹھ گئی۔ جب اس کو کوئی خاص بات کرنی ہوتی تھی، وہ چپ چاپ آ کے پاس بیٹھ جاتی تھی اور انگلیاں مروڑتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

''کہو کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے لیے چائے لاؤں۔'' اس نے مجھ سے پوچھا اور پھر رمضو کی طرف دیکھا۔

''لے آؤ۔'' میں سمجھ گیا کہ وہ رمضو کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی۔

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے پیر سکیڑے۔ ''چلو بھئی رمضو میاں اب تمہاری چھٹی۔''

''اچھا جی.....'' وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

رمضو کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی زلیخا چائے لے آئی۔ میں نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''بولو کیا بات ہے؟''

''میں ریحان کی طرف سے فکرمند ہوں۔'' زلیخا نے دھیمی آواز سے کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟ کیا تم سے کوئی بدتمیزی کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے ریحان کے مزاج کا اندازہ تھا۔ ضدی اور منہ پھٹ تو وہ تھا ہی۔

''کہتا ہے اب نہیں پڑھوں گا۔ میری شادی کر دو۔''

''کیا.....؟'' مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ''یہ کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے..... صرف سولہ برس۔''

www.aimdayjeem.com

''انیس برس.....'' زلیخا نے میری تصحیح کی۔ ''آپ تو بچوں کی عمریں ہی بھول جاتے ہیں۔ ماشاء اللہ تحریم سولہویں برس میں ہے اور فرحان پندرھویں میں۔ سب ہی یکے بعد دیگرے جوان ہو رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے لیے کچھ سوچیں۔''

''کیا سوچوں؟ انہوں نے تو خود سوچ لیا۔'' مجھے سچ مچ غصہ آنے لگا۔ ''یعنی کہ نہ پڑھنا نہ لکھنا بس شادی کا شوق۔''

''یہ آج کل کے بچے ہیں۔ ہماری طرح نہیں۔ جب اچھے اسکولوں میں پڑھائیں گے تو فیصلہ سازی بھی سیکھیں گے۔'' زلیخا نے بڑے آرام سے کہا۔

میں نے چونک کے زلیخا کی طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو میں بڑا ٹھہراؤ اور سمجھ داری کا عنصر ہوتا تھا۔

''کیا بات ہے، آج تو تم بہت سمجھ داری کی باتیں کر رہی ہو۔'' میں نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

''باتیں تو عام سی ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔ ''یہ تو توجہ دینے پر ہے۔''

اس کا لہجہ بے حد سادہ تھا۔

''کیا تم ناراض ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھلا، ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔''

''ہاں.....'' میں نے کہا پھر ذرا ٹھہر کے پوچھا۔ ''وہ لڑکی کون ہے جس سے شادی کا کہہ رہا ہے ریحان؟''

''اس کی کلاس فیلو ہے۔ وہ بھی تیار ہے مگر اس کی ماں کہتی ہے کہ ابھی تم کچھ کام نہیں کرتے تو میں رشتہ کیسے دوں؟''

''اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔'' مجھے افسوس ہوا۔ ''میں بات کرتا ہوں اس سے۔''

''کیا بات کریں گے کہ شادی کیوں کرنا چاہتا ہے؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''پھر.....؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''جوان اولاد سے دو بدو بات کرنے کے بجائے اس لڑکی کو دیکھیں، اگر اچھی لڑکی ہے تو ہاں کر دیں۔ شادی تو کرنی ہے۔ کہیں بھی کرنی ہے، اب اگر اس کی پسند شامل ہو جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' زلیخا نے آہستہ سے کہا۔

''تم نے لڑکی دیکھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' زلیخا نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی۔ ''ایک دن لے آیا اس کو موٹر سائیکل پر بٹھا کے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آپ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے کہا امی یہ عارفہ ہے۔ میری کلاس فیلو۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' مجھے پھر غصہ آنے لگا۔

''میں کیا کرتی؟'' زلیخا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''میں نے چائے پانی کا پوچھا۔ کھانا کھلایا۔ وہ چھریرے بدن کی تیکھے نین نقش والی لڑکی ہے۔ اچھی ہے۔'' زلیخا نے کہا۔

''گھر لانے کی ہمت ہوئی ہے تو پھر مزید پیش قدمی بھی کی ہوگی۔''

''ہاں.....'' زلیخا نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ آپ ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں۔ میں نے تو سوچا ہے کہ لڑکی کی شادی بھی کر دوں۔''

''لڑکی..... کون لڑکی؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ ماتھے پر ہاتھ مار کے بولی۔ ''میں تحریم کی بات کر رہی ہوں۔ اس کا قد کاٹھ دیکھا ہے آپ نے۔ بالکل برابر کی لگتی ہے وہ میرے ساتھ۔''

''مگر اس کا اس مسئلے سے کیا تعلق؟'' میں نے کہا۔

''لڑکی ہے۔ بھائی کی محبت دیکھے گی تو کل کو اس کے دل میں بھی کوئی خیال آ سکتا ہے۔ اب کیا لڑکی اور لڑکا ہمارے لیے برابر نہیں؟'' زلیخا نے کہا۔

''بھس میں چنگاری پڑ جائے تو سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے۔ پاس پانی بھی پڑا ہو تو وہ آگ نہیں بجھاتا، ابل جاتا ہے۔''

میں حیرت سے زلیخا کو دیکھنے لگا۔ کتنی خاموش کتنی گہری تھی وہ.....

''تو تحریم کا رشتہ کہاں کرنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بھائی جان مانگ رہے ہیں..... اپنے لڑکے کے لیے۔'' زلیخا نے میرے بڑے سالے کا نام لیا۔ ''اس نے ماسٹر کر لیا ہے۔ بہت اچھی نوکری ملی ہے بینک میں۔''

''اچھا۔''

''میں تو کہتی ہوں کہ دونوں کو ساتھ ہی نمٹا دیں۔ خرچ کم ہوگا۔ دونوں کا تیل مہندی ایک ساتھ ہو جائے گا۔ پھر ایک کی برات، ایک کا ولیمہ۔'' لگتا تھا کہ سارا پلان زلیخا کے ذہن میں واضح تھا۔ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔

میں خاموش رہا اور سوچتا رہا کہ میرے ہی گھر میں، میری ہی اولاد نے مجھے کس قدر غیر متعلق کر دیا ہے اپنے معاملات سے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''جو تم کو مناسب لگے وہ کر لو۔ عملاً تو فیصلہ تم لوگ کر ہی چکے ہو۔''

www.elibayeen.com

''غصہ نہ کریں۔ بات کو سمجھیں۔'' زلیخا نے تحمل سے کہا۔ ''یہ سب میں اس لیے کر رہی ہوں کہ بات باہر نہ پھیلے۔ بلاوجہ کی بدنامی نہ ہو اور پھر جذباتی معاملات میں اولاد کے دل میں والدین کے خلاف گرہ پڑ جائے تو بہت مشکل سے جاتی ہے۔''

''میں ناراض نہیں ہوں لیکن افسوس ضرور ہے کہ میری اولاد کے لیے میرے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں ان کے لیے رشتے ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ گیا۔ ذرا چھوٹے سے بھی پوچھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی کہیں دل دے بیٹھے ہوں اور ایک دن بھائی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آپ ہی کوئی بیاہ لائیں۔''

''آپ غصے میں ہیں۔ آرام کیجیے۔'' زلیخا نے کہا۔

''بلاوجہ کی سوچوں میں خود کو ہلکان کرنے کا فائدہ؟''

''یہ تو والدین کا فرض ہے۔'' اس نے اسی تحمل مزاجی سے کہا۔ ''ذرا سچ بتائیے کہ آج تک آپ نے اپنے بچوں کے لیے رشتے کا بھی خود سے سوچا؟''

زلیخا کا سوال ایسا تھا کہ میں چپ ہو گیا۔

واقعی میں نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ مجھے بچوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ میں تو انہیں ابھی تک بچہ ہی سمجھ رہا تھا مگر وہ ہمیں سمجھا رہے تھے کہ ہم بچے نہیں ہیں بلکہ بچے کے باپ بننے کی چاہ میں ہیں۔

☆☆☆

میں نے زلیخا کے کہنے پر عارفہ کے گھر والوں کو رات کے کھانے پر بلا لیا۔ عارفہ خوش مزاج تھی مگر اس کے مزاج میں تیزی تھی۔ اس کی ماں اور باپ دونوں ہی درمیانے سے معاشی حالات میں زندگی گزار رہے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ عارفہ کی ماں اپنے شوہر پر حاوی ہے۔ مجھے عارفہ کا باپ جو کہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھا، ایک خاموش طبع شخص نظر آیا۔

عارفہ کی ماں نے کہا۔ ''بہن! میں یہ وضاحت کر دوں کہ میں جہیز دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ سچ پوچھیں تو ہمارے لیے تو آپ کی یہی نیکی ہو گی کہ آپ شربت کے پیالے پر ہی دو بول پڑھوا کے رخصت کرا لیں۔''

زلیخا بولی۔ ''ہمیں جہیز کی کوئی طلب نہیں۔ ہمیں تو بس اچھی فیملی اور ذمے دار بہو چاہیے۔''

''اب سترہ برس کی عمر میں لڑکی میں کتنی ذمے داری، کتنی سمجھ داری ہو گی بھلا آپ ہی بتائیں۔'' عارفہ کی ماں نے تڑ سے جواب دیا۔ ''بیٹیاں تو ابھی قد نکالتی نہیں ہیں کہ ہم ان پر شادی کی ذمے داری لاد دیتے ہیں۔'' اس کا لہجہ کرخت تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔'' میں نے مداخلت کی۔ ''لیکن جب یہ اٹھارہ بیس برس کے لڑکے لڑکیاں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے لگیں تو ان کو اپنی اپنی ذمے داریاں اٹھانے کی بھی عقل ہونی چاہیے۔''

''جی.....'' میری بات کے جواب میں عارفہ کی ماں ایک جی کہہ کر چپ ہو گئی۔

ان ہی باتوں میں کھانا ختم ہو گیا اور وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ریحان میرے پاس آیا۔ تھوڑی دیر وہ میرے پاس بیٹھا رہا پھر کہنے لگا۔

''شکریہ ابو۔''

''کس بات کا شکریہ؟'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

''آپ نے میری خواہش کو پورا کر دیا۔''

''اور تم نے مجھے اپنے معاملے میں شریک ہی نہیں کیا۔''

''مجھے ڈر تھا کہ آپ انکار کر دیں گے۔'' وہ آہستہ سے سر جھکا کے بولا۔

''ہاں.....'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ضرور منع کرتا مگر میں جانتا ہوں کہ تم عمر کے اس حصے میں ہو جہاں نصیحت سب سے بڑی فضیحت لگتی ہے اور سمجھانے والا بُرا ہی نہیں دشمن ہوتا ہے اگرچہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔''

وہ خاموش رہا۔ زلیخا نے کہا جو خاموش کھڑی سب سن رہی تھی۔

''اب اس خوشی کے موقع پر تو ایسی باتیں نہ کریں۔ بچے کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''اچھا۔'' میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ''اگر یہ بچہ ہے تو اس کو ابھی سمجھا دو، اگر اس نے اپنی سسرال کے درمیان میں فاصلہ نہ رکھا تو وہ عورت اس پر حاوی ہو جائے گی۔ بیوی اچھی ہو یا بری، گزارہ تم نے کرنا ہے لیکن تمہارا انتخاب.....'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''بہرحال میں اس کو معیاری نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ کامیاب رہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اتنی باتیں سنانے سے بہتر تھا کہ آپ منع ہی کر دیتے۔'' ریحان نے منہ بنا کے کہا۔

''اگر تم نے فیصلہ کیا ہے تو ڈٹے رہو۔ میری آزمت لو۔ میں تو سبزی دیکھ کر بتا دوں کہ کب تک کھلے گی اور کب بیٹھ جائے گی۔ بیٹا! انسان چند باتوں سے پہچانا جاتا ہے مگر

www.alibayeen.com

جذبات کی رنگین عینک سارے سیاہ سفید بدل دیتی ہے۔"

"اچھا... اچھا... چھوڑیں یہ باتیں! یہ بتائیں کہ چائے پئیں گے؟" زلیخا نے گھبرا کر کہا۔

"ضرور۔" میں نے کہا۔

ریحان تھوڑی دیر کھڑا اپنے ہونٹ چباتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد زلیخا نے آہستہ سے کہا۔

"جب آپ نے کہہ دیا تھا کہ انہیں بلا لو پھر بچے کا دل اپنی طرف سے بُرا کیوں کرتے ہیں؟"

"سمجھا نا میرا کام تھا۔ باقی اس کی مرضی۔ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"جب سب کرنا ہی ہے تو بچے کا دل بُرا نہ کریں۔" اس نے کہا اور تھوڑی دیر مجھے کھڑی دیکھتی رہی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

میرے بڑے سالے نے بھی اپنے بیٹے کا باقاعدہ رشتہ دے دیا۔

میں نے دونوں کی شادی کا فیصلہ سال بھر کے بعد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریحان کی خواہش تھی کہ وہ جنرل اسٹور کھولے۔ میں نے اس کو جنرل اسٹور کھلوا دیا۔ وہ تن دہی سے اس میں لگ گیا۔

اس دوران میں ہم نے فیصلہ کیا کہ مکان کی توسیع کر دی جائے۔ ہم دونوں میاں بیوی نیچے کے پورشن میں رہیں اور اوپر دو منزلیں بنا کر ریحان اور فرحان کے لیے پورشن بنا دیں تاکہ پہلے ہی دن سے وہ اپنی زندگی کی خلوت میں ہماری مداخلت سے پریشان نہ ہوں۔

"لیکن کبھی یہ نہ سوچیے گا کہ ان کا کھانا پینا بھی علیحدہ ہو۔" زلیخا نے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"شاید آپ عارفہ کی عادتوں کو پسند نہ کریں۔" اس نے کہا۔ "آج کل کی لڑکیاں زیادہ تر اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔" وہ بولی۔

"کیا تمہیں اپنی تحریم سے کبھی کوئی ایسا خدشہ لاحق ہوا کہ وہ اپنے میاں کو لے کر الگ ہو جائے گی؟" میں نے سوال کیا۔

وہ تیزی سے بولی۔ "میری تحریم ایسی نہیں۔"

"خالی تمہاری تحریم کا مسئلہ ہی نہیں۔ اس میں تمہاری تربیت کا بھی ہاتھ ہے۔ جو وہ اس نہج پر نہیں سوچے گی۔ یہی فرق ہے جو میں واضح کرنا چاہتا تھا۔ شکر ہے کہ تم نے خود محسوس کر لیا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

میں نے پھر کہا۔ "تمہیں ایک بات بتاؤں۔"

"جی....." اس نے آہستہ سے کہا۔ "کہیے۔"

"والدین اولاد کو کبھی الگ نہیں کرتے۔ الگ ہونے کی خواہش کے تانے بانے بیوی کی سوچ سے جنم لیتے ہیں۔ عورت کی گھر کی خواہش اور حاکمیت کی آرزو بری بات نہیں لیکن یہ چیزیں وہی عورت سمجھتی ہے جس نے اپنا آپ مار کے زمانے کی سختیاں جھیل کر حکمرانی کے گر سیکھے ہوں ورنہ پھر نسلیں بے کسے شتر بے مہار کی صورت والدین کی ہی نہیں، اپنی بھی زندگی حرام کر لیتی ہیں۔"

"آپ اتنا زیادہ گہرا نہ سوچا کریں۔" زلیخا دھیمے سے ہنسی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پتا نہیں میرے دیکھنے میں کیا تھا کہ اس کے رخسار تپ گئے۔

"کیا بات ہے، آج تو آپ بہت عالموں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں؟"

"تم اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو رہا ہو۔

"آج تو آپ بہت عجیب سی باتیں کر رہے ہیں۔ جن باتوں کو کبھی نہیں کہا، اب ان کو کہنے سے کیا حاصل؟" اس نے دھیمے سے کہا۔ "میری عادت نہ بگاڑیے۔ میں ایسے ہی بھلی ہوں۔ محبت کی عادت اور خیال کا دھیان رہنے لگے تو پھر جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

کیا میں نے زلیخا کو سمجھنے میں غلطی کی تھی یا وہ رازوں بھری پوٹلی تھی جس کو میری توجہ کھوج رہی تھی؟

میں سوچتا رہ گیا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ریحان اور تحریم دونوں بہن بھائی کی شادیاں کر دیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ زلیخا نے کیسے اور کس طرح تیاریاں کیں۔ مجھے تو بس پیسے دینے سے کام تھا مگر ایک کام اس نے بڑا عجیب کیا۔ اس نے اپنی خریداری کی فہرست میں فرحان کو بھی شامل رکھا۔ پتا نہیں کیا کیا چیزیں اس نے فرحان کی ہونے والی بیوی کے لیے خرید لی تھیں۔

"کیا ہوا تمہیں جو ابھی سے تم فرحان کے لیے بھی

www.aiitbayjeem.com

تیاریاں کر رہی ہو؟''

''فرحان میرا لاڈلا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے لیے بھی جلدی سے دلہن لے آؤں۔''

''اب اس طرح نہ کرو۔ تمہیں تو بس شادیوں کا شوق ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ بچوں کی شادی سے فارغ ہو کر میرے لیے دلہن ڈھونڈنا شروع کر دو۔'' میں نے مذاق میں کہا۔

وہ بولی۔ ''آپ نے کبھی اپنے دل کی بات مجھے بتائی ہی نہیں۔ ورنہ میں تو یہ بھی کر گزروں۔''

''اچھا.....'' میں نے اسے مزید تنگ کرنے کی نیت سے کہا۔ ''کیا آدھا آدھا بنوارا قبول کر لو گی؟''

''بنوارے کی میں قائل نہیں۔'' اس نے اپنی روایتی نرمی سے کہا۔ ''میں تو سارا کا سارا اسے سونپ دوں گی۔ جب عورت مرد کا بنوارا کرتی ہے تو مرد امتحان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انصاف کے خوف میں پڑ جاتا ہے۔ میں تو آپ کو کسی امتحان، کسی خوف میں ڈالنا ہی نہیں چاہتی۔''

''تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے؟'' میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''تم نے کہا نہیں کبھی۔''

''ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''جو محسوس نہ کیا جا سکے، اس جذبے کو چیخ چیخ کر بیان کرنے سے کیا حاصل؟'' زلیخا نے کہا۔ ''میں اگر آپ کو نہیں کہہ پائی تو آپ بھی تو مجھ کو سمجھ نہ پائے۔''

میں ہکا بکا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ وہ زلیخا تو نہ تھی جو میرے ساتھ رہتی تھی۔ یہ تو کوئی اور زلیخا تھی۔ نئی نئی سی۔ مگر میں نے تو اس کو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میرے ساتھ جسمانی طور پر زلیخا اور جذباتی طور پر آج بھی زبیدہ رہتی تھی۔ ذوبی رہتی تھی۔

یہ میں کہاں الجھا ہوا تھا؟ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرا خالی تھا۔ زلیخا باہر جا چکی تھی اور کمرا صرف میرے خالی وجود سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

میں نذیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب اچانک نذیر نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا چلا؟''

''کیا.....؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اونچا مکان پھر سے آباد ہونے والا ہے۔''

''کون سا اونچا مکان؟'' میں نے پوچھا۔ گلی میں کئی گھر دو منزلہ بن چکے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے؟'' نذیر ہنسا۔ ''جیسے جانتا نہیں یا مجھے الو بنا رہا ہے۔''

''کیا؟'' اچانک میرا دل دھڑکنے لگا۔

نذیر نے قہقہہ لگایا۔ ''آ گیا نا اپنی اصل پہ.....''

''کب آئے وہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے صفائی ہو رہی ہے مگر تیری کھڑکی ابھی نہیں کھلی۔'' وہ بولا۔

میں نے گردن گھما کے دیکھا۔ نذیر کی بیٹھک سے وہ کھڑکی آج بھی نظر آ رہی تھی۔ کھڑکی ہنوز بند تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر گردن واپس گھمائی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے گہری سانس بھری۔

''کیا پرانی محبت یاد آ رہی ہے؟''

''محبت کہاں یار۔'' میں نے پھر گہری سانس بھری۔ ''وہ تو بس ایک کسک، ایک ناسور ہے۔ ایسا گھاؤ کہ جب بھی بھرنے لگتا ہے، یادوں کے پنجوں سے کھرچ کھرچ کے سرخ کر لیتا ہوں۔''

''یار تُو تو بڑی فلمی سی باتیں کرنے لگا ہے۔''

''یار! یہ جو محبت ہے نا، یہ لفظ سکھا دیتی ہے ورنہ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں آٹھویں پاس ہوں۔ نہ مجھے مطالعے کا شوق اور نہ ہی.....''

میں چپ ہو گیا۔ بات ادھوری رہ گئی۔ نذیر کی بیوی اندر داخل ہو رہی تھی۔

''میں کہتی ہوں کہ یہ تم نے کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ تم باپ بیٹوں کا روز کا کوئی نیا فساد کھڑا ہوتا ہے۔'' نذیر کی بیوی نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی مگر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اب کیا نیا مسئلہ بنا لیا ہے اس نے؟'' نذیر نے ایک گہرا کش لے کر سگریٹ کا ٹوٹا نیچے پھینک کر جوتے سے مسلا۔

''کیا یہ سامنے ایش ٹرے نظر نہیں آ رہی جو نیچے گند ڈال رہے ہو؟'' اس نے نذیر کی حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا۔

''گند؟'' نذیر نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

''میرے سامنے تو تم ہو۔''

''تم نہیں سدھرو گے۔'' دفعتاً وہ ہنس پڑی اور پھر میری طرف مڑ کے بولی۔ ''کبھی اس سازشی بڈھے کو بھی سمجھاؤ۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔

مجھے معلوم تھا کہ اب ان کے درمیان وہی پرانا قصہ دہرایا جائے گا۔ جب وہ غصے میں ہوتی تھی تو نذیر کو سازشی بڈھے کا لقب دیتی تھی اور جب موڈ میں ہوتی تھی تو بھی اسے سازشی بڈھا کہتی۔

نذیر کی اور اس کی شادی کا سارا معاملہ ایک سازش

www.alhidayeen.com

تھا۔ نذیر میری طرح طبیعت کا خاموش نہیں بلکہ کھلا ڈلا آدمی تھا۔ اس کو اپنی ماموں زاد پسند تھی جو کہ ایک بیکری والے کی بیٹی تھی۔ جس کا باپ یعنی نذیر کا ماموں اس کباڑیے کی اولاد سے شادی کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''تو کیا ہوا ہم کباڑیے کی اولاد ہیں تو پرانی چیزیں بیچتے اور خریدتے ہیں مگر ہمارا کام کھلا اور بے ایمانی سے پاک ہے۔ تیرا باپ تو بھوسی نکروں کی ڈبل روٹی بنا کے بیچتا ہے۔ دودھ سڑ جائے تو ربڑی بنا دیتا ہے۔ کیا ہے تیرا باپ۔ معاشرے کا ناسور۔ بدبخت۔'' نذیر چلا کے کہتا۔ ''تو میرے ساتھ بھاگ چل۔''

''کہاں؟''

''جہاں کوئی نہ ہو۔'' نذیر نے فرمایا۔

''نکاح کون پڑھائے گا تیرا باپ یا یہ میسنا۔'' اس کی محبوبہ نے بیک وقت نذیر کے باپ اور مجھے رگیدا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''مجھے اس معاملے میں شامل مت کرو۔'' میں نے احتجاج کیا۔

وہ دونوں خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔

ان کے اس اچانک خاموش ہو جانے سے مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ ''کیا بات ہے، تم دونوں مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟''

''تم ہی ہمیں ملا سکتے ہو۔'' نذیر نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''یہ کیا کرے گا؟'' نذیر کی بات پر اس نے کہا۔

''میں.....'' میں نے گھبرا کے کہا۔ ''میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم پتھر مار کے بیکری کا شیشہ توڑ سکتے ہو۔ دھمکی دے سکتے ہو اور پتا ہے.....'' نذیر نے اچانک پراسرار انداز اختیار کر لیا۔

''تم مجھے ان لڑائی جھگڑوں سے دور رکھو اور پھر مجھے اس سے شادی تھوڑی کرنی ہے، یہ تو تم دونوں کا مسئلہ ہے۔'' میں نے فوراً بہانہ تراشا۔

''بس سب کچھ میرے ذہن میں آ گیا ہے۔'' اچانک نذیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ماموں ایک نمبر کا ڈرپوک ہے۔ بس ہمیں اسی سے فائدہ اٹھانا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ اپنے باپ کے اس طرح کے تذکرے پر جز بز ہوئی۔

''تم کل کہہ دینا کہ میں کالج نہیں جاؤں گی۔'' نذیر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ تنک کے بولی۔ ''میں اپنی پڑھائی چھوڑ نہیں سکتی۔ ممکن ہی نہیں۔''

''سنا تو کر بندر کی بچی۔'' نذیر غصے سے بھنا کر بولا۔ ''پہلے ہی نخرے شروع کر دیتی ہے۔''

''بکو مت۔'' وہ غصے سے بولی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم کل کالج نہ جانا۔ ماموں پوچھیں تو کہہ دینا لیقے کے بندے میرا پیچھا کرتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اور بس۔ دو چار دن کالج نہ جانا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔ ''اور لیقے کا نام کیوں لے رہے ہو؟ تم کو معلوم ہے کہ لیقا کون ہے۔ سبزی منڈی کا نامی گرامی بدمعاش ہے۔ چار کیس کے مقدمے چل رہے ہیں اس پر۔'' میں نے نذیر کے منصوبے پر فوراً اعتراض کیا۔

''تو لیقے کو بتانے کون جائے گا؟ میں، تم یا..... یہ.....'' اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ''ماموں ڈرپوک..... جس کی زبان میں تو دم ہے مگر دل نہیں چڑیا سا ہے!''

نذیر اپنے ماموں کی حقیقت جانتا تھا۔

''لیکن اس سے ہوگا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' نذیر نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اب تمہارا کام شروع ہوگا۔ تم نے پہلے دن پتھر مار کے شیشے توڑ دینے ہیں اور پھر دوسرے دن ایک خط ماموں کو ارسال کر دینا۔''

''کیا مطلب؟ کیا میں کوئی قربانی کا بکرا ہوں؟'' میں نے گھبرا کے کہا۔ ''اگر ماموں نے دیکھ لیا تو پھر..... نہیں یار..... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''تو کیسا یار ہے؟ یار کے لیے تو لوگ ہنستے مسکراتے پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔''

''وہ اور یار ہوں گے۔'' میں نے صاف انکار کر دیا۔

''ارے سن تو لو۔'' اچانک رخشندہ نے لجاجت سے کہا۔ ''ایک ذرا سی نذیر کی بات ماننے سے کیا بگڑ جائے گا؟''

''اور کیا..... رات تین بجے کس کو پتا کہ کون بیکری کے شیشے توڑ گیا۔'' نذیر نے مجھے اور رخشندہ کو دیکھ کر فوراً کہا۔ ''بس تم نے پتھر کے بعد ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے اور بس۔''

''کیا اس کے بعد بھی کوئی کام ہوگا؟'' میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''جب نیا شیشہ لگ جائے تو پھر ایک اور پتھر مار دینا۔'' نذیر نے اطمینان سے کہا۔

''اور اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی تو؟'' میں نے پریشان ہو کے پوچھا۔

www.aiidayjeem.com

''ماموں اور پولیس میں رپورٹ لکھوائیں گے، تھانے جائیں گے؟ ان کا تو تھانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہی دم نکلتا ہے۔''

رخشندہ نے باپ کے بارے میں اس قسم کی بات سن کر ناگواری کا اظہار کیا اور چائے کا کپ کھینچ کر نذیر کو مارا جو نذیر کے ماتھے پر لگا اور گومڑ نکل آیا۔

''شرم نہیں آتی مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ اپنے مستقبل کے مجازی خدا پر۔'' نذیر نے چیخ کر کہا۔

''اور تمہیں غیرت نہیں آتی۔ اپنے اکلوتے ماموں کا اس طرح تذکرہ کرتے ہوئے..... بے حیا۔''

رخشندہ نے اپنے حملے کا جواز پیش کیا اور بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

نذیر ماتھا سہلاتے ہوئے ہنسنے لگا۔

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جو نذیر نے سوچا تھا۔

رخشندہ نے دوسرے دن کالج سے آکے اپنا بیگ بیڈ پر پھینکا اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ماں سراسیمہ اس کے پاس آئی۔

رخشندہ نے کہا۔ ''آج مجھے لیچے کے غنڈوں نے چھیڑا ہے۔''

''کیا.....؟'' ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''کب؟ کیسے؟ کس طرح؟'' اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''کل میرے ساتھ چلنا اور دیکھ لینا۔'' رخشندہ روتے ہوئے چلا کے بولی۔

''م..... میں کیوں جاؤں؟'' رخشندہ کی ماں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''بس کل سے تمہارا کالج جانا بند۔''

اسی وقت گھر میں ہنگامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ رخشندہ کے باپ سراج نے کہا۔ ''دیکھو بیٹی! اس کا کیا ہے وہ غنڈا ہے، قاتل ہے، دشمنوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دیتا ہے۔''

''تو کیا میں اس کے ڈر سے کالج چھوڑ دوں؟ کل کہیں گے کہ دنیا چھوڑ دو۔'' رخشندہ نے غصے سے کہا۔

''کیا واہی تباہی بک رہی ہو۔'' ماں نے اسے ڈانٹا۔

''میں ہی بری ہوں نا۔ سب کا مجھ ہی پر بس چلتا ہے۔'' رخشندہ نے رونا شروع کر دیا۔ رخشندہ کی ماں نے کلس کے کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں کہ لڑکی کے ہاتھ پیلے کرو۔ اپنے شوہر کی ذمے داری بنے ہماری جان چھوڑے۔''

''رشتے ملتے کہاں ہیں؟'' رخشندہ کے باپ نے کہا۔

''اب تمہیں نظر نہیں آرہا تو میں کیا کروں۔ کب سے رشتہ مانگ رہی ہے نذیر کی ماں۔''

''وہ منحوس، صورت حرام۔'' رخشندہ کے باپ نے غصے سے کہا۔ ''میں مر جاؤں گا مگر اس کباڑیے کی اولاد کو اپنی بیٹی نہ دوں گا۔ منحوس سارا دن کچرے میں گھسا رہتا ہے۔ عید بقر عید کوئی دن ہے جو اس نے کباڑ خانے سے باہر گزارا ہو؟''

''تم جانو تمہارا کام۔'' رخشندہ کی ماں نے تنک کے کہا۔ ''کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو سر پر ہاتھ رکھ کے رونا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' رخشندہ کے باپ نے کہا اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن رخشندہ کالج نہیں گئی۔

☆☆☆

رات کو تین بجے کے قریب میں نے ایک زوردار پتھر بیکری کے شیشے پر دے مارا جہاں بلب کی روشنی میں ڈبل روٹی، کیک اور پیسٹریاں چمک رہی تھیں۔

شیشہ ایک زوردار چھناکے سے اندر جا کے گرا اور کرچی کرچی ہو گیا۔ رخشندہ کے باپ نے کچھ ہی دن پہلے یہ شیشہ لگوایا تھا۔

شیشہ توڑ کر میں نے جا کر رخشندہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سب ہی کو معلوم تھا کہ میں رات میں منڈی کے لیے نکلتا تھا لہٰذا اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

دروازہ رخشندہ کے بھائی نے کھولا۔ اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں اور چہرہ غصے سے بھرا ہوا۔ واضح طور پر وہ میری زوردار دستکوں کے باعث گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے ابا کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سو رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اتنی رات میں کیا مسئلہ ہو گیا تمہیں؟''

''مسئلہ مجھے نہیں تمہیں ہوا ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگ نیند میں مزے اڑا رہے ہو اور تمہاری بیکری کے کسی نے شیشے توڑ دیے ہیں۔''

''کیا؟'' اس کی نیند ہوا ہو گئی۔

''ابا.....'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''بیکری میں ڈاکا پڑ گیا ہے، جلدی اٹھو۔''

ذرا کی ذرا میں پورا گھر اٹھ بیٹھا۔ رخشندہ کے دونوں بھائی رخشندہ اور اس کا باپ دروازے میں جمع ہو گئے۔

''کس نے ڈاکا ڈالا؟'' رخشندہ کے باپ نے کہا اور مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے کیا پتا۔ میں نے تو بیکری کا شیشہ ٹوٹا ہوا دیکھا تو

www.aiilaayeem.com

بتا دیا۔''

میں نے دیکھا کہ رخشندہ نے عقب سے اپنی ماں کے کان میں کوئی سرگوشی کی تھی۔ رخشندہ کی ماں نے میاں سے کہا۔

''ارے وہی ہوں گے لفنگے بدمعاش فیقے کے ساتھی۔ بیکری لوٹ کر لے گئے۔''

مجھے ہنسی آنے لگی تھی مگر میں نے بڑی مشکل سے ضبط کی۔

رخشندہ کی ماں کے انکشاف نے رخشندہ کے باپ کا چہرہ زرد کر دیا۔

''ہو نہ ہو، انہی کی کارروائی ہے۔'' رخشندہ کی ماں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ''آج کالج نہیں بھیجا تو انہوں نے یہ انتقامی کارروائی کر ڈالی۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ محلہ چھوڑ کے ہم نواب شاہ چلتے ہیں۔''

''پاگل ہو گئی ہو کیا۔'' رخشندہ کے ابا نے درمیان میں ایک ناقابلِ اشاعت گالی فٹ کی۔

میں نے کہا۔ ''سارا قصہ یہیں کھڑے کھڑے نمٹاؤ گے یا بیکری کی بھی خبر لو گے۔''

''چلو.....'' رخشندہ کا بڑا بھائی کمبل لپیٹے باہر نکلا۔

''دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟''

رخشندہ کے ابا غصے میں تھے اور ڈر بھی رہے تھے۔ مجھے ان کی اس حالت کو پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جس وقت نذیر نے کہا تھا کہ ماموں تو ڈرپوک ہیں، اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ واقعتاً اتنے چھوٹے دل کے ہیں۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔'' رخشندہ کے باپ نے میرا بازو پکڑا۔

''میں کیا کروں گا جا کے.... یہ تو تم لوگوں کا مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے دیکھا تو آ کے بتا دیا۔ محلے داری کا حق تھا ادا کر دیا۔''

''تم نذیر کے دوست ہو نا۔'' رخشندہ کے بڑے بھائی نے کہا۔ ''وہ ہمارا ماموں زاد ہے، بھائی ہے تو تم بھی ہمارے بھائی ہوئے۔ ذرا دیر میں چلے جانا۔'' اس کا سانولا چہرہ مزید سانولا ہو گیا تھا۔

مجھے ہنسی تو بہت آئی۔ یہ وہی تھا جو کہ ہمیشہ ہماری ٹوہ میں لگا رہتا تھا اور اس نے کبھی بھی ہم سے ایک محلے میں رہتے ہوئے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ بیکری کی وجہ سے اس کا رویہ دوسروں سے بڑی ہتک والا ہوتا تھا۔

میں دل ہی دل میں خوب مزے لے رہا تھا۔ ہم بیکری تک پہنچے تو ایک بلی اور ایک کتا اندر موجود تھے۔

رخشندہ کے باپ نے پھر زیرِ لب ایک ناقابلِ اشاعت گالی کا اجرا فرماتے ہوئے تالا کھولا اور اندر کی لائٹیں جلائیں۔

سامنے ہی وہ بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس سے میں نے شیشہ توڑا تھا اور قریب ہی ایک کاغذ پڑا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' رخشندہ کے چھوٹے بھائی نے وہ کاغذ اٹھایا اور بلب کی روشنی میں اس کو کھولا۔

اس پر ٹیڑھے میڑھے لفظوں میں لکھا تھا..... ''کب تک اندر رکھو گے؟ ہم اٹھا کے لے جائیں گے۔'' تحریر سے لگ رہا تھا جیسے کسی بچے کی لکھائی ہے۔

''یہ..... یہ کیا ہے ابا؟'' رخشندہ کے بڑے بھائی نے سوال کیا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید کہتا، دھپ کی آواز آئی تو ہم سب نے چونک کر دیکھا۔ رخشندہ کا باپ گھبرا کے فرش پر گر کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس کارروائی کا نتیجہ آئندہ دو دن میں سامنے آ گیا۔ جب نذیر کا نکاح رخشندہ سے فقط شربت کے گلاس پر ہو گیا اور بیکری میں شیشوں کی جگہ پہلے کی طرح شٹر لگ گئے۔

یہ تھی وہ سازش جس کی وجہ سے رخشندہ ہم دونوں کو سازشی کہتی تھی۔ حالانکہ اس سازش کو اندرونِ خانہ ہوا دینے میں وہ پوری کی پوری شامل تھی۔ مگر اس سب کے باوجود اس کو کھڑکی والے معاملے کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔

بقول نذیر کے..... ''یار تیرے معاملے کو میں کیسے کسی کو بتا سکتا ہوں۔ تو تو دوست ہے۔ تیری ہر بات امانت ہے۔''

☆☆☆

ایک بار پھر میری راتوں کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ میں نے آہستگی سے زلیخا کی طرف دیکھا، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

میں دھیمے سے بنا آواز پیدا کیے اٹھا اور اپنی الماری کو آہستہ سے کھولا۔ سب سے نچلے حصے میں وہ ڈبا رکھا ہوا تھا جس سے میری تنہائیاں آباد تھیں۔ وہی ڈبا جو مجھے زبیدہ، میری زوجہ مجھے تحفے میں دے گئی تھی جس میں سمسن..... ڈیلائیلا کی کہانی اور اس کی چوٹی رکھی ہوئی تھی۔ وہی چوٹی جس کی خوشبو آج بھی برقرار تھی۔

میں نے احتیاط سے کپڑا ہٹایا اور ڈبا کھولا۔ کتاب بھی ویسے ہی رکھی تھی اور اس پر رکھی ہوئی چوٹی کی رنگت بھی ویسی ہی تھی جیسے برسوں پہلے تھی۔ یوں جیسے اس پر وقت ٹھہرا ہوا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یادیں مر کیوں نہیں جاتیں؟ بوڑھی ہو کر ذہن سے اتر کیوں نہیں جاتی ہیں؟

میں نے دھیمے سے، بہت آہستگی سے اس چوٹی کو

www.aiidayjeem.com

اپنی انگلیوں سے چھوا۔ آنکھیں بند کر کے بولا۔ ''تمہارے بال کتنے خوبصورت ہیں۔''

زوبی ہنسی۔ ''یہ جملہ تم ہزاروں بار کہہ چکے ہو۔''

''اور کیا کہوں؟'' میں نے جذب کے عالم میں کہا۔

''تم نے مجھے جاتے ہوئے لفظ دیے کہاں؟''

''تو تم بولتے..... کچھ کہتے؟'' اس کی آواز میں ویسی ہی نرمی تھی۔

''کچھ کہوں گا تو تم پھر وہی کرو گی۔'' میں نے کہا۔

''کیا کروں گی؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''اپنا منہ چھپا کے دروازے کو کھلا چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی۔''

وہ ہنسنے لگی پھر اسی طرح منہ چھپا کے اندر بھاگ گئی۔ میں اس دن کی طرح ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔

اچانک زلیخا نے نیند میں کروٹ لی اور میرے تکیے کو اپنے قریب کھینچا اور اس پر ہاتھ رکھ کر پھر سو گئی۔

میں نے آہستہ سے ڈبا بند کیا۔ الماری کے نچلے خانے میں رکھا اور الماری کا پٹ دھیرے سے بند کر کے اپنے بیڈ پر آ گیا اور سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر چھت کو گھورنے لگا۔

پتا نہیں یہ کیسا چور ہے جو دل میں گھس کے، بکل مار کے بیٹھ جائے تو نکلنے کا نام تک نہیں لیتا۔ کیوں انسان اتنا بے بس اور بزدل ہے کہ اپنے ہی اندر چھپے چور کو باہر نکال نہیں پاتا۔

بہت سارے سوالات دماغ کے گنبد میں چکرانے لگے۔ بہت سارے سوال سوالی بن کے دل کے دروازے کے باہر لائن لگا کے بیٹھ گئے۔

کاش ہم اپنے اپنے چور کو نکال سکتے اور پوچھ سکتے کہ کیا کرتے رہتے ہو..... ہمیشہ کیوں بے چین کرتے ہو ہم کو؟

مگر کوئی جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جلتی آنکھیں چھت کو گھورتے گھورتے موند جاتی ہیں۔ ایسے میں بس ایک ہی دیوی ہے جو شانتی دیتی ہے، تسلی دیتی ہے اور اپنی نرم دبیز ریشمی تھپتھپاہٹ سے آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ دماغ کو مفلوج کر دیتی ہے، حسیات کو سن کر دیتی ہے۔

مہربان دیوی..... نیند کی دیوی.....

☆☆☆

برسوں کی عادت تھی۔ رات چاہے کتنی ہی دیر میں سونے کے لیے لیٹوں، آنکھ اپنے وقت پر تین ساڑھے تین بجے کھل جاتی تھی۔ میرے اٹھتے ہی جیسے کسی لاشعوری دستک سے زلیخا بھی بیدار ہو جاتی تھی۔ میرے لیے ناشتا بناتی۔ چائے تیار کرتی اور مجھے بالکل اسی طرح رخصت کرتی جیسے ابا کو اماں رخصت کرتی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اماں ساتھ ساتھ باتیں کرتی جاتی تھیں اور زلیخا چپ چاپ کام کیے جاتی۔ بس اس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بولتی رہتی تھی۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہ کر رہی ہوں۔ بس ناشتا لا رہی ہوں۔

میں حسب معمول گھر سے نکلا۔ گلی نیم اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ زبیدہ کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا، زبیدہ کا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح اسے دیکھتا ہوا گزر گیا۔ شاید وہ لوگ ابھی تک منتقل نہیں ہوئے تھے۔

منڈی میں خاصی تیزی تھی۔ ہماری ملکی پیاز کی فصل کچھ خراب ہو گئی تھی اور کچھ بیرون ملک بھیجے جانے کے سبب پیاز کی قلت تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہو گا۔ میرا برسوں کا تجربہ کچھ معاملات کی بو پہلے ہی سونگھ لیتا تھا۔

جو پیاز مہینے بھر پہلے دکاندار تیس روپے کلو بیچ رہے تھے، اب وہ منڈی میں آڑھت کے ریٹ تھے اور باہر پیاز اسی سے ایک سو دس روپے کلو کے درمیان بک رہی تھی۔ میرے پاس پیاز کی اچھی خاصی مقدار تھی۔ میرے گودام میں چار پانچ ہزار بوریاں موجود تھیں۔

میں منڈی پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پندرہ دنوں میں پیاز کی سپلائی بحال ہونے والی ہے جس کے نتیجے میں پیاز کی قیمت گرے گی۔

''دو ہزار بوریاں آج لازمی نکال دو۔'' میں نے اسلم سے کہا۔

''مگر ابھی تو نئی فصل آنے میں دو مہینے ہیں۔'' شبیر آڑھتی نے تعجب سے پوچھا۔

''گودام میں جگہ بھی تو چاہیے۔'' میں نے شبیر آڑھتی کو جواب دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔

بارہ روپے کی خرید پیاز چالیس میں نکلے تو پھر منافع کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ مسئلہ صرف کاروباری سوجھ بوجھ کا ہوتا ہے۔

میں نے چائے منگوائی اور بن کے ساتھ پینے لگا۔

صبح کے نو بج رہے تھے۔ میں پیسے لے کر گھر نہیں جاتا تھا۔ منڈی میں بنے ہی بینک میں جمع کرا دیتا تھا۔ بعض اوقات لاکھوں روپے ہوتے تھے۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ نقدی لے کر سفر کیا جائے، چاہے وہ سفر کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔

میں نے کچھ سبزیاں وغیرہ لیں اور گھر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے سبزیاں رکھیں اور ہاتھ منہ دھو کر جو بستر پر لیٹا تو بے خبر سو گیا۔

www.aiitbayjeem.com

میری آنکھ کھلی تو زلیخا ریحان سے کہہ رہی تھی۔ ''جاؤ وہاں سبزی دے کر آؤ۔''

''جی امی ....'' ریحان نے کہا اور سبزی اٹھا کے باہر نکل گیا۔

زلیخا بھی اماں کی طرح سبزیاں آس پاس کے گھروں میں بھجوا دیا کرتی تھی۔

میں نے بستر پر لیٹے لیٹے پکار کے کہا۔ ''نذیر کے ہاں بھی بھجوا دینا۔''

''لو بھلا، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' زلیخا دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''بھئی کمال ہے کہ تم سب یاد رکھتی ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''پہلے چائے لاؤں یا پھر کھانا؟''

''نہیں، پہلے چائے لے آؤ۔'' میں نے بازو پھیلا کے انگڑائی لی۔ ''صبح کا آغاز تمہارے ہاتھ کی چائے سے کروں تو دن اچھا گزرتا ہے۔''

''صبح .....'' زلیخا نے کہا۔ ''ذرا گھڑی دیکھیں، تین بج رہے ہیں۔''

''مگر ہماری تو اب صبح ہوتی ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''لگتا ہے آج کی آڑھت بہت اچھی ہوئی ہے جو آپ کا مزاج اچھا ہے۔''

''تو میں تم سے لڑتا کب ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو .....'' وہ جیسے پھر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' وہ دھیرے سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

دفعتاً مجھے یاد آیا کہ نذیر سے مل کر پوچھوں کہ کیا وہ لوگ آ گئے؟ نذیر کا زیادہ تر وقت تو بیٹھک میں ہی گزرتا تھا۔

میں اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو مٹر قیمہ اور گرم گرم روٹیاں تیار تھیں۔ کھانے کی خوشبو ایسی تھی کہ میری بھوک چمک گئی حالانکہ تھوڑی دیر پہلے میرا کھانے کا ارادہ نہیں تھا۔

میں نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ زلیخا چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ خالی پلیٹیں دیکھ کے بولی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی اس لیے میں جلدی سے گرم گرم روٹیاں اتار لائی۔''

میں نے سر ہلایا۔ اس نے چائے سائڈ ٹیبل پر رکھی اور پوچھا۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟''

''میں کہاں جاؤں گا۔ بس ذرا دیر کو نذیر کی بیٹھک میں جاؤں گا۔''

''آپ کے دوست نہیں بدلتے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں بھلا دوست بھی بدلنے کی چیز ہوتے ہیں کیا۔ ویسے بھی نذیر میرا بچپن کا دوست ہے بس اس سے دل مل گیا ہے۔''

''صحیح کہتے ہیں آپ۔ جب دل مل جائے تو پھر دوسرے کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟'' اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں خاموش رہا۔

اب بھلا اس کی بات کا میں کیا جواب دیتا۔ سچ بھی یہی تھا کہ نذیر کے علاوہ میرا کوئی دوست تھا بھی نہیں۔ باقی محلے میں سلام دعا تو سب سے تھی لیکن میرا اٹھنا بیٹھنا نذیر کے ساتھ ہی تھا۔

میں چائے پی کر نذیر کی طرف چل دیا۔ وہ حسب معمول بیٹھک میں ہی تھا۔ وہ اپنا کباڑی کا کام بارہ بجے تک نمٹا لیتا تھا۔ ویسے بھی اس کے دو شاگرد سارا دن وہاں ہوتے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

''اب اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تجھے ہی یاد کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم آؤ گے۔''

''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔''

''نہیں، جہاں چاہ وہاں راہ ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔

''آج بھی گھر میں صفائی کا کام ہو رہا ہے۔ ایک بہت بوڑھی سی کلوٹی اندر باہر آتی جاتی ہے۔ باقی تو کوئی نظر نہیں آیا۔'' نذیر نے رپورٹ دی۔

''میں نے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔''

''اچھا .....'' نذیر نے حیرت سے کہا۔ ''چلو تم نے پوچھا ہی نہیں، میں نے بتایا ہی نہیں اور آگے بھی نہیں بتاؤں گا کیونکہ بھلا تمہیں کیا دلچسپی۔'' وہ بولا اور پھر ہنسنے لگا۔

میں خجل سا ہو گیا۔ نذیر نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور کہنے لگا۔

''یار! تو ذرا بھی نہیں بدلا۔ ساٹھ برس کا ہو رہا ہے اور آج بھی اس کے ذکر سے تیرے گالوں پر لالی دوڑ جاتی ہے۔ عجیب مرد ہے تو۔'' اس نے کہا پھر ذرا ٹھہر کے بولا۔

''نہیں یار! آج کے تناظر میں جملہ درست کر لوں۔ عجیب بڈھا ہے تو .....'' وہ پھر ہنسنے لگا۔

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''مجھ سے زیادہ

www.urdtrayjeem.com

بڈھے تو تم ہو۔ مجھ سے دو چار سال بڑے ہو۔ میں تو ستاون کا ہوں، تم باسٹھ برس کے سٹھیائے ہوئے بڈھے۔'' میں نے کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہنسنے لگے۔

''یار! جب میں چھوٹا تھا تو ابا سے کہتا تھا کہ ابا تم اتنے برسوں سے ایسی جگہ رہ رہ کے تھک نہیں جاتے، اکتا نہیں جاتے۔ تب وہ بڑے پیار سے کہتے تھے..... نذیرے بیٹا جب تو ہماری عمر کو پہنچے گا تو تجھے پتا بھی نہیں چلے گا بچوں کی دیکھ بھال میں، پالنے پوسنے میں وقت کیسے دن رات کو گلا دیتا ہے۔ جیسے میرے ماہ و سال گزر گئے۔ ویسے ایک دن تم بھی سوچو گے ہائے..... اتنا وقت کیسے گزر گیا۔''

''سچ کہتے تھے چاچا جی.....'' میں نے کہا۔ ''میں بھی آج سوچتا ہوں کہ ابھی کل ہی کی بات تھی۔ میں ابا کے ساتھ منہ اندھیرے موٹر سائیکل پر سبزی منڈی جاتا تھا اور اب دیکھو، راستے وہی رہے مگر ہم دن رات کی ریس میں پس گئے۔''

''ہاں یار.....'' نذیر نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ ''بس ایک چیز نہیں بدلی۔ رخشندہ مجھے آج بھی پہلے جیسے دکھتی ہے۔ ویسے ہی شوخ، شریر، چلبلی، جملے باز۔''

''کتنے خوش قسمت ہو کہ کہیں وہ مل گئی جس کو تم نے چاہا۔''

''یار! زلیخا بھابی بھی بہت اچھی ہے۔'' نذیر نے کہا۔

''ہاں، اس میں کیا شک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن نہ ملنے کی کسک اور تڑپ شاید تعلق کو مضبوط کر جاتی ہے۔ نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی تسلی۔ نہ قول نہ قرار..... بس دل کے سادے کاغذ پر اپنا نام ایسا لکھ گئی کہ مٹانا چاہوں تو بھی نہیں مٹ سکتا۔''

اچانک کسی نے بیٹھک کے پٹ کو تھپتھپایا۔

میں نے اور نذیر نے چونک کر بیک وقت دیکھا۔ وہاں ایک گہری سانولی رنگت کی عورت کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وہاں سے آئی ہوں۔'' اس نے انگلی کے اشارے سے کھڑکی والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا.....'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہ گھر کی بتی جلتے جلتے اچانک بند ہو گئی ہے۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اکیلا گھر ہے۔ کوئی لڑکا ہے تو بھیج دو۔ ذرا بلب دیکھ لے، فیوز تو نہیں ہو گیا۔ یا کسی دکان سے بجلی والے کو بلا دیں، مجھے یہاں دکانوں کا پتا نہیں۔''

''جاؤ تم دیکھ لو۔'' نذیر نے مجھ سے کہا۔ ''میرے گھٹنوں میں تو درد ہے۔''

''چلو.....'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے گھر جا پہنچا۔ برسوں بعد، شاید صدیوں کے بعد میں نے اس کھلے دروازے میں قدم رکھا جس کو ایک بار اپنے ہاتھوں سے بند کر کے گیا تھا۔

بیرونی دروازے کے ساتھ ہی چھوٹی سی ڈیوڑھی بنی ہوئی تھی جس میں بجلی کا میٹر لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی سرکٹ بریکر لگے تھے۔ میں نے قریب جا کے دیکھا۔ ایک بریکر آف ہو گیا تھا۔

میں نے اس کو آن کر دیا۔ ڈیوڑھی میں لگا ہوا بلب بھی روشن ہو گیا۔

''بھئی تم تو بڑے کاریگر ہو.....'' اس نے کہا۔ ''ذرا اندر کے بلب بھی چیک کر لو۔ سب جلتے ہیں یا نہیں۔ بجلی والے لگا تو گئے تھے اور ہاں، فریج کا تار بھی لگا دو۔ مجھے بجلی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ لوگ تو کل آئیں گے۔'' بڑی بی بہت باتونی تھیں۔ بولے ہی جا رہی تھیں۔

اندر صحن کے ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جس کے ساتھ وہ کمرا تھا جس میں کھڑکی باہر کھلتی تھی۔ نیچے تین کمرے تھے جن میں کافی سارا سامان بندھا ہوا رکھا تھا۔ ایک بڑا سا جہازی سائز فریزر بھی رکھا ہوا تھا۔

''اسی کو آن کرنا ہے.....؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' بڑی بی نے کہا۔

پلگ فریزر کے اوپر ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے فریزر کے پیچھے لگے ساکٹ میں پلگ لگا دیا۔ فریزر کی موٹر ایک جھرجھری لے کر بیدار ہو گئی اور موٹر چلنے کی باریک سی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''اور تو کوئی کام نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم بجلی والے ہو؟''

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''تم کہاں رہتے ہو؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔ اس کا انداز ایک دم چوکنا ہو گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں اسی گلی میں رہتا ہوں۔ جس بیٹھک سے مجھے بلا کے لائی ہو، اسی بیٹھک سے چار گھر آگے۔ میرا آڑھت کا کام ہے۔''

www.alibayiem.com

''آڑھت ... کا ہے کی آڑھت؟'' بڑی بی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''میرا منڈی میں سبزیوں کا کام ہے۔ میں سبزیاں خریدتا بیچتا ہوں۔'' میں نے آسان لفظوں میں بڑی بی کو بتایا۔

''اچھا... اچھا...'' اس نے سر ہلایا۔ اس کے لہجے سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا۔

''اگر کچھ کھانا ہے تو میں بھجوا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''گھر میں کوئی نہیں ہے۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''ہاں گھر والے تو کل آئیں گے، میر پور خاص سے۔ تب ہی چولہا ہانڈی شروع ہوگا۔ دو دن سے اچار سے روٹی کھا رہی ہوں۔ تندور کی روٹی باسی اور سخت ہو گئی ہے۔'' بڑی بی نے کہا۔

''فکر نہ کرو، کھانا اور چائے سب آ جائے گا۔'' میں نے تسلی دی۔

''یہ محلے والے بڑے اچھے ہیں۔'' بڑی بی نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے ایک لڑکا بہت ساری سبزیاں دے گیا تھا۔ آلو پیاز ادرک لہسن دھنیا مرچی اور بہت سارے مٹر۔''

''وہ میرا بیٹا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''اچھا.....'' بڑی بی نے کہا۔ ''یہ تو بڑا اچھا محلہ ہے، سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ مگر یہ سب تو تب ہی استعمال ہوگا جب وہ لوگ آ جائیں گے۔''

''فکر مت کریں، اس میں کوئی چیز خراب ہونے والی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ویسے آپ لوگوں نے یہ مکان خرید لیا ہے یا کرائے پر آئے ہیں؟''

''نہیں بھیا۔'' بڑی بی کے لہجے میں اپنائیت آ گئی۔ ''یہ تو سمجھ لو ہمارا ہی ہے۔ برسوں خالی پڑا رہا۔ جب کسی پر وقت پڑا تو سہارا اسی مکان نے دیا۔ بس قسمت زدوں کی پناہ گاہ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''پہلے حمیرا پر آفت پڑی تو اس گھر میں رہنے کو چلی آئی۔ پھر اس کی لڑکی پر مصیبت پڑی تو اب وہ آ رہی ہے رہنے کو۔''

''حمیرا.....'' مجھے یہ نام سنا سنا سا لگا۔ ''یہ حمیرا کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے برسوں پہلے رہنے کو آئی تھی یہاں چند دن کے لیے۔ اس کے میاں کے بھائیوں کے درمیان فساد ہو گیا تھا جائداد کا۔ تینوں بھائیوں نے بیوی بچی سمیت گھر سے نکال دیا۔ تب حمیرا کے بھائی افضل نے اپنا یہ مکان بہن کو دیا تھا رہنے کو مگر پھر رشتے دار بیچ میں پڑے اور صلح صفائی کے بعد حمیرا اور اس کے میاں کو لے گئے آ کر.....'' بڑی بی نے بتایا۔

''ہاں.....'' میں نے جواب دیا ''مجھے یاد آ گیا۔ اس وقت شاید میں سولہ سترہ برس کا تھا۔ جب چند دنوں کے لیے ایک خاتون اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔''

''ہاں..... ہاں.....'' بڑی بی نے جلدی سے کہا۔ ''تم نے صحیح پہچانا۔ حمیرا آئی تھی اپنی لڑکی کے ساتھ۔ کیا نام ہے، زبیدہ کے ساتھ۔''

''تو اب کون آ رہا ہے یہاں رہنے.....؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''ارے آنا کس نے ہے۔ زبیدہ ہی آ رہی ہے۔ بہت تکلیف میں زندگی گزاری ہے اس نے۔ پتا نہیں دونوں ماں بیٹیوں کی قسمت کیسی ہے؟'' بڑی بی نے کہا۔ ان کے لہجے میں بڑا تاسف تھا جیسے انہیں ان لوگوں سے دلی ہمدردی ہو۔

''آپ کی وہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بھیا.....'' بڑی بی نے ایک گہری سانس لی۔ ''اللہ بخشے زبیدہ کے باپ کو۔ مجھ بے سہارا کو ایک بار جو بہن کہہ دیا تو پھر اس بیوہ سے ساری عمر بہن کا رشتہ نبھایا۔ میں ان دونوں کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ میرا کلیجا ہیں دونوں۔ اب جب سارا زمانہ ان کا دشمن ہوا ہے تو کیا میں اسے چھوڑ دوں؟ نہ بھیا نہ..... ایسی نمک حرام تو میں ہوں نہیں۔'' انہوں نے کہا۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اسی وقت مغرب کی اذان ہونے لگی۔

''میں ذرا نماز پڑھ لوں۔'' بڑی بی نے کہا۔

''مجھے بھی اجازت دیں۔ میں کھانا بھجواتا ہوں تھوڑی دیر میں۔'' میں نے کہا اور اندر کے دروازے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

میں گھر واپس آ رہا تھا تو نذیر کی بیٹھک بند تھی۔ شاید وہ کسی کام سے اندر تھا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا گھر آ گیا۔ حسب معمول تحریم اپنی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ میں نے تحریم کو آواز دے کے بلایا۔

''جی ابو.....'' وہ سر پر دوپٹا ڈالتی ہوئی اندر آ گئی۔ ان دنوں وہ رہنے کے لیے اپنی ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔

''بیٹا! امی سے کہنا کہ جہاں انہوں نے دن میں

www.aldbayjeem.com

بوریاں بچھوائی تھیں۔ وہاں ایک اماں ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے لیے کھانا اور چائے وغیرہ بھجوائی۔ وہ گھر میں اکیلی تھیں۔"

"جی ابو۔" تحریم نے سعادت مندی سے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔ اچانک مجھے یاد آیا۔ میں گھر سے بنا کھائے اور بیکری سے چائنیز اور آئس کریم لے آیا۔ مجھے بمشکل آنے جانے میں آدھا گھنٹا لگا ہوگا۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر باورچی خانے کا رخ کیا۔ تحریم اپنی ماں سے باتیں کرتی ہوئی روٹیاں ڈال رہی تھی۔

"دو چار دن کے لیے گھر آئی ہے اور تم اس سے روٹیاں بنوا رہی ہو۔" میں نے زلیخا سے کہا۔

"ابو جی! کام کرنا اچھا لگتا ہے مجھے گھر کا۔" تحریم نے ہنس کر کہا۔

"کیا لائے ہو؟" زلیخا نے پوچھا۔

"یہ تحریم کے لیے ہے۔ چائنیز اور آئس کریم۔" میں نے تحریم کو شاپر دیتے ہوئے کہا۔

"تم کسی چیز کی فکر مت کرنا بیٹی۔ وہ گھر اب تم اس گھر سے کبھی ضرور ہو۔ بیاہ کے گھر یہ گھر، اس کا حصہ تم آج بھی ہو اور ہمیشہ رہو گی۔"

"جی ابو! میں جانتی ہوں۔" تحریم مسکرا دی۔

اپنی بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کے میرا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ سچ ہی تو کہتے ہیں لوگ کہ بیٹی سے ڈر نہیں لگتا۔ ڈر اس کے نصیب سے لگتا ہے۔

مگر یہ ڈر جب بڑھ جاتا ہے اور ڈر سے بڑھ کے زخم میں ڈھل جاتا ہے جب آپ بے پروا ہو جاتے ہیں۔ بیٹی سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ جب تک آپ بیٹی کی فکر میں رہیں گے، اس کے معاملات میں شامل رہیں گے..... بیٹی کے سسرال والے اپنے رویے میں محتاط رہیں گے۔ میں سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ زبیدہ اب کیسی ہو گی؟ کیا اس نے مجھے یاد رکھا ہوگا؟ کیا میں جیسے اس کو سوچتا ہوں وہ بھی مجھے سوچتی ہوگی؟ یا پھر میں اس کے لیے ایک گیا گزرا وقت بن کر رہ گیا ہوں؟

"ایسی کوئی بات نہیں۔" زبیدہ نے کہا۔

"ارے تم....." مجھے حیرت ہوئی۔

"اگر تم مجھے سوچو گے تو میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"سچ!"

وہ ہنسنے لگی۔ اچانک جیسے کمرے میں اس کی آواز کے ساتھ روشنی پھیل گئی۔ میرے پپوٹوں پر دباؤ پڑا اور میں نے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی تھی کہ ڈائجسٹ کی سہولت میں قارئین و اسٹال پر پرچے نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز تھیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروا لیں۔

یا

ادارے کو 1200 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 600 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

www.urdudayjeem.com

آنکھیں کھول دیں۔

زبیدہ نہیں، زلیخا سامنے کھڑی تھی اور بجلی کے بورڈ کے پاس کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' مجھے دفعتاً ناگواری کا احساس لگنے لگا۔

''اندھیرے کمرے میں لیٹے ہیں، کھانا بھی نہیں کھایا۔ تیار ہے، لے آؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں رہنے دو۔ دل نہیں چاہ رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیریت..... طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' وہ میرے بستر کی طرف بڑھ آئی۔

''طبیعت ٹھیک ہے، بس ذرا بتی بجھا دو۔ سر میں درد ہے۔'' میں نے کہا اور آنکھیں بند کر کے کروٹ بدلی۔

''چائے بنا دوں..... سر درد کی گولی لا دوں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''نہیں، بس سو جاؤں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس وقت مجھے اس کی مداخلت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر پلٹی اور کمرے کی بتی بند کر کے باہر چلی گئی۔

''امی! ابو نے کہا تھا کہ کھانا بھجوانا ہے۔'' مجھے باہر سے تحریم کی آواز آئی۔

''ہاں، ریحان کے ہاتھ بھجوا دیا ہے۔ تمہارے باپ کی کبھی کوئی بات مجھے بھولتی ہے بھلا؟'' زلیخا کا جواب مجھے سنائی دیا۔

میں آنکھیں بند کر کے دوبارہ زبیدہ کا تصور کرنے لگا مگر تصور میں کھنڈت پڑ گئی تھی۔ اندھیرا تھا مگر زبیدہ کے چہرے کی چاندنی ندارد تھی۔

مجھے الجھن ہونے لگی اور نہ جانے اس الجھن میں کب سو گیا۔

☆☆☆

عادت کے مطابق میری آنکھ تین بجے کھل گئی۔ مگر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اٹھنے کی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سارا بدن تھکا ہوا، ٹوٹا ہوا، شل ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرا سارا بدن جل رہا ہے۔

اسی وقت زلیخا اندر آئی۔ ''ارے..... آپ اٹھ گئے۔''

''مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

زلیخا نے قریب آ کے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''ارے، ماتھا تو بری طرح جل رہا ہے۔ آپ کو سخت بخار ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے آج جانے کی۔'' اس نے فوراً کہا۔

''مجھے پانی دو۔'' میں نے کہا۔

وہ جلدی سے باہر گئی اور پانی کا گلاس بھر لائی اور مجھے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کتنی بار کہا ہے آپ کو کہ رات میں موٹر سائیکل پر نہ جایا کریں۔ گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ وہ لے جائیں، نہ کچھ پہن کے جاتے ہیں۔ موسم بدل رہا ہے۔ سردی لگ گئی ہے آپ کو۔ میں بسکٹ لاتی ہوں چائے کے ساتھ کھا لیں۔ پھر دوا دیتی ہوں۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''ابھی ایسی سردی کہاں۔'' میں نے کہا۔

''اب آپ پہلے جیسے نہیں رہے، جب سردیوں میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہا لیتے تھے۔ عمر دیکھی ہے اپنی.....؟ اٹھاون برس ہو رہی ہے، اوپر سے نخرے۔'' وہ خفا ہونے لگی۔

''ذرا مجھے فون دو!''

''اچھا، اتنی رات کو کس کو فون کرنا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری سوتن کو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میری سوتن۔'' وہ جیسے اچانک بجھ سی گئی۔

مجھے غصہ آ گیا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ منڈی اسلم کو فون کروں گا کہ آج میں نہیں آ رہا۔ وہ اپنے حساب سے خرید و فروخت کر لے۔''

''اچھا۔'' اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں فون پر اسلم سے رابطہ کر کے اسے ہدایات دینے لگا جبکہ زلیخا چائے لینے کے لیے چلی گئی۔ فون رکھ کے میں غسل خانے میں جا کر کلی کرنے لگا تو منہ کا ذائقہ عجیب ہو رہا تھا بخار کی وجہ سے۔

مجھے اماں یاد آ گئیں۔ بچپن میں جب بخار سے منہ کڑوا ہوتا تو وہ مجھے بہلاتے ہوئے کہتیں۔

''بیٹا! بخار کا کڑوا منہ تو مبارک ہوتا ہے۔ بیماری سے سارے بدن کی زکوٰۃ نکل جاتی ہے، جتنا زیادہ منہ کڑوا ہو گا اتنی ہی جلدی اچھے ہو گے۔''

اماں کو یاد کر کے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ سچ ہے ماں کبھی نہیں مرتی!

زلیخا چائے لے آئی۔ ساتھ میں دو شامی کباب اور بسکٹ بھی تھے۔ ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔ ''رات بھی بھوکے پیٹ سو گئے تھے۔ ٹھنڈ اور کمزوری سے بخار آ گیا ہے۔''

''آؤ تم بھی بیٹھو۔'' میں نے کہا۔

''اچھا.....'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور

www.aiitbayjeem.com

بولی۔ ''میں اپنی چائے لے آؤں۔''

اکثر وہ باورچی خانے میں ہی چائے پی لیتی تھی۔ وہ جلدی سے جا کر اپنی چائے لے آئی۔

''تم بھی تو کھاؤ.....'' میں نے ایک کباب اٹھا کے اس کو دیا۔

''آپ کھا لیجیے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی دوا بھی کھانی ہے۔''

''کھا لوں گا مگر تم یہ تو لو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا میرے ہاتھ سے لینا اچھا نہیں لگا؟''

''اچھا کیوں نہیں لگے گا پر.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''پر کیا؟'' میں نے بسکٹ دانتوں سے توڑا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔

''یہی کہ آپ کی اتنی توجہ مجھ پر ہوتی کہاں ہے۔'' وہ بولی۔

''ایسا مت کہو۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''کیا تمہیں کبھی کوئی تنگی ہوئی۔ میری طرف سے کوئی کمی، کوئی کوتاہی؟''

''کبھی نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پھر.....؟''

''پھر یہ کہ شاید میں سمجھا نہ سکوں اور آپ سمجھ نہ سکیں۔'' وہ بولی پھر اچانک اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ارے، گولیاں تو میں باہر ہی بھول آئی۔''

وہ کپ رکھ کے تیزی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں چائے سے بسکٹ کھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں گولیاں اور پانی کا گلاس تھا۔ میں چائے ختم کر چکا تھا۔

''یہ لیجیے اور اچھی طرح کمبل لپیٹ کے لیٹ جائیں۔ ابھی پسینا آئے گا تو بخار اتر جائے گا۔''

میں نے خاموشی سے گلاس اور گولیاں لے کر پانی سے نگل لیں اور لیٹ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''آپ لیٹیں، میں ذرا باورچی خانے کے برتن سمیٹ لوں اور دروازہ بند کر لوں۔''

اس نے میرا کمبل درست کیا اور کمرے کی بتی بند کر کے باہر نکل گئی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور دوبارہ سو گیا۔

☆☆☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی دس بجا رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا اور خود کو چھو کے دیکھا۔ بخار نہیں تھا۔ میں اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو زلیخا کمرے میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔ اس نے میری طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''صبح آٹھ بجے کے قریب اسلم آیا تھا۔ آپ کی طبیعت کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس لیے آپ کو نہیں اٹھایا۔''

''یہ الماری میں رکھ دو۔'' میں نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

زلیخا نے الماری کھول کے پیسوں کا لفافہ اس میں رکھا اور میرا ماتھا چھوتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے بخار اتر گیا۔ کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟ بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''ہاں۔ تیز پتی کی چائے لے آؤ۔'' میں نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی کچھ کھانے کا جی نہیں چاہ رہا۔''

''اچھا ابھی لائی۔'' وہ جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔

''ابو! اب آپ کیسے ہیں؟'' تحریم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں بیٹی۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' میں نے اسے بلایا۔ وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔

''تمہاری سسرال میں تو سب اچھا ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''سب اچھا ہے۔ ماموں میرا بڑا خیال رکھتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ماموں میری وجہ سے ان کو ڈانٹ بھی دیتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔ اس کے انداز میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔

''بس بیٹا ہمیشہ خوش رہو۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ہنسنے لگی۔

☆☆☆

میں گھر میں داخل ہوا تو صحن میں بیٹھی ہوئی زلیخا کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے برابر میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔

میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔

زلیخا نے مجھے دیکھ لیا اور بولی۔ ''آ جائیں۔ یہ ہماری ہی پڑوسن زبیدہ ہیں جو آج صبح ہی آئی ہیں اپنے مکان میں۔''

زبیدہ.....! جیسے میرے قدم اپنی جگہ گڑ کے رہ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ حرکت کروں..... کھڑا رہوں، واپس مڑ جاؤں یا سامنے بیٹھ کر اس کو دیکھوں جس کو میں نے ہمیشہ یاد کیا۔

زبیدہ میری جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ اس کی پشت سے دوپٹے کے نیچے سے اس کی لمبی چوٹی جھانک رہی تھی۔

اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے مڑ کے میری طرف

www.aiitbayjeem.com

دیکھا۔ مجھے لگا جیسے زبیدہ پیچھے مڑ کے دیکھ رہی ہو اور خالہ حمیرا اس کے پاس بیٹھی ہوں۔

برسوں پہلے کا منظر من وعن میرے سامنے تھا۔

''آیئے نا..... وہاں کیوں کھڑے ہیں؟'' زلیخا نے مجھے کھڑے دیکھ کے کہا۔ ''یہ اماں جی سے ملنے آئی تھیں۔ میں نے بتایا کہ.....'' زلیخا خاموش ہوگئی۔

میں آہستہ سے آگے بڑھا۔ زبیدہ نے ابھی تک چہرہ نہیں گھمایا تھا۔ میں آہستہ سے جا کر زلیخا کے برابر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

اسی وقت ریحان آیا اور اس نے کہا۔ ''امی! ذرا بات سنیے گا۔''

''اچھا میں ابھی آتی ہوں۔'' زلیخا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ باتیں کریں۔ میں ریحان کی بات سن کر آتی ہوں۔ ساتھ ہی چائے بھی لے آتی ہوں۔'' زلیخا کہہ کر چلی گئی۔

زبیدہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ دلکش ہو گیا تھا یا مجھے لگ رہا تھا۔

''تم کیسی ہو؟'' میں نے پوچھا اور محسوس کیا جیسے میری آواز مرتعش ہو رہی ہے۔

''آپ کیسے ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''اماں جی کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ وہ بہت اچھی تھیں۔'' زبیدہ نے کہا۔

''تم لوگ پلٹ کے ہی نہیں آئے؟'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''اس وقت میرے اختیار میں کیا تھا؟'' زبیدہ نے جواب دیا۔ پتا نہیں کہ اس نے شکوہ کیا، بتایا یا پھر وقت کے نامہربان ہونے کا ماتم کیا۔

''بہرحال اچھا لگا.....'' میں نے کہا۔

''وقت بہت گزر گیا۔'' اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''امی! یہ کون ہیں؟'' اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا۔

''یہ..... یہ.....'' زبیدہ نے رک رک کے کہا۔ ''یہ وہ جو ریحان آئے تھے نا صبح سبزی لے کر..... ان کے ابو ہیں۔''

''اچھا.....'' اس نے سر ہلایا۔

''یہ تو بالکل تمہاری کاپی ہے۔'' میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ ''بالکل اسی طرح تم دکھتی تھیں۔''

''آپ کو یاد ہے؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ پھر مزید کہا۔ ''ریحان بھی آپ کا بیٹا بالکل ویسا ہی ہے جیسے پہلے آپ تھے۔'' زبیدہ نے دور کھڑے ریحان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہو بہو تم ہو.....'' وہ کہہ کر جیسے چونک سی گئی۔

پھر چپ ہوگئی۔ پھر لمحاتی وقفے کے بعد کہنے لگی۔ ''یہ میری بیٹی ہے..... ریشماں۔'' اس نے ایک نظر بیٹی کی طرف دیکھا جس میں پیار ہی پیار تھا۔ ''میرے جینے کا سبب.....''

''ہاں.....'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''جینے کے لیے سبب تو چاہیے ہوتا ہے مگر کیا جینے کے لیے صرف ایک ہی سبب ہوتا ہے۔ کوئی اور نہیں؟''

''کوئی..... اور.....'' زبیدہ نے جیسے بہت کھینچ کے لفظ ادا کیے۔ ''چھوڑیے۔''

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ باتیں بہت تھیں۔ گفتگو کا ایک بھنڈار تھا مگر شاید کہنے کا یارا نہ تھا۔

زلیخا چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرے لے آئی اور ہماری طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا بات ہے، آپ لوگ چپ چاپ بیٹھے ہیں؟''

''کیا کہیں، کہنے کو کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ..... بعض اوقات اچانک ملاقات ہو تو جیسے لفظ ایک دم اڑن چھو ہو جاتے ہیں اور ذہن خالی رہ جاتا ہے کہ کیا کہنا ہے، کیا سننا اور کیا بتانا ہے؟'' زلیخا کے انداز میں جیسے شوخی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''ارے بھئی جب ہمارے سامنے امتحان کا پرچہ آتا تھا تو جیسے چند لمحوں کے لیے سوال پڑھ کے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ہمارے لیے ہمارے ہی کورس سے بنا ہے۔ سارا ذہن بھک سے اڑ جاتا تھا۔ کئی منٹوں میں حواس قابو میں آتے تھے پھر امتحان شروع کرتے تھے۔'' وہ ہنس کے بولی۔

''صحیح کہتی ہیں آپ..... کچھ امتحان ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ امتحان ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔'' اس نے پتا نہیں کیوں اپنی بیٹی ریشماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اتنی زور سے کہ ریشماں کسمسا کر رہ گئی۔

''امی.....'' اس نے کہا۔ زبیدہ نے چونک کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''یہ چائے لیجیے اور یہ کباب بھی.....'' زلیخا نے کہا۔

''جی جی.....'' زبیدہ نے جلدی سے چائے کا کپ تھام لیا۔

میں نے خاموشی سے چائے ختم کی اور انہیں باتیں کرتا چھوڑ کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ عجیب سی کیفیت تھی دل کی۔ جیسے کچھ ہو گیا، جیسے کچھ کھو گیا اور جیسے کچھ مل گیا۔ میں سوچ رہا تھا یا پتا نہیں میں اپنی جگہ پر تھا بھی یا نہیں۔ بعض اوقات جیسے اندر کوئی جذبہ ہی مفقود ہو جاتا ہے۔

www.aitbayjeem.com

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب آپ اپنے آپ ہی میں اس قدر اکیلے ہو جاتے ہیں کہ گھبرا جاتے ہیں اور یہ گھبراہٹ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ میں بھی شاید ایسی ہی کیفیات سے دوچار تھا۔

تم آئی ہو اتنے انتظار کے بعد!

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی قول و قرار!

پھر یہ زندگی ہمیں ایک دوسرے کے مقابل کیوں لے آئی؟ کیوں میرا انتظار مکمل ہوا..... لیکن!

لیکن کیا زبیدہ کو بھی کوئی انتظار تھا؟ میں اسی محور پر گھوم رہا تھا اور جواب ندارد۔

مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزرا۔ گھنٹے، ہفتے یا سال۔ بعض اوقات وقت کی اکائیاں بھی تو گم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب میں حواس کی دنیا میں واپس آیا تو کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ قید جیسا۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور بیڈ سے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی کی ایک تیز بوچھاڑ اندر آئی۔ اس کے عقب میں زلیخا تھی۔

''تم.....''

''آپ اٹھ گئے؟'' زلیخا نے کہا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ''میں اندر آئی تو آپ سو رہے تھے۔ میں نے لائٹ نہیں جلائی، کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ شور کی وجہ سے آپ کی آنکھ نہ کھلے۔ تھوڑا آرام کر لیں۔'' اس نے طویل جملے ادا کر کے میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے، آپ خاموش خاموش سے ہیں؟''

''کچھ نہیں.....'' میں نے کہا مگر میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ''پانی دینا۔''

زلیخا واپس مڑ گئی اور چند ہی منٹ میں پانی لے آئی۔ میں نے غٹاغٹ پانی اندر انڈیل لیا۔

''کیا بات ہے، آپ کو پسینا آ رہا ہے؟'' زلیخا نے کہا۔

''پتا نہیں کیوں طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لگتا ہے کہ آپ کو نظر لگ گئی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''بھلا مجھے کس کی نظر لگے گی؟''

''وہ جو ماں بیٹی آئی تھیں، کیا نظر بھر کے دیکھا تھا انہوں نے؟'' زلیخا نے کہا۔

''اب میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں جو نظریں لگ جائیں گی مجھے۔''

''آپ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ آپ ستاون اٹھاون سال کے ہو گئے ہیں۔ پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ ذرا اپنے آپ پر توجہ دیں تو دیکھیں کتنے جوان لگتے ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔

''اپنے آپ پر توجہ دوں..... مگر کس کے لیے؟'' میں نے رواروی میں کہہ دیا۔

زلیخا کے چہرے پر ایک سایہ سا رینگ گیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلط بات کہہ دی ہے مگر تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم تو ہو نا میرے پاس۔ بس جیسا ہوں ٹھیک ہوں۔''

''جی.....'' زلیخا نے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

''امی.....'' باہر سے ریحان کی آواز آئی۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل سے ہمارے بہت پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنا کلینک ہمارے محلے سے باہر واقع سڑک کے ساتھ ہی بنا رکھا تھا۔ ملنسار آدمی تھے۔ ساٹھ ستر کے پیٹے میں تھے۔ مجھے ان کا فون آیا۔

''کہیے کیسے یاد کیا آپ نے؟'' میں نے رسمی سلام دعا کے بعد پوچھا۔

''بھابی جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''کیا ہوا انہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے ان کو کہا تھا کہ اپنے ٹیسٹ کرا لیں مگر انہوں نے شاید دھیان نہیں دیا۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔

''کون سے ٹیسٹ؟'' میں نے سوال کیا۔

''ان کے سینے میں تکلیف ہے۔ میں نے کچھ ٹیسٹ لکھ کے دیے تھے۔ پندرہ بیس دن ہو گئے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں یہ ٹیسٹ کروا لینے چاہئیں۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھی اور نہیں بھی۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''یہ تو رپورٹ آنے پر پتا چلے گا۔''

''میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

''زلیخا۔'' میں نے آواز دی۔

''جی.....'' زلیخا دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''ڈاکٹر جمیل کا فون آیا تھا..... کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی کچھ کھانسی تھی اور سینے میں درد تھا۔ انہوں نے فضول میں ہی بہت سے ٹیسٹ لکھ دیے۔

www.alfbayeen.com

پیسے ضائع ہوں گے....." وہ ہنسی۔

"یہ کیا بے پروائی ہے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے کبھی اس طرح فون کیا ہے کبھی پہلے۔ فوراً سارے ٹیسٹ کراؤ جو انہوں نے کہے ہیں۔"

"ارے بھئی، یہ بخار وغیرہ کا ٹیسٹ ضروری ہے کیا؟" اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تمہیں اعتراض کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس مجھ سے نہیں کھائی جاتی ہیں کڑوی کسیلی دوائیاں۔"

"ریحان....." میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ریحان کو آواز دی۔

"جی ابو....." وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گیا۔ "کہیے....."

"اپنی امی کو لے کر ابھی جاؤ اور ان کے سارے ٹیسٹ جو ڈاکٹر صاحب نے لکھ کے دیے ہیں..... کراؤ۔" میں نے کہا۔ "اور ان کی کوئی بات نہیں ماننا، کوئی بھی ٹیسٹ نہ چھوڑنا۔"

"جی ابو جی! میں نے امی کو پچھلے ہفتے بھی کہا تھا مگر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چلیں۔"

"اچھا بھئی....." زلیخا نے بے دلی سے کہا اور الماری میں سے چادر نکالنے لگی۔ وہ دونوں چلے گئے۔

بڑے بیٹے کی جب سے شادی ہوئی تھی، وہ بس اپنے پورشن کا ہو کر رہ گیا تھا۔ نیچے آنا اس نے بہت ہی کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو اس سے پورے پورے ہفتے ملاقات ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ اس کے معاملات میں ہم لوگ کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میرے قیاس کے عین مطابق وہ اجنبی ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی گھلنے ملنے والی بہو ثابت نہ ہو سکی تھی۔ اس کا رویہ اتنا سرد ہوتا تھا کہ زلیخا اس سے بہت کم بولتی تھی۔ ہاں، کبھی کبھی وہ یہ ضرور کہتی تھی کہ آپ کا اندازہ درست تھا۔ پھر چپ ہو جاتی۔ میں ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک جیسے مجھے چائے کی طلب ہونے لگی۔ میں اٹھ کے باورچی خانے میں چلا گیا۔ ابھی میں نے چائے بنانے کے لیے پانی ہی رکھا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

میں نے جا کر دروازہ کھولا تو زبیدہ کے ساتھ رہنے والی بڑی بی کھڑی تھیں۔ انہوں نے پہلی نظر میں مجھے پہچان لیا۔ میں نے سلام کیا۔

وہ جواب دے کر بولیں۔ "بھیا! اگر زحمت نہ ہو تو ذرا گھر چلے چلو۔ آج پھر کوئی بجلی کا مسئلہ ہو گیا ہے ہمارے گھر تو کوئی مرد ہے نہیں۔"

"اچھا....." میں نے کہا۔ "ذرا ٹھہریے میں چلتا ہوں۔"

"اچھا، میں جا رہی ہوں..... آپ جلدی آ جاؤ۔ یہاں ٹھہر کے کیا کروں گی۔ گھر پر بھی کوئی نہیں ہے۔ دونوں کے سوا۔ کوئی آئے جائے تو دروازہ مجھے ہی کھولنا پڑتا ہے۔"

"جی....." میں نے کہا اور وہ میرا جواب سنے بغیر مڑ گئیں۔

میں نے چولہا بند کیا اور کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آ گیا۔ گھر کی ایک چابی میرے کی رنگ میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

میں نے دروازہ بند کیا تو وہ خودکار طور پر لاک ہو گیا۔ میں نے دروازے پر جا کر دستک دی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ گویا بڑی بی دروازے سے ہی لگی کھڑی تھیں۔

میں نے سوئچ بورڈ دیکھا تو وہی سرکٹ بریکر بند تھا۔ غالباً وائرنگ بہت پرانی ہو گئی تھی جو ذرا سا لوڈ پڑتے ہی بریکر خودکار طریقے سے گرم ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ میں نے سرکٹ بریکر کو آن کر دیا۔

"بھئی تم تو فوراً ہی خرابی پکڑ لیتے ہو۔ کیا تم سچ مچ الیکٹریشن نہیں ہو؟" بڑی بی نے دوبارہ پوچھا جو سوال وہ پہلے بھی کر چکی تھیں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

"کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟" بڑی بی نے چڑ کے کہا۔

"میں اپنے بیٹے سے کہہ دوں گا، وہ کل الیکٹریشن کو بلوا کے ساری وائرنگ چیک کروا دے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔"

"اچھا مجھے اجازت؟" میں نے پوچھا۔

"لو بھلا، بغیر چائے پیے کیسے جا سکتے ہو۔ بی بی نے تو تمہارے لیے چائے کا پانی رکھا ہوا ہے۔" بڑی بی نے فوراً جواب دیا۔

"چائے..... لیکن....."

"ارے بھیا لیکن ویکن چھوڑو۔ تم لوگ تو بچپن کے ساتھی ہو۔ غیریت کیسی؟" انہوں نے چمک کر کہا۔

"چلو اندر چلو۔" وہ مجھ سے آگے آگے ڈیوڑھی سے نکل گئیں۔

میں ان کے پیچھے آہستہ قدموں سے چلتا ہوا صحن میں پہنچ گیا۔

"آیئے، اندر آ جایئے۔" ریشماں نے اندرونی دروازے پر کھڑے ہوئے کہا۔

میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کمرا جو چند دن پہلے اجاڑ نظر آ رہا تھا، اب سلیقے سے بیٹھنے کے لیے آراستہ تھا۔

www.aitmaytiem.com

ایک جانب لکڑی کا جھولا تھا جس کو چھت کی زنجیروں سے معلق کیا گیا تھا۔ اس پر کشن لگے ہوئے تھے۔ اسی جانب ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر سفید چادر پڑی تھی اور ہلکے رنگ کا گول تکیہ رکھا ہوا تھا جبکہ درمیان میں صوفے اور ایک طویل شیشے کی میز تھی۔

میں ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ ریشماں مجھے اندر بٹھا کے دوبارہ باہر چلی گئی۔

مجھے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ زبیدہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ریشماں چائے کی ٹرالی لیے آ رہی تھی جس میں چائے کے ساتھ کچھ دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھے رہیے۔'' زبیدہ نے کہا اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔

ریشماں نے ایک پلیٹ میری طرف بڑھائی اور ساتھ میں کباب کی پلیٹ بھی۔

''اتنے تکلفات کی کیا ضرورت تھی۔ بس چائے کافی تھی۔''

''چائے کافی تو نہیں ہوتی۔'' ریشماں نے برجستہ مداخلت کی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''تمہاری بیٹی بہت ذہین ہے۔'' میں نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا آپ سچ مچ بچپن کے دوست ہیں؟'' ریشماں نے پوچھا۔ ''مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کو کیسا لگ رہا ہے۔۔۔؟''

''ریشماں! تم بہت بولتی ہو۔'' زبیدہ نے دھیمے سے کہا۔

''سوری انکل! آپ کو برا تو نہیں لگا۔'' ریشماں نے جلدی سے معذرت کی۔ ''میں تو بس یہی سوچ رہی ہوں کہ آپ لوگ برسوں پہلے کیسے ہوں گے۔ کیا باتیں کرتے ہوں گے؟ کیا کرتے ہوں گے؟''

''ہماری اتنی طویل دوستی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ملاقات۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

زبیدہ نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھی سنتی رہی۔

''تمہاری امی تو ان دنوں شاید تمہاری جتنی ہی ہوں گی یا شاید کچھ کم۔ بس چند ہی دن رہی تھیں تمہاری امی۔ پھر تمہاری نانی کے ساتھ واپس چلی گئیں۔''

''اچھا۔۔۔۔۔'' ریشماں نے یوں کہا جیسے اسے شدید مایوسی ہوئی ہو۔ ''یعنی کہ کوئی خاص نہیں۔''

''اب پتا نہیں تم کس خاص قسم کی بات کی توقع رکھتی تھیں؟''

''پتا نہیں۔'' ریشماں ہنسنے لگی۔

''کبھی کبھی نہ یاد رہنے میں بھی ایک یاد رہ جاتی ہے۔'' زبیدہ نے دھیمے سے کہا۔

''ریشماں۔۔۔'' باہر سے بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ ریشماں باہر چلی گئی۔ کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے۔

چند لمحوں کے بعد زبیدہ نے کہا۔ ''چائے لیجیے نا۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''تم۔۔۔۔ آپ بھی لیں۔۔۔۔'' میں نے کہا۔

''آپ تم کیوں نہیں کہتے؟'' اس نے کہا۔

''کیسی ہو؟''

''آپ کے سامنے ہوں۔''

''بہت وقت گزر گیا مگر تمہاری بیٹی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔''

''وقت کا کام تو بیت جانا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ مگر نہ جانے بعض جگہ وقت کیوں نہیں بیتتا۔''

''کہاں؟''

''یادوں میں۔''

وہ چپ رہی۔

کمرے کی خاموشی میں کبھی کبھی ہماری چائے کے ننھے ننھے گھونٹوں کی آوازیں سرسراتیں۔

''کیوں چلے گئے تھے تم لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو کے بھائیوں نے دادا جی کے مرنے کے بعد جائداد کی تقسیم میں جھگڑا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو دادا جان کی کوئی وصیت نہیں تھی، دوسرے سب لوگ ابو سے ناراض تھے۔ دادا کی زندگی میں تو کچھ نہ بول سکے مگر ان کے مرتے ہی سب لوگ اپنے اپنے چولے اتار کے سامنے آ گئے۔''

''سب کیوں ناراض تھے تمہارے ابو سے؟''

''امی کی وجہ سے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''امی اور ابو یونیورسٹی فیلو تھے۔ ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور کورٹ میرج کر لی جبکہ سب کا خیال تھا کہ شادی خاندان میں ہونی چاہیے تھی۔ بس دادا ابو نے ہی ساتھ دیا مگر بھائی بہن بھاوجیں سب مخالف ہو گئے اور پھر ایک دن جھگڑا اتنا بڑھا کہ ابو نے ہمیں یہاں شفٹ کر دیا۔ یہ گھر نانا نے خریدا تھا، جب وہ اس شہر میں کاروبار کے سلسلے میں آتے جاتے تھے۔ بڑے ماموں نے کہا کہ یہ تمہارا حصہ ہے تم رہو مگر پھر صلح ہو گئی۔''

''صلح کی کوئی تو شرط ہو گی۔ اس قسم کی صورت حال میں سادہ سی صلح تو نہیں ہو سکتی۔'' میں نے سوال کیا۔

www.aitbayjeem.com

''ہاں.....'' زبیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ صلح ہوئی مگر اس شرط پر کہ میرا رشتہ تایا ابو کے بڑے بیٹے سے ہوگا جو اس وقت عمر میں مجھ سے پندرہ سال زیادہ تھا۔ ابو نے محض اس لیے ہاں کر دی کہ خاندان چھوٹ نہ جائے۔ دو سال بعد میری رخصتی ہوگئی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ اس کی خاندان میں شادی نہ ہونے کی وجہ اس کا نفسیاتی عارضہ تھا۔ غصے میں وہ جنونی ہو جاتا تھا۔ بلا کا شکی مزاج تھا۔ نو برس میں نے جس اذیت میں گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں اس کی مار پیٹ کے نشان نہ ہوں۔ پھر اللہ نے مجھے نجات دے دی۔'' وہ گہرا سانس بھر کے چپ ہوگئی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

وہ کہنے لگی۔ ''میں نے بتایا نا کہ وہ غصے میں جنونی ہو جاتا تھا۔ اس کا نفسیاتی علاج چل رہا تھا۔ اسی دوران اس کو غصہ آیا اور اس نے اپنے سر کو دیوار میں دے مارا۔ اللہ جانے کہاں سر کے اندر چوٹ آئی، وہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے اسپتال لے گئے مگر تین چار دن وہ بے ہوش رہ کر اسی حالت میں مر گیا۔ میں بیوہ ہوگئی۔ لوگ بیوہ ہونے پر غم سے مرنے لگتے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ میں بے حد پرسکون تھی جیسے میرے اوپر سے خوف اور وحشت کا ہالا ٹوٹ گیا ہو۔

''ان دنوں یہ پانچ برس کی تھی۔ امی اور ابو کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں میری حالت پر کڑھ کڑھ کر چلے گئے۔ ماموں نے پھر بڑھ کے تھام لیا اور اپنے گھر لے گئے۔ گزشتہ سال بڑے ماموں بھی گزر گئے۔ انہوں نے اپنے مرنے سے پہلے یہ مکان میرے نام کروا دیا تھا اور جو پیسے امی ابو کے تھے، وہ میرے نام سے سیونگ ڈیپازٹ کر دیے مگر ماموں کے انتقال کے بعد گھر کے دیگر افراد کی نگاہیں بدلنے لگیں تو میں نے سوچا کیوں دوسروں کے پاس پڑی رہوں اس لیے اماں بی کو لے کر یہاں چلی آئی۔ آگے جو قسمت.....''

زبیدہ چپ ہوگئی۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا چھا گیا۔

''بہت تکلیف دہ زندگی ہوگئی تھی تمہاری۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تقدیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ سب ہی بے بس ہیں ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے..... سب ہی وقت کے اسیر ہوئے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے دوبارہ بنواتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''بس کافی ہے۔''

''آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اپنے دکھوں کی پوٹلی کھول کے بیٹھ گئی۔''

''کہنے سے دکھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' میں نے تسلی دی۔

''ہاں مگر ماہ و سال تو واپس نہیں آتے۔ زخم بھر جاتے ہیں، نشان نہیں جاتے۔'' میں نے اسے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک چپ ہمارے درمیان کھڑی ہمیں ہی خاموشی سے تک رہی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''آیئے گا پھر۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اگر مناسب سمجھیں۔''

میں نے اسے دیکھا اور پھر باہر نکل آیا۔ بعض باتوں کا فوری کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ دروازہ جو برسوں پہلے میں نے بند کیا تھا وہ پھر سے کھل گیا تھا۔

میں نے واپسی پر دیکھا، نذیر کی بیٹھک کا دروازہ بند تھا۔ میں گھر آ گیا۔ ابھی تک ریحان اور زلیخا واپس نہیں آئے تھے۔ میں ان کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ریحان اور زلیخا آ گئے تھے۔

''کیا ہوا..... سارے ٹیسٹ ہوگئے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ابو! سارے ٹیسٹ ہوگئے ہیں۔ ایک ٹیسٹ کے لیے پرسوں بلایا ہے۔ اس کی رپورٹ پندرہ دن کے بعد ملے گی۔'' ریحان نے بتایا۔

''اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ ماں کا کوئی بھی ٹیسٹ باقی نہ رہے اور شام کو ڈاکٹر جمیل سے بھی ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی ابو..... میں امی کو لے جاؤں گا۔''

''نہیں، ڈاکٹر جمیل کے پاس میں لے جاؤں گا تمہاری امی کو۔'' میں نے جواب دیا۔

ریحان سر ہلا کے چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''تم اندر چل کے آرام کرو۔ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔''

زلیخا نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اس کے چہرے سے تھکن مترشح تھی۔

☆☆☆

شام کو میں زلیخا کو لے کر ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا۔

www.aldayeem.com

حسنِ اتفاق سے اس وقت مریضوں کا رش نہیں تھا۔ دو چار مریضوں کے بعد ہی ہماری باری آ گئی۔ میں نے ڈاکٹر جمیل کو بتایا کہ آج ٹیسٹ کے لیے گئے تھے۔ ایک ٹیسٹ دو دن کے بعد ہوگا اور اس کی رپورٹ پندرہ دن کے بعد ملے گی۔

''سب خیریت تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے لیکن احتیاط کر لینا بہتر ہوتا ہے اس لیے میں نے ٹیسٹ لکھ دیے۔'' ڈاکٹر جمیل نے خوش دلی سے کہا۔

پھر انہوں نے زلیخا سے مخاطب ہو کے کہا۔ ''دوائیں لے رہی ہیں نا آپ؟''

''جی بالکل۔'' زلیخا نے جواب دیا۔

اسی وقت ایک اور خاتون اندر داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی زلیخا اٹھ کے ان کی طرف چلی گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔

میں نے ڈاکٹر جمیل سے پوچھا۔ ''صحیح بات بتایئے کیا مسئلہ ہے؟''

ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''ابھی آپ انہیں بتایئے گا نہیں۔ ان کے سینے میں کئی ماہ سے درد ہے۔ دوا ایک مرتبہ انہوں نے دوا لی لیکن پھر انہوں نے احتیاط نہیں کی۔ میرا اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے سینے میں پرابلم نہ ہو اس لیے میں نے احتیاطاً ٹیسٹ لکھے تھے لیکن یہ توجہ نہیں دے رہی ہیں۔ اب خواتین میں یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کہیں کینسر کا خطرہ تو نہیں؟''

''خدا کرے کہ میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو لیکن زیادہ خواتین شرم و حیا کے باعث اپنے سینے میں، بغل میں ہونے والی گلٹی کو چھپا جاتی ہیں اور درد یا سوجن ہونے پر کوئی درد کش گولی کھا لیتی ہیں لیکن باقاعدہ علاج کے بغیر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔''

تھوڑی دیر کے لیے جیسے میں گنگ سا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔

''یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''دوسروں کی توجہ ہو یا نہ ہو۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''لیکن ایسے مرض میں سب سے زیادہ شوہر کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....'' میں نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اول تو پہلے رپورٹس آنے دیں۔ دوسرے یہ کہ اب یہ ناقابلِ علاج مرض نہیں رہا۔ محبت، توجہ اور اچھی دوائیں یہ سب مل کر مرض کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ابھی آپ اپنی بیگم سے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کیجیے گا۔''

ڈاکٹر جمیل نے خاتون سے مل کر واپس آتی زلیخا کو دیکھ کر کہا۔ میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ ہم دونوں واپس آ گئے۔

''ڈاکٹر آپ سے کیا سٹر پٹر کر رہے تھے؟'' زلیخا نے چادر تہ کر کے الماری میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہے تھے کہ آپ کی بیگم ابھی تک اتنی خوبصورت کیسے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' زلیخا نے ناراضگی سے کہا۔ ''ڈاکٹر جمیل ہرگز ایسی بات نہیں کر سکتے۔ وہ بہت مہذب آدمی ہیں۔''

''تو کیا میں غیر مہذب ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

''اب چائے بھی پلاؤ گی یا نہیں؟'' میں نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کیا۔

''ارے ابھی لائی۔'' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے شکر کیا کہ وہ اس بہانے باہر چلی گئی ورنہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کے متعلق میں اسے کیا بتاتا؟

☆☆☆

تیسرے دن زلیخا کو ریحان دوبارہ ٹیسٹ کے لیے لے گیا۔ اس ٹیسٹ رپورٹ کا ہمیں پندرہ دن انتظار کرنا تھا۔

درحقیقت یہ ٹیسٹ اس بات کی تصدیق کے لیے تھا کہ کیا زلیخا کو بریسٹ کینسر ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس اسٹیج پر ہے تاکہ اسی حساب سے علاج شروع کیا جا سکے۔

وہ پندرہ دن میں نے بڑی مشکل سے کاٹے اور انتظار کرتا رہا۔ پندرھویں دن میں خود رپورٹ لینے چلا گیا۔

رپورٹ لے کر میں سیدھا ڈاکٹر جمیل کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تمام رپورٹس کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہنے لگے۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیگم کو بریسٹ کینسر ہو گیا ہے۔ میں آپ کو ڈاکٹر منور مرزا کو ریفر کرنا چاہوں گا..... یا آپ اپنے طور پر کسی اور ڈاکٹر کو دکھانا چاہیں تو بہتر ہے۔''

میں خاموشی سے ان کی شکل دیکھتا رہا۔ ایک اندیشہ ہونا اور پھر اندیشے کی تصدیق ہو جانا زندگی کا بدترین مرحلہ ہوتا ہے۔

''مجھے احساس ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر نہیں لیکن حوصلہ ہارنا اس مسئلے کا حل نہیں۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''آپ کو اپنی بیگم کا حوصلہ بننا ہے۔''

www.alifayeem.com

''جی.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر جمیل نے مجھے ڈاکٹر منور مرزا کا پتا لکھ کر دے دیا، میں باہر آ گیا۔

میں نے گھر آ کے ڈاکٹر منور مرزا کا نمبر ملایا۔ انہوں نے ڈاکٹر جمیل کے ریفرنس سے مجھے اسی رات نو بجے کا وقت دے دیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

''آپ کو کیا ہوا، خیریت تو ہے نا؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے چہرے کا رنگ بالکل پھیکا پڑا ہوا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے انداز میں تشویش کا عنصر غالب تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری رپورٹس آ گئی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر جمیل کو دکھائی ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر منور مرزا کو دکھانے کے لیے کہا ہے بلکہ آج ہی وقت بھی لے دیا ہے۔ رات نو بجے کا۔''

''ڈاکٹر جمیل تو خود ڈاکٹر ہیں، انہیں دوسرے ڈاکٹر کو ریفر کرنے کی کیا ضرورت؟'' زلیخا نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''دراصل ڈاکٹر جمیل جنرل فزیشن ہیں جبکہ وہ چاہتے ہیں اسپیشلسٹ سے رابطہ قائم کیا جائے تاکہ رپورٹ کے مطابق علاج کیا جا سکے۔''

''ٹھیک ہے.....'' زلیخا نے کہا۔

''پھر میں ذرا جلدی سے کھانا بنا لوں۔ ریحان آئے گا تو کھانا تیار ہو گا۔ اس کو بھوک بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔ میں چپ رہ کر اسے دیکھتا رہا۔

گھنٹے بھر میں اس نے کھانا تیار کر لیا۔ ہم گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ ریحان آ گیا۔ ہم اس کو ڈاکٹر کا کہہ کر روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر منور مرزا کا کلینک شہر کے معروف علاقے میں تھا۔ میں نے استقبالیہ پر نام بتایا تو اس نے ہمیں مزید انتظار کرنے کی ہدایت کر کے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انتظار گاہ میں ہمارے علاوہ کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں مرد و خواتین دونوں ہی شامل تھے۔ بعض میڈیسن کمپنیوں کے پبلسٹی اسٹینڈ بھی رکھے ہوئے تھے جن میں دواؤں کے متعلق لکھا ہوا تھا۔

زلیخا خاموشی سے بیٹھ کر جائزہ لینے لگی۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں خاموش تھا۔ بعض اوقات جیسے لفظ گم ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر میں استقبالیہ سے ہمارا نام پکارا گیا اور ہم ڈاکٹر منور مرزا کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ادھیڑ عمر کے سفید بالوں والے ایک مسکراتے شخص تھے جن کا چہرہ ہی امید جگا دیتا ہے۔

انہوں نے تمام رپورٹس دیکھیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''اگر آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو میری ایک بات دھیان میں رکھیے گا۔''

''جی ڈاکٹر صاحب فرمائیے۔'' میں نے جواب دیا اور زلیخا کی طرف دیکھا۔

وہ بھی پوری طرح ڈاکٹر منور مرزا کی جانب متوجہ تھی۔

''دوائیں، غذا، دیکھ بھال یہ سب اس علاج میں صرف پچیس فیصد کام کرتے ہیں اور پچھتر فیصد آپ کا اپنا زندہ رہنے کا طاقت ور جذبہ۔ یہ مرض ایسا ہے کہ اس کا نام سن کر ہی آدمی ہمت ہار جاتا ہے کہ اب میں ایک ایسے سفر پر چل پڑا ہوں جس کا انجام صرف موت ہے لیکن آج کی میڈیکل تاریخ ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے کہ جنہوں نے اس مرض کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور موت کو پیچھے دھکیل دیا۔'' ڈاکٹر منور مرزا نے خاموش ہو کر ہماری طرف دیکھا۔

''آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی بالکل.....'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''اور آپ.....؟'' ڈاکٹر صاحب نے زلیخا کو بھی مخاطب کیا۔ ''آپ کا کیا فیصلہ ہے؟''

''زندہ رہنا کون نہیں چاہتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بالکل۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''ہم کو زندگی کا طاقت ور احساس ہی فتح دلاتا ہے۔''

''جی.....''

''ہم کل سے آپ کا علاج شروع کرنا چاہیں گے۔ کیا آپ تیار ہیں؟''

''بالکل.....'' میں نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، آپ صبح نو بجے تشریف لے آئیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''جی بہتر.....'' میں نے کہا اور ہم دونوں باہر آ گئے۔

واپسی پر زلیخا چپ چپ سی تھی۔ گھر آ کے وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ ریحان ہمارا منتظر تھا۔

''کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''کل سے باقاعدہ علاج شروع ہو گا۔'' میں نے بتایا۔ ''مختلف مختلف دورانیہ ہو گا علاج کا۔''

www.aldhayeem.com

''امی! آپ فکر نہ کریں، آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ریحان نے ماں کا ہاتھ تھام کے کہا۔

''ہاں.....'' زلیخا نے آہستگی سے جواب دیا۔ ''تم جو ہو میرے ساتھ.....''

''آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاؤں؟'' ریحان نے پوچھا۔

''فرحان ابھی نہیں آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، بھائی دو دن کے لیے کسی کام سے باہر گئے ہیں اور بھابی اپنے گھر گئی ہیں۔'' ریحان نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''اگر کہو تو ابھی فرحان کو فون کر کے بلا لیتے ہیں۔''

''نہیں۔'' زلیخا نے فوراً انکار کر دیا۔ ''کسی ضروری کام ہی سے گیا ہو گیا۔''

''تمہیں کچھ کھانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''خالی پیٹ ہو۔ دوائیں بھی لینی ہیں۔''

''کھانا تو میں بنا کے گئی تھی۔ ریحان گرم کر لے گا۔''

''امی! چٹپٹے تکے لے آؤں..... ابھی گیا اور ابھی آیا۔'' ریحان نے کہا اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں بالکل۔'' میں نے کہا۔

ریحان چلا گیا۔

اچانک زلیخا نے کہا۔ ''امی کہتی تھیں کہ وہ عورت خوش قسمت ہوتی ہے جو شوہر کی زندگی میں رخصت ہو جاتی ہے۔ اپنے شوہر کے ہاتھوں سے کفن دفن پاتی ہے۔''

''اچھا جی.....'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ اچانک اس قسم کی گفتگو کیوں شروع کر دی آپ نے..... خیریت تو ہے نا؟''

''مجھے باتوں میں مت ٹالیے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''باتوں میں نہیں ٹال رہا بلکہ اندر سے مجھے غصہ آ رہا ہے۔ اس قسم کی باتوں کا کیا مطلب۔ زندگی اور موت کا تمام معاملہ اللہ پاک کے اختیار میں ہے۔ ہمیں صرف اور صرف اچھا سوچنا چاہیے۔''

زلیخا نے میری طرف دیکھا اور چپ ہو گئی۔

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ زلیخا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ بہت سرد تھا۔

''کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا پھر اچانک اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو ڈھلک آئے۔

''بری بات۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''ہمت نہیں ہارتے۔ تم تو بہت بہادر ہو۔''

وہ کچھ نہ بولی۔ بس اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو نکلتے رہے۔ میں خاموش رہا اور اسے رونے دیا۔ رونے سے بھی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔

بعض اوقات بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کافی دیر کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک بات کہوں؟''

''کہو۔''

''میں چاہتی ہوں کہ ریحان کی شادی کر دوں۔'' وہ دھیمے سے بولی۔ ''میری تو بڑی آرزو تھی کہ میں فرحان کی اولاد دیکھوں مگر.....'' وہ چپ ہو گئی۔

''مگر کیا؟'' میں نے کہا۔ ''ابھی ان کی شادی کو دو برس ہی تو ہوئے ہیں۔ بعض مرتبہ بچے لیٹ ہو جاتے ہیں، ابھی تو بڑی عمر پڑی ہے۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' اس نے آہستہ سے ماتھے پر سے میرا ہاتھ ہٹایا۔

''عارفہ بچہ پیدا ہی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کہتی ہے کہ فی الحال وہ اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتی اور.....'' وہ چپ ہو گئی۔

''تو کیا ہوا؟'' میں نے دھیمے سے کہا پھر مزید بولا..... ''کچھ فیصلے تو اولاد کو خود کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اس میں، میں اور تم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ اگر میں آپ کو مجبور نہ کرتی تو یہ شادی نہ ہوتی۔ آپ کا کہنا کتنا درست ثابت ہوا کہ وہ گھریلو لڑکی نہیں ہے۔''

''دیکھو، جو ماضی میں ہو گیا، اس پر رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت۔ ان کا جوڑ لکھا تھا سو ہو گیا۔ ہر شادی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوتا ہی ہے نا۔ بس.....'' میں نے اس کو تسلی دی۔

''ہاں..... لیکن.....'' اس نے کہنا چاہا۔ مگر میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''بس اب فضول باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ ریحان کے لیے تم نے کوئی لڑکی دیکھی ہے کیا؟''

''بس اچانک ہی.....'' اس نے میری طرف دیکھا ''مجھے اچھی لگی۔ کبھی خاموش، کبھی اداس، کبھی کچھ۔ کبھی کچھ۔''

''کون ہے وہ خوش قسمت جسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر رہی ہو؟''

''وہ.....'' اس نے کہا ہی تھا کہ کمرے میں ریحان داخل ہوا۔

''میں گرم تکے کباب لے آیا ہوں۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔

''میں نکالتی ہوں۔'' زلیخا جلدی سے اٹھی۔

www.aitbayjeem.com

''میں لاتا ہوں، آپ آرام کریں۔'' ریحان نے کہا۔
''اب میں ایسی بیمار بھی نہیں کہ اٹھ نہ سکوں۔'' وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود اٹھ گئی اور ریحان کے ساتھ باورچی خانے میں چلی گئی۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ ریحان کے ساتھ ٹرے لے کر اندر آ گئی۔ تکوں کی خوشبو نے بھوک واقعی تیز کر دی تھی۔ ہم تینوں ہی کھانے میں مصروف ہو گئے۔
''امی! میں آپ کے لیے فانٹا لایا ہوں۔'' ریحان نے کہا۔ زلیخا کوک ٹائپ بوتل نہیں پیتی تھی۔
''بہت اچھا کیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔'' اس نے بیٹے کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔
''بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر گھومنے چلیں گے۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔'' ریحان نے ہنس کر کہا۔
''اب یہ لاابالی پن چھوڑ دو۔ تمہاری امی تمہارے لیے کچھ سوچ رہی ہیں۔''
''مثلاً؟'' ریحان نے پوچھا اور ماں کی طرف دیکھا۔
''میں سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں۔'' زلیخا نے کہا۔
''ابھی سے؟'' ریحان نے سوالیہ انداز میں کہا۔
''ابھی تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ یہ کام بھی ہونا ہے۔''
''کیا تمہیں کوئی پسند ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں، یہ تو آپ لوگوں کا کام ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔
''ماں صدقے۔'' بے ساختہ زلیخا نے کہا۔ ''تم نے تو میرا سیروں خون بڑھا دیا۔''
''اگر کوئی پسند ہوتی تو کیا ہوتا؟'' ریحان نے ہنس کر پوچھا۔
''کچھ نہیں ہوتا۔ بس اس سے تمہاری شادی کر دیتے۔'' زلیخا نے آہستہ سے کہا۔
''امی! میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل جل کے رہیں اور اس کے لیے لڑکی وہ ہو، جو گھریلو ہو اور جو آپ دونوں کی عزت کرے، آپ کو پسند کرے۔'' اس نے کہا۔
مجھے بہت اچھا لگا۔ ریحان بہت سمجھداری کی باتیں کر رہا تھا۔
''تم نے پوچھا نہیں کہ لڑکی کون ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔
''جب فیصلہ آپ لوگوں پر چھوڑ دیا ہے تو مجھے تحقیق کی کیا ضرورت؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے جیسے آپ دونوں مل کر میرا تو! لگا رہے ہیں۔''
مجھے اور زلیخا دونوں کو ہی اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔
ان ہی باتوں کے دوران کھانا ختم ہو گیا۔ ریحان برتن سمیٹ کر باہر لے گیا۔
''چلو اب سو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''صبح جلدی اٹھنا ہے۔''
''اچھا۔'' زلیخا نے کہا اور لیٹ گئی۔
رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، میں نے نائٹ بلب جلا دیا اور لیٹ گیا۔ ذرا دیر بعد زلیخا نے میری طرف کروٹ بدلی۔
''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں بس ایسے ہی۔'' اس نے کہا۔
''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر باتیں کرنے کا دل چاہ رہا ہے تو باتیں کرو۔''
''ایک بات پوچھوں؟'' زلیخا نے کہا۔
''پوچھو، ایک کیا دس باتیں پوچھو۔'' میں نے جواب دیا۔
''اگر میں نہ رہی تو کیا آپ دوسری شادی کریں گے؟'' اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔
''کیسی بے تکی بات ہے؟ بہتر ہے کہ تم سو جاؤ۔'' مجھے غصہ آ گیا۔
''ناراض نہ ہوں..... لیکن بتایئے تو سہی۔''
''اچھا تو سنو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا عادی ہو گیا ہوں۔ ہر چیز میں تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ میرا خیال نہیں کہ کوئی اور تمہاری جگہ لے سکے۔''
وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''میں بھی بس عادت بنی..... محبت نہیں!''
اس کا جملہ اتنا اچانک تھا کہ میں کچھ بول نہ سکا۔
''شاید میں تمہیں سمجھا نہیں پایا۔'' میں نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''تم نے کسی بھی مرحلے پر مجھے کسی مشکل کا احساس نہیں ہونے دیا۔ کبھی کوئی ضد، غصہ، جھنجلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تم ایک مثالی عورت ہو۔''
''مثالی عورت۔'' اس نے دھیرے سے دہرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆

صبح میری آنکھ ساڑھے سات بجے کھل گئی۔ میں نے الارم لگایا ہوا تھا۔ میں نے رات ہی اسلم کو کہہ دیا تھا کہ منڈی کا کام وہ دیکھ لے۔
میں نے زلیخا کو اٹھایا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ سامنے دیوار گیر گھڑی پر اس کی نظر پڑی۔ ''یا اللہ! میں اتنی بے خبر سوئی کہ آنکھ ہی نہ کھلی۔''

www.urdubayeen.com

''کوئی بات نہیں۔ میں نے اسلم کو رات ہی بتا دیا تھا کہ میں آج نہیں آؤں گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''اچھا .....'' وہ مطمئن ہو گئی۔ ''میں ناشتا بناتی ہوں۔'' وہ بال سمیٹتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔

ابھی وہ باورچی خانے میں ہی تھی کہ ریحان بھی تیار ہو کے آ گیا۔ ''ابو! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو آپ امی کے ساتھ رہیے گا میں لاتا رہوں گا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔''

''کیا ٹھیک رہے گا؟'' زلیخا نے پوچھا۔

ہم باپ بیٹا باورچی خانے کے سامنے ٹی وی لاؤنج میں باتیں کر رہے تھے جہاں سے باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی زلیخا ہماری باتیں سن رہی تھی۔

''امی! اسپتال ہمیں بھی جانا ہے۔'' ریحان نے کہا۔

''اور یونیورسٹی کون جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''آج کوئی خاص کلاس نہیں ہے۔'' ریحان نے جواب دیا۔

''تمہارا یونیورسٹی کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' میں نے ریحان سے پوچھا۔

''وہی جو آپ کر رہے ہیں۔'' ریحان نے بتایا۔

''کیا مطلب، تم آڑھت کرو گے..... ایم بی اے کر کے؟''

''تو کیا ہوا؟'' ریحان نے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ کام برا ہے؟ اگر آپ لوگ نہ ہوں تو شہر کا شہر ترستا بھوکا رہ جائے گا۔ میں تو بس اسے ایک نیا رخ دوں گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پاکستانی آلو، پیاز اور لہسن کی بڑی کھپت ہے مڈل ایسٹ میں۔ میں بیرون ملک ان چیزوں کو بھیجوں گا۔ آپ دیکھیے گا۔''

''بہت اچھے۔'' میں نے تعریف کی۔ ''یہ تو بہت اچھا پروجیکٹ ہے۔ گھر کا کام اور کیا چاہیے۔''

''بالکل۔'' ریحان نے کہا۔ ''میں اپنے ابو کے کام کو نیا انداز دوں گا۔ آپ دیکھیے گا کیا ہوتا ہے۔''

''ارے واہ! میرا بیٹا تو بہت سمجھ دار ہو گیا ہے۔'' زلیخا نے کہا جو ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

''ظاہر ہے، بیٹا کس کا ہے۔''

''وہ تو ظاہر ہے کہ تمہارا بیٹا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر میں ناشتا لگ گیا۔ ہم تینوں ناشتا کرنے لگے۔ اسی دوران زلیخا نے کہا۔ ''آپ دونوں میری بات اچھی طرح سن لیں۔ مجھے اس طرح کا کوئی علاج نہیں کروانا، نہ تو میں گنجی ہونا چاہتی ہوں نہ ہی اپنا حلیہ خراب کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میرا ہاتھ کپ تھامے ہوا میں معلق رہ گیا۔

''آپ مجھے کیا بچی سمجھتے ہیں؟ کیا مجھے پتا نہیں کہ بریسٹ کینسر کیا ہوتا ہے؟'' اس نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا۔

ہم دونوں چپ ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں ریحان نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن دستیاب علاج سے فائدہ اٹھانا بھی تو کوئی برا نہیں۔ آخر یہ جدید میڈیسن انسانوں کی بھلائی کے لیے ہی تو ہیں۔''

''ہاں.....'' زلیخا نے سکون سے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں۔ مجھے نہ بہلاؤ۔''

زلیخا کا لہجہ اتنا دوٹوک تھا کہ ہم خاموش ہو گئے۔

میں نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ ''کیوں نہ ایسا کریں کہ آج ہی ہو آتے ہیں۔ وقت بھی لیا ہوا ہے اور تمہاری نہ سہی ہماری تسلی ہو جائے گی۔''

زلیخا چند لمحوں تک ہمیں دیکھتی رہی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں جب چاہوں گی چلی چلوں گی مگر آج نہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کبھی ضد نہ کرنے والی زلیخا اتنی ضدی اور دوٹوک کیسے ہو گئی ہے۔

ریحان نے ناشتا ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنا ایک اسائنمنٹ مکمل کر لوں۔ اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔''

میں نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ ریحان اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

زلیخا نے نہ جانے کیا بات کی کہ ایک دن مجھے کہنے لگی۔ ''ذرا زبیدہ باجی کے گھر چلیں گے میرے ساتھ؟''

''ہاں چلو خیریت؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ریحان کی شادی زبیدہ باجی کی بیٹی ریشماں سے کر دوں۔ مجھے وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے۔''

''کیا؟'' میں اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحے تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

اس نے مجھے دیکھا۔ ''کیا آپ کو پسند نہیں ریشماں؟''

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن میرا تو خیال تھا کہ تم اپنے کسی بھائی کی بیٹی لو

www.aiidayjeem.com

گی۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو رہنے دیں۔'' اس نے میرے چہرے پر نگاہیں جمائیں۔

میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر کیا وہ راضی ہو جائیں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' زلیخا نے کہا۔ ''جب آپ کہیں گے تو وہ نہ نہیں کریں گی۔''

''تمہیں اتنا یقین کیوں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ بولی۔ ''بس بعض اوقات احساس ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہمارے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری بات ہی نہیں ٹال سکتا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے جرح کی۔ ''تمہیں کیونکر یہ اندازہ ہے کہ وہ بات مان لے گی؟''

زلیخا نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''بس کوئی وجہ نہیں۔ یقین ہے۔'' وہ بولی۔ ''اگر نہیں جانا چاہتے تو صاف منع کر دیں۔'' اس کے انداز میں غصہ تھا۔

میں چپ ہو گیا پھر میں نے کہا۔ ''اگر تمہیں اتنا ہی بھروسا ہے تو پھر جب کہو، چلتے ہیں۔''

''آج شام ہی۔'' اس نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شام کو ہم دونوں میاں بیوی زبیدہ کے گھر پہنچے۔ وہ بہت خوش ہوئی اور حیران بھی کیونکہ ہم دونوں کبھی ان کے گھر اکٹھے نہیں آئے تھے۔

ہم لوگ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

''چائے یا ٹھنڈا کیا چلے گا؟'' زبیدہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ آپ دونوں میرے گھر آئے ہیں۔''

''جب ہم ایک ہی محلے میں ہیں تو آنا جانا تو لگا ہی رہے گا۔'' زلیخا نے کہا۔ ''اچھی سی چائے پلوا دیجیے۔''

زبیدہ نے اماں بی سے چائے بنوانے کے لیے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں ریشماں چائے کی ٹرالی لیے چلی آئی جو چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔

''چلیں باتیں تو ہوتی رہیں گی، چائے تو لیں.....'' زبیدہ نے کہا۔

''ہم آپ سے ایک چیز مانگنے آئے ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔

''کہیے۔'' زبیدہ نے چونک کر کہا۔

زلیخا بولی۔ ''مجھے آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی۔ اس کو مانگنے آئی ہوں اپنے بیٹے ریحان کے لیے۔''

''کیا؟'' زبیدہ کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ اس نے مجھے دیکھا پھر زلیخا کو۔

''آپ کی مہربانی لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' زلیخا نے تیزی سے کہا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے ہی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔ تو ہم سوالی بن کر نصیب کی تھالی بن کے آئے ہیں۔ کیا آپ ہمیں خالی ہاتھ لوٹائیں گی.....؟'' زلیخا نے کہا۔ اس نے ''ہمیں'' پر خاصا زور دیا تھا۔

''مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دیجیے۔'' زبیدہ نے کہا۔

''آپ ضرور سوچیں لیکن ہمارے حق میں۔'' زلیخا نے چائے کا گھونٹ لیا۔ زبیدہ مسکرا دی۔

زلیخا نے کہا۔ ''میرا بیٹا بہت نرم مزاج اور خیال رکھنے والا ہے۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔ وہ بہت خوش رکھے گا آپ کی بیٹی کو۔''

''جی میں جانتی ہوں۔'' زبیدہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے لیے خوش قسمتی ہوگی کہ آپ لوگوں سے ناتا جڑ جائے۔''

''میرے پاس وقت کم ہے۔'' اچانک زلیخا نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' زبیدہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے کہ نیک کام میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ جو تھوڑی سی، چھوٹی سی زندگی ہے ہمیں اس میں خوشیاں کشید کر لینا چاہئیں۔''

''جی ..... جی ..... بالکل۔'' زبیدہ نے فوراً کہا۔ لیکن اس کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکی۔

''اچھا ہم چلتے ہیں، آپ ہمیں کل تک بتا دیجیے گا۔'' زلیخا نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیں۔'' زلیخا نے میری طرف دیکھا۔

ہم دونوں انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئے۔

گھر پہنچ کے میں نے کہا۔ ''تم نے کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں کر دی ان سے جواب لینے میں؟''

''میں چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد ریحان کا سہرا دیکھ لوں۔''

''اتنی مایوس کیوں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بچوں کی شادی سے تو مایوسی ختم ہو جائے گی۔ مصروفیت مل جائے گی اور آپ مجھے مایوس سمجھ رہے ہیں۔'' زلیخا نے جواب دیا۔

''تمہاری منطق سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' میں نے کہا۔

''میری طرف سے تمہیں اجازت ہے جس طرح چاہو کرو۔''

www.aitbayjeetn.com

''شکریہ.....'' زلیخا نے ہنس کر کہا۔

☆☆☆

زبیدہ راضی ہو گئی۔ اس نے بیٹی کے لیے ہاں کر دی۔ زلیخا نے کہا کہ اسے جہیز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر اس کے باوجود زبیدہ نے بیڈ روم کا سارا فرنیچر دیا۔ ریحان نے ماں کی خواہش کو پورا کیا اور ریشماں بہت سادگی سے بہو بن کر ہمارے گھر آ گئی۔

ولیمے کے تیسرے دن ریحان نے کہا۔ ''امی! میں نے آپ کی بات مان لی۔ اب آپ ہماری بات مانیں۔''

''کہو بیٹا۔'' زلیخا نے مسکرا کے کہا۔

''اب آپ اپنا علاج کروانا شروع کیجیے اور پہلے سن لیجیے کہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔''

''بالکل صحیح۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ سب تم نے اپنی مرضی سے کیا۔ اب ہماری مرضی چلے گی۔''

زلیخا نے غور سے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔

''اس میں بھلا ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''خالی ہنس نہیں رہی ہوں، خوش ہو رہی ہوں کہ آپ نے اپنا استحقاق تو جتایا۔''

اس کی بات سن کر میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں۔ کیا تمہیں میرا کہنا برا لگا؟''

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پھر کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ تو ہر بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔'' اس نے اچانک جیسے جھنجلا کے کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

زلیخا کا علاج شروع ہو گیا۔ وہ چڑچڑی اور غصیلی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اس کے علاج کے منفی اثرات تھے۔ بعض لوگوں کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ جب آپ کے بال جھڑنے لگیں اور چہرہ آہستہ آہستہ اندرونی کمزوری کا غماز بننے لگے۔

چھٹی کیموتھراپی کے بعد زلیخا نے کہا۔ ''میں اب نہیں جاؤں گی۔ میں سکون سے مرنا چاہتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اللہ نہ کرے کہ یہ وقت آئے۔'' میں نے کہا۔

''موت تو آنی ہے، اس سے کون بھاگ سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر نے میرا بریسٹ ریموو کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی عورت کے لیے یہ کتنی اذیت ناک بات ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں تمہاری زندگی عزیز ہے، تم ہماری ضرورت ہو۔''

''عزیز ہو، زندگی عزیز ہے، ضرورت ہو۔'' زلیخا ہنسی۔

''کیا تمہیں میرا کہنا برا لگا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ضرورت ہی تو ہوں میں۔'' وہ کروٹ بدل کے منہ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گئی۔

''زلیخا۔'' میں نے آہستہ سے اسے پکارا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

یہ ریحان کی شادی کا دوسرا مہینا تھا جب میں نے زلیخا کو بہت خوش دیکھا۔

''کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بات ہی خوشی کی ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''پتا ہے آپ کو ریشماں کی رپورٹ آ گئی ہے۔ میں دادی بننے والی ہوں۔'' وہ ہنسنے لگی۔

میں نے غور سے دیکھا، اس کے پیلے چہرے میں گلابیت جھلک رہی تھی۔

''ریشماں.....'' اس نے آواز دی۔

''جی امی.....'' ریشماں باورچی خانے سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' زلیخا نے بیڈ پر کھسک کر جگہ دی۔

''تمہارے ابو خوش ہیں۔'' وہ ہنسنے لگی۔ ریشماں کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔

''ارے بھئی انعام دیجیے میری بیٹی کو۔'' زلیخا نے کہا پھر مجھے دیکھا۔ ''اتنے غور سے نہ دیکھیں، میری بیٹی کو نظر لگ جائے گی۔''

اتنے میں ریحان بھی آ گیا۔

''بس اپنی بہو کے چکر میں اپنے بیٹے کو بھول گئیں۔'' اس نے لاڈ سے گلہ کیا۔

''میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔'' زلیخا نے پیار سے بیٹے کو دیکھا۔

''میری ایک خواہش ہے۔'' زلیخا نے کہا۔

''ایک کیوں آپ دس خواہشیں کیجیے۔'' ریحان نے شوخی سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی خوشی کے اثرات تھے۔

باپ بننے کی خوشی کچھ الگ ہی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم نے اس کائنات میں اپنا عکس چھوڑ دیا۔ اپنا آپ منوا لیا۔ اپنے ہونے کا ثبوت دے دیا۔

www.aliyeen.com

"اگر لڑکی ہو تو اس کا نام زلیخا رکھنا اور اگر لڑکا ہو تو اس کا نام ماجد رکھنا۔" پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

"دادا دادی کے نام پر۔"

"امی آپ سلامت رہیں۔ بچوں کے نام آپ ہی نے رکھنے ہیں، دو چار چھ آٹھ۔"

ریحان نے کہا اور شرارتاً بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ جھینپ گئی۔

"کیوں میری بچی کو تنگ کر رہا ہے۔" زلیخا نے پیار سے بیٹے کو ڈانٹا۔ ہم لوگ ہنسنے لگے۔

☆☆☆

لیکن..... لیکن زلیخا اپنے پوتے کو دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ پتا نہیں کیوں اور کیسے جس تیزی سے میری دنیا میں وہ آئی تھی، اتنی ہی خاموشی سے چلی گئی۔ گھر جیسے خالی ہو گیا تھا۔

ریشماں اپنی ماں کے پاس تھی۔ اس کے ہاں ولادت قریب تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہ ہونے کے باعث میں نے اسے کہا تھا کہ تم اپنی ماں کے پاس رہو۔ ان معاملات میں سہارا بہت ضروری ہوتا ہے۔

ریحان رات گئے آتا تھا۔ فرحان تو پہلے ہی الگ تھلگ رہتا تھا۔ ماں کے بعد تو جیسے اس سے دوریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔

رات حبس زدہ تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ سامنے ہی زلیخا کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے شلوار سوٹ، دوپٹے..... نیچے رکھی ہوئی چوڑیاں اور اس کے استعمال کا سامان۔ میں نے اس کا پٹ بند کر کے الماری کا دوسرا پٹ کھولا۔ پتا نہیں کیوں بہت عرصے کے بعد میں نے وہ ڈبا نکالا۔ وہ ڈبا جس میں میری یادیں بند تھیں۔

میں نے ڈبے کو نکال کے بیڈ پر رکھا پھر آہستہ سے اسے کھولا۔ اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔

'یہ تو میں نے نہیں رکھا۔' میں نے سوچا اور کاغذ اٹھا لیا۔ وہ خط تھا۔ زلیخا کا میرے نام۔

"جیسے جب یہ خط آپ پڑھ رہے ہوں گے تو اس کا مطلب ہو گا کہ اب میں آپ کے پاس نہیں ہوں اور پتا نہیں کہ آپ کی یادوں میں بھی ہوں یا نہیں۔ میں نے آپ کو بہت ٹوٹ کے چاہا۔ اتنا چاہا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کے ہر چھوٹے بڑے کام کو میں نے عبادت سمجھ کے کیا لیکن میں آپ سے جواباً محبت کا گرم جوش اظہار نہ پا سکی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ میرے پاس جسمانی طور پر تھے لیکن آپ کا دل اور روح کسی اور کے پاس تھی۔

یہ حقیقت مجھے اسی دن معلوم ہو گئی تھی۔ جس دن آپ نے کہا تھا..... میں تمہیں زوبی کہا کروں۔ آپ مجھ میں کسی اور کو ڈھونڈ رہے تھے۔

میں ضرورت تھی۔ بیوی تھی۔ عادت تھی۔

بس آپ کی محبت نہیں تھی۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ آپ کس قدر مشکل زندگی گزارتے ہیں۔ میرے ساتھ رہتے ہیں مگر مجھے احساس تک نہیں ہونے دیتے کہ آپ میرے پاس ہو کر بھی میرے نہیں۔ بہت فنکار آدمی ہیں آپ۔

ساری زندگی میں آپ سے ملنے کے لیے ترستی رہی اور آپ کھڑکی کھلنے کے منتظر رہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عورت جو آپ کی بیوی ہو، وہ آپ سے بے خبر رہ سکتی ہے؟ میری ساری محبت اور وفائیں اس ڈبے کے بھنور میں ڈوبتی رہیں۔ میں کس کے لیے جیتی؟ عورت کو صرف بچے، گھر، معاشی سکون ہی نہیں شوہر بھی چاہیے ہوتا ہے۔ محبت اور گرم جوشی سے بھرپور..... مگر آپ نے تو ساری زندگی مجھے عادت کی طرح اپنائے رکھا۔

اب میں نہیں ہوں۔ آپ آزاد ہیں۔

مگر کیسے آزاد؟

اب آپ کے سامنے زبیدہ ہے۔ ایک اپنے گھر میں۔ ایک ہمارے گھر میں..... ریشماں کی صورت۔ ایک زبیدہ آپ کی محبت..... آپ کی زوبی۔

ایک زبیدہ آپ کی بہو۔ آپ کی بیٹی۔

ساری عمر میں جس کرب میں مبتلا رہی، آپ کے پاس رہتے ہوئے بھی آپ کو نہ پا سکی۔ اب آپ نہ تو مجھے پا سکیں گے، نہ زوبی کو۔

آپ کی زلیخا۔ اگر آپ نے مجھے اپنا سمجھا۔"

خط میرے ہاتھ میں لرز رہا ہے، میری زندگی کپکپا رہی ہے۔

کیا مجھے خواب دیکھنے، اپنے دل کی کوٹھڑی میں کچھ بھی رکھنے کا حق حاصل نہیں تھا؟

زلیخا! آج تم نے مجھے واقعی اکیلا کر دیا۔ نہ تو میرے پاس تم رہیں نہ زبیدہ۔ مجھے اتنا خالی اور تہی دست کر کے تمہیں کیا ملا..... اور میں نے کیا کمایا؟

خط میرے ہاتھ میں لرز رہا ہے۔ میری زندگی کپکپا رہی ہے۔

⌘⌘⌘

www.urdtayjeem.com